کتابی سلسلہ ۱

ندآ فاضلی نمبر

اعتراف

کتابی سلسلہ ۱

ندا فاضلی نمبر

رابطہ
اعتراف گروپ
الکھنندا، ۴۵۹ / ۱۴، نہرو نگر، کرلا (مشرق) ممبئی - ۴۰۰۰۷۰

Aetraf (Book Series No.1) اعتراف کتابی سلسلہ ۱

Nida Fazli Number ندا فاضلی نمبر

قیمت : -/250 روپے - غیر مجلد (دوسو پچاس روپے)
-/300 روپے - مجلد (تین سو روپے)

اشاعت : اپریل 2005

ناشر : ڈاکٹر رام پنڈت [ازراہ کرم چیک Aetraf Group کے نام بھجوائیں]

ترسیل زر کا پتہ : Dr. Ram Pandit, Alakhnanda - 14/459, Nehru Nagar, Kurla (E), Mumbai - 400 070, Tel. No. 25220413

شریک کار : اسلم پرویز
Sanobar Manzil, 16/3 - Hall Road, Kurla, Mumbai - 400 070, Tel. No. 9322403565

مرتب : وقار قادری
Asmita Vintage-I, B-Wing, 501, Naya Nagar, Mira Road (E) Dist Thane - 401 107, Tel. 28115693

کمپوزنگ : غزالی
اور نور گرافکس، فون: 9869193591

ٹائٹل : پریش پنڈت [تصویر: عباس صباحت]

ملنے کے پتے :
- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ
دہلی، علی گڑھ اور ممبئی
- کتاب دار [بک سیلرس اینڈ پبلشر]
جلال منزل، گراؤنڈ فلور، ٹیمکر اسٹریٹ، نزد جے جے اسپتال، ممبئی-8
- معیار پبلی کیشنز،
کے 302، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی-110031
- سیفی بک ایجنسی،
امین بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی - ۴۰۰۰۰۳

Printed at : Adabi Printing Press, Mumbai - 400 008

• ترتیب

انٹرویوز

کلامِ ندا - انتخاب: عبدالاحد سازؔ

مضامین ندا - انتخاب: وقار قادری

خطوط

عرضِ مرتب

اردو کے اہم شاعروں اورادیبوں کے فن وشخصیت کا اعتراف کرنے کی غرض سے ہم نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔اس کی پہلی کڑی ''ندافاضلی نمبر'' آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

آخرندافاضلی ہی کیوں؟

ندافاضلی ہمارے عہد کے ان ممتاز شاعروں میں سے ہیں جن کی تخلیقات نے بعد کی نسل کو بے حد متاثر اورمتوجہ کیا ہے۔ان کی شاعری سے اردو میں ایک نیا شعری محاورہ وجود میں آیا ہے۔انہوں نے اس بھولی بسری لسانی وراثت (خسرو، میرا، کبیر، رحیم، سورداس وغیرہ) سے رشتہ جوڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے جسے لوگ بھول گئے تھے۔ندا نے نہ صرف اس وراثت کی بازیافت کی ہے، اس وراثت میں موجودہ عہد کی لسانی ذہانت جوڑ کے اردو کے شعری ادب میں نئے امکانات کی نشاندہی کی ہے۔وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں مگر ان کے نثری اسلوب نے بھی اپنی ایک الگ راہ بنائی ہے۔ بقول وارث علوی ''تم (ندا) ان چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہو جن کی شاعری اور نثر دونوں لوگوں کو رِجھا گئے ہیں۔''

آج ندا یقیناً اردو شعروادب کا اہم اور نمایاں نام بن کر ادبی دنیا پر چھا گئے ہیں۔ ہم نے ان کے چالیس پینتالیس برس کے طویل ادبی سفر کا جائزہ لینے اور اہل اردو کی جانب سے ان کی ادبی خدمات کا **اعتراف** کرنے کی کوشش کی ہے۔

جب اعتراف کا یہ خصوصی شمارہ شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ذہن میں کئی نام تھے۔ ہر نام اپنی جگہ اہم تھا مگر ہم نے ایک ہی نام پر اتفاق کیا اور وہ نام تھا ندافاضلی۔ ندافاضلی، اپنی کئی خصوصیات کی بنا پر ممتاز ہیں۔وہ بیک وقت کئی شعبوں سے منسلک ہیں۔نہ صرف اردوادب کا ایک اہم نام ہیں بلکہ ایک کامیاب فلمی گیت کار، مترجم، کالم

نگار اور ٹی وی کے ادبی پروگراموں کے پیش کار ہیں۔ ندا کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے۔اعتراف کے اس شمارے کے ذریعہ ان کے اس سفر کا ۲۰۰۵ء تک کا جائزہ آپ کے سامنے پیش ہے۔انہی کا ایک شعر ہے ؎

اب جہاں بھی ہیں وہیں تک لکھو رودادِ سفر
ہم تو نکلے تھے کہیں اور ہی جانے کے لئے

اس نمبر میں شامل تمام مقالہ نگار، مضمون نگار اور تبصرہ نگار حضرات کا بے حد ممنون ہوں کہ ان کے قلمی تعاون کے بغیر اس نمبر کی اشاعت ممکن نہیں تھی۔ جناب عبدالاحد ساز اور جناب شاہد ندیم کا خصوصی شکریہ کہ انہوں نے مجھے تعاون دیا۔

ڈاکٹر رام پنڈت اور اسلم پرویز جیسے دوستوں کا ساتھ جب تک ہے، اعتراف کا یہ کتابی سلسلہ جاری رہے گا۔

ع اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

ندا فاضلی نمبر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ہمیں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

وقار قادری

اپریل ۲۰۰۵ء

ندا ایک تعـــارف

نـام : ندا فاضلی

پتـہ : B/201،سن رائز، آرام نگر II،ورسوا، اندھیری (ویسٹ)، ممبئی۔ 061 400

پیدائش : ۱۲/اکتوبر ۱۹۴۰ء (گوالیار)

تعلیم : ایم۔اے (اُردو، ہندی)، وِکرم یونیورسٹی، اُجین

کتابیں : شاعری—اردو

لفظوں کا پُل - [اشاعت اوّل] ۱۹۷۱ء

لفظوں کا پُل [اشاعت دوّم] - ۱۹۹۸ء

مورناچ -دسمبر ۱۹۷۸ء

آنکھ اور خواب کے درمیان - ۱۹۸۴

کھویا ہُوا سا کچھ - ۱۹۹۶ء

شہر تو میرے ساتھ چل - ۲۰۰۴ء

نثر — اردو

ملاقاتیں (تنقید) - ۱۹۸۶ء

دیواروں کے بیچ (ناول)

دیواروں کے باہر (ناول) - ۲۰۰۰ء

چہرے (مشاعرہ کے شاعروں پر خاکے) ۲۰۰۲ء

شاعری — ہندی

مورناچ

آنکھوں بھرا آکاش

کھویا ہُوا سا کچھ

سفر میں دُھوپ تو ہوگی

ہم قدم

ندا فاضلی کی شاعری (انتخاب، ترتیب کے۔ایل نندن)

(گجراتی) ترتیب پیش لفظ: داغؔ دہلوی

جگرؔ مرادآبادی

جاں نثار اخترؔ

نریش کمار شادؔ

حسنؔ نعیم

فراقؔ گورکھپوری

احمد فرازؔ

محمدؔ علوی

بشیرؔ بدر

ندؔا فاضلی

اعزازات

غالبؔ ایوارڈ (برائے ادب)

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (برائے "کھویا ہُوا سا کچھ")

ایم۔ پی۔ شاسن ساہتیہ پریشد پُرسکار (برائے "ملاقاتیں")

جے۔ دیال ہارمونی ایوارڈ، دہلی (برائے شاعری)

روٹری ایکسلینٹ ایوارڈ (برائے ادب)

اسکرین ایوارڈ' بہترین نغموں کے لئے (برائے فلم "سُر")

اِس کے علاوہ اِس ممتاز شاعر کی شاعرانہ صلاحیت کا اعتراف کرتے ہُوئے مختلف ریاستوں مہاراشٹر، اُتر پردیش، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، راجستھان اور بہار نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔

کئی فلموں میں گیت تحریر کیے اور فلمی دُنیا کو کئی معیاری گیت دیے۔ مختلف ٹی وی سیریل تحریر کیے اور ای۔ ٹی وی کے پروگرام اُردو بازار اور یو ٹی این کے شاعری پروگرام کی نظامت بھی فرمائی۔ اِن کی شاعری کئی بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

آپ نے امریکہ، اٹلی، کینیڈا، آسٹریلیا، برطانیہ اور یو۔ اے۔ ای میں ہندوستانی ادب کی نمائندگی کی ہے۔

پہچانتے تو ہونگے ندا فاضلی کو تم (سورج کو کھیل سمجھا تھا چھوتے ہی جل گیا)

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

گذرتے وقت نے دھندلا دیئے سبھی چہرے
خوشی خوشی ہے، نہ غم غم ہے کیا کیا جائے
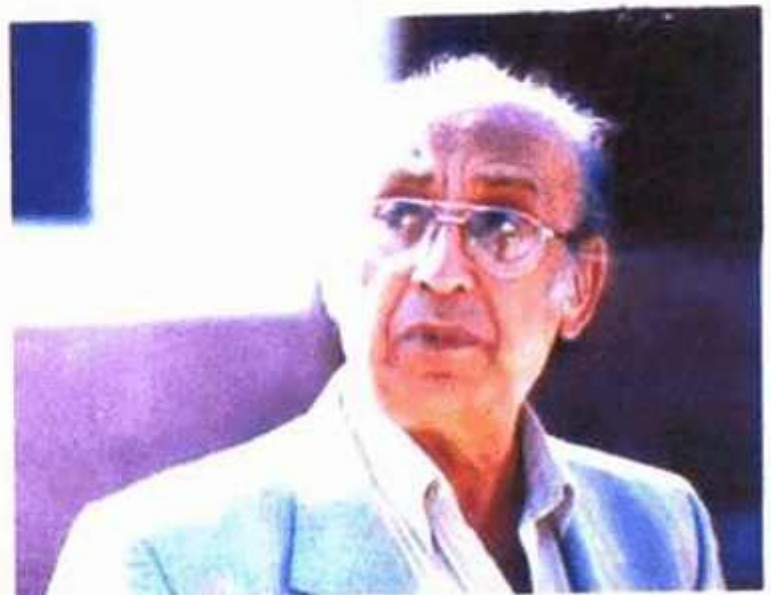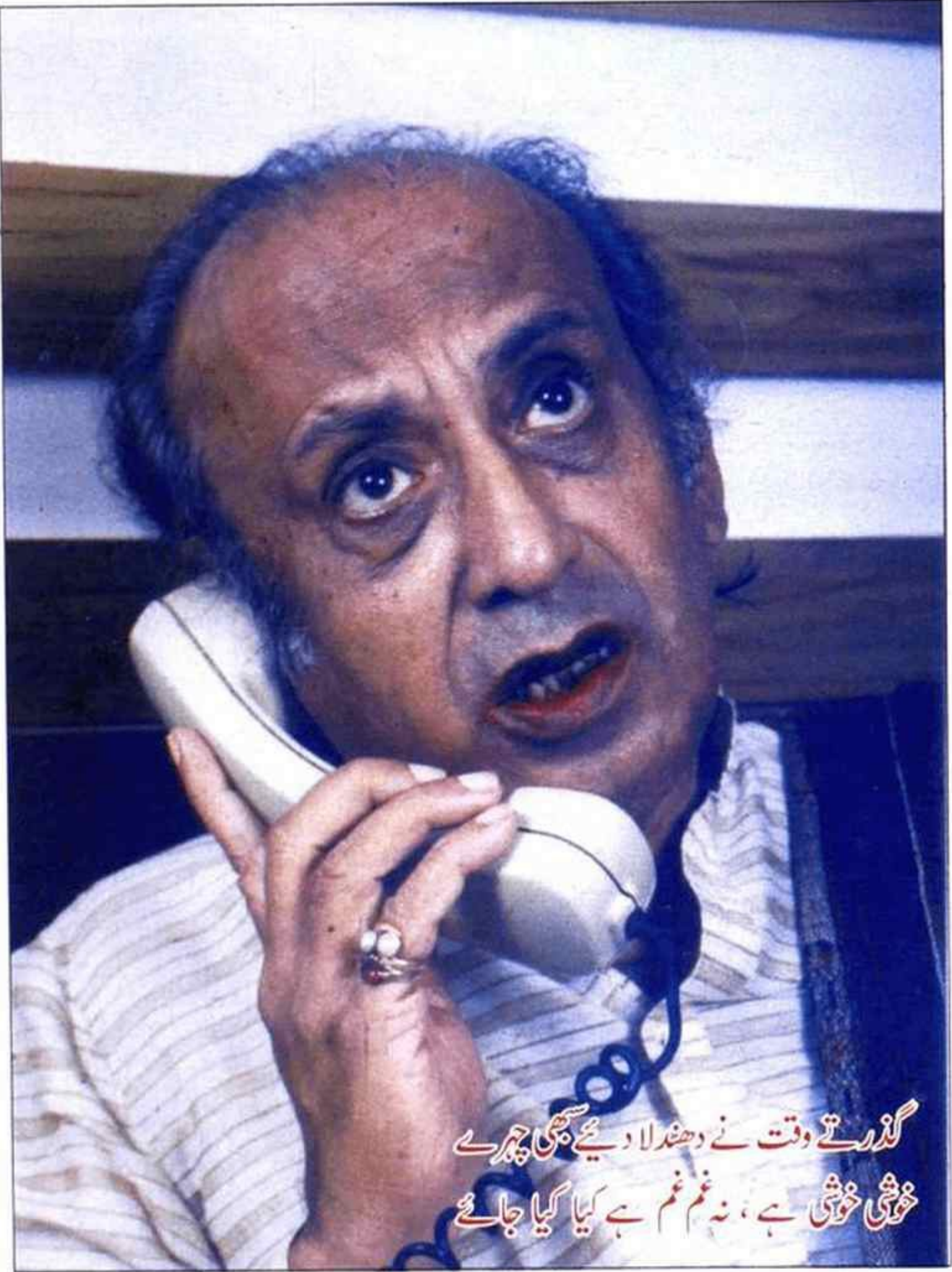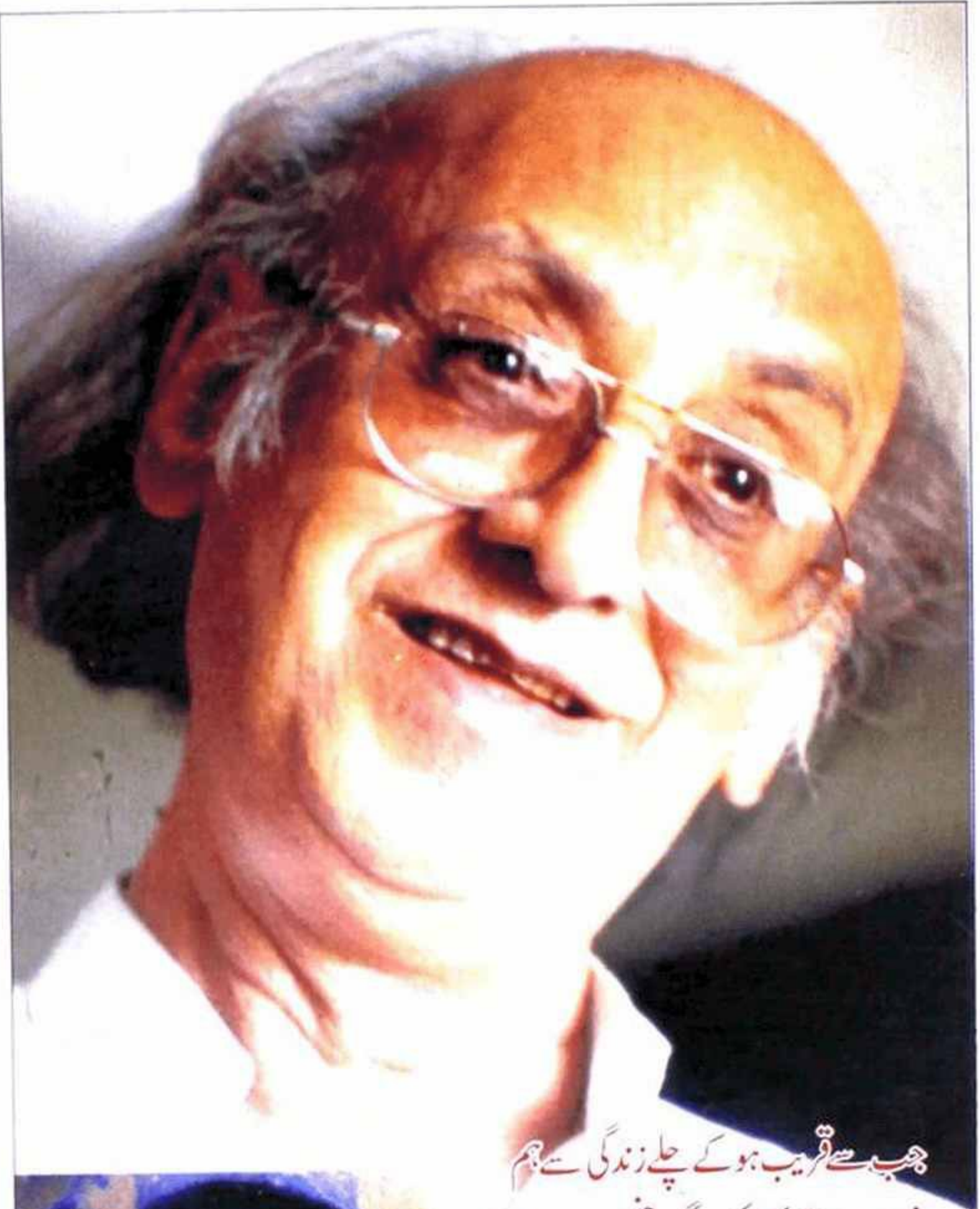
جب سے قریب ہو کے چلے زندگی سے ہم
خود اپنے آئینے کو لگے اجنبی سے ہم

دائیں سے : اقبال انجم، ندا فاضلی، معصوم نظر
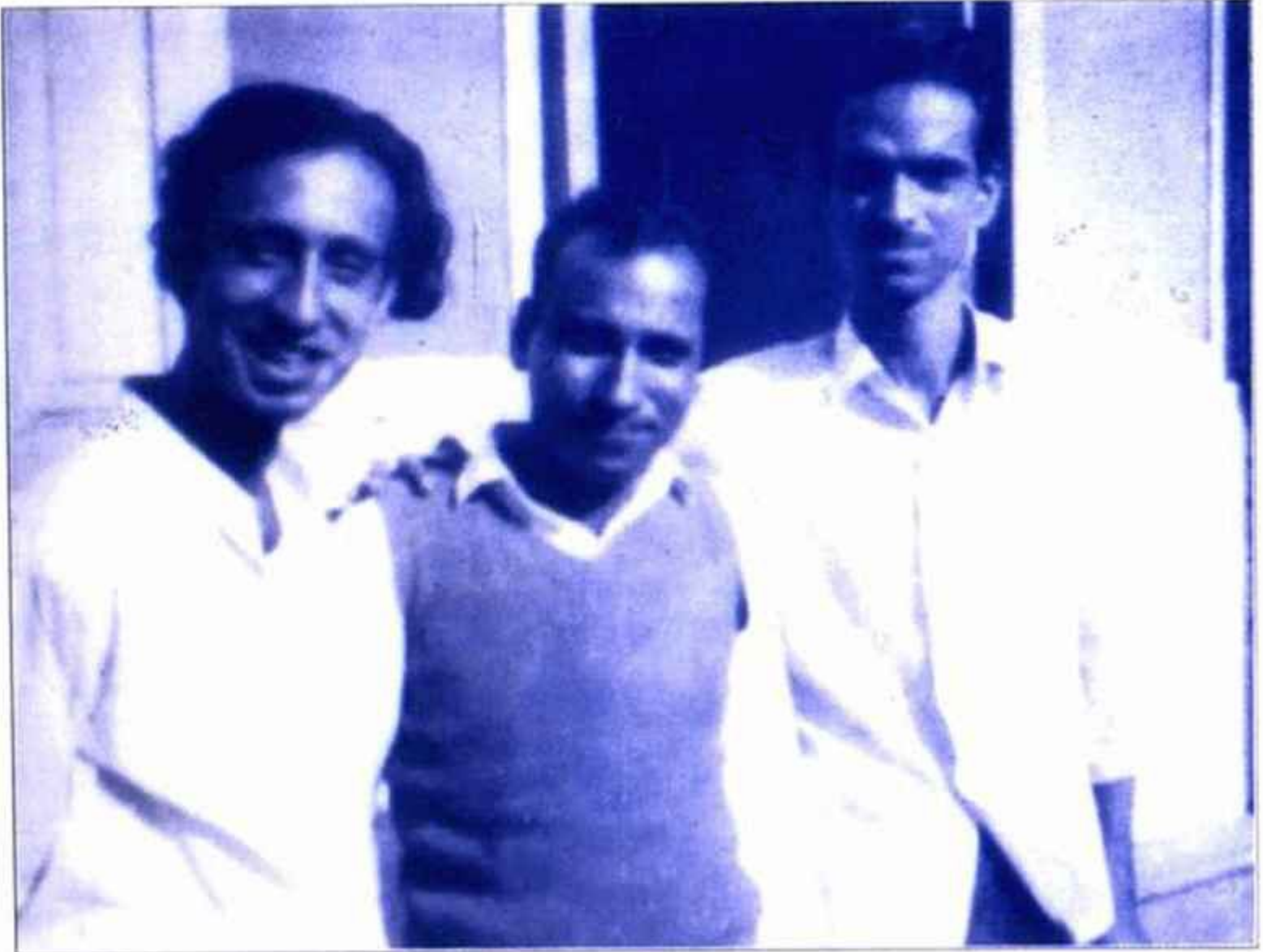
رس نٹراج (فلم ویکلی) کے مدیر ندا فاضلی کے ساتھ ان کا اسٹاف

ندا فاضلی ساہتیہ اکادمی انعام حاصل کرتے ہوئے۔

مجروح سلطانپوری سے انعام لیتے ہوئے ندا فاضلی

ظ انصاری اور ندا فاضلی احمد آباد میں ولی کے مزار پر

کیفی اعظمی کی خدمت میں شیلندر سمان پیش کرتے ہوئے، ساتھ میں جاوید اختر بائیں سے اول رام نرائن صراف

ندافاضلی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جون ایلیا اور ایک پاکستانی شاعرہ

دائیں سے :امید فاضلی، شبنم رومانی، گوپی چند نارنگ، اختر الایمان، ندافاضلی، ادا جعفری اور نسیم درانی، پاکستان میں

بشیر بدر کے ساتھ ندا فاضلی ایک نشست میں
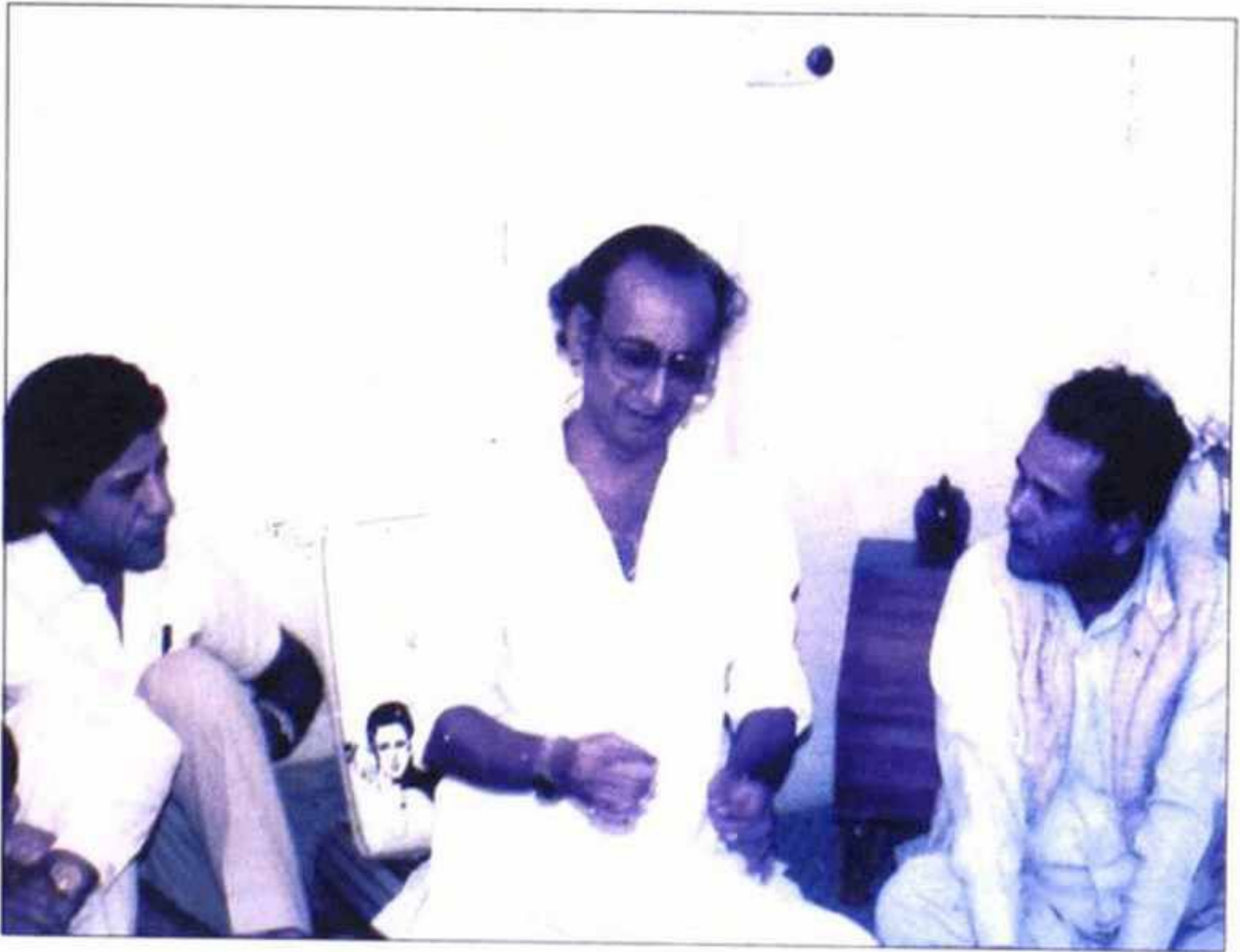
محبوب خزاں کے ساتھ ندا فاضلی

افتخار نسیم، حمایت علی شاعر، قتیل شفائی سے [illegible]

دائیں سے مراٹھی شاعر منگیش پاڈگاؤنکر اور گجراتی ادیب سریش دلال کے ساتھ

موسیقارِ اعظم نوشاد، ممتاز راشد کے ہمراہ ندا فاضلی

گجند رسنگھ (ڈائریکٹر سارے گاما)، موسیقار غلام مصطفیٰ خان اور خیام کے ساتھ ندا فاضلی

دائیں سے: عبدالاحد سازؔ، پورن پنکج، عقب میں نجے معصوم، ندا فاضلی، مقتدر حمید ایک نجی محفل میں

دائیں سے: ڈاکٹر رام پنڈت، ندا فاضلی، شاہد ندیم، وقار قادری اور مدھوسدن اڈیوریکر

جون ایلیا، مالتی جوشی اور ندا فاضلی ایک نجی محفل میں

دائیں سے: شاعر جون ایلیا، مالتی جوشی اور شاندار کمال امروہوی

ندا فاضلی طلعت عزیز کے ساتھ

سیریل ''نور جہاں'' کے سیٹ پر اداکارہ گوری، ندا فاضلی، پریم کشن اور طلعت عزیز

البم ''ان سائٹ'' کی رسمِ اجراء کے موقع پر جگجیت سنگھ کے ہمراہ

ندا فاضلی اداکارہ زرینہ وہاب کے ساتھ، 'اردو ہے جس کا نام' کے سیٹ پر
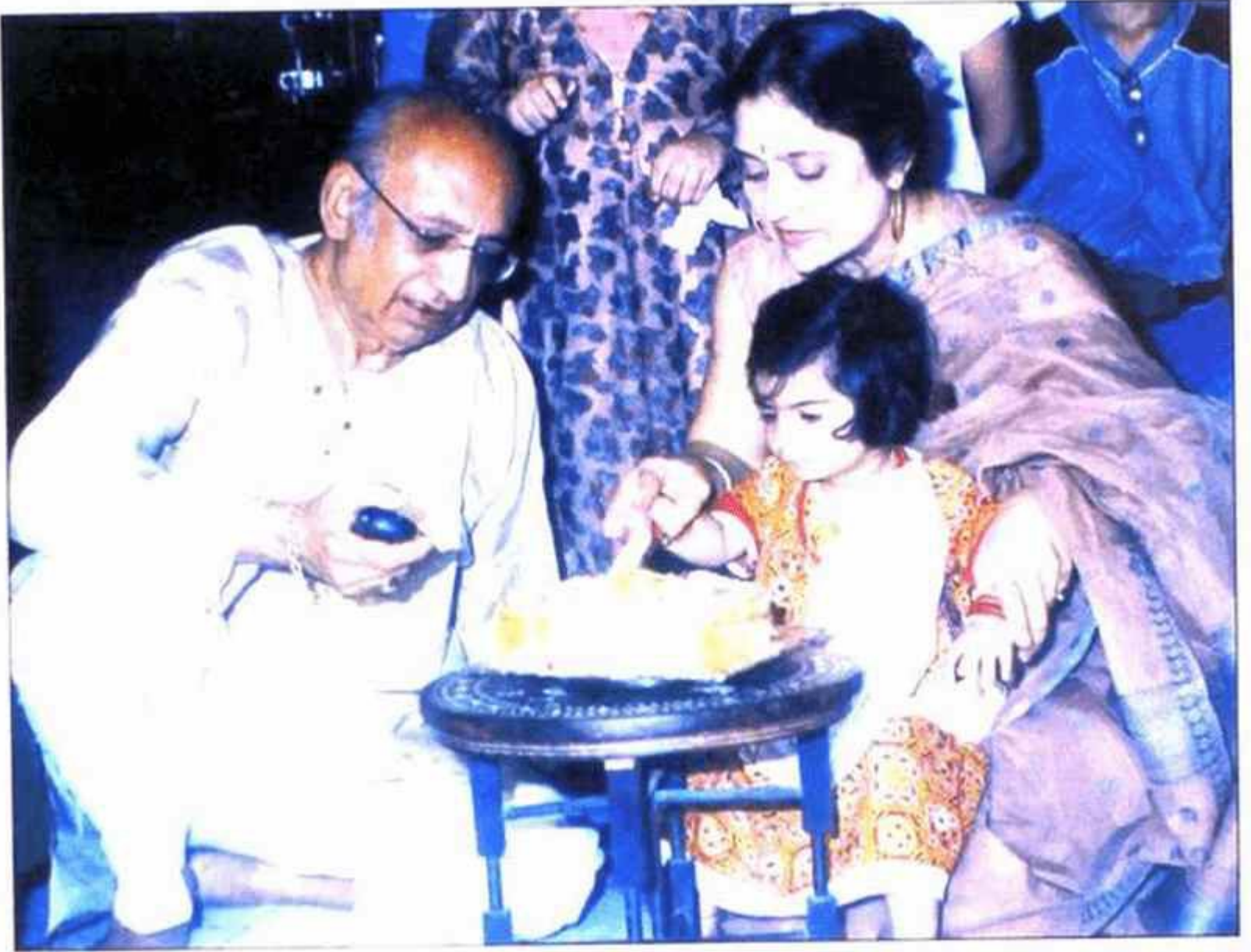
مالتی جوشی اور ندا فاضلی اپنی بیٹی تحریر کی سالگرہ پر

اپنی بیٹی تحریر اور مالتی جوشی کے ساتھ خوشی کے لمحات میں

مالتی جوشی اور ندا فاضلی
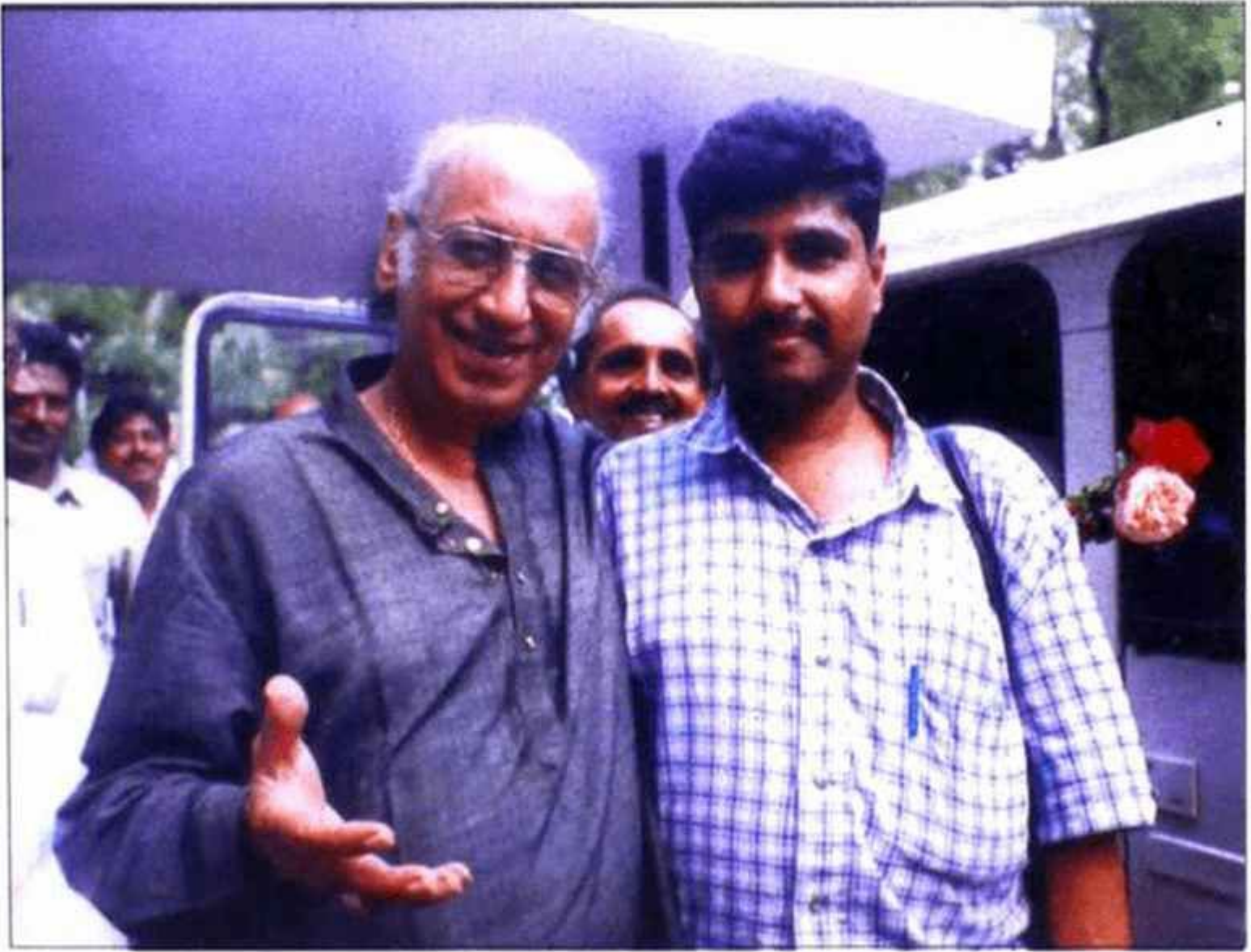
ندا فاضلی ، اس شمارہ کے مرتب وقار قادری کے ساتھ

جدید شاعری کا معتبر نام.... ندا فاضلی

● پروفیسر وارث علوی

جدید شاعروں کی جونسل ۱۹۵۰ء۔ ۱۹۵۵ء کے بعد سامنے آئی اس میں ندا میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ پسندیدہ سے میری مراد وہ شاعر ہیں جنھیں ایک بار پڑھا تو دوسری بار پڑھنے کی ہوس جاگتی ہے ،یایوں کہیئے کہ جن کی نظموں کے نقوش دلکش مناظر فطرت کی مانند اپنی طرف لوٹ آنے کے بلاوے بھیجتے ہیں۔ بڑے شاعروں مثلاً: فیض اور راشد کا بلاوا تو بڑے پہاڑوں کا بلاوا ہے اور ان کی نظموں کی آوازوں سے ذہن کے ایوان گونجتے رہتے ہیں لیکن کچھ شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی خوبصورت نظمیں تتلیوں کی طرح رنگ بکھیرتی ہیں اور ذہن ان کے پیچھے بھاگنے کے لئے بے چین ہوا ُٹھتا ہے۔

یہ کسی کی طرف لوٹنے والا معاملہ میرے اندر رہے ہوئے قاری کا قطعی شخصی معاملہ ہے۔ اس میں نقاد کو بہت زیادہ دخل نہیں۔ میں نے اپنے اندر رہے ہوئے قاری پر نقاد کو حاوی ہونے نہیں دیا۔ کیونکہ میرا تجربہ رہا ہے کہ نقاد قاری کے ساتھ بڑی دست بُرد کرتا ہے۔ ادب کی واقفیت کے لئے نقاد کو قدیم اور جدید ادب میں بہت سی ایسی چیزوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے جو اس کے مذاق کی نہیں ہوتیں۔ بطور قاری کے نقاد کی جو ترجیحات ہوتی ہیں وہ نقاد کی نہیں ہوتیں۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ وہ بے شمار تعداد جن پر ہمارے عہد کے نقادوں نے تعریفی مضامین لکھ کر انھیں بانس پر چڑھایا ہے۔ میرے لئے بطور شاعر کے کوئی کشش نہیں رکھتے تو بطور نقاد کے میں ان پر مضمون لکھ تو سکتا ہوں کیونکہ مضمون تو کسی پر بھی لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسے مضامین میں نقاد کا قلم چلتا ہے اور نقاد کے اندر رہا ہوا قاری قلم کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ طبعاً میں اُس شاعر پر لکھنا پسند کرتا ہوں جس کی نظمیں مجھے بھاتی ہیں۔ بے شک نقاد میں اتنی بُقراطی طاقت ہوتی ہے کہ وہ بے جان نظموں کو بھی جاندار بنا سکتا ہے۔ ایسی نظمیں اس کی تنقید کے پانیوں میں چمکدار مچھلیوں کی طرح تیرتی ہیں لیکن پانی سے باہر دم توڑ دیتی ہیں۔ اچھی نظم تو فی نفسہ اچھی ہوتی ہے۔ وہ تنقید کے پانی میں آ کر نہیں چمکتی بلکہ سینکڑوں قارئین سے جن میں نقاد بھی ایک قاری ہوتا ہے اپنی صفت ذاتی پر داد وصول کرتی ہے۔ ایسی نظم یا نظموں پر جو مضامین لکھے جاتے ہیں اُن میں بُقراطی کیمیا گری سے زیادہ اِس چٹخارے کی آواز

ہوتی ہے جو کیک کا مزہ کیک کو کھانے میں ہے یا ''عطر آنست کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوئید'' کی معنوی بازگشت ہے۔

یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں وہ قاری اساس تنقید سے مختلف ہے۔ کیونکہ منکسرانہ ہے۔ قاری اساس تنقید کا میلان عموماً ایسی نظموں کی طرف ہوتا ہے جو اپنا حسن اور معنویت قاری یعنی نقاد اور وہ بھی کافی بُقراطی قسم کے نقاد کی تعبیر اور تفسیر سے پائی ہیں۔ لیکن اپنا کوئی جوہر ذاتی نہیں رکھتی۔ یہ تو نقاد ہے جو نظم کو معنی عطا کرتا ہے۔ اور جتنے نقاد اتنے معنیٰ اور اس سے نظم کی کثیر المعنویت عبارت ہے۔ یا یوں کہیئے کہ نظم چونکہ کثیر المعنی ہوتی ہے اس لئے ہر قاری کے لئے الگ اور منفرد معنی رکھتی ہے اور ہر قاری کی تعبیر چاہے اتنی مختلف بلکہ دوسرے سے متضاد ہو، اپنی قدر رکھتی ہے۔ تنقید کے معاملات ذرا پیچیدہ ہیں اور آسانی سے سمجھ میں آنے والے نہیں اس لئے میں نے کہا میرا تنقیدی طریقہ کار بہت سیدھا سادا اور منکسرانہ ہے میں اس نظم کے حسن اور معنی کو پانے کی کوشش کرتا ہوں جو اپنا حسن منوا چکی ہے اور معنی آشکار کر چکی ہے۔ اسے آپ تحصیل حاصل کہیئے یا کوئی اور نام دیجئے لیکن ہیئتی تنقید جو ہیئت کے تجربے کے ذریعہ حسن و معنی تک رسائی حاصل کرتی ہے عموماً ایسی ہی نظموں سے سروکار رکھتی ہے جو اپنا حسن پہلے منوا چکی ہیں، ایسی نظموں کی ناقدانہ تحسین میں چاہے نقاد کے لئے وہ مہم سازی کے مواقع نہ ہوں جو اشکال اور ابہام کی گھنی جھاڑیوں اور علامات اور اساطیر کے جنگلوں میں معنیٰ کا شکار تلاش کرتے میں نقاد کو میسر آتے ہیں۔ لیکن شاعری چونکہ چیستاں نہیں ہے اور شاعری اپنی اعلیٰ ترین شکل میں پیچیدگی اور تہہ داری کے باوصف سادگی کا حسن رکھتی ہے۔ تنقید کا وافر حصہ ایسی ہی سادہ اور پرکار نظموں کے حسن کا راز پانے کے لئے وقف رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ندا یا فیض یا اختر الایمان کی بجائے افتخار جالب زیادہ مرکزِ توجہ رہتے۔ چنانچہ میں اپنے کام کا آغاز ندا کی ایک نظم سے کرتا ہوں جس کا عنوان تو نہیں ہے کیونکہ وہ غزل کے فارم میں ہے لیکن ردیف کی رعایت سے ہم نظم کو ''ماں'' کا عنوان دے سکتے ہیں۔ یہ نظم ماں پر ہے۔ اسے میں اردو کی چند بہترین نظموں میں شمار کرتا ہوں اور میرے نزدیک نظموں کا کوئی بھی انتخاب اس کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا۔ سادگی ایسی کہ تنقید انگشت بدنداں کہ اس کے متعلق کیا لکھئے۔ فنکارانہ پرکاری اور تہہ داری ایسی کہ خامہ سر بر گریباں کہ اعجازِ سخن اور حسن آفرینی کے رموز سے پردہ کیسے اُٹھائے۔ نظم دیکھئے۔

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں

بانس کی کھری کھاٹ کے اوپر ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوتی آدھی جاگتی تھکی دوپہری جیسی ماں

چڑیوں کی چہکار میں گونجے رادھا موہن علی علی
مُرغی کی آواز سے کھلتی گھر کی کنڈی جیسی ماں

بیوی بیٹی بہن پڑوسن تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دن بھر اک رسی کے اوپر چلتی نٹنی جیسی ماں

بانٹ کے اپنا چہرہ ماتھا آنکھیں جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اِک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

ماں کے موضوع پر ویسے تو اقبالؔ کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' ایک اچھی نظم شمار کی جاتی ہے۔ لیکن نظم فلسفیانہ خیالات سے اتنی بوجھل ہے کہ نہ تو ماں کی تصویر ابھرتی ہے نہ شخصی تاثر پر تاثیر ڈھنگ سے اظہار پاتا ہے۔ میرے نزدیک اردو میں ماں کے موضوع پر صرف دو نظمیں یادگار رہیں گی۔ فراق کی نظم ''جگنو'' اور ندا کی منقولہ بالا نظم۔

ندؔا کی نظم کا امتیازی وصف اس کا اختصار ہے۔ جو اس وقت زیادہ قابل تعریف بنتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نظم غزل کے فارم میں لکھی گئی ہے جس میں بھرتی کے اشعار بے تکلف راہ پاتے ہیں۔ شاید فراقؔ تو دوغزلہ سہ غزلہ لکھ ڈالتے لیکن ندؔا نے اشعار کی تعداد پانچ سے بڑھنے نہیں دی۔ اشعار کا کیا ذکر نظم میں ایک لفظ بھرتی کا نہیں ملے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ندا نے نظم کا اسلوب اور ڈکشن ہی ایسا پسند کیا ہے کہ اس میں زیادہ اشعار نکالنا پتہ پانی کرتا ہے۔ دوغزلہ اور سہ غزلہ کی کیا بات۔ اس اسلوب میں فراقؔ سے چھٹا شعر بھی بن نہ پاتا۔ نظم کا آرٹ اس وقت کمالِ فن کی حدود کو چھو لیتا ہے۔ جب نظم اتنی کسی ہوئی ہو کہ ایک لفظ کی کمی بیشی کو بھی برداشت نہ کرسکے۔ فراقؔ اور ندؔا دونوں کی ماں ایک عام ہندوستانی عورت ہے۔ اقبالؔ کی نظم میں فارسی زدہ اسلوب اور فلسفیانہ فکر دونوں نظم کو زمین پر حرکت کرنے نہیں دیتے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ماں پر نظموں میں یا تو جذباتیت کا وفور رہتا ہے یا ماں کے گرد تقدیس کا ایسا ہالہ ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا کی مخلوق ہی نظر نہیں آتی۔ فراقؔ اور ندا کا بڑا کارنامہ یہی ہے کہ ماں کا جانا پہچانا روپ نہایت حقیقت پسند طریقے پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

فراق کی نظم میں ماں ایک نوجوان عورت ہے جو اس بچہ کی جس نے اسے دیکھا تک نہیں، ذہن کی پرچھائیوں میں اِس وقت زندہ ہوتی ہے۔ جب وہ سیانا بن کر سوچتا ہے کہ بچپن میں اس کی ماں موت کا نوالا نہ بنی ہوتی تو کس کس طرح اِس سے لاڈ پیار جتاتی اور اسے کیسی نظر آتی۔ فراق کی نظم اِن یادوں کی ایک چلتی پھرتی فلم ہے۔ جن سے لڑکا ماں کی موت کے سبب محروم رہا لیکن اب وہ ماں ہوتی تو کیا ~~ہوتا~~ کے احساس تلے اِن یادوں کو سوچ رہا ہے جو اِس کے نصیب میں نہیں آئیں۔ اِس کے برعکس ندا کی نظم ایک چھوٹا سا البم ہے جس میں پانچ سات تصویریں ہیں۔ لیکن اِن تصویروں میں ماں کی پوری شخصیت، پورا کردار، پوری روح سما گئی ہے۔ اِن تصویروں میں سفرِ حیات کی تمام اہم منزلوں کا عکس ہے۔ ندا نے کیمرے کے مخصوص زاویوں سے روشن اور تاریکی کی انوکھی بازیگری کے ذریعے، ایسی ایسی معمولی تفصیلات کو اُبھارا ہے کہ وہ جو مانوس تھا اِس اچھوتے روپ میں دیکھ کر ہمارا شعور اس جمالیاتی مسرت کے نور سے جگمگا اُٹھتا ہے جس کا سرچشمہ شناخت کا جھٹکا A shock of Recognition ہے۔

ندا کے تخیل کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ ایک ہی مصرع میں مختلف حواس سے مستعار اتنے سارے شعری پیکر جمع کر لیتے ہیں کہ ہمارے تمام حواس جاگ اُٹھتے ہیں۔ مصرع وہ بجلی کا تار بن جاتا ہے جس کی برقی رو ہم ہماری رگوں میں دوڑتی محسوس کرتے ہیں۔ یہ تاثر اور تاثیر نہیں تو شاعری راکھ کا ڈھیر ہے۔ بے جان لفظوں کا بے کیف کھیل۔ ایک ایسا لق و دق میدان جسے ایک بار دیکھا تو دوسری بار دیکھنے کی ہوس نہیں ہوتی۔ ایسی شاعری کوئی بلاوا نہیں بھیجتی۔

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں۔ بیسن کی روٹی کو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اِس کی سوندھی خوشبو کو ہم سونگھ سکتے ہیں۔ اِس کے ذائقہ کو ہم محسوس کر سکتے ہیں اور کھٹی چٹنی کے لفظوں سے تو منہ میں پانی چھوٹنے لگتا ہے۔ اور گرم گرم سوندھی روٹی سے لامسہ حرارت محسوس کرتا ہے۔ لیکن ان واضح شاعری پیکروں کے پیچھے کچھ پنہاں تصویریں بھی ہیں جو ہمارے لاشعور سے اُٹھ کر شعور کی سطح پر پرچھائیاں بناتی ہیں۔ کہی گئی باتوں میں اَن کہی باتوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ مثلاً چولھے کے پاس بیٹھی روٹی پکاتی ہوئی ماں۔ اِس کے پاس بیٹھا ہوا کھلنڈرا تندرست بچہ جو پسینے سے شرابور محلّہ سے کھیل کر آیا ہے اور جسے کڑاکے کی بھوک لگی ہے۔ یہ واقعہ نظم میں نہیں بیان کیا گیا لیکن سوندھی روٹی کے امیج میں وہ پنہاں ہے۔ ماں اور بیٹا، روٹی اور چٹنی، باہم مل کر اِس کا نقش بناتے ہیں۔ فراق مثنوی کی ہیت میں لکھتے تو یہ پورا واقعہ بیان ہوتا۔ ندا کے یہاں تفصیلی اجمال میں اِس طرح سما گئی ہے جس طرح قطرے میں دریا کا اضطراب سما

جاتا ہے۔

اس غزل نما ردیف میں ندا نے ماں کی ردیف سے وہ کام لیا ہے کہ ماں کی جو کچھ بھی حرکات سکنات اور صفات ہیں، اس کے جو کچھ بھی گھریلو کام کاج ہیں ان کا بیان وضاحتی بننے کی بجائے ایک مرکب کی صورت ہیں ماں کی شخصیت کی شناخت بن جاتا ہے۔ گویا صفات ہی سے ذات تشکیل پاتی ہے۔ اور یہ ذات خارج میں تو ماں ہے لیکن نظم میں محض ردیف۔ یہی ردیف اس کی صفات کو اس کی ذات کا جزولا ینفک بناتی ہے۔ مثلاً روٹی پکاتی اور چوکا برتن کرتی ماں کی تصویر کے سینکڑوں Variations ہیں۔ بیانیہ شاعری میں، انھیں سینکڑوں طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ندا نے اسلوب اور اظہار کا وہ پیرایہ اختیار کیا ہے کہ چوکا برتن کرنے کا پورا عمل ماں کی ردیف میں ایسا سما گیا ہے کہ اب ماں کی تصویر ندا ہی کی بنائی ہوئی تصویر رہے گی اور دوسری سینکڑوں تصویریں اس تصویر کی یکتائی اور انفرادیت کو پہنچ نہیں پاتیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تصویر ماں ہی کی نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب، ایک تمدن، ایک قرینۂ حیات کی تصویر ہے۔ گاؤں کی سیدھی سادی زندگی، کھیلنا، بچپن، سلگتے چولھے، چمکتے برتن، تیز بھوک، سوندھی روٹی، کھٹی میٹھی چٹنی، ماں کی ماستا، بچہ کی معصومیت یہ تو اس زندگی کے رُخ ہیں۔ جن سے ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنا الہام اور تخلیقی سرو سامان پایا ہے۔

نظم کے مصرعہ اوّل میں ماں کی ماستا کا روپ ہے جو پالن ہار ہے۔ مصرعہ ثانی میں گرہستن کا روپ ہے جو چوکا برتن، چمٹا پھکنی کے کاموں میں منقول ہے۔ دوسرے شعر میں گھر کی رکھوالی کا روپ ہے جو بانس کی کھرّی کھاٹ کے اوپر ہر آہٹ پر کان دھرے آدھی سوئی آدھی جاگی کھری دوپہری جیسی ہے۔ اس شعر کا صوتی آہنگ کھ اور ٹ اور دھ اور گھ کی آوازوں سے تعمیر ہوا ہے۔ جو نظم کی ارضی فضا کو شدید تر بناتا ہے۔ یہاں گاؤں کی تپتی دوپہر بھی ہے۔ بانس کی کھری چارپائی بھی ہے۔ اور دوپہر کی آدھی جاگتی آدھی سوتی نیند بھی ہے۔ دن اور موسم کی یہ پوری حقیقت پسندانہ کیفیات اپنی شناخت قائم رکھتے ہوئے ایک کُل کا جزو بن جاتی ہیں۔ اور یہ کُل گھر کی رکھوالی ماں کا روپ ہے۔

تیسرے شعر میں شاعر صبح کی سہانی کیفیت کو ماں کی شخصیت میں منقلب کر دیتا ہے۔ صُبح کے بیان میں فطرت اور ثقافت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ چڑیوں کی چہکار کے ساتھ رادھا موہن علی علی کے بھجن اور مناجات کی آوازیں مل کر صُبح کو سہانہ پن اور تقدیس عطا کرتے ہیں۔ اس گھڑی میں جبکہ پوری فطرت نورِ ازل میں نہائی ہوئی ہے۔ دروازے کی کنڈی کھولنا، دن کے کام کاج کا آغاز کرنا ہے۔ اور کام

عبادت ہے۔ یہاں تقدیس کی ایک ہلکی پرچھائیں ماں پر پڑنے بھی نہیں پاتی کہ دیوی بنتی ماں کا روپ پلک جھپکتے ہی پانچویں شعر میں نٹنی بن جاتا ہے۔ کیونکہ ماں تو بیوی، بیٹی، بہن، پڑوسن تھوڑی تھوڑی سب کچھ ہے۔ اِسے گرہستن کے روپ میں پکارو تو سامنے، پڑوسن آواز دے تو حاضر۔ دن بھر ایک رسی کے اوپر چلتی نٹنی جیسی ماں کی تصویر میں حیرت اور ظرافت کا ہوش رُبا امتزاج ہے۔ ایک ردیف کی کیل میں کتنی رنگا رنگ تصویریں ہیں جو ٹنگی ہوئی ہیں۔ اور نظم میں کتنے مختلف اور متنوع جذبات کے دھارے ہیں جو ایک ردیف کے جھرنے سے پھوٹتے بھی ہیں اور اِس میں سما بھی جاتے ہیں۔

نظم کا پانچواں اور آخری شعر تو نہ صرف نظم کا نقطۂ عروج ہے بلکہ مصوّر کا وہ نقشِ اعجاز ہے جس کے بطن میں پنہاں رازِ حیات کو دیکھ کر ہم مبہوت رہ جاتے ہیں۔ ایک طرف جو ماں ہے، اِس کے اتنے مختلف روپ ہم نے دیکھے لیکن ایک پھٹے پرانے البم میں ماں کی اِس تصویر پر ہماری نظر پڑتی ہے جس میں کبھی وہ ایک چنچل لڑکی تھی تو نشاط زیست کا لمحہ عمر رواں کی پلکوں پر خوشی کا وہ آنسو بن جاتا ہے جس میں زندگی کا تمام حسن اور تمام کرب ست رنگ دھنک کی طرح کِھل اُٹھتا ہے۔ کیا یہی وہ الھڑ لڑکی ہے جو آج ہماری ماں ہے تو پھر اس کی پُرکشش آنکھیں، خوبصورت چہرہ، بلند پیشانی کہاں گئی۔ بانٹ دی، سب میں، ہم میں، تم میں بیسن کی روٹی ہی کی مانند گم ہوگئی چوکا برتن، بیٹا بیٹی، شوہر پڑوسن میں۔ سب کچھ دے کر، بانٹ کر اب رہ گئی ہے صرف ایک ماں۔ نٹنی کی صورت، ایثار نفسی کی صورت، یہ صورت، یہ مورت ندا فاضلی کی پانچ شعروں کی نظم ہے۔

اِس نظم کے ذریعے ہم نے اِسے اِس طرح دیکھا' جس طرح پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فنکار جس چیز کو دیکھتا ہے اِسے ایک نئے معنی عطا کرتا ہے۔ ہم اِس کے آرٹ کے ذریعے اِس چیز کو اِس طرح دیکھتے ہیں گویا پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہ بصیرت ہے جو صرف شاعرانہ تخیل عطا کرتا ہے۔ کیونکہ قطرے میں دریا کو اور جزو میں کُل کو دیکھنا انسانی اعمال کے سرچشموں کی تھاہ پانا' ظاہر سے گزر کر باطنی حقیقت کا سراغ لگانا اِس کا بنیادی کام ہے۔ اِس معنی میں ہر بڑا فن پارہ حیات و کائنات کی ایک نئی تعبیر ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی سچائی کا عکس ہوتا ہے جس کا عرفان وجدانی طریقہ پر ہی ممکن ہے۔ اقبال نے شیکسپیئر پر اپنی نظم میں اس نکتے کو کتنے خوبصورت طریقہ پر بیان کیا ہے۔

حُسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حُسن
دلِ انساں کو تیرا حُسنِ کلام آئینہ

ندا فاضلی کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ کسی اسلوب کا اسیر نہیں ہوتا حالانکہ شاعری کی جس نسل سے اِن کا تعلق رہا ہے وہ جدیدیت کا ہراول دستہ تھی اور ارا گارد کی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ اس کی پوری طاقت نئے اسالیب کے تجربات کرنے اور پھر کسی ایک اسلوب کے حلقہ بگوش ہو جاتے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ ندا کے یہاں اسلوبِ شعر اندرونی تخلیقی اُپج اور موضوع کے مطابق تشکیل پاتا ہے۔

''ماں'' کے اسلوب میں کوئی دوسری نظم ندا کے یہاں نہیں ملتی اور یہی چیز ''ماں'' کو ندا کے یہاں اور ایک معنی میں پوری اردو شاعری میں حرف مکرر نہیں بناتی ہر بڑے شاعر کے پاس ایک بڑی نظم ہونا ضروری ہے جیسے کہ اختر الایمان کے پاس ''ایک لڑکا''، مجاز کے پاس ''آوارہ'' سردار جعفری کے پاس ''میں پھر آؤں گا'' وغیرہ وغیرہ۔ میرے نزدیک ندا کے پاس اس کی نظم ''ماں'' ہے۔

ندا کے یہاں اسالیب کی رنگارنگی ہے۔ ایک اسلوب تو ''ماں'' کا ہے، جسے ہم کسی مانوس یا مروج یا بہتر اصطلاح یا صنفِ شاعری کی عدم موجودگی میں تشبیہی تشخص کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا اسلوب اشعار کو انسانی تشخص عطا کرنے کا ہے۔ جس کی نمائندہ مثال ندا کی نظم ''دو کھڑکیاں'' ہے۔

آمنے سامنے دو نئی کھڑکیاں
جلتی سگریٹ کی لہراتی آواز میں
سوئی ڈورے کے رنگین الفاظ میں
مشورے کر رہی ہیں کئی روز سے

شاید اب

بوڑھے دروازے سر جوڑ کر
وقت کی بات کو وقت پر مان لیں
بیچ کی ٹوٹی پھوٹی گلی چھوڑ کر
کھڑکیوں کے اشاروں کو پہچان لیں

ایک بوسیدہ مضمون پر ایک نہایت ہی خوبصورت نظم ہے۔ یہاں لڑکے، لڑکی، ماں، باپ اور خاندانی رُکاوٹوں کو، کھڑکیوں، بوڑھے دروازوں، جلتی سگریٹ، سوئی ڈورے اور ٹوٹی پھوٹی گلی کی نشانیوں کے ذریعہ ظاہر کرتی ہے۔ لیکن باوجود دسترس کے ندا نے اِس اسلوب کو اپنی شناخت نہیں بنایا۔ اس کے استعمال نے نرمی واحتیاط سے کام لیا۔ اِس اسلوب کا بہترین استعمال اِن نظموں میں ہوا ہے جو موسموں اور

دِن کے پہروں مثلاً سردی، گرمی، پہلا پانی، صبح، دوپہر یا شام یا نیادِن یا چھوٹے شہر کی رات کی تاثراتی کیفیات کو بیان کرتی ہیں۔

نظم ''شام'' میں اِس اُسلوب کی کارفرمائی ملاحظہ فرمایئے۔

سوکھے کپڑوں کو چھت سے چنتی ہوئی
پیلی کرنوں کا ہار بُنتی ہوئی
گیلے بالوں میں تولیہ لپٹائے
ہاتھ میں اِک کٹی پتنگ اُٹھائے
دائیں بازو پہ تھوڑی دھوپ سجائے
سیڑھیوں سے اُتر کے آئی ہے
کس قدر بن سنور کے آئی ہے
بجتے ہاتھوں سے چمنیاں دھوکر
گھر کے ہر کام سے سبک ہوکر
پالنے کو جھلا رہی ہے شام
پیالیوں میں کھلا رہی ہیں شام
چنداماموں اُگا رہی ہے شام

شاعری میں شام کے بہت سے رُوپ ہیں۔ منظر فطرت کے طور پر یا نظم کے پس منظر کے طور پر۔ شہر کی شام، گاؤں کی شام، وادیٔ کہسار کی شام اور یہ شاعری کے مرغوب موضوعات ہیں۔ ندا مناظر فطرت کا شاعر نہیں ہے جس معنی میں اقبالؔ یا جوشؔ اختر الایمان ہیں۔ ندا کے یہاں فطرت اور تمدن کی آمیزش ہے۔ کیفیت چاہے صبح کی ہو یا دوپہر کی یا شام کی ندا اِسے انسانی تشخص کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ مذکورہ نظم میں شام کی کیفیت ایک گرہستن اور ماں کے رُوپ میں ظاہر ہوئی ہے۔ تصویریں گرہستن کی ہیں۔ لیکن اِن میں رنگ شام کی کیفیتوں کا بھرا گیا ہے۔ ایسی نظموں میں ایک ذرا سی بے احتیاطی سے شام کی کیفیت پر گرہستن کی حقیقت غالب آجاتی ہے۔

شام کے وقت گرہستن کے کاموں میں ہی شام کا وقت اور اس کی کیفیت اور حقیقت کا عکس ہے۔ لیکن ندا کی زیادہ تر نظمیں راست اسلوب میں ہیں۔ ان میں بیانیہ، کہانی کا عنصر، واقعات، کردار، بزلہ

سنجی، نقطہ آفرینی، طنز، قول محال، علامتوں اور شعری پیکروں سے خوب کام لیا ہے۔ کبھی کبھی تو اِن نظموں میں سامنے کی بات' سامنے کی بات ہی رہتی ہے لیکن کامیاب نظموں میں ذرا سا Irony حیرت اور چونکا دینے والی بات سے نظم منفرد حسن کی حامل بن جاتی ہے۔ ندا اِبہام، اشکال اور اِظہار کی پیچیدگی سے ہمیشہ دور رہا ہے۔ وہ صاف ستھرے اسلوب کا شاعر ہے۔ اِس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس کے یہاں شعری تجربہ سپاٹ یا سطحی ہوتا ہے۔ نفسیاتی اور جذباتی پیچیدگیوں کے باوصف وہ اظہار کے پیرایہ کو شفاف رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی ایک نظم دیکھئے جو اس کے مجموعہ ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' میں جسم کی جستجو کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ دراصل اس نظم کا عنوان مجموعہ کا نام ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ کوئی اور نظم اس نام سے مجموعہ میں نہیں ہے۔ لیکن ندا نے غالباً جسم کی جستجو کا عنوان اِس لئے پسند کیا کہ نظم کی تفہیم میں اس سے آسانی ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ کم شاعر ہیں جو قاری کا اتنا خیال کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی خوبصورت نظم ہے اور خود ندا کے پاس ایسی تہہ دار پیچیدہ تجربہ والی نظم جو ایسی نادر فنکارانہ اظہار کی باریکیوں کی حامل ہے' کہیں اور نظر نہیں آتی۔ نظم ملاحظہ فرمایئے۔

سنو تم
یہ میرا تمہارا
جو رشتہ ہے
ایک راستہ ہے
میں تم سے گذر کر ہی
تم تک پہنچنے کی رفتار ہوں
میرا آغاز تم
میرا انجام تم
تمہیں دیکھ کر میں تمہیں سوچتا ہوں
تمہیں پا کے ہی
میں تمہیں کھوجتا ہوں
تم اپنے بدن کے سمندر میں

صدیوں سے پوشیدہ

ایک خواب ہو

اور میں!!

خون کی تیز گردش میں بجتی ہوئی آنکھ ہوں

آنکھ اور خواب کے درمیاں

روشنی تتلیاں

نیند بیداریاں

جسم سے جسم تک، ہر ملن اک سفر

ہر سفر، خواب کی آرزو، جسم کی جستجو!

شخصی نظموں میں ندا کے یہاں ایک جلاوطن Exile شاعر کا درد پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ چھوڑا ہوا گاؤں اس کے اندر زندہ ہے۔ لیکن ترک کی ہوئی محبت کا احساس جرم اور ٹوٹے ہوئے رشتوں کا غم' گاؤں کی خوشگوار یادوں کو اُبھرنے نہیں دیتا۔ چنانچہ ندا کے یہاں ناسٹلجیائی Nostalgia نظمیں نہیں ہیں جو عموماً ماضی کی یادوں سے شاداب ہوتی ہیں۔ یہاں تو 'کھویا ہوا سا کچھ' کا احساس زیادہ ہے۔ ندا کی ایک بہت خوبصورت نظم ہے ''دور کا ستارا''۔ دیکھئے:

میں برسوں بعد

اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا

اپنے گھر پہنچا

لیکن میرے گھر میں

اب میرا گھر نہیں تھا

اب میرے بھائی اجنبی عورتوں کے شوہر بن چکے تھے

میرے گھر میں

اب میری بہنیں

انجانے مردوں کے ساتھ مجھ سے ملنے آتی تھیں

اپنے اپنے دائروں میں تقسیم

میرے بھائی بہن کا پیار
اب صرف تحفوں کا لین دین بن چکا تھا
میں جب تک وہاں رہا
شیو کرنے کے بعد
برش، کریم ،سیفٹی ریزر، خود دھو کر اٹیچی میں رکھتا رہا
میلے کپڑے، خود گن کر لانڈری میں دیتا رہا
اب میرے گھر میں وہ نہیں تھے
جو بہت سوں میں بٹ کر بھی
پورے کے پورے میرے تھے
جنھیں میری ہر کھوئی چیز کا پتہ یاد تھا
مجھے کافی دیر ہو گئی تھی
دیر ہو جانے پر ہر کھویا ہوا گھر
آسماں کا ستارہ بن جاتا ہے جو دور سے بلاتا ہے،
لیکن پاس نہیں آتا

یہ اُن ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی نظم ہے جن سے گھر چھوٹ گیا ہے۔ ایک بار رشتے ٹوٹتے ہیں تو جڑتے نہیں ۔ کیونکہ وقت کے بہاؤ میں بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ وہ ایک کسک چھوڑ جاتے ہیں اور یہ کسک جب جاگتی ہے تو آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ اِس نے کھویا کتنا گرانمایہ تھا۔ اجنبیت کے ویرانے میں ،دشتِ جلاوطنی میں اس کسک کا جاگنا ایک سوکھی ٹہنی پر اچانک ایک سُرخ پھول کا کھلنا ہے۔ دل کا لہو ہونا ہے۔ ندا کی یہ نظم دیکھئے۔ عنوان ہے ''رُخصت ہوتے وقت''۔

رُخصت ہوتے وقت
اُس نے کچھ نہیں کہا
لیکن ایئرپورٹ پر اٹیچی کھولتے ہوئے
میں نے دیکھا
میرے کپڑوں کے نیچے

اُس نے اپنے دونوں بچوں کی تصویریں چھپادی ہیں
تعجب ہے
چھوٹی بہن ہو کر بھی
اُس نے مجھے ماں کی طرح دعا دی ہے

آخری دو مصرعوں نے نظم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ بچوں کی تصویر شاعر کو بچوں کا نگہبان، سر پرست بلکہ پالن ہار بناتی ہے۔ ماں کی دعا بچے کے لئے یہی ہوتی ہے کہ وہ بلند اقبال ہو، سو سال جیئے، دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ ایک بہن نے ایک تنہا جلاوطن بھائی کو صرف اپنے بچوں کی تصویریں دے کر اس کے بنجر وجود میں انسانی رشتوں کے کتنے سرچشموں کے دہانے کھول دئے ہیں۔ یہ کتنی سیدھی سادی نظم ایک قول محال کے پَر لگا کر کتنی بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ اکثر یہ بلندیاں نظموں کو جِٹ ہوائی جہاز کے انجن لگانے کے باوجود حاصل نہیں ہوتی۔ عموماً ہم ناکام نظموں کا ذِکر نہیں کرتے۔ لیکن ان کی ناکامی میں کامیاب نظموں کے راز پنہاں ہوتے ہیں۔ ندا کی اِک نظم ہے" والد کی وفات پر" اس میں ندا بتانا چاہتا ہے کہ تمہاری قبر پر میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا، مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے، تمہاری موت کی سچی خبر میں نے اُڑائی تھی، وہ جھوٹا تھا۔ پھر ندا مختلف فرضی دلائل کے ذریعہ بتاتا ہے کہ باپ تو خود اس کے اندر زندہ ہے۔ تمہارے ہاتھ، میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں، میں لکھنے کے لئے جب بھی قلم کاغذ اُٹھاتا ہوں، تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں۔ ایسے دلائل کے ذریعہ ندا اس نتیجے پر پہنچتا ہے۔

تمہاری قبر پر
جس نے تمہارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں میں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

پوری نظم فکر معکوس سے لبریز اور آخری قول محال کی ایسی مثال جو بالآخر مضحکہ خیز اٹکل سوچ بن جاتی ہے۔ یہاں فکر و احساس کی وہ سچائی اور سادگی نہیں جو اپنی میں بچوں کی تصویر رکھنے میں ہے۔ وہاں بہن کا بھولپن ہے، یہاں شاعر کی طرّاری ہے۔ دونوں نظموں میں فرق شاعری اور سوفسطری کا ہے۔ دلائل

سے آپ دن کو رات ثابت کر سکتے ہیں لیکن اس سے نظم میں نہ دن کی روشنی رہے گی نہ رات کی پر اسرار کیفیت ۔صرف فکر طرّ ار کی چھل کپٹ رہ جائے گی ۔ جو شریر بچّہ کی ''بارشِ با ہم می بازی'' کی مانند بیزار کن بن جائے گی۔

ترقی پسندوں کے برعکس ندؔا نے جس دنیا میں آنکھ کھولی وہ آزادی کے بعد کی دنیا تھی ۔ جو عہد غلامی سے بھی بدتر ثابت ہوئی کیونکہ خونچکاں فسادات، زبردست بھرشٹاچار اور دنیا کو بہتر بنانے کی ہر آئیڈیولوجی اور خواب سے تہی دامن تھی ۔ زوالِ رُوس کے ساتھ اشترا کی آئیڈیولوجی کی شکست تخلیقی فنکاروں کے لئے کوئی خوش گوار تجربہ ثابت نہیں ہوئی ۔ جدید افسانہ کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ تو اب قعرِ گمنامی میں فراموش ہو چکا ہے ۔ جدید شاعری کا بھی سرمایہ افسوسناک حد تک قلیل ،تنگ مایہ اور معمولی رہا ہے ۔ حالانکہ نظریاتی جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کے بعد توقع تھی کہ شاعری کو نئی جولانگاہیں میسر آئیں گی ۔ سوائے ایک دو ، یا دو تین شاعروں کے اِس ضمن میں کسی بھی شاعر کی کارکردگی غیر معمولی تو کیا ، اطمینان بخش بھی نظر نہیں آتی ۔ ایسا لگتا ہے اِن کے پاس شاعری کے موضوعات ہی نہیں ۔ مابعد جدیدیت کے نظریہ ساز اسے آئیڈیولوجی کے فقدان اور ہئیت پسندی پر محمول کرتے ہیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو مشرق و مغرب کی اور زبانوں کا بھی یہی حال ہوتا جو نہیں ہے ۔ لہٰذا میں تو اسے آزادی کے بعد مُسلم اقلیت اور اردو زبان پر بڑی بپتا اور تخلیقی صلاحیتوں کے فقدان کے طور پر ہی دیکھتا ہوں ۔ بہر حال یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے ۔

ندؔا جس دنیا میں رہتا ہے' اس میں غیر اطمینانی کے اسباب جتنا کہ وہ باہم سمجھ رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہیں ۔ لیکن اب اِس دنیا کو بدلنے کے آس کے پاس دوسرے جدید شعراء کی مانند کوئی نظریات نہیں رہے' سوائے اِس کے کہ نظامِ سیاست اور معاشرت کو بدلنے کی بجائے وہ آدمی کو بدلے ۔ اسے ضرورت اِنقلابی یا کمیشار کی نہیں' جو خارجی دنیا کو بدلتا ہے بلکہ صوفی درویش یا سنت کی ہے ۔ جو آدمی کو اندر سے بدلتا ہے ۔ ندا کے اِس احساس کو معنویت ملتی ہے اِس ہندوستانی روایت سے جس نے کبیؔر، تلسی داس، میرا بائی رحیؔم اور سورداؔس کو پیدا کیا ۔ جس سے ندؔا واقف ہے' لیکن اردو شعراء باوصف فراؔق گورکھپوری کی کوششوں کے واقفیت پیدا نہ کر سکے ۔ ایک معتبر سیاسی آئیڈیولوجی کی عدم موجودگی میں ندؔا کی وابستگی بھکتی واد اور روحانی روایت کی بخشی ہوئی انسان دوستی سے خوشہ چینی ہے جس نے اِس کی شاعری کو ایک نیا موڑ دیا ہے ۔ اِس موڑ کی اپنی پنہائیاں بھی ہیں اور خدشات بھی ۔ دُنیا چاہے اتنی نابکار اور ستم ظریف سہی' بہر حال اس میں آدمی کو جینا ہے ۔ لہٰذا موافقت اور بغاوت ، مفاہمت اور انحراف یا اگر دُنیا ساز گار نہیں تو برہم زن

اگر زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز کی کشمکش نے ندا کی شاعری کو ایک ایسی رزم گاہ بنادیا ہے جہاں تیر کبھی نشانے پر بیٹھتا ہے کبھی خطا ہوتا ہے۔ ندا کی ایک نظم ہے۔ عنوان ہے ''شکایت''۔

تمہاری شکایت بجا ہے
مگر تم سے پہلے بھی، دُنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے، یہی کل بھی ہوگی
تمہیں بھی اِسی اینٹ پتھر کی دُنیا میں
پل پل بکھرنا ہے، جینا ہے مرنا ہے
بدلتے ہوئے موسموں کی یہ دُنیا
کبھی گرم ہوگی، کبھی سرد ہوگی
کبھی بادلوں میں نہائے گی دھرتی
کبھی دور تک، گرد ہی گرد ہوگی
فقط ایک تم ہی نہیں ہو
یہاں جو بھی اپنی طرح سوچتا ہے
زمانے کی نیرنگیوں سے خفا ہے
ہر اک زندگی اِک نیا تجربہ ہے
مگر جب تلک یہ شکایت ہے زندہ
یہ سمجھو زمیں پر محبت ہے زندہ

لاگ نہ سہی لگاؤ ہی سہی' ایک رشتہ تو قائم ہے' یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو آدمی بکھر جائے، شکایت میں مفاہمت پنہاں ہے، لیکن مکمل مفاہمت' جو زمانے کے نشیب و فراز اور ظلم و ستم کو دیکھ نہیں سکتی' جو عموماً موکھش اور نجات کے متمنی مذہبی لوگوں' یا دولت و آسودگی میں مگن خود مطمئن خنزیروں کو پیدا کرتی ہے۔ ایسی مفاہمت ندا کو منظور نہیں لہٰذا شکایت دُنیا کی حقائق ہی کا جزو لاینفک ہے۔

اب ندا کی ایک اور نظم دیکھئے۔ عنوان ہے ''انتشار''

ہر ایک جرم نام ہے
جو نام سنگسار ہے

وہ نام بے قصور ہے
قصوروار بھوک ہے
جو مدتوں سے رائفل ہے
چیخ ہے، پکار ہے
یہی گناہ گار ہے
نہیں یہ بھوک تو کسی محل کی پہرہ دار ہے
غریب تاب دار ہے
گناہ گار ہے محل
مگر محل تو خود سیاستوں کا اشتہار ہے
سیاستوں کے ارد گرد بھی کوئی حصار ہے
عجیب انتشار ہے
نا کوئی چور چور ہے نہ کوئی ساہوکار ہے
یہ کیسا کاروبار ہے
خدا کی کائنات کا، خدا ہی ذمہ دار ہے

یہ نظم بہت اچھی نہیں ہے' قافیوں کا التزام ہے۔ لیکن اس سے کوئی خوشگوار آہنگ ترکیب نہیں پاتا۔ نظم کے فریم ورک میں ندا نے دُنیاوی انتشار کے متعلق سوچ کو راہ دی ہے لیکن ندا کے سوچنے میں کوئی گہرائی نہیں ہے۔ سوچ بہت سطحی' بلکہ پیش پا اُفتادہ ہے۔ جس کا فطری انجام ہاری ہوئی فکر کا خدا کی کائنات کا خدا ہی ذمہ دار ہے کی شکست خوردگی پر ہوتا ہے۔ مارکسی فکر سے عدم واقفیت یا اس سے بے اطمینانی کا انجام حالات کی ستم ظریفی پر اسی شکست خوردگی اور بے عملی پر ہوتا تھا۔ دیکھئے چور چور ہے اور ساہوکار بھی ساہوکار نہیں چور ہے جو آج کے اقتصادی گھوٹالوں کا نا قابلِ معافی مجرم ہے۔

اگر ندا سمجھتے ہیں کہ دُنیا کا خالق اور رکھوال خدا ہے تو دُنیا کی آج کی نہیں پوری تاریخ کا منظر نامہ کے ذمہ دار خدا ہی ہے۔ جس کے رحیم و کریم اور Benevolent ہونے کا تصور مشکوک ہو جاتا ہے اور مابعد الطبیعاتی بغاوت کی راہ کشادہ کرتا ہے۔ ندا اس بغاوت کی طرف قدم اٹھانے سے ہچکچاتا ہے۔ دنیا کا منظر نامہ ایسا ہے کہ خدا کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور ایک پر انتشار دور میں خدا کی بنائی

ہوئی کائنات کے قبول کرنے کی طرف انکار کا باغیانہ رویہ فکر کی سطح پر جرأت مندانہ قدم کا تقاضہ کرتا ہے۔ چاہے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ قدم سفید و سیاہ کو الگ کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ ندا یہ قدم نہیں اٹھاتا سارتر اور راشد کی طرح خدا کے Benevolent تصور سے دامن کش نہیں ہوتا۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جدید دنیا میں انتشار کا سبب نہ تو انسانی خباثت کے طور پر سامنے آتا ہے نہ الحاد کی صورت میں، نہ ایوان کارا موزوف کی صورت میں جو خدا کا انکار نہیں کرتا بلکہ اس دنیا میں آنے کی اپنی ٹکٹ واپس کر دیتا ہے۔ ندا کے اندر رہا ہوا ایک مذہبی احساس الحاد سے گھبراتا ہے۔ خدا سے توقعات وابستہ کرتا ہے اور فکر کی لنگوٹی میں کلبیت کو پھاگ کھلنے نہیں دیتا' ورنہ کلبیت اُسے اپنا پہلا سبق سکھاتی کہ خدا ہی دُنیا کا ذمہ دار نہیں رہا، ایک غلط چیز کو پیدا کر کے وہ اسے بھول چکا ہے اور اس کا تیاگ کر چکا ہے اور انسانیت کے دکھ درد اور غم و اندوہ کی وہ کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ اِس دنیا میں غم کی بے ستونی کو توڑ کر جوئے شیر لانے کی پوری ذمہ داری انسان پر آتی ہے۔ اور اب انسانیت کی وہ درانتی ٹوٹ چکی ہے جو بے ستون کو توڑ سکتی ہے۔ جوئے شیر اب انسان کا آنسو بن کر رہ گئی ہے اور انسان کا مقدر غلیظ جھونپڑپٹیوں کی گندی نالیوں پر اکتفا کرنے پر اگر مجبور نہیں تو اس پر قناعت کر چکا ہے۔ اس قناعت اور مفاہمت پر ایک نظم ندا کے پاس ہے۔ عنوان ہے ''نیا دیوتا''۔

وہ جب تک جیا
دوستوں کو بے وقوف بناتا رہا
رشوت، بے ایمانی، جھوٹ
ہر طریقہ سے دولت کماتا رہا، اور اپنے جیتے جی
اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر
اُنھیں باعزت شہری بنا کے سکون کے ساتھ مر گیا
کیا ضروری ہے ہر بار اس کو دیوتا بنا کر پوجیں
جس میں کوئی بھی انسانی برائی نہ ہو

یہ خراب نظم نتیجہ ہے' اِس شاعرانہ چونچلے بازی کا جو اپنی چونچ میں دنیا سے سمجھوتے کا سورج لئے ہوئے ہے۔ سمجھوتا ایک قسم کا برتاؤ ہے' دنیا کے ساتھ کوئی اخلاقی رویہ نہیں۔ اس میں طنز خصوصاً اپنی ذات پر طنز کا عنصر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بات اخلاقیات کی آ گئی ہے کہ کون سے آدمی کو اچھا یا برا سمجھا جائے تو میں

یہ بتادوں کہ دُنیا میں ظالم بادشاہوں سے لے کر غضب ناک جاگیرداروں' ٹھنڈے کلیجے خون کرنے والے مافیا سے لے کر بھرشٹا چاری سیاست دانوں تک سبھی لوگ اپنی بیوی یا بچوں کے لئے اچھے ہی ہوتے ہیں' یا اچھے ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔

ایسے لوگوں پر گاڈ فادر جیسی کتاب لکھی جاسکتی ہے' جو ادب نہیں ہوتا۔ ادب میں کردار کے کھرے کھوٹے کی پہچان کا طریقہ افسانہ ناول اور ڈرامہ کے پاس ہے۔ اور شاعری بھی جب اس قسم کی کوشش کرتی ہے تو براؤننگ Browning کے ڈرامائی مونولوگ کا اسلوب اپناتی ہے جس میں ہر لفظ کے قطرۂ شبنم کو Irony کی کرن چمکاتی ہے۔ ندا میں جو طفلانہ شرارت کا عنصر ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی بذلہ سنجی، استدلالی قوت اور سوفسٹری کی ذریعہ ہر غلط چیز کو صحیح ثابت کر کے لوگوں کو چکرا دے گا۔ ایسے مرحلوں پر سمجھدار شاعر دو باتوں کا خاص خیال رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آیا اس کی بذلہ سنجی، استدلالی قوت اور طنز میں واقعی اتنی طاقت ہے، دوسری یہ کہ آیا ایسے موضوعات شاعری کے فریم ورک میں سما سکتے ہیں یا اور شاید نہیں رکھتا۔ وہ فکشن اور ڈرامے کے موضوعات ہیں۔ اسی قبیل کی ایک نظم ہے۔ ''کوئی اکیلا کہاں ہے'' یہ نظم ان شاعروں کا گویا دنداں شکن جواب ہے جو دَورِ جدید کے ویرانے میں تنہا آدمی کی شاعری کرتے ہیں حالانکہ خود ندا کی غزلوں اور نظموں سے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ بے وطنی خاندان سے دوری وغیرہ کے سبب خود اس کے یہاں تنہائی کا گہرا احساس ہے لیکن ندا جب ایک طرز احساس کا منہ چڑھانے پر آجائے تو کسی میں طاقت ہے کہ اسے روکے' اسے اپنے قلم کی طاقت پر پورا بھروسہ ہے۔ اپنی وہی طاقت جو دن کو رات ثابت کرتی ہے۔ تنہائی آدمی کا کتنا زبردست مسئلہ ہے۔ اور کیسا آفاقی اور ازل گیر و ابدتاب مسئلہ ہے اور میر و غالب کا شام ہی سے بجھا رہتا ہے اور کاوِ کاوِ سخت جان ہائے تنہائی نہ پوچھ سے لے کر فیض کی ''اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا'' کے علاوہ مغرب کی شاعری اور فکشن میں کیسے جانکاہ طریقہ پر بکھرا پڑا ہے۔ ندا نے اس سے معمولی واقفیت پانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اسے تو نظم میں یہ ثابت کرنا ہے کہ اکیلا پن آدمی کی فرصت کا فلسفہ ہے اور اسے غلط ثابت کرنے کے لئے وہ جس شاعرانہ استدلال سے کام لیتا ہے اس میں آسمانی صحیفوں کی آیتوں اور شلوکوں کی تقدیس ہے۔

شکریہ........اے درخت تیرا
تری گھنی چھاؤں میرے رستے کی دلکشی ہے
شکریہ..........اے چمکتے سورج

تری شعاعوں سے، میرے آنگن میں روشنی ہے

شکریہ.........اے چہکتی چڑیا

ترے سروں سے میری خموشی میں نغمگی ہے

پہاڑ، میرے لئے موسم سجا رہا ہے

کوئی اکیلا کہاں ہے، زمیں کے ذرّے سے

ہر اِک وجود ایک کارواں ہے

زمین ماں ہے

ہر ایک سر پر، ہزاروں رشتوں کا آسماں ہے

بٹی ہوئی سرحدوں میں، سب کچھ جڑا ہوا ہے

اکیلا پن، آدمی کی فرصت کا فلسفہ ہے

سوال یہ ہے کہ قدرت کی ان تمام نعمتوں سے تو ہر آدمی فیضیاب ہے' پھر بھی آدمی سماجی ،نفسیاتی اور مابعد الطبیعاتی سطح پر اکیلے پن کے احساس کا کم یا زیادہ شکار ہے۔ نا ہوتا تو اکیلے پن کا لفظ ہی نہ ہوتا۔ ہر لفظ ایک احساس کو جنم دینے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ ندؔا کی یہ نظم خود اس بات کی دلیل ہے کہ اکیلا پن جیسی کوئی چیز ہے جس کے بتلان کے لئے یہ نظم وجود میں آئی ہے۔ ندا کا استدلال حقیقی نہیں جذباتی ہے۔ بے شک درخت رستے کی دلکشی ہے جسے ہر آنکھ دیکھتی ہے لیکن کوئی آنکھ اس بوڑھی عورت کو بھی دیکھ لیتی ہے جس کا دنیا میں کوئی نہیں اور جو اس درخت کے نیچے زندگی کے تنہا دن کاٹ رہی ہے۔

اس حقیقت کو دیکھنے پر ہمارا اصرار نہیں اور درخت کی خوبصورتی سے ہمیں انکار نہیں لیکن مظاہر فطرت کا حسن انسان کی ارزاتی زبونی اور تنہائی کی تلافی نہیں۔ دونوں حقائق اپنا اپنا وجود رکھتے ہیں۔ تنہائی ایک احساس ہے جس کا کوئی مداوا نہیں چاہے وہ ہرے بھرے شہر میں رہتا ہو یا بھرے پرے خاندان میں۔ یہ بالکل وہی احساس ہے جو سب کچھ پا کر بھی کسی چیز کی کمی کو محسوس کرتا ہے۔ غالبؔ کے اِس شعر میں اِس احساس کی نہایت معنی خیز ترجمانی ہوئی ہے۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں

مانا کہ ترے رخ سے نگہ کامیاب ہے

کچھ ایسے ہی ایک احساس کا، کھوئے سے کچھ کا، تھوڑی سی کمی کے رہ جانے کا اظہار ندؔا کی ایک

بے حد خوبصورت نظم میں ہوا ہے۔

ہر نظم مکمل ہوتی ہے
لیکن وہ قلم سے کاغذ پر
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے
ہر پریت مکمل ہوتی ہے
لیکن وہ گگن سے دھرتی پر
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے
ہر جیت مکمل ہوتی ہے
سرحد سے وہ لیکن آنگن میں
جب آتی ہے
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے
ہر نظم نئی
ہر پریت نئی، ہر جیت نئی کہلاتی ہے
ہر بار مگر لگتا ہے یوں ہی
تھوڑی سی کمی رہ جاتی ہے

بعض سیاسی، سماجی اور اخلاقی موضوعات پر ندا کے یہاں دلچسپ نظمیں ملتی ہیں۔ یہاں طنز کارگر ہے۔ ''چھوٹا آدمی'' اس نوع کی ایک نظم ہے۔ چھوٹا آدمی یا عام آدمی شعر وادب کا موضوع ہے، سیاسی شطرنج کا مہرہ ہے، مذاہب کا ادنیٰ شکار ہے اور تاریخ میں ہمیشہ ستایا ہوا، کچلا ہوا اور دکھوں کا انبارِ بے پایاں رہا ہے۔ اقبال کے یہاں عظمتِ انسانی کے نغمے اور فوق الانسان کے فلسفے ہیں۔ ترقی پسندوں نے عوام کی طاقت کے گیت گائے ہیں۔ فیض اور دوسرے شعراء نے ''ہم لوگ'' کے عنوانات سے بعض اچھی نظمیں لکھی ہیں لیکن ''چھوٹے آدمی'' کو کسی شاعر نے اس طرح نہیں دیکھا جیسا کہ ندا نے دیکھا ہے۔

تمہارے لئے سب دعا گو ہیں
تم جو نہ ہو گے، تو کچھ بھی نہ ہوگا
اسی طرح مر مر کے جیتے رہو تم
تمہی ہر جگہ ہو، تمہی مسئلہ ہو، تمہی حوصلہ ہو
مصور کے رنگوں میں تصویر بھی تم
مصنف کے لفظوں میں تحریر بھی تم
مقرر کے نعروں میں تقریر بھی تم
تمہارے لئے ہی، خدا باپ نے
اپنے اکلوتے بیٹے کو قرباں کیا ہے
سب ہی آسمانی کتابوں نے تم پر
تمہارے عذابوں کو، آساں کیا ہے
خدا کی بنائی ہوئی اس زمیں پر، جو سچ پوچھو
تم سے محبت ہے سب کو
تمہارے دکھوں کا مداوا نہ ہوگا
تمہارے دکھوں کی ضرورت ہے سب کو

''قومی یک جہتی'' ہمارے زمانے میں ایک تحریم کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ اِس موضوع پر بڑے سیمینار، کانفرینسیں اور جلسے ہوتے ہیں اور نہایت ہی پاکیزہ خیالات کا اِظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے عیار منافق معاشرے کا دستور ہے کہ ''جوں بہ خلوت می روند اٰں کارِ دیگر می کنند''۔ جو ذہن کے تاریک گوشوں میں چھپے ہوئے تعصبات کے کیڑوں کو حرکت میں لانے سے عبارت ہے۔

ندا حسبِ معمول ایک شریر بچہ کی طرح قومی یک جہتی وہاں پاتا ہے جہاں گنہگار تو پہنچتے ہیں لیکن اِن مقدس ہستیوں کا گذر نہیں جن کے نیک آسمانی منصوبوں نے زمیں کو فتنہ وفساد سے بھر دیا ہے۔ ندا کی یہ نظم منٹو کی یاد دلاتی ہے۔

وہ طوائف، کئی مردوں کو پہچانتی ہے
شاید اِسی لئے، اِس کے کمرے میں

ہر مذہب کے بھگوان کی ایک ایک تصویر لگی ہے
یہ تصویریں
لیڈروں کی تصویروں کی طرح نمائشی نہیں
اس کا دروازہ، رات گئے تک
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
ہر ذات کے آدمی کے لئے کھلا رہتا ہے
خدا جانے
اس کے کمرے کی سی کشادگی
مسجد اور مندر کے آنگنوں میں کب پیدا ہوگی

''کامیاب آدمی'' کا قولِ محال بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ اِتنی مختصر سی نظم میں کتنے دور و دراز کے اندیشوں کو ندؔا نے سمیٹ لیا ہے۔

وہ گالی کھا کے مسکراتا ہے
ہر ذِلت کو بھول جاتا ہے
ہر اک کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے
اِسے کامیابی کا راستہ مل گیا ہے
وہ بہت جلد
دوسروں کو ستانے کے قابل ہو جائے گا

شاعری میں تازہ کار تخیل کی ایک پہچان انوکھے خیال اور اچھوتے موضوع پر نظم کی تشکیل ہے۔ ''آخری سچ'' ایک ایسی ہی نظم ہے۔ شاعری میں اِس اساس سے تو ہم واقف ہیں کہ ایک ازلی بے قراری، ایک ابدی اضطراب، ایک مسلسل جستجو، ایک بے منزل سفر، زندگی کو حرکت اور تڑپ عطا کرتی ہے۔ یعنی وہی بات کہ وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب لیکن ندؔا احساس کے اِس شعلے کو مذاہبِ عالم کے خرمنوں میں لے جاتا ہے۔ اِس جھنجھٹ میں پڑے بغیر کہ آخری سچائی کون سے مذہب کے پاس ہے۔ وہ آخری سچائی کی اہمیت ہی کو ثانوی بنا دیتا ہے۔

وہی ہے زندہ بزرگ سچائی کی راہوں
تجربوں کا عذاب ہے جو
سکوں نہیں، اضطراب ہے جو

ایسے آدمی کے لئے ندا جو دعا مانگتا ہے وہی نظم کو ایک تعجب خیز موڑ دے کر اسے نئی معنویت عطا کرتی ہے۔

دعا کرو، آسماں سے اس پر
کوئی صحیفہ اتر نہ آئے
کھلی فضاؤں میں
آخری سچ کا زہر
پھر سے بکھر نہ جائے
جو آپ اپنی تلاش میں ہے
وہ دیوتا بن کر مر نہ جائے

ندا اس معنی میں واقعی ایک باغی شاعر ہے کہ وہ مروجہ اور مصدقہ سچائیوں اور قدروں کو قبول کرنے کی بجائے ایسے خیالات اور تجربات پیش کرتا ہے۔ جو ہمیں چونکاتے اور دھچکا پہنچاتے ہیں۔ چونکانے کا اس کا طریقہ ' کار مروّجہ قدروں کو سر کے بل کھڑا کر دینے کا ہے۔ قولِ محال' طنز اور مزاح ان تینوں کی ہلکی سی آنچ پا کر اُس کی نظمیں ہمارے فکر و احساس پر ان دیکھی راہوں سے حملہ کرتی ہیں، ہم چونکتے ہیں، جھنجھلاتے ہیں، مسکراتے ہیں اور ہار مان جاتے ہیں'' مجھے یاد ہے''،'' صورت سے مورت تک''،'' غلط نشانہ''،'' ناراض آدمی '' ایسی ہی نظمیں ہیں۔ ایک نظم '' سچائی'' ملاحظہ فرمایئے۔ جو اس رنگ کی عمدہ مثال ہے۔

وہ کسی ایک مرد کے ساتھ
زیادہ دن نہیں رہ سکتی
یہ اس کی کمزوری نہیں' سچائی ہے
لیکن جتنے دن وہ جس کے ساتھ رہتی ہے
اُس کے ساتھ بے وفائی نہیں کرتی
اُسے لوگ بھلے ہی کچھ کہیں

مگر!! کسی ایک گھر میں
زندگی بھر جھوٹ بولنے سے
الگ الگ مکانوں میں سچائیاں بکھیرنا
زیادہ بہتر ہے

یہ ہرجائی پن جب ایک ماروائی شکل اختیار کرتا ہے تو ندا کا خدا بھی کسی ایک گھر میں قید ہونے کی بجائے چاروں طرف سچائیاں بکھیرتا ہے۔ خدا کا یہ وحدت الوجودی تصور ندا کے یہاں کسی ذاتی روحانی ضرورت سے زیادہ فرقہ پرستی اور فسادات کا ردِ عمل ہے۔ محمد علوی کے یہاں خدا کے نہ ہونے کا غم ہے۔ گویا اس نے اپنے بے یقینی کے کرب کو گوارا کرلیا ہے۔ ندا کے لئے خدا کے نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہے لیکن اب انسان کی مذہبی فتنہ پردازیوں سے بیزار ہو کہ مندر مسجد کی دنیا سے دور چلا گیا ہے۔ اس دنیا میں تھا تو اسے لوگوں نے پہچانا نہیں۔ جس طرح بہت پہلے' گاؤں کے بزرگوں نے اسے پہچانا تھا' دیکھا تھا' پوجا تھا یہیں تھا وہ یہیں بچوں کی آنکھوں میں' لہکتے سبز پیڑوں میں' ہواؤں میں مہکتا تھا۔ ندی کے ساتھ بہتا تھا۔ ابھی بھی وہ روز چاند بن کر آتا ہے' سورج بن کر جگمگاتا ہے' ماں کے گہنوں میں کھنکتا ہے' چھپ کر بہنوں میں ہنستا ہے' وہ مزدور کے پسینہ میں بھی ہے' اور برسات کے مہینہ میں بھی' لیکن اب ہمارے کان بہرے ہیں' ہماری رُوح اندھی ہے' ہم اسے نہ دیکھ سکتے ہیں نہ اس کی آواز کو سن سکتے ہیں 'چنانچہ وہ غصہ ہو کر آسمان پر لوٹ جاتا ہے' اور خدا بن کر قہر ڈھاتا ہے۔ جب تک خدا مظاہر فطرت میں تھا ،درختوں ، پرندوں ، بچوں کی ہنسی ، ماں کے پیار ،نسائی پیکر کے حسن اور انسانی محنت میں تھا' رحمتوں اور برکتوں کی صورت تھا۔ شاید اس کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔ اب آسمان پہ چلا گیا تو اس کا نام خدا ہو گیا اور کام قہر ڈھانا۔ وہ مندر اور مسجد میں قید ہو گیا تو فتنہ و فساد بن گیا۔ خدا کو مذاہب کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرانے کے لئے ندا نے ایک طرف تو Nature Pantheism کا سہارا لیا ہے' دوسری طرف خدا کو خود کی ذات کا قصہ بنالیا۔

ندی' میرے اندر سے ہو کر گذرتی ہے
آ کاش
آنکھوں کا دھوکا نہیں تھا
یہ بات ان دنوں کی ہے

جب اس زمیں کو
عبادت گھروں کی ضرورت نہیں تھی، مجھی میں خدا تھا

تیسری طرف ندا نے خدا اور انسان کے درمیان وہ رشتہ قائم کیا جس کی بہترین ترجمانی حضرت موسیٰ اور گڈریا کی وہ حکایت کرتی ہے جس میں گڈریا کہتا ہے کہ خدا مجھے ملے تو میں اسے نہلاؤں، کھانا کھلاؤں، بالوں میں کنگھی کروں۔ یہاں شاعر فطرت سے الگ خدا کو بطور شخص کے دیکھتا ہے۔ لیکن اپنے شعور کو بچہ کی معصومیت کی سطح پر ہی رکھتا ہے۔ اگر خدا چاند، ستاروں، آفتاب، زمین اور فطرت سے الگ کوئی چیز نہیں تو وہ انسانی عوامل اور اُس کی ضرورتوں سے بھی الگ کوئی چیز نہیں۔ یہ رشتہ پھر آقا اور غلام کا نہیں، باپ اور بچہ کا بن جاتا ہے۔ ندا کی ''حمد'' اس رشتہ کی بہت ہی اچھی ترجمانی کرتی ہے۔

نیل گگن میں بیٹھے
کب تک چاند ستاروں سے جھانکو گے
پربت کی اونچی چوٹی سے
کب تک دنیا کو دیکھو گے
آدرشوں کے بند صحیفوں میں
کب تک آرام کرو گے
میرا چھپّر ٹپک رہا ہے
بن کر سورج اسے سکھاؤ
خالی ہے آٹے کا کنستر
بن کر گیہوں اُس میں آؤ
ٹوٹ گیا ہے ماں کا چشمہ
شیشہ بن کر اِسے بناؤ
چُپ چُپ ہیں آنگن میں بچے
بن کر گیند انھیں بہلاؤ
شام ہوئی ہے
چاند اُگاؤ، پیڑ ہلاؤ، ہوا چلاؤ

کام بہت ہیں، ہاتھ بٹاؤ اللہ میاں
میرے گھر میں آ ہی جاؤ اللہ میاں

''میرے گھر میں آ ہی جاؤ اللہ میاں'' ندا کی دی ہوئی فٹ نوٹ کے مطابق یو پی کے ایک لوک گیت کا مصرع ہے۔ گویا لوک گیتوں میں خدا کا یہ معصومانہ تصور زندہ ہے۔ آدمی کے اندر موسی کا گڈریہ مرا نہیں۔ اِس سلسلہ کی نظموں میں سب سے اچھی نظم غزل کے فارم میں ہے۔ جس کا عنوان فہرست میں ''گرج برس'' دیا گیا ہے۔ پانچ شعروں کی اس نظم میں لوک گیت، بھکتی رس، تاریخ، منطق اور انسان دوستی کی دھنک کے رنگ بکھرے پڑے ہیں۔

گرج برس پیاسی دھرتی پہ پھر پانی دے مولا
چڑیوں کو دانے' بچوں کو گڑ دھانی دے مولا

دو اور دو کا جوڑ ہمیشہ چار کہاں ہوتا ہے
سوچ سمجھ والوں کو تھوڑی نادانی دے مولا

پر روشن کر زہر کا پیالہ' چمکا نئی صلیبیں
جھوٹوں کی دنیا میں سچ کو تابانی دے مولا

پھر مورت سے باہر آ کر چاروں اور بکھر جا
پھر مندر کو کوئی میرا دیوانی دے مولا

ترے ہوتے کوئی کسی کی جاں کا دشمن کیوں ہو
جینے والوں کو مرنے کی آسانی دے مولا

کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی کہ ندا کی شاعری میں خدا پر نظمیں ملک میں فرقہ پرستی کا ردِعمل ہیں۔ گویا خدا ندا کے دماغ میں اتنا نہیں جتنا دل میں ہے۔ یعنی وہ ایک دانشورانہ حربہ ہے تنگ نظر مذہبیت کے خلاف نبرد آزمائی کا۔ لیکن محولہ بالا نظم میں دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے کہ کچھ ایسی کیفیت ہے کہ لگتا ہے کہ ندا کے دل کی گہرائیوں میں ایک مذہبی یا دوسرے لفظوں میں روحانی احساس پنہاں بھی ہے اور خفتہ بھی جو اس وقت جاگ اٹھتا ہے جب جھوٹوں کی دنیا میں سچ کی تابانی گنگنانے لگتی ہے۔ اب میرا دیوانی والا شعر لیجئے۔ یہ میرا سے ایک والہانہ لگاؤ کے بغیر نوکِ قلم پر آ ہی نہیں سکتا۔

ہمارے بہت سے شعراء نے فرقہ پرستی اور فسادات کے خلاف نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں جو بہت اثر انگیز ہیں۔لیکن میرے خیال میں ندا فاضلی واحد شاعر ہے جس نے مذہب کے نام پر روا رکھی گئی بہیمانہ خونریزی کا جواب مذہب ہی کے ہتھیار سے دیا اور اس خدا کا تصور پیش کیا جو ویدانت، تصوف، بھکتی واد اور لوک گیتوں پر مبنی تمام انسانیت کا خدا ہے جو شہ رگ کے قریب ہے، دل کی دھڑکن ہے، فطرت کے رگ و ریشے میں قوتِ نمو بن کر دوڑتا ہے۔جو گرجتا ہے اور برستا ہے اور چڑیوں کو دانے اور بچوں کو گُڑ دھانی دیتا ہے۔اس خدا پر ندا نظمیں غزلیں بھی عوامی محاورے اور بچوں کے کھلنڈرے لہجہ میں لکھتا ہے۔ خدا کے ساتھ یہ کھلواڑ اُردو شاعری میں بالکل نئی چیز ہے۔اور صرف ندا سے منسوب ہے۔یہ غزل دیکھئے

بندرا بن کے کرشن کنہیا اللہ ھو
بنسی ، رادھا ، گیتا گیا اللہ ھو

تھوڑے تنکے تھوڑے دانے تھوڑا جل
اک ہی جیسی ہر گوریا اللہ ھو

جیسا اس کا برتن ویسا اس کا تن
گھٹتی بڑھتی گنگا میا اللہ ھو

اک ہی دریا نیلا ،پیلا ،لال، ہرا
اپنی اپنی سب کی تیا اللہ ھو

مولویوں کا سجدہ' پنڈت کی پوجا
مزدوروں کی ہیا ہیا اللہ ھو

ایسا لگتا ہے ندا کے اندر رہا ہوا شریر بچہ زمین پر قائم کی ہوئی مندر مسجد کی تحریمات ہی کو توڑتا پھوڑتا نہیں بلکہ آسمان کی طرف بھی لپکتا ہے اور خدا کو جس کے لئے زمین بازیچۂ اطفال تھی' کھینچ کر زندگی کے اس کھیل میں اپنے ساتھ شامل کرتا ہے۔جس میں خدا اگر صحیح داؤ نہیں لگا تا' تو اپنے رحیم و کریم ہونے سے زیادہ اپنے قہار و جبار ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔کھیل کھیل ہی میں' مذاق مذاق ہی میں ندا خدا کو جتلا دیتا ہے کہ تُو ہی بادل، چاند، ستارا، ہریالی ہے اور تُو ہی ناگا سا کی بھی ہے۔ جو بڑی گٹر بٹر گھوٹا لے والا معاملہ ہے۔یہ غزل دیکھئے۔

کالا امبر ' پیلی دھرتی یا اللہ
ہا ہا ' ہو ہو ' ہی ہی ہی ہی ' یا اللہ

پیر پیمبر کو اب اور نہ زحمت دے
چولہا چکی ' روٹی سبزی ' یا اللہ

کرگل اور کشمیر ہی تیرے نام ہوں کیوں
بھائی ، بہن ، محبوبہ ، بیٹی یا اللہ

گڑ مصری بھی بھیج کبھی اخباروں میں
کئی دِنوں سے چائے ہے کڑوی یا اللہ

تُو ہی بادل ، چاند ، ستارا ، ہریالی
اور کبھی تُو ناگا ساکی یا اللہ

ناگا ساکی کا ذمہ دار بھی اگر خدا ہی ہے تو پھر مابعد طبیعاتی بغاوت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ لیکن ندؔا اِن دروازوں کے قریب جاتا ہے۔ پھر انہیں کھولتا نہیں ۔ یہ دروازے اُردو شاعری میں راشد نے کھولے ہیں ۔ اور ندؔا ' راشد ہوں یا فیض ' اُنھیں محفوظ فاصلوں پر رکھتا ہے ۔ وہ بازی گاہ کو دانشورانہ جولا نگاہ میں بدلنا پسند نہیں کرتا ۔ کیونکہ وہ ماں ، بہن ، بیٹی ، روٹی اور گڑ دھانی ، برستے پانی اور میرا دیوانی کی قیمت پر انکار اور الحاد کے کرب کا سودا کرنا نہیں چاہتا ۔ یہ روّیہ اس کے نشاط جو اور مسرت اندوز شاعرانہ مزاج سے لگا نہیں کھاتا ۔ لیکن وہ اتنا سادہ لوح بھی نہیں کہ ناگا ساکی سے چشم پوشی کر کے ساقی گری کی خیر منائے ۔ اسے شعر کا شعور حاصل ہے اور وہ اس سے آنکھیں چار کرتا ہے ۔ ان لمحات میں اس کا طنز کاری وار کرتا ہے جس کی بہترین مثال اس کی نظم '' ایک قومی رہنما کے نام '' ہے ۔

مجھے معلوم ہے
تمہارے نام سے منسوب ہیں
ٹوٹے ہُوئے سورج
شکستہ چاند ، کالا آسماں
کرفیو زدہ راہیں

سلگتے کھیل کے میدان
روتی چیختی مائیں
مجھے معلوم ہے
چاروں طرف یہ جو تباہی ہے
حکومت ہے
سیاست کے تماشوں کی گواہی ہے
تمہیں، ہندو کی چاہت ہے
نہ مسلم سے عداوت ہے
تمہارا دھرم صدیوں سے تجارت تھا' تجارت ہے
مجھے معلوم ہے لیکن
تمہیں مُجرِم کہوں کیسے؟
عدالت میں
تمہارے جرم کو ثابت کروں کیسے؟
تمہاری جیب میں خنجر، نہ ہاتھوں میں کوئی بم تھا
تمہارے رتھ پہ تو، مریادہ پرشوتم کا پرچم تھا

ندؔا نے یہ نظم لال قلعہ کے مشاعرے میں اُن لوگوں کے سامنے جرأت مندی سے پڑھی تھی جو اس رتھ کے ذمہ دار تھے۔ آج سے پچاس سال اور ممکن ہے نظم کی تفہیم کے لئے رتھ اور پرچم کی تفہیم کے لئے فٹ نوٹ دینے کی ضرورت پڑے۔ اس معاملے میں سیاسی نظم چاہے ترقی پسندوں کی ہو یا جدید شاعروں کی' تاریخ کے ایک لمحے میں قید ہوتی ہے۔ زمان و مکان اور تاریخی حالات سے ابدی صداقتوں کی حامل نظموں کی مانند بلند نہیں ہو پاتی۔ یہ سیاسی شاعری کی مجبوری ہے۔

فیضؔ کی نظم ''سیاسی لیڈر کے نام'' رات، نور، سحر کے اشاروں سے کام لیتی ہے اور علامتی اسلوب کو اپناتی ہے۔ لیکن وہ بھی ایک مخصوص تاریخی صورتحال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ندؔا کی نظم راست اسلوب میں ہے۔ گویا اسالیب بھی ان نظموں کی ہنگامی صفات کو آفاقیت کا جوہر عطا نہیں کر پاتے چنانچہ ہمارا یہ سمجھنا کہ آرٹ ہنگامی موضوعات کو ابدیت اور آفاقیت عطا کرتا ہے۔ جزوی صداقت کا حامل ہے۔ گویا وہ نظریہ

شعر جو موضوع کو غیر اہم اور فنکاری کو سب کچھ سمجھتا ہے ہر نوع کی شاعری کا پیمانہ نہیں بن سکتا۔

ندا کی رومانی شاعری میں شخصی وارداتوں کا عکس گہرا ہے۔ بڑے شہر میں آنے کے بعد ترقی کوشی کی جدوجہد میں مبتلا ہونے اور انجام کار کامیاب ہونے کے تجربات نے اس محبت کی یاد کو دھندلا کر دیا جو کسی اور شہر یا آبائی بستی میں کی گئی تھی۔ یہاں غمِ روزگار غمِ عشق سے زیادہ دلفریب ثابت ہوئے۔

اِس رُومانی احساس کی جگہ کہ 'آؤ کہ سوزِ مرگِ محبت منائیں ہم' یا چلو کہ چل کر چراغاں کریں دیارِ حبیب کی جگہ ایسی کلبیت نے لے لی ہے جو اول تو جذبۂ محبت ہی کو مشکوک نظروں سے دیکھتی ہے۔ اور جذبۂ محبت کو جنسی جبلت سے الگ نہیں کر پاتی۔

نظم ''فرصت''

میں نہیں سمجھ پایا آج تک اس الجھن کو
خون میں حرارت تھی یا تری محبت تھی

قیس ہو کہ لیلیٰ ہو، ہیر ہو کہ رانجھا ہو
بات صرف اتنی ہے، آدمی کو فرصت تھی

ظاہر ہے ایسی کلبیت بڑی رُومانی شاعری کا سرچشمہ نہیں بن سکتی۔ پھر تو آدمی جنس میں پناہ ڈھونڈنے لگتا ہے' اور ندا نے دو چار نظموں میں یہ بھی کوشش کر دیکھی' لیکن گیتوں، دوہوں، غزلوں، بارہ ماسوں، بھگتی رس اور شرنگار رس کا پروردہ ذہن نہ تو پردیسی بالما کو جنس کی آگ میں جھونک سکتا ہے نہ گاؤں کی گتیا سے باتیں کرتی برہن کی آگ کو برفاب کرنے پر رضامند ہوتا ہے۔ چنانچہ حالات سے سمجھوتا ایک حل رہ جاتا ہے۔ اخترالایمان کے یہاں اس سمجھوتے پر ندا کے یہاں خندۂ زیرِ لبی ملتا ہے۔ لیکن ندا کی کیا بساط' حالات اچھے اچھوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ نظم ''پھر یوں ہوا''

ممکن ہے چند روز، پریشاں رہی ہو تم
یہ بھی ہوا ہو، وقت پہ سورج اُگا نہ ہو
اِملی میں کوئی اچھا کتارہ پکا نہ ہو
چھت کی کھلی ہواؤں میں آنچل اُڑا نہ ہو
دو تین دن رضائی میں سردی رُکی نہ ہو
کمرے کی رات پنکھ پسارے اُڑی نہ ہو

ہنسنے کی بات پر بھی بہ مشکل ہنسی ہو تم
ممکن ہے چند روز پریشاں رہی ہو تم
کچھ دِن خطوں میں آنسو بہے شوروغل ہوا
تم زہر پی کے سوئیں، میں انجن سے کٹ گیا
پھر یوں ہوا کہ دُھوپ کھلی 'ابر چھٹ گیا
میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسالیا
تم نے پڑوس میں نیا بھائی بنا لیا

خوبصورت نظم ہے۔رومانی محبت میں جدائی کی تمام کیفیتوں کا احاطہ کرتی ہے۔اس میں زندگی کی صداقت کا عنصر ہے۔محبت میں یوں لوگ مرنہیں جاتے زندہ رہنے کی راہیں تلاش کر لیتے ہیں۔ندا کی نظم ''ایک کہانی'' کا موضوع بھی یہی ہے۔اس نظم کی خوبصورتی گریز کا وہ لمحہ ہے جس میں زمان ومکان کی سرحدیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ندا نظم میں محبوبہ کو ایک ایسے لمحے کی دہلیز پر کھڑا کر دیتا ہے جس میں ماضی کی فراموش کردہ محبت حال کے ایک واقعہ سے تازہ ہو کر مستقبل کا اندیشہ بن جاتی ہے۔

تم نے' شاید کسی رسالے میں
کوئی افسانہ پڑھ لیا ہوگا
کھوگئی ہوگی روپ کی رانی
عشق نے زہر کھالیا ہوگا
تم اکیلی کھڑی ہوئی ہوگی
سر سے آنچل ڈھلک رہا ہوگا
یا پڑوسن کے پھول سے رُخ پر
کوئی دھبہ چمک رہا ہوگا
کام میں ہونگے سارے گھر والے
ریڈیو گنگنا رہا ہوگا، تم پہ نشہ سا چھا گیا ہوگا
مجھ کو وشواس ہے کہ اب تم بھی
کھڑکی کھول دینے پر

اپنی لڑکی کو ٹوکتی ہوگی

گیت گانے سے روکتی ہوگی

میرے نزدیک اس سلسلہ کی سب سے خوبصورت نظم "پگھلتا دھواں" ہے۔اس نظم میں شخصی عنصر آفاقیت میں گم ہوگیا ہے۔ یہ ہر اُس شخص کی داستان ہے جو شہر میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں میں اُسے یاد کرتا ہے' جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ یاد یہاں ایک بولتی ہوئی خوبصورت تصویر بن گئی ہے۔خود ندا کو اتنے جاندار حاضراتی شعری پیکر کسی اور نظم میں حاصل نہیں ہوئے۔

دور شاداب پہاڑی پہ بنا اک بنگلہ
لال کھپریلوں پہ پھیلی ہوئی انگور کی بیل
صحن میں بکھرے ہوئے مٹی کے راجارانی
منہ چڑاتی ہوئی بچوں کو کوئی دیوانی
سیب کے اُجلے درختوں کی گھنی چھاؤں میں
پاؤں ڈالے ہوئے تالاب میں کوئی لڑکی
گورے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تکیہ کا غلاف
ان کہی باتوں کو دھاگوں میں سیئے جاتی ہے
دل کے جذبات کا اظہار کئے جاتی ہے
گرم چولھے کے قریب بیٹھی اک عورت
اک پیوند لگی ساڑھی سے تن کو ڈھانپے
دھندلی آنکھوں سے مرے سمت تکے جاتی ہے
مجھ کو آواز پہ آواز دیئے جاتی ہے
اک سلگتی ہوئی سگریٹ کا بل کھاتا دھواں
پھیلتا جاتا ہے ہر سمت مرے کمرے میں

رومانی نظموں کی ایک رسم وہ اتفاقیہ لمحاتی ملاقات ہے جس میں مُرد عورت' مرد عورت ہی کی طرح ملتے ہیں، کوئی رشتہ ناطہ نہیں، نام ٹھام ٹھور ٹھکانا نہیں' لیکن یہ ملن نشاط انگیز لمحات کی اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے اور ایسے ہی ملاپ کی نئی خواہشیں پیدا کر جاتا ہے۔ایک مختصر سی نظم "ایک ملاقات" اس کی دلچسپ مثال ہے

نیم تلے دو جسم اُجالے چھم چھم بہتا ندیا جل

اُڑی اُڑی چہرے کی رنگت کھلے کھلے زُلفوں کے بَل

دبی دبی کچھ گیلی سانسیں جُھکے جُھکے سے نین کنول

نام اُس کا؟ دو نیلی آنکھیں

ذات اس کی؟ رستے کی رُت

مذہب اس کا؟ بھیگا موسم

پتا؟ بہاروں کی برسات

یہ خالص بایولوجی کی سطح پر عورت مرد کا ملن جو اخلاقیات کو راہ نہیں دیتا' اور جو مغرب کے کھلے اور آزاد معاشروں میں مشرق کی نسبت زیادہ عام ہے' ایک ایسی انسانی صورتحال کو سامنے لاتا ہے جو آج کے متمدن سماج میں ایک متمدن آدمی کے احساس کو' خالص حسن کی حیوانی سطح پر نہیں رکھتی' بلکہ اسے فطرت کے خوبصورت استعاروں میں بدل دیتی ہے اور استعارہ بایولوجی پر تمدن کی ظفر مندی کی علامت ہے۔ یعنی جو کچھ ہوا وہ تو جنس کی کارفرمائی تھی' لیکن اس کی یاد استعاروں کے سبب تمدنی آدمی کے شعور کی آئینہ دار ہے۔ لیکن نظم کا Paradox یہ ہے کہ یہی استعارے اس تمدن کی نفی کرتے ہیں جس کی تعبیر جنس کی جبلت پر اخلاقیات کے پہرے بٹھاتی ہے۔ کیونکہ جبلت پر اخلاقی پابندیوں کے بغیر تمدن کی تعبیر ممکن نہیں۔ گویا اتفاقیہ ملاقات ایک متمدن معاشرے میں بایولوجی یا جبلت کے حسن کو اتفاقیہ پالینے کا تجربہ ہے۔ لیکن یہ تجربہ ایک وحشی آدمی کا نہیں جو فطرت کا جزو ہے اور فطرت سے الگ اپنا شعور پیدا نہیں کرسکتا۔ لیکن ایک ایسے آدمی کا ہے جو فطرت سے الگ اپنا شعور رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا تجربہ متمدن دنیا میں فطرت کے حسن کا اپنا پُراسرار تجربہ ہے۔ اس لئے چھم چھم بہتا ندیا جل' دو نیلی آنکھیں' رستے کی رُت' بھیگا موسم' بہاروں کی برسات' ایک جسم' ایک وجود کی نشانی بن پاتے ہیں۔ نظم کیا ہے منٹو کا افسانہ "بو" کی شاعرانہ تفسیر ہے۔ وہاں بھی صرف ایک میتھون ہے۔ نہ نام' نہ ٹھام' نہ ٹھوڑ ٹھکانہ۔

ندانہ جنس کا اسیر ہے نہ ذات کا زندانی' وہ دونوں کو ساتھ لے کر بھی چلتا ہے اور دونوں سے بلند بھی ہوجاتا ہے۔ وہ حسن و محبت کی رُومان پرور اور تابناک فضاؤں میں اپنے لئے کوئی دانہ دُنکا مانگے بغیر پرواز کرسکتا ہے۔ حسین صورتوں سے اور محبت بھرے دلوں سے چھلکتی اتنی وسیع دنیا میں اپنی ذات میں جی کر بھی آدمی کتنا جی سکتا ہے۔ اپنے لئے کچھ بھی مانگے بغیر دوسروں کی خوشیوں، محبتوں اور لب و رُخسار کے

مہکتے ہوئے گلستانوں میں جینا پھر کائنات کو اپنی ذات میں سمونا ہے۔ بلکہ ذات کو کائنات کی پنہائی عطا کرنا ہے۔اس تجربہ کا بیان اس کی ایک نظم ''ایک لڑکی'' میں ہوا ہے۔اور اتنی سجتا سے ہوا ہے کہ ہم ہاتھ میں ایک بیج لے کر اُسے کریدتے ہیں' اُچھالتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس میں تو ایک پورا درخت پنہاں ہے۔نظم دیکھئے:

وہ پھول پھول بدن
سانولی سی لڑکی
جو روز!
میری گلی سے گذر کے جاتی ہے
سنا ہے
وہ کسی لڑکے سے پیار کرتی ہے
بہار ہو کر بہار تلاش کرتی ہے
نہ کوئی میل!
نہ کوئی لگاؤ ہے لیکن
نہ جانے کیوں
بس اُسی وقت جب وہ آتی ہے
کچھ انتظار کی عادت سی ہو گئی ہے مجھے
اِک اجنبی کی ضرورت سی ہو گئی ہے مجھے
مرے دراندے کے آگے
وہ پھوس کا چھپّر
گلی کے موڑ پہ
اُکھڑا ہوا سا اِک پتھر
وہ اِک جھکتی ہوئی بدنما سی نیم کی شاخ
اور اُس پہ جنگلی کبوتر کے گھونسلے کا نشان
یہ ساری چیزیں، کہ جیسے مجھی میں شامل ہیں

مرے دکھوں میں، مری ہر خوشی میں شامل ہیں

میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی، یونہی گزرتی رہے

اسی طرح کسی لڑکے کو، پیار کرتی رہے

ندا کے یہاں غزل اور نظم کی سرحدیں مٹ جاتی ہیں۔ ایسا بہت سے شاعروں کے یہاں ہوا' اقبال، جوش، فراق، فیض، ناصر کاظمی۔ اُن کی نظموں پر غزل اور غزلوں پہ نظم کے اثرات ہیں لیکن اثرات' اثرات ہی رہتے ہیں۔ بالِ جبریل کی غزلوں کو کوئی نظم نہیں کہتا گو ان میں غزل کے روایتی اسالیب اور مضامین نظر نہیں آتے۔ ندا کی ''ماں'' اور ''مولا'' کی ردیف والی غزلوں کو ظاہری ہیئت کے سبب غزل کہا جاسکتا ہے لیکن ایسا کہنا محض ظاہر داری ہوگا' اس کی روح تو نظم کی ہے۔ اُس کا ہر شعر دوسرے سے آزاد ہونے کے باوصف اِس قدر رچا ہوا ہے کہ ایسی معنوی وحدت کم ہی نظموں میں نظر آتی ہے۔ کیونکہ جوش تو ٹھیک خود اقبال کے یہاں بھی نظم کی وحدت کی بجائے غزل کی پریشاں بیانی عام سی بات ہے۔ جو مشرقی مزاج کا ایک وصف رہا ہے لیکن ان استثنائی مثالوں سے قطع نظر ندا کے یہاں غزل اور نظم اپنی صنفی انفرادیت قائم رکھتی ہیں' اِس حد تک کہ یہ کہنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اس کی غزل اچھی ہے یا نظم۔ بعض لوگوں کے نزدیک اُس کی غزل اُس کی نظم سے بہتر ہے لیکن غزل اور نظم کی اس تفریق کو میں کوئی قدرتی مسئلہ بنانا پسند نہیں کرتا۔ یعنی میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اور اُس سے نظم نہیں سنبھلتی۔ ندا کے یہاں اچھی نظموں کے مساوی اچھی غزلوں کی تعداد بھی وافر پیمانہ پر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کی غزلوں میں وہ تمام احساسات اور خیالات ڈھل گئے ہیں جو نظموں میں اِظہار نہ پا سکے۔ اگر نظموں میں اِظہار پاتے تو اپنی اشاریت، معنوی تہہ داری، طنزیہ کنایوں اور بے تکلّف گفتگو کا وہ لطف کھودیتے جو غزل کے اشعار کا وصف رہا ہے۔

ندا جدید شاعر ہے۔ جدید غزل کی وہ شاہراہ جس پر ظفر اقبال، محمد علوی، بشیر بدر، عادل منصوری، بمل کرشن اشک اور دوسرے شعراء غزلخواں کم اور رپا بہ جولاں زیادہ چلے اس پر سب سے بڑا اشتہار ندا کے اُس مرغ کا ہے جو سورج کو چونچ میں لئے کھڑا ہے۔ لیکن یہ اِشتہار محض اِلتباس ثابت ہوا۔ ندا نے کمرے کے پردے کھینچ لئے اور رات ہوگئی۔ غزل پھر پردہ نشیں ہوگئی جس سے ندا باتیں اس شائستہ لہجے میں کرنے لگا' جس میں غزل کے شعراء عشق و محبت کی باتیں کرتے آئے تھے۔ البتہ ندا کی باتوں میں غمِ عشق سے زیادہ غمِ روزگار کا ذِکر تھا۔ ظفر اقبال اور محمد علوی پکارتے رہے کہ یہی باتیں کرنی ہیں تو ہمارے

ساتھ آ ؤ اور جدید رنگ میں کھیل کھیلو' لیکن ندا کھیل کھیلنے پر راضی نہ ہوا۔ اس سے ندا کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ کلاسیکی طرزِ بیان کے رکھ رکھاؤ کو قائم رکھ سکا۔ گو کھیل کھیلنے والے شاعروں کو بھی کوئی نقصان نہیں ہوا سوائے اِس کے کہ غزل کے روایتی اسلوب کے دلدادگان کو اُن کی دھمال چوکڑیاں کچھ زیادہ پسند نہ آئیں۔ وہ لوگ جو ظفر اقبال کے اوٹ پٹانگ تجربات سے جز بز ہیں' اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ اِک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔ شاید ظفر اقبال بھی اس طرح بچ جائیں گے جس طرح غالب اپنے منتخبہ کلام کے سبب بچ گئے۔ ابھی تو وہ نسخۂ بھوپال لکھ رہے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ جدید غزل وہ تخیلی کھلواڑ جو مضامین نو کی طوطا میناؤں کی اُڑانوں، بذلہ سنجی، معنی آفرینی، قولِ محال، طنز و مزاح بلکہ پھکڑ پن سے عبارت ہے یہ کھلواڑ' کم کم ہی سہی غزل کی شاعری کا شروع ہی سے ایک عنصر رہی ہے۔ اس جولا نگاہ میں جدید شاعروں نے اپنے عہد کے بدلے ہوئے مزاج کے مطابق چوکڑیاں بھری ہیں لیکن ندا نے چوکڑیاں نہیں بھریں کیونکہ مشاعروں کا مقبول شاعر ہونے کے سبب اُس نے سلامتی اسی میں دیکھی کہ اسٹیج کی لمبائی چوڑائی کا خیال رکھے۔ مشاعرے اس نے خوب پڑھے اور آج بھی پڑھتا ہے اور نظمیں بھی سناتا ہے اور غزلیں بھی' اور دونوں میں کامیاب رہتا ہے۔ لیکن مشاعرے کے تفریحی عنصر کو وہ اپنے کلام میں راہ نہیں دیتا۔ شاعری وہ اپنے مزاج کے مطابق ہی کرتا ہے۔ غزل میں نہ تو وہ جدید غزل کے میلانات کے دھاروں پر بہانہ مشاعروں کے تفریحی تقاضوں کا شکار ہوا۔ ندا کے طرزِ سخن میں زبان اور بیان کا رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ البتہ یہ رکھ رکھاؤ اُن شعراء کی غزل سے مختلف ہے۔ جو جدید غزل کی بے راہ روی کو ٹھکانے پر لگانے کے لئے شعوری طور پر کلاسیکی طرزِ سخن کی باز آفرینی کی طرف مائل ہوئے۔ اِس شعوری کاوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو اُن کی غزل میں خود آگاہ کلاسیکی صنعت گری کا بوجھل پن پیدا ہوا اور دوسری طرف ان کی غزل جدید حسیت کی ترجمانی کا حق نہ ادا کر سکی۔

ندا کی غزل زبان و بیان کی شکستگی اور شائستگی کے باوصف جدید غزل ہے کیوں کہ وہ اس احساس کی آئینہ دار ہے جو دورِ جدید میں بڑے شہروں کی تیز رفتار زندگی میں فرد کی تنہائی، اجنبیت اور جلاوطنی سے عبارت ہے۔ تنہائی، اجنبیت اور جلاوطنی کے یہ احساسات آج کی مابعد جدید تنقید میں مشکوک قرار پاتے ہیں۔ جدیدیت پر مابعد جدید تنقید کا سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ ان احساسات کے شب خون نے تخلیق کے سرچشموں کو خشک کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ ترقی پسندوں کی عوام سے دل بستگی اور اشتراکی اور انقلابی آئیڈیولوجی سے وابستگی اتنا ہی مثبت رویہ تھا جتنا کہ علامہ اقبال کی اِسلام سے دِل بستگی۔ تو کیا

شاعری کی شاخ اس وقت پھول لاتی ہے جب شاعر شجر سے پیوستہ رہتا ہے اور اُمیدِ بہار رکھتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو فیض کی نظم ''ہم لوگ'' اور ''تنہائی'' معرضِ وجود میں نہ آتیں۔ دراصل شاعر کو اپنے احساس کے ساتھ سچائی برتنی پڑتی ہے۔ یہ احساس چاہے پھر گھور نراشا کا ہو، زندگی کی بے معنویت کا ہو یا قنوطیت کا۔ یہ احساسات نئے نہیں ہیں۔ ہزاروں سال سے شاعری میں دُنیا جہان میں بکھرے پڑے ہیں۔ کیوں کہ زندگی ہمیشہ جنازہ بردوش اور جام بکف رہتی ہے۔ اُن احساسات سے گذرنا' اُن سے آنکھیں چار کرنا، اُن سے مغلوب ہو کر اُن سے بلند ہونے کی جدوجہد کرنا' شاعر ہی کا نہیں انسان کا بھی مقدر رہا ہے۔ مابعد جدید دور تو تمام انسانی' اخلاقی اور مذہبی آدرشوں کی مردہ کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ ہر مہابیانیہ' ہر روایت' ہر قدر دم توڑ چکی ہے۔ عقل بھی اور عقل عامہ بھی' اخلاق بھی اور انسانی روابط بھی' روشن خیالی بھی اور آدرشوں اور قدروں کی تعمیر کا جذبہ بھی' عوام بھی اور عام آدمی بھی' ازدواج بھی اور خاندان بھی' ہر چیز مر چکی ہے۔ خدا بھی مرا' مصنف بھی مرا' معنی بھی مرا اور ادب بھی مرا' مابعد جدیدیت اسی مرگِ انبوہ کا جشن ہے' جسے وہ تخلیق جاریہ کا نام دیتی ہے۔ وادیٔ خموشاں کے سناٹوں میں ابھی تک تو تخلیق کی لہر کی کوئی آواز سنائی نہیں دی' سوائے نقاد کے اس بانگ کے کہ جدیدیت نہ ماند' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے کم از کم اُردو کی حد تک کوئی پوسٹ ماڈرنسٹ بریک تھرو دِکھائی نہیں دیتا۔ تنقید میں شوروغوغا بہت ہے۔ لیکن یہ شور اس آپریشن تھیٹر کا ہے جس میں ڈاکٹر اور نرسیں چیختے چلاتے ہیں اور آلاتِ جرح ونقد کھنکتے' ٹوٹتے' پھوٹتے ہیں لیکن نومولود تولد نہیں ہو پاتا۔ وجہ یہ ہے کہ اسے اب مصنف کے بدن سے نہیں بلکہ لکھت کی کوکھ سے المعنویت کے ساتھ جنم لینا ہے۔ یہ جنم بڑا کٹھن ہے۔ جبریل بھی اپنی نوائے سروش کے ساتھ آپریشن تھیٹر کے باہر ہیں کہ اندر نقد و جرح کے اُستروں کی چکا فاق کے درمیان ان کا گذر بے معنی بن گیا ہے۔

یہ تو جملۂ معترضہ اور مضحکہ تھا۔ ندا مابعد جدید شاعر نہیں' وہ جدید شاعر ہیں جو اپنے منفی احساسات سے آنکھیں چار ہی نہیں کرتا بلکہ اُن احساسات کے ساتھ جینے اور ہم آہنگ ہونے کے آداب سیکھ رہا ہے مسائل کے آسان حل اُس کے پاس نہیں ہیں۔ وہ زمین سے اُکھڑ چکا ہے اور ایک نئی زمین میں اپنی جڑیں پیدا کرنے کے صبر آزما مراحل سے گزر رہا ہے۔ وہ ترقی پسندی سے بھی واقف ہے اور مارکسزم سے بھی۔ لیکن ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح ان کھیلے ہوئے پتوں پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ یہ کشمکش جدید آدمی' جدیدیت اور جدید شاعری کی پہچان ہے۔ ندا کی نسل کے بعد کی نسل کی شاعری کی بھی یہی پہچان ہے۔ کیوں کہ انہیں جن حالات کا سامنا ہے وہ ندا کی نسل کے شاعروں سے بھی زیادہ ابتر اور مایوس کن ہیں

۔یوں سمجھئے کہ رجائیت' انسان دوستی' مستقبل پر اعتماد اور حیات افروز آدرشوں کا وہ سرچشمہ جس سے اقبالؔ، جوشؔ، فراقؔ اور ترقی پسند شعراء کی تخیل شاداب تھا' جدید شعراء تک آتے آتے خشک ہو گیا۔ یہ سمجھنا کہ مابعد جدید نقادوں کے مغرب سے مستعار وہ نظریات جو مادہ پرستی' سرمایہ پرستی' جنگ پرستی' جنسی انارکی، صارفیت اور کمرشیل کلچر کی بنجر زمین سے خار دار ببولوں کی طرح پھوٹتے ہیں۔ وہ فرقہ پرستی' لسانی عصبیت اور گھورنراشا میں جینے والے اُردو زبان کی رجائیت' انسان دوستی اور تخلیق کی لگن کا جذبہ فراہم کریں گے' یہ ایک ایسا دامِ فریب ہے جس کا شکار کرگسوں میں پلا وہ شاہین ہو سکتا ہے جو حقائق کے سنگلاخ پربتوں پر نہیں بلکہ شہرت کی بلندیوں پر اپنا آشیانا بناتا ہے۔ جدید شاعروں کے یہاں الہام کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ الہام کے مسائل کے تمام مباحث میراجی اور راشد کے ساتھ آئے اور انھی پر ختم ہو گئے۔ جس طرح عریانی اور فحاشی کے تمام مسائل عصمت اور منٹو کے ساتھ پیدا ہوئے اور اُنھیں پر ختم ہوئے۔

جدید شاعر مسائل لے کر نہیں آئے۔ اس لئے تخلیق کی ناکامی کا المیہ جدیدیت کے حوالے سے ایک غیر ضروری بحث تھی۔ اس طرح تنہائی اور اجنبیت اور جلاوطنی ان تمام شعراء کا مشترکہ موضوع ہوتا تو اُن کی یک رنگی اور یک آہنگی اور موضوع کی محدودیت انہیں ترقی پسندوں ہی کی مانند گردن زدنی قرار دیتے۔ مابعد جدیدیت کا علمبردار شہریار' ساقی فاروقی' افتخار عارف' محمد علوی وغیرہ پر مضامین لکھ چکے ہیں اور انہیں جدیدیت کے نمائندہ شاعر تسلیم کر چکے ہیں۔

دراصل مابعد جدید نقاد مابعد شعر و ادب کے اس بنیادی نکتہ سے واقف نہیں کہ ہر اچھے اور بڑے شاعر میں جہاں اپنے زمانے کی بخشی ہوئی الجھنوں' تناؤ' مایوسیاں' محرومیاں' درد اور کرب ہوتا ہے وہیں ان احساسات کو شاعری میں سلیقہ مندی سے برتنے کا شعور بھی ہوتا ہے۔ یہ شعور مسائل کا حل پیش کرتا بھی ہے اور نہیں بھی کرتا۔ لیکن مسائل کے ساتھ جینے' انہیں برداشت کرنے اور ان کے زہر کا تریاق اسی زندگی' اس زمانے اور انہیں حالات میں تلاش کرنے کے آداب سکھاتا ہے۔ یعنی تنہائی اور اجنبیت کا احساس پوری شدت کے ساتھ نظم میں ڈھل کر' نظم میں تحلیل ہو کر اپنا مداوا آپ پیدا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاعری نا قابلِ برداشت ہو جاتی۔ مثلاً فیضؔ کی نظم ''تنہائی'' میں تنہائی کے زہر کا تریاق پوری نظم کی فضا ہے۔ جو راستوں اور رہگزاروں' ایوانوں اور خوابیدہ چراغوں' اجنبی خاک اور قدموں کے سراغ' شمعوں اور مے و مینا و ایاغ کے جگمگاتے پیکروں سے تعمیر ہوئی ہے۔ نظم میں احساس نراشا کا ہے لیکن اظہار جاگتے جگمگاتے پیکروں سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ کہنا کہ فیضؔ تنہائی اور مایوسی کے غیر صحت مند جذبات کے شکار ہوئے ہیں'

اتنی ہی احمقانہ بات ہے جتنی آج کل کے جدیدیت کے حوالے سے یہ کہنا کہ جدیدیت میں سوائے تنہائی اور جلاوطنی وغیرہ وغیرہ کے رکھا کیا ہے اور یہ منفی جذبات ہیں۔

ندا کی غزلوں کا وصف یہ ہے کہ ان میں پہلی بار ایک بڑے شہر میں غریب الوطن شاعر کا پورا کرب' حیرانی' پریشانی کا اظہار ہوا ہے۔میرا خیال ہے کہ جدید شاعروں میں کسی کے یہاں نگر کویتا کی اتنی اچھی اور رنگا رنگ کیفیات کی حامل شاعری کی مثال نہیں ملتی جتنی کے ندا کے یہاں۔لیکن نگر کویتا کے لئے غزل کا دامن چھوٹا ہے۔اس میں شہر کی وہ کیفیات، پھیلاؤ، ہڑبونگ، گہما گہمی، جھونپڑیاں اور گندگیاں، آسمان بوس عمارتیں، خوبصورت کشادہ راستے، اور رات کو جھلملاتے قمقموں کی وہ لکیر نہیں جھلکتی جو نظموں کو شہر کا عکس اور آئینہ بتاتی ہے۔ندا کے پاس ایک ایسی نظم ہے جس میں شہر اپنے تضادات سے چور ایک کیفیت میں ڈوبا ہوا ملتا ہے۔نظم کا عنوان ہے "میرا شہر"۔

یہی شہر ہے جو اب\
بنا چھاؤں کے ناریل کے سہارے\
جھکائے ہوئے سر کو بیٹھا ہوا ہے\
اکیلا سا، چپ سا، سہما سا\
کبھی یہ بھی\
چاروں طرف بھاگتا تھا\
بڑا زندہ دل تھا\
یہ راتوں میں دن کی طرح جاگتا تھا\
کبھی جین پہنے جوانوں کے جیسا\
کبھی چلتی لوکل میں گانوں کے جیسا\
کبھی آرتی اور اذانوں کے جیسا\
کبھی دور کے آسمانوں کے جیسا\
صدا اُس کی چاروں طرف گونجتی تھی\
کھنکتا ہوا ایسا کلدار تھا وہ\
خود اپنی ہی مستی میں سرشار تھا یہ

نظر لگ گئی اِس کو شاید کسی کی
کبھی اِس کی جیبوں میں ڈھیروں ہنسی تھی

یہ ہنستا بہت تھا

شہر کی بدلتی کیفیتوں کو ضبط قلم کرنے کی ہمارے یہاں بہت کم مثالیں ملتی ہیں ۔ یہ غزل غیر معمولی نہیں لیکن چونکہ اس میں ایک شہر کا موڈ جھلکتا ہے اس لئے دلچسپ ہے ۔ اردو شاعری میں شہر پر نظمیں کم ہیں' گو زبان کا مزاج دیہاتی نہیں شہری ہے ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے فیضؔ کی دو نظمیں ''شہر کو یہاں سے دیکھو'' اور ''روشنیوں کے شہر'' سردار جعفری کی ممبئی پر نظمیں جو سطحی مشاہدے اور سہل بیانیہ کے سبب اچھی بن نہیں پاتیں اور اختر الایمان اور محمد علوی کی چند دلچسپ نظموں کے علاوہ نگر کویتا کا وہ روپ ہمارے یہاں پیدا نہیں ہونے پایا جو مثلاً بادلیئر، ایلیٹ، ایلیا اہرن اور رالف گنز برگ کے یہاں نظر آتا ہے ۔ البتہ سلیم پیرا دانیہ کی ایک انگریزی نظم ''باندرہ'' کا جو خوبصورت ترجمہ باقر مہدی نے ''اظہار'' کے ایک شمارے میں کیا ہے' اُسے میں بلا تکلف نگر کویتا کا ایک بے مثل فن پارہ کہہ سکتا ہوں ۔ ندا کی غزلوں کا راوی غزل کا روایتی عاشق نہیں بلکہ خود ندا ہے ۔ اس آرکی ٹائپ کی صورت میں جو تلاش معاش کا مارا ہوا ایک بے سہارہ غریب شہر ہے ۔ جو اپنی جیب میں گاؤں کی یاد داشتوں کے چند سکے لئے پھرتا ہے اس کے مشاہدات اور تجربات میں نہ صرف ایک بڑے شہر کی چند دلچسپ تصویریں سما گئی ہیں بلکہ باہم برسرِ پیکار جذبات اور ان کش مکشوں کا اظہار بھی ہوا ہے جو تضادات سے بلند ہو کر ایک نیا توازن حاصل کرنے کی ان کوششوں کا عکس بھی ہے جو شہر کی پراگندہ زندگی کو چند مثبت بنیادوں پر استوار کرنے کا آرزو مند ہے ۔ غزل اب محبوب کی گلی سے نکل کر شہر کی سڑک پر آ گئی ہے ۔ شہر کے سڑکوں کی آوارگی اور آبلہ پائی اجنبی انجان چہروں کی دلبر بائی، بے جڑی، اجنبیت اور تنہائی، بے چہرہ بھیڑ اور چوہوں کی دوڑ ہم پیشہ و ہم مشربوں اور ہم زبانوں سے چشم کیس اور رقابتیں اور زندگی کے اُن قرینوں کی تڑپ اور تلاش' جو اِس بے ہنگم، حوصلہ شکن اور تھکا دینے والی تگ و دو میں اس آباد خرابے میں زندگی کو تھوڑا بہت نشاط انگیز اور منفی چیز بنا سکیں ۔ فکر و احساس کے یہ وہ مناظر ہیں جو ندا کی غزل کو اس کا انفرادی لب ولہجہ اور آب و رنگ عطا کرتے ہیں ۔

ندا کا پہلا مجموعۂ کلام ''لفظوں کا پل'' ۱۹۶۹ء میں رحیمی پریس ممبئی سے شائع ہوا تھا' جس کی قیمت ساڑھے تین روپے تھی ۔ اُس مجموعہ میں پانچ غزلیں ہیں جو گاؤں تک کھیت کھلیانوں میں گنگناتی پھرتی ہیں ۔ وہ گیتوں کے رسیلے آہنگ' برہن کی آگ اور پردیسی کی یاد کی مدھر تانوں سے گونجتی ہیں ۔ اُن میں سے

چند اشعار دیکھئے:

نیل گگن میں تیر رہا ہے اُجلا اُجلا چوڑا چاند
ماں کی لوری سا بچوں کے دودھ کٹورے جیسا چاند

پردیسی سونی آنکھوں میں شعلے سے لہراتے ہیں
بھائی کی چھیڑوں سا بادل' آپا کی چٹکی سا چاند

تم بھی لکھنا تم نے اُس شب کتنی بار پیا پانی
تم نے بھی تو چھجے اوپر دیکھا ہوگا پورا چاند

پیا نہیں جب گاؤں میں
آگ لگے سب گاؤں میں
لکھنے والو آگے لکھو
لوٹو گے کب گاؤں میں
کتنی لمبی لگتی ہے
پگڈنڈی اب گاؤں میں

سا جی جنگل پار کئے ہیں چپ چپ راہ تکوں
بچھیا بیٹھی تھان میں اونگھے کس سے بات کروں

درشن جل کے پیاسے نینا' ملن کی پیاسی دیہہ
پیاس بجھے نہ میری چاہے پورا تال پیوں

آڑھی ترچھی ریکھاؤں سے ساری پٹیا دلدل
کب تک بیٹھے بیٹھے پیسے پیسے اور گنوں

خط ہے کہ بدلتی رُت یا گیتوں بھرا ساون
اٹھلاتی ہوئی کلیاں ، شرماتے ہوئے آنگن

شیشے سا دھلا چوکا ، موتی سے چمکتے برتن

کھلتا ہوا ایک چہرہ' ہنستے ہوئے سو درپن

بچوں سی ہمکی شب' گیندوں سے اُچھلتے دن
چہروں سی دُھلی خوشیاں' زُلفوں سے کھلی اُلجھن

ہر پیڑ کوئی قصہ' ہر گھر کوئی افسانہ

ہر راستہ پہچانا' ہر چہرے پہ اپنا پن

لیکن یہ مدھرتا شہر میں داخل ہوتے ہی غائب ہوجاتی ہے۔ وہ سورج جو مرغے کی چونچ میں تھا اُس سے اب ندا کی انگلیاں جھلستی ہیں۔

پہچانتے تو ہوگے ندا فاضلی کو تم
سورج کو کھیل سمجھا تھا' چھوتے ہی جل گیا

اب ندا مانوس بستیوں سے نکل کر بے چہرہ بھیڑ میں کھو جاتا ہے۔ ممبئی پر یہ نظم دیکھئے:

یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا
فضا میں گونج رہی ہیں
ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں ہواؤں میں انگنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو
کھوئے کولہے' پنڈلیاں' ٹانگیں
مگر کہیں کوئی، چہرہ نظر نہیں آتا

کہاں تو گاؤں کا یہ شیتل جل جیسا سادہ سلونا منظر تھا۔

ہر پیڑ کوئی قصہ' ہر گھر کوئی افسانہ

ہر راستہ پہچانا' ہر چہرے پہ اپنا پن

اب اس کی جگہ شہر کا یہ کھٹی ڈکار جیسا شعر نظر آتا ہے۔

رستے میں کوئی کار، نہ عورت، نہ بلڈنگیں   دو گھونٹ تھی شراب مگر جی بہل گیا

اب ندا کی پوری شاعری کھویا ہوا سا کچھ کو پانے کی کشمکش کی شاعری ہے۔ یہ کھویا ہوا سا کچھ وہی

قرینۂ حیات ہے جو شورشِ گیتی میں کھو گیا ہے اس تلاش کی ابتدائی غزلیں تو وہی انسانی روابط ہیں جو بڑے شہروں کی چوکھٹ پر'' پہلی بلی'' کا کام کرتے ہیں۔

ندا فاضلی کا دوسرا مجموعۂ کلام'' مورناچ'' دسمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ قیمت چھ روپے یعنی پہلی کتاب سے ڈھائی روپے زیادہ۔ لیکن شہر میں اُن ڈھائی روپیوں کو کمانے میں ندا نے کبیر کے'' ڈھائی اکشر پریم کے'' ایسے کھوئے کہ نہ برہ کی اگن یاد رہی نہ ہی نیل گگن کا چاند۔ اب اُس کی پوری کوشش اِس اجنبی شہر میں' اِس بے چہرہ بھیڑ' اِس مکھوٹوں کی نمائش گاہ میں نئے انداز سے زندگی کرنے' نئے طور طریقے اپنانے میں صرف ہونے لگی۔ کتاب کے آغاز میں یہ شعر کتنا معنی خیز ہے۔

کوشش کرو یہ لمحہ جیسے بھی ہو' ٹل جائے
شاید کوئی جینے کا امکان نکل آئے

'' مورناچ'' کی غزل سے یہ اشعار دیکھئے۔ اِن میں وہ زہر ہے جو ایک بڑے اجنبی شہر کے ایک غریب الوطن آدمی کی رگوں میں بہتا ہے۔ اِن میں وہ مصلحتیں' عیاریاں' سمجھوتہ بازیاں' ہوشیاریاں اور چالاکیاں بھی ہیں جو ایک رقابتوں' حریفائیوں' گلا کاٹ سرمایادارانہ مقابلوں اور کامیابی کیلئے چوہوں کی دوڑ میں شامل ہونے کیلئے ضروری ہیں۔

شائستہ محفلوں کی فضاؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم!

اچھے بُرے کے فرق نے بستی اُجاڑ دی
مجبور ہوکے ملنے لگے ، ہر کسی سے ہم

دشمنی ہوگی کس سے کہ محبت ہوگی
زندگی ہے تو ہر سہارے کی ضرورت ہوگی

بات کم کیجئے ذہانت کو چھپاتے رہیئے
اجنبی شہر ہے یہ' دوست بناتے رہیئے
دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ

دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیئے

محبت میں وفاداری سے بچئے
جہاں تک ہو اداکاری سے بچئے

ہر اک صورت بھلی لگتی ہے کچھ دن
لہو کی شعبدہ کاری سے بچئے

شرافت ، آدمیت ، درد مندی
بڑے شہروں کی بیماری سے بچئے

ضروری کیا کہ ہر محفل میں بیٹھیں!
تکلف کی روا داری سے بچئے

نیا شہر ہے اور کچھ دن رہو
یہ سارا ملمع اُتر جائے گا

کسی سے خوش ہے کسی سے خفا خفا سا ہے
وہ شہر میں ابھی شاید نیا نیا سا ہے

وہ شخص جو کچھ دن سے بہت ہنسنے لگا تھا
سنتے ہیں وہ کل ریل کی پٹری پہ پڑا تھا

تصویروں کے اس شہر میں نفرت بھی بہت ہے
اپنا سا ملے کوئی تو دشمن ہی بنا لے

بیٹھے ہیں دوستوں میں ضروری ہیں قہقہے
سب کو ہنسا رہے ہیں مگر رو رہے ہیں ہم

چمکتے کپڑے، مہکتا خلوص ، پختہ مکان
ہر ایک بزم میں عزت حفاظتیں مانگے

اس کے دشمن ہیں بہت آدمی اچھا ہوگا
وہ بھی میری ہی طرح شہر میں تنہا ہوگا

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

اور کچھ دیر یونہی جنگ 'سیاست' مذہب
اور تھک جاؤ ابھی نیند کہاں آئے گی

میری غربت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی

ان اشعار میں اجنبی شہر کی جدوجہد کتنی منفی ہے۔ شائستہ محفلیں ہوں' ہر کسی سے ملنے کی مجبوری ہو' دشمن کے باوصف' زندہ رہنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہو' بات کم کرنا' ذہانت کو چھپانا' دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملانا' ہر کسی کو دوست بنانا' وفاداری کی اداکاری سے بچنا' شرافت' آدمیت' دردمندی کی بیماریوں سے محفوظ رہنا' کسی سے خوش کسی سے خفا' نفرت کو بھی غنیمت سمجھنا' اور اپنا سا کوئی ملے تو دوست نہ سہی دشمن ہی بنالینا' دل غم زدہ ہو لیکن دوستوں کی محفلوں میں زبردستی قہقہے لگاتے رہنا' عزت کے لئے چمکتے کپڑے' دکھاوے کا خلوص' پختہ مکان کی حفاظتیں تلاش کرنا' کسی کو گرا کر اپنا راستہ تلاش کرنا' جنگ' سیاست' مذہب پر اس وقت تک پٹی پٹائی باتیں کرتے رہنا، جب تک نیند نہ آجائے اور غربت کو شرافت کی نشانی سمجھنا' اور یہ اندیشہ کہ وقت بدلا تو کردار بھی بدل جائے گا جدید شہر کے کھوکھلے آدمی کی عبرتناک نشانیاں ہیں۔

خیر' اب تو ایسے گاؤں اور قصبے بھی نہیں رہے جن کے معاشرے میں ان منفی قدروں اور رویوں سے بچ کر آدمی (نیک اور شریفانہ کی بات نہیں) ایک بھری پری سالم زندگی کا تصور کر سکے۔ اگر ایسا معاشرہ میسر آتا تو اس میں برہن کی آگ' ہجر کی رات' اور پردیسی سے جدائی کی بپتا اس بڑے شہر کی چلچلاتی دھوپ سے زندگی اور شاعری کا زیادہ شفاف اور صالح سرچشمہ ثابت ہوئی کیونکہ وہاں کردار کی سالمیت برقرار رہتی ہے اور یہاں یعنی اجنبی بے چہرہ شہر میں کردار ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ کردار سالم ہو تو جام سفالی ہی سہی' مٹی کی صراحی ہی سہی' مسرت کے آبِ زلال کو محفوظ رکھتی ہے۔

کردار ٹوٹا پھوٹا ہو تو بلور کا جام سہی شہر تابناک کی مسرتِ دوآتشہ کو تھام نہیں سکتا۔ اس معنی میں ندا

فاضلی کے متذکرہ بالا اشعار میں دورِ جدید کا وہ کرب سما گیا ہے جو بڑے شہروں کے اس معاشرے کا زائدہ ہے جو آدمی کو سماجی میل جول کی زندگی سے محروم کر کے اس کے کردار کی سالمیت کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ ''لیکن'' اور یہ لیکن مضمون کے اس مرحلے میں بارہ من وزن کا ہے۔

ندا فاضلی بڑے شہر میں کردار کی پائمالی اور خستگی کو آستین کے نمائشی زخم نہیں بناتا۔ اس سے قبل کہ اُس کی منزل خود ترجمانہ جذباتیت کا شکار بنتی' وہ ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ یہ موڑ ہے بڑے شہروں میں شکایتوں سے پُر راگ سے جیسے باجہ کی مثال جینے کی بجائے' زندہ رہنے کا کچھ ایسا سلیقہ پیدا کرنا کہ نشاط و حسن کے کچھ امکانات نکل آئیں۔ زمانے کے ہاتھوں خود کو تباہ ہونے سے بچانے کیلئے فکر و احساس و عمل تینوں سطح پر آدمی کو اپنی قوتِ ارادی کے ذریعے چند فیصلے کرنے پڑتے ہیں' اور ندا یہ فیصلے کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں ندا حالات کو خود پر غالب ہونے نہیں دیتا۔

اپنا غم لے کے کہیں اور نہ جایا جائے
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سجایا جائے

اس شعر میں تو ڈاکٹر جانسن کا ناول ''رسالیاس'' اور والیئر کا ناول ''کینڈیڈا'' (candida) کی تفہیم سمٹ آتی ہے کہ دنیا جہاں میں مسرت کی تلاش کرنے کے بعد ناول کا ہیرو تھک ہار کر بالآخر اپنے پائیں باغ کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اس غزل کا یہ شعر تو اب جگ بیتی پر چڑھا ہوا ہے۔

گھر سے مسجد ہے بہت دُور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

بچوں پر ندا نے بہت اشعار کہے ہیں کیونکہ اب بچوں ہی میں وہی معصومیت دیکھنے ملتی ہے جو کسی زمانے میں سیدھے سادے لوگوں میں عام تھی۔ بہر حال زندگی کی بے معنویت سے بچنے کی ندا کی کوشش دیکھنے کے قابل ہے۔ بے معنویت کو غالب آنے دو تو وہ زندگی کو دیمک کی طرح کھا جاتی ہے۔ کیا خوبصورت شعر کہا ہے ندا نے

پہلے ہر چیز نظر آئے گی بے معنی سی
اور پھر اپنی ہی نظروں سے اُتر جاؤ گے

زندہ رہنے کیلئے جس دانش مندی کی ضرورت ہے' وہ ندا کے ذیل کے شعروں میں دیکھئے:

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

پہلے ہمیں بھی نیند نہ آتی تھی گھر سے دور
اب جس جگہ بھی رات پڑی تھک کے سو گئے

اپنا وجود ہی تھا پہاڑوں کا سلسلہ
ہر راستہ تھا صاف کہیں پیچ تھا نہ خم

ندؔا زمانہ کے نشیب و فراز سے واقف ہے۔ لیکن وہ اپنی ذات سے بھی اُلجھتا ہے جو اندرونی کشمکش کو بڑھاتی ہے اور یہ کشمکش جو شاعری کا سرچشمہ ہے۔ ایک شعر دیکھئے۔

دیکھا ہوا سا کچھ ہے تو سوچا ہوا سا کچھ
ہر وقت میرے ساتھ ہے اُلجھا ہوا سا کچھ

اس موضوع کے کچھ ہیر پھیر دیکھئے۔

کہیں چھت تھی دیوار و در تھے کہیں
ملا مجھ کو گھر کا پتہ دیر سے

دیا تو بہت زندگی نے مجھے
مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

کہیں رک گئے راہ میں بے سبب
کہیں وقت سے پہلے گھر آئی شب

ہوئے بند دروازے کھل کھل کے سب
جہاں بھی گیا میں گیا دیر سے

ندؔا کے یہاں اب نہ شخصی اَنا پر اصرار ہے نہ حالات کے جبر کا شکوہ۔ زندگی کا ایک بہاؤ ہے جس پر اَنا کی کشتی کو چھوڑ دینے ہی میں عافیت نظر آتی ہے۔

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رُخ ہواؤں کا جدھر کا ہے اُدھر کے ہم ہیں

چلتے رہتے ہیں کہ چلنا ہے مسافر کا نصیب
سوچتے رہتے ہیں کس راہ گزر کے ہم ہیں

ساحل کی گیلی ریت پہ بچوں کے کھیل سا
ہر لمحہ مجھ میں بنتا بکھرتا ہوا سا کچھ

اب دوسروں پر دارومدار کرنے کی بجائے اس میں خود اعتمادی بھی آ گئی ہے۔

کچھ لوگ یونہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

آشوب دل کو لئے گھر میں بیٹھے رہنا' یا روتی صورت لئے شہر میں گھومنا' دونوں کا علاج نہیں ہے۔ بہرصورت شہر کے ساتھ سمجھوتہ کیا بھی تو شہر کا کردار فوراً نہیں بدلتا۔

ہنستے ہوئے شہروں سے ہے بازار کی رونق
رونے کی یہاں ویسے بھی فرصت نہیں ملتی

نکلا کرو یہ شمع لئے بھی گھر سے باہر
کمرے میں سجانے کو مصیبت نہیں ملتی

ان طور طریقوں سے کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ شہر کا کردار بدل جاتا ہے۔

اور تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن کبھی کبھی یوں ہی
چلتا پھرتا شہر اچانک تنہا لگتا ہے

شہر کی طرف یہ کچھ اُلجھا سلجھا سا رویہ اُنھیں اپنے بہت سے ہم عصر شاعروں سے علیحدہ شناخت بخشتا ہے۔ اُن شعراء کے یہاں شہر آشوب' اور آشوبِ آگہی ویرانیٔ حیات اور خرابہ کی تلخی نشاطِ فن کو اپنے رنگ بکھیرنے نہیں دیتی۔ ندا حالات سے' اپنی ذات سے' اپنی شاعری سے کچھ ایسا دانشمندانہ سمجھوتہ کرتا ہے کہ احساس اور فکر کی سطح پر جینے کا ایک نیا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ندا کی ایک بے حد مقبول اور خوبصورت غزل ہے۔ جس پر یہ طویل مضمون ختم کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

اٹھ کے کپڑے بدل گھر سے باہر نکل جو ہوا سو ہوا
رات کے بعد دن، آج کے بعد کل، جو ہوا سو ہوا

جب تلک سانس ہے، بھوک ہے، پیاس ہے، یہ ہی اِتہاس ہے
رکھ کے کاندھے پہ ہل کھیت کی اور چل' جو ہوا سو ہوا

خون سے تر بتر کر کے ہر رہگذر تھک چلے جانور
لکڑیوں کی طرح پھر سے چولہے میں جل' جو ہوا سو ہوا

جو مرا کیوں مرا' جو کٹا کیوں کٹا' جو جلا کیوں جلا
مدتوں سے گم ان سوالوں کے حل، جو ہوا سو ہوا

مندروں میں بھجن، مسجدوں میں اذان، آدمی ہے کہاں؟
آدمی کے لئے ایک تازہ غزل جو ہوا سو ہوا

●●

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر

● شمیم حنفی

ندؔا کی شاعری میں اور نثر میں آنکھ ادراک کے بنیادی وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات ندؔا کے بیشتر معاصرین کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ اِس عام معذوری نے ہمارے زمانے کے ادب اور حسیّت کو خاصہ نقصان پہنچایا ہے۔ زیادہ تر لکھنے والوں کی جھولی تجربے کے تنوع اور احساسات کی رنگا رنگی سے محروم جو دِکھائی دیتی ہے تو اِس لئے کہ وہ دیکھنے اور سوچنے کے عمل میں اشتراک کے عنصر کو دریافت نہیں کر پاتے۔ خیال کی یکسانیت نے ایک بہت بڑی خرابی اس عہد کے ادب میں یہ پیدا کی ہے کہ اکثر لکھنے والے اپنی پہچان کھو بیٹھے ہیں۔ ایک کا شعر یا کہانی دُوسرے کے نام سے پڑھ دی جائے تو فرق نہیں پڑتا' سب کے سب ایک ہی رستے پر گامزن ہیں اور ایک ہی منزل کے مسافر دکھائی دیتے ہیں۔

بیرونی احکامات کے پابند یا Regimented ادب میں ایسی صورت حال کا پیدا ہو جانا فطری ہے۔ لیکن تخلیقی سرگرمی کا کوئی بھی اک سلسلہ جو اپنی انفرادیت پر اصرار کرتا ہو اور اس عہد کا تخلیقی مزاج جو ہر طرح کے بیرونی دباؤ کا منکر ہے' اُس کے واسطے سے یک رنگی اور یکسانیت کی یہ ہولناک تصویر جو ہمارے سامنے ہے' خاصی پریشان کن ہے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی صلاحیت اور رویّوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ ندؔا کی نثر و نظم کا سب سے نمایاں پہلو تجریدی فکر سے اس کی عدم مطابقت اور نئے لکھنے والوں کی بے چہرہ بھیڑ سے اس کی دوری ہے۔ بے شک سب کے سب اِس عہد کے تجربوں میں شریک ہیں، ایک جیسے مسئلوں سے دو چار ہیں' لیکن ندؔا نے اس دُنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی ایک الگ دُنیا بنا رکھی ہے جہاں کسی اور کا حکم نہیں چلتا۔ ندؔا کے احساسات اور انفرادی رویّے اُن کی نثر و نظم کے مزاج کا تعیّن کرتے ہیں۔ اِس خود مختاری کے دعوے دار تو بہت ہوں گے، لیکن ندؔا نے جس خوبی اور کامیابی کے ساتھ اقتدار سے کام لیا ہے' اُس سے اُن کے معاصرین عام طور پر محروم ہیں۔

سب سے بڑا اور آسانی سے نظر آنے والا فرق تو یہی ہے کہ ندؔا کے یہاں شعری اظہار اور نثری اظہار کی صلاحیت تقریباً ایک جیسی ہے۔ اُن کی نثر و نظم کے ترکیبی اجزاء ایک سے ہیں۔ دونوں کے رنگ

اور موسم اور مزہ ایک سا ہے۔ شعر تو خیر سبھی کہتے ہیں لیکن نئے شاعروں میں ندا کی جیسی شفاف، حساس اور بے ساختہ نثر لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ ندا کی شاعری میں تو کبھی کبھی آواز کچھ بلند اور لہجہ کچھ تیز ہو جاتا ہے' لیکن اُن کی نثر ہمیشہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہے' ایک خوش خرام جوئے آب کی طرح۔ اُن کی نثر جھالر یا سجاوٹ کے سامان سے حیرت انگیز حد تک خالی ہے۔ ندا اپنی بات متبسم لہجہ میں نہیں کہتے' مگر اپنے آپ کو ذرا بھی بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ "دیواروں کے بیچ" اور "دیواروں کے باہر" سے پہلے' میں نے رسائل میں اُن کے کچھ مضامین اور اُن کی انٹرویوز کی کتاب "ملاقاتیں" دیکھی تھی' اُن سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ندا فکری یا جذباتی مبالغے سے عاری' بہت گتھی ہوئی' رواں دواں نثر میں اظہارِ مطالب کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ تخلیقی ضبط اور احساسِ تناسب کے بغیر ایسی نثر نہیں لکھی جا سکتی۔ چنانچہ ان دونوں کتابوں میں بھی ندا نے بیان کا جو پیرایہ اور زبان کا جو طور اختیار کیا ہے' اُس میں لفظوں کے ساتھ ساتھ اپنے احساسات پر بھی مضبوط گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"صبح کے دُھندلکوں سے گوالیار کا ایک محلہ دھیمے دھیمے اُبھر رہا ہے۔ نئی سڑک، بڑے دالان اور آنگن اور کئی کشادہ کمروں کا ایک اونچی دیواروں کا پرانا گھر، اِس گھر میں دائیں بائیں کئی دروازے ہیں۔ سامنے املی کا گھنا درخت ہے جس میں بارہ مہینے کھٹے کتارے جھولتے ہیں۔ ان کو پوری دوپہر محلے بھر کے بچے پتھر مار مار کر گراتے ہیں' ان کتاروں کی چھینا جھپٹی میں ہر روز کئی چھوٹی بڑی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ ان لڑائیوں میں کبھی بڑی عورتیں بھی شریک ہو جاتی ہیں..............

اس املی کے پیڑ کا ایک بڑا بھائی بھی ہے۔ گھر کے دروازے کے سامنے لمبے چوڑے پیٹ اور کئی موٹے بھاری ہاتھوں والا نیم کا درخت.......... یہ دونوں عمر کے لحاظ سے بزرگ ہیں............ مکان کے پیچھے ایک تنگ سی گلی ہے۔ اس گلی کے کونے پر ایک پرانا کنواں ہے جس پر ہمیشہ پانی بھرنے والی لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا ہے........ آس پاس کئی کچے پکے چھپر کے گھر ہیں۔ ان میں کولی ذات کے لوگ رہتے ہیں۔ سویرا ہوتے ہی یہ گروہ بنا کر تیگرا ندی کے کنارے نکل جاتے ہیں اور شام کو وہاں سے ریت بھر کر لاتے ہیں جسے بھٹی میں تپا کر دن بھر سونا چاندی نکالتے ہیں.........."

("دیواروں کے بیچ" ص ۱۰/۹)

جمیل فاطمہ اور مرتضٰی حسن کے تذکرے سے شروع ہونے والی اِس کہانی کے کرداروں میں املی اور نیم کے یہ پیڑ، محلہ، بستی، کنواں، لڑکیاں، بچے اور پڑوس میں آباد کولیوں کے چھپر والے گھر بھی شامل

ہیں۔تقریباً چار سو صفحوں پر پھیلی ہوئی اِس آپ بیتی میں ایک جانی بوجھی اور برتی ہوئی دُنیا آباد ہے۔کوئی کردار کسی دوسرے کردار پر حاوی نہیں ہونے پاتا اور سب کے سب کہانی کو آگے بڑھانے میں ایک خاموش اور خود کار رول ادا کرتے جاتے ہیں۔کہانی کے بیان میں کئی شہر آتے ہیں۔گوالیار، بمبئی، دلّی، کراچی، شکاگو اور سکھ دُکھ کے تمام دیکھے بھالے موسم آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔اِس بہ ظاہر سیدھے سادے اور معمولی بیانیے کی تعمیر کرنے والوں میں ہر سطح، ہر طبقے، مسلک اور مزاج کے لوگ شامل ہیں۔ شریف زادیاں، طوائفیں، ہیجڑے، پہلوان، شاعر، ادیب، لفنگے اور بھکاری، مولوی اور پنڈت۔غرض کہ خاصی رنگارنگی اور چہل قدمی ہے۔سوئی سوئی سی پُرامن بستیوں کے بیان سے لے کر فساد زدہ ماحول کی سنسنی، دہشت اور درشتی تک، ندؔا انسانی جذبوں، خوابوں، امنگوں اور احساسات تک ہر طرح کے تجربوں سے گذرے ہیں۔کہیں اپنے شعور کی ستائش اور اپنی ہستی کا نشہ نہیں، عبارت آرائی اور فلسفہ طرازی نہیں، کسی پر طنز، تمسخر، تحقیر اور ملامت کا اظہار نہیں۔یہاں تک کہ اپنی طباعی اور بصیرت کے بیان سے پڑھنے والوں کو متاثر کرنے کی طلب بھی نہیں۔تجربوں کے کھرے پن اور متعلقہ تفصیلات سے جھلکتی ہوئی دردمندی اور سوز کی ایک دائم و قائم کیفیت نے اِس کتاب کو انسانی سوچ، رویّے اور طرزِ ادا کی ایک موہنی شکل دے دی ہے۔آپ بیتیاں مصیبت بن جاتی ہیں جب بیان کرنے والا آپ اپنے وجود کی سطح سے اوپر اُٹھنے اور اپنے بندھے ٹکے شعور کے دائرے سے پل بھر کے لئے بھی باہر آنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

اکثر شاعروں، ادیبوں، سماجی مصلحوں اور دانشوروں کی سرگذشت ٹھیٹ انسانی سطح پر اُن کی نارسائیوں، معذوریوں اور ہزیمتوں پر پردہ ڈالنے کی بالواسطہ اور متواتر جستجو کے باعث غیر دلچسپ، حتیٰ کہ مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔یہ تو ہر شئے اور شخص کی نقل اُس کی اصل کے مطابق سامنے لانے کا بے لوث اور جرائتمندانہ رویّہ ہے' مثال کے طور پر غالبؔ کے خطوں میں' جو اپنے اور دُنیا کے فرق کو بڑے فطری انداز میں مٹا کر رکھ دیتا ہے۔بدقسمتی سے یہ اندازِ نظر عام نہیں ہے اور منٹو کے سوا اُردو کا کوئی دوسرا نثر نگار اِس معاملے میں غالبؔ کے ساتھ نہیں ٹھہرتا۔غالبؔ کے خطوں اور منٹو کی کہانیوں سے لکھنے والے کی جو شبیہیں اُبھرتی ہیں اُن کا سب سے نمایاں شناختی نشان اُن کی دیانت داری اور سچائی ہے۔اِسی کے ساتھ ساتھ اُن کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان میں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے مظہر اور اچھے بُرے ہر سطح کے انسانوں کو ایک سی کشادہ نظری اور طبیعت کے کھلے پن کے ساتھ قبول کیا گیا ہے۔

ندؔا کی ان کتابوں میں رنگوں، صورتوں اور چیزوں کی بھیڑ دِکھائی دیتی ہے اور ہر رنگ، صورت

اور شئے اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے۔ اپنے والدین سے لے کر دوستوں، عزیزوں، پڑوسیوں، شناساؤں اور اجنبیوں تک ندا نے سب کے بیان میں ایک سی قبولیت کا رویہ قائم رکھا ہے۔ کسی کو نہ تو اس کے وجود کی حقیقی سطح سے خواہ مخواہ اوپر اُٹھانے کی کوشش کی ہے نہ اُسے گرانے کی۔ اِسی لئے رواداری میں اور یونہی راہ چلتے نگاہ میں ٹھٹھک جانے والے منظر بھی ان کتابوں میں اپنے بیان کرنے والے کی طرح اپنی ایک خاص جگہ رکھتے ہیں۔ نہ تو اپنی قامت سے بڑے نظر آتے ہیں نہ چھوٹے اور ایک خوبی تو اِن کتابوں میں ایسی ہے جس کی توقع کم سے کم تخلیقی سرگرمی یا دانشوری کا سہ رنگ اپنانے والوں سے نہیں کی جاسکتی۔ اِس قبیل کا ہر کردار بالعموم ایک خاص قسم کا پوز اختیار کرنے کا عادی ہو جاتا ہے' غیر معمولی نہیں تو مختلف دِکھائی دینے کی طلب اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اِس کی صورت یا تو مسخ ہو جاتی ہے یا مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔

ندا کی کہانی میں جادوئی اور عبقری شکلیں رکھنے والوں کا گذر نہیں۔ چونکہ اُس سے ہماری شناسائی کا وسیلہ خود ندا کی ذات ہوتی ہے۔ اِس لئے ندا اپنی ہی طرح اُن پر بھی کسی طرح کا ملمع نہیں چڑھاتے۔ مشاہیر شاعروں، ادیبوں اور نچلے متوسط طبقے سے لے کر بہ ظاہر گرے پڑے لوگوں تک' اُن میں سے ہر ایک کی حرمت محفوظ اور حیثیت برقرار رہتی ہے کوئی کسی سے ہٹا نہیں دکھائی دیتا۔

کمال امروہی، بیدی، عصمت، اختر الایمان، کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، نیاز حیدر، راہی معصوم رضا، باقر مہدی اور ظ۔ انصاری سے لے کر عزیز جاوید، رحمت علی بھائی، پپو قصائی اور نورا تک کسی کی عزت پر آنچ نہیں آتی۔ حاجی مستان، ٹھاکر موہن سنگھ کادیہ، جون ایلیا، افتخار نسیم سب اپنی اپنی دُنیا میں رہتے ہیں' ایک محض ندا کے تجربے میں آجانے سے اُن کی شبیہیں بگڑنے نہیں پاتیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ندا کو خیالوں اور انسانوں سے یکساں ربط اور دلچسپی ہے' دوسرے یہ کہ ندا کو ان لوگوں کے ساتھ ساتھ اپنی حد کا احساس بھی رہتا ہے اور کسی بھی دوسرے کردار کی کمزوری سے وہ فائدہ اُٹھانے' ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہونے' اُسے رسوا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تقریباً چار سو صفحوں پر پھیلی ہوئی اس آپ بیتی کی دونوں جلدوں میں سب سے نمایاں پہلو انسانی عنصر کا ہے اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ندا نے واقعات اور افراد کے تذکرے میں کہیں بھی اس عنصر پر کسی قسم کے تعصب یا ترجیح کو غالب نہیں آنے دیا۔ ہر سطح کے لوگوں کا، ہر فرقے اور طبقے کے ماحول یا Ethos کا احاطہ اُنھوں نے ایک سی توجہ اور سادگی کے ساتھ کیا ہے۔

ایک دھیمی حزنیہ کیفیت قصے کے بیان میں شروع سے اخیر تک اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ اِس کیفیت کے باعث بہ ظاہر غیر جذباتی واردات کی عکاسی میں بھی حقیقت پسندی کے باوجود ایک شعریت سی در آئی ہے۔ اِسی وجہ سے ندا نے کہیں کہیں جو اشعار یا نظموں کے ٹکڑے استعمال کئے ہیں اُن پر پیوند کاری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ نظم ہو یا نثر، خیال کی ایک سی رَو پوری کہانی میں مستور دکھائی دیتی ہے۔ کچھ افراد جن کی شخصیتیں قدرے پراسرار نظر آتی ہیں۔ مثلاً: عشرت یا عزیز جاوید یا ان سب سے زیادہ جمیل فاطمہ کی شخصیت تو ان کے بیان میں ندا نے اپنی لسانی کفایت اور اپنے احساسات کی تنظیم اور توازن کی وجہ سے غیر معمولی کشش پیدا کردی ہے۔ حقیقی زندگی سے زیادہ یہ افسانوی کردار محسوس ہوتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ٹھاکر موہن سنگھ کا و یہ جیسا کردار بھی جو سرسری نظر سے دیکھا جائے تو ایک طرح کا Comic Relief مہیا کرنے والا شخص دکھائی دیتا ہے' اُس کی کہانی بھی ندا نے اس طرح سنائی ہے کہ اُداسی کی ایک باریک پرت اس کی تصویر پر جم سی گئی ہے۔ اس غم آلود انسانی تماشے کے بیان میں پچھلے پچاس پچپن برس کی احتجاجی زندگی اور سیاسی ہنگاموں کا شور شرابہ بھی شامل ہے۔ تقسیم، فسادات، بابری مسجد کی شہادت کا بیان اس طرح کرنا گویا کہ بیان کرنے والا گزراں وقت کی دہلیز سے ایک لحہ بہ لحہ دھندلی ہوتی ہوئی انسانی واردات کو دیکھتا ہے اور خاموشی سے آگے بڑھ جاتا ہے' ایک خاص قسم کے اخلاقی موقف کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ زندگی کو اس کے تمام تر تضادات اور بدہیئتوں کے ساتھ قبول کرنا اور اپنے آپ کو کلبیت یا برہمی کے احساس سے بچائے رکھنا آسان بات نہیں ہے۔ ندا نے یہ کام بہت سلیقے کے ساتھ انجام دیا ہے' بصری، جذباتی اور ذہنی مساوات کے ایک تہہ نشیں رویّے کے ساتھ۔ انسان حیوان بن جائے جب بھی آخری تجزیے میں آدمی ہی کہا جائے گا۔ بہ قول نظیر

یاں آدمی ہی نور ہے اور آدمی ہی نار

اُردو میں ''کارِ جہاں دراز ہے'' کی اشاعت کے بعد سے سوانحی ناولوں کا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے۔ گرچہ ادب کے بعض جید علماء بھی شروع شروع میں Non-Fiction ناول کو ناول ماننے کے روادار نہیں تھے۔ ویسے سچ بات تو یہ ہے کہ ایک براہ راست یا بالواسطہ سوانحی عنصر کے بغیر ناول لکھنا شاید ممکن ہی نہیں ہے۔

ندا نے بھی اِس آپ بیتی کو سوانحی ناول کا نام دیا ہے۔ اِس طرح اُنھوں نے ہمیں یہ بتانا چاہا ہے کہ اُنھوں نے یہ سارا تماشا' تماشے سے باہر کھڑے ہوئے ایک شخص کے طور پر دُور سے دیکھنے اور

دکھانے کی کوشش کی ہے۔ بے شک یہ ایک غیر معمولی اور کامیاب کوشش ہے۔اس پورے منظر نامے کے مرکز میں رہتے ہوئے بھی ندا نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا ہے، ہر کردار کو پوری آزادی دی ہے اور اسے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا ہے۔ اسی لئے ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' ہر جگہ پڑھنے والے کو ایک کھلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ نہ کردار گھٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں نہ پڑھنے والے کا دم گھٹتا ہے۔ اظہار ذات کا یہ اسلوب بہت کم لکھنے والوں کے حصے میں آتا ہے۔

●●

چپ چپ نہ بیٹھ رُوٹھ کے ایسا نہ ہو کہیں
ہر آدمی کے ہاتھ میں پتھر دِکھائی دے

ندا فاضلی ــــــ اپنے لہجے کی دریافت

● بشر نواز

سُسرو سے نوجوان مقرّر نے کہا" میں ہُو بہُو آپ کے لہجے میں تقریر کر سکتا ہوں۔"

" بہتر ہوتا تم اپنے لہجے میں بات کر سکتے۔' سُسرو کا جواب تھا۔

اپنے لہجے کی دریافت دراصل اپنی شخصیت کی دریافت ہے۔ اور سُسرو یہی نکتہ اپنے نوجوان شاگرد کو سمجھانا چاہتا تھا۔ تخلیقی عمل اپنی تلاش وجستجو کا فنی اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر تخلیق کار کو اپنا اندازِ اظہار خود دریافت کرنا پڑتا ہے۔ دریافت کا یہ عمل پیچیدہ بھی ہوتا ہے اور بھٹکانے والا بھی۔ پیچیدہ یوں کہ اس میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عوامل ماضی و حال کے نئے رشتے کی تعمیر اور اس رشتے کے جمالیاتی توازن کے مراحل ہیں اور بھٹکانے والا یوں' کہ اکثر تخلیق کار اجتہاد کے شوق میں ہیئت پرستی اور لفظی کرتب بازی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہوتا یوں ہے کہ اپنے لب و لہجہ کی تلاش کا عمل شخصیت کے شعور کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ جہاں یہ شعور اس تلاش میں شامل نہیں ہوتا' وہاں زبان فیشن زدہ چمک دمک سے ضرور آراستہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں زندگی کی حرارت نہیں پیدا ہوتی۔ ندا فاضلی کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ اُنھوں نے کرتب بازیوں اور لفظی کلیشیز میں (جنھیں جدید شاعری کے ابتدائی دور میں' مکتبی قسم کے نقادوں کا اعتبار حاصل تھا) اُلجھے بغیر اپنا لہجہ پالیا ہے۔ وہ اپنے موضوع اور لہجے کو ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور اپنے انداز و اسلوب سے جدید شاعروں کی بھیڑ میں الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہر لہجے اور اسٹائل کی کچھ تحدیدات ہوتی ہیں۔ یعنی ہر موضوع، ہر لہجہ میں پوری طرح اپنا اظہار نہیں پا سکتا۔ مثلاً کسی پیچیدہ فلسفیانہ موضوع کے لئے سیدھا سادہ انداز ناکافی ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی ہلکے پھلکے جذبے کے بیان کے لئے بھاری بھرکم الفاظ مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ اندازِ فکر کسی حد تک صحیح ہوتے ہوئے بھی مکمل صداقت نہیں ہے موضوع اور لہجہ کا یہ تفاوت فنکارانہ بصیرت کی کمی کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور صرف اِنھی لوگوں کے لئے مسئلہ بنتا ہے جو اپنا اسٹائل، اپنی شخصیت

کے شعور سے اخذ کرنے کے بجائے کتابوں اور پیش رو فنکاروں کے فنی نمونوں سے حاصل کرتے ہیں۔ ترقی پسند شاعروں میں سردار جعفری کے یہاں اب جو فیض کے اندازِ اظہار کی تقلید نمایاں ہے۔ وہ شخصیت کے اسی شعور کی ناپختگی کی غماز ہے۔ کسی شاعر کے الفاظ یا تراکیب کی نقل تو ممکن ہے لیکن الفاظ کے پیچھے جو رُوح کارفرما ہوتی 'وہ بنا شخصیت کے رچاؤ کے آسانی سے گرفت میں نہیں آتی۔

شخصیت ہی اسلوب ہے موضوع کا انتخاب شخصیت ہی کے تابع ہوتا ہے۔ اس لئے موضوع اور اسلوب میں دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر فنی نقطۂ نظر سے یہ نظریہ بھی سطحی معلوم ہوتا ہے کہ پیچیدہ موضوع صرف پیچیدہ ہیئت اور نامانوس زبان ہی میں اِظہار پا سکتا ہے۔ دراصل ہیئت و زبان کا پیدا کردہ اُلجھاؤ موضوع کی تہہ داری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ بلکہ اکثر اوقات تہہ داری کا واہمہ پیدا کر کے گمراہ کر دیتا ہے۔ کئی جدید شاعر اس گمرہی کے اب تک شکار ہیں۔ وہ لفظوں کے لغوی اُلجھاؤ کو تہہ داری سمجھنے کی بھول کرتے ہیں۔ ندا فاضلی کے ہاں الفاظ کے غیر ضروری ہیر پھیر کے بجائے جذبہ و احساس کی تہہ داری ملتی ہے۔ ان کے سیدھے سادے الفاظ کے پیچھے سوچتے ہوئے ذہن کی تہہ اور تہہ در تہہ احساسات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے اشعار معنوی اعتبار سے وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں لفظ ختم ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ندا کے ہاں الفاظ مکمل معنی دینے کے بجائے احساساتی امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں اور احساس کی شدت معنوی تہہ داری بن جاتی ہے۔

زندگی انتظار جیسی ہے   دُور تک رہ گذار جیسی ہے

یا

پہلے بھی جیتے تھے مگر جب سے ملی ہے زندگی
سیدھی نہیں ہے دُور تک اُلجھی ہوئی ہے زندگی

یہاں انتظار اور رہ گذار کا تلازمہ ایک نئی معنوی جہت کو جنم دیتا ہے اور جب زندگی انتظار بن جاتی ہے تو رہ گذار عام راستہ نہیں رہ جاتا بلکہ کسی غیر مرئی کیفیت کا احساس دِلاتی ہے۔ اِسی طرح دوسرے شعر میں '' پہلے بھی جیتے تھے'' اور '' جب سے ملی ہے زندگی'' کو شخصی معنی دیے گئے ہیں۔ '' جیتے تھے'' اور '' زندگی'' کے معنوی تضاد سے جو وسعت اور...... اُبھرے ہیں وہ بھی شدتِ احساس کا ہی جادو ہے۔ ندا فاضلی کے پاس احساسات کی تجسیم اور اشیاء کو غیر مرئی یا غیر مرئی جذبوں کو اشیاء کا روپ دینے کا رویہ عام ہے۔ چنانچہ کبھی زندگی ایک آنکھ سے ہنستی ہے اور ایک آنکھ سے روتی نظر آتی ہے۔

یہاں اُنھوں نے گریک دیوتا جینوس کو زندگی کی علامت بنایا ہے۔

کہیں موسم چہرے بن جاتے ہیں، کبھی خواب ستاروں کا رُوپ لے لیتے ہیں اور کبھی خدا کسی پھول، کسی پنچھی، کسی بچے کے تبسم میں مجسّم ہو جاتا ہے۔ ندؔا کی زبان تصویری ہے۔ یہ لوک بھاشا کا وہ ارتقائی رُوپ ہے جس کے ابتدائی نقوش برج، اَودھی اور کھڑی بولی کی بھگتی شاعری میں ملتے ہیں۔

ایک سے ہوگئے چہرے یوں کہ موسم کے سہارے
مری آنکھوں سے کہیں کھو گیا منظر میرا

کس سے پوچھوں کہ کہاں گم ہوں کئی برسوں سے
ہر جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے مجھے گھر میرا

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

جس طرح بجلی کے مثبت اور منفی کرنٹ کو ایک تار کے ذریعہ ملانے سے روشنی پیدا ہوتی ہے، اسی طرح ندؔا کے ہاں دو متخالف احساسات، جذبات فن کاری کے اَن دیکھے رشتے سے جڑ کر معنوی چکا چوند پیدا کرتے ہیں۔ یہ کیفیت قدیم شعری صفت اجتماعِ ضدین سے یوں مختلف ہے کہ اِن میں اشیاء یا احساسات کو اُن کے ظاہری رُوپ میں نہیں بلکہ باطنی کیفیات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے۔ یہاں محض تضاد سے معنی جنم نہیں لیتے بلکہ بہ یک وقت پیدا ہونے والی نفسیاتی شعریت شعر کی بنیاد بنتی ہے۔

اِس اندھیرے میں تو ٹھوکر ہی اُجالا دے گی
ہر چمکتی قربت میں کوئی فاصلہ دیکھوں

کوئی بادل چھپا تھا تشنگی میں
نیند میں بھی وہ جاگتا ہی ملا

جیون شور بھرا سناٹا

اب کے جو گھٹائیں چھائیں برسات میں جل کر دیکھیں

موضوعاتی اعتبار سے یہی رویّہ زندگی کے تضادات کی طرف ندؔا کو متوجہ کرتا ہے۔ چنانچہ اُن کی نظم ''جنگ'' جہاں ختم ہوتی ہے، وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اور جنگ کے بعد کے سکون میں جنگ کی ہولنا کی

اپنا احساس دِلاتی ہے۔

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد
جنگ
بے گھر
بے سہارا
سرد خاموشی کی آندھی میں بکھر کے
ذرّہ ذرّہ
پھیلتی ہے
تیل
گھی
آٹا، کھنکتی چوڑیوں کا رُوپ لے کر
بستی بستی ڈولتی ہے
ہر گلی کوچے میں گھس کر
بند دروازوں کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک جنگ گھر، گھر بولتی ہے

زندگی اور موت کا بظاہر یہ تضاد ''والد کی موت پر ایک نظم'' میں ایک نئی اور غیر متوقع جہت اِختیار کرتا ہے اور زندگی کے تسلسل کا احساس دِلاتا ہے۔ یہاں موت ہر چیز کا اختتام نہیں بنتی بلکہ ایک سلسلہ دَر سلسلہ سفر بن جاتی ہے۔ شکلیں اور چہرے بدلتے ہیں لیکن زندگی چلتی رہتی ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع کے برتاؤ اور جذباتی نظم و ضبط کے لحاظ سے اُردو کی اہم نظموں میں سے ایک ہے۔

تمہاری قبر پر میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچّی خبر جس نے اُڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
مری آنکھیں تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک

میں جو بھی دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں

وہ وہی ہے

جو ہماری نیک نامی اور بدنامی کی دُنیا تھی

کہیں کچھ بھی نہیں بدلا

تمہارے ہاتھ میری اُنگلیوں میں سانس لیتے ہیں

میں لکھنے کے لئے جب بھی قلم کاغذ اُٹھاتا ہوں

تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کُرسی میں پاتا ہوں

یہاں زندگی کی شکل اور جسم کے حدُود توڑ کر وسیع تر تناظر میں نظر آتی ہے۔ بظاہر سیدھے سادے الفاظ کی ایک خاص ترتیب پا کر نظم کا تانا بانا بنتے ہیں اور نظم مصرعوں میں نہیں بلکہ پوری اکائی کی صورت میں اپنی معنوی تہیں کھولتی چلی جاتی ہے۔ زندگی اور موت کے فلسفہ پر عام طور پر بھاری بھر کم ڈکشن استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے ندا فاضلی کے ہاں ڈکشن مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اِس میں حرارت اور جان کتابی صداقتوں کی بجائے نجی تجربے یا کبیر داس کے لفظوں میں ''انو بھو گاوے سوراگی ہے'' سے آتی ہے۔ اِس لئے اِس میں لفظ کہیں بھی احساس یا خیال پر حاوی نہیں ہونے پاتا۔ دراصل ندا کا اسلوب بڑا دھوکہ دینے والا ہے، اُنھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے۔

''لائبریریوں میں محفوظ زبان نئے عہد کی غیر محفوظیت کے لئے ناکافی ہے، اس زبان کو تخلیقی سطح پر فعال بنانے کے لئے، اِسے کُتب خانوں سے باہر نکال کر دوبارہ گلی کوچوں، کوٹھوں، چائے خانوں اور بھیڑ بھاڑ سے متعارف کرانا چاہیئے۔'' ندا اپنی زبان وہاں سے اُٹھاتے ہیں جہاں سے شائستہ ادیبوں کا گذر ہمیشہ ممنوع رہا ہے۔ کبیر داس اور نظیر کو اِس جُرم کی سزا برسوں بھگتنی پڑی۔ ندا فاضلی بھی انہی ادبی.... کے گروہ سے جڑے ہوئے ہیں۔ زبان کے تعلق سے یہ رویہ ندا کی طاقت بھی ہے، کمزوری بھی۔ طاقت یوں کہ عام بول چال کے الفاظ قاری کو فوری متوجہ کر لیتے ہیں اور کمزوری یوں کہ انہی الفاظ اور اندازِ اظہار کی وجہ سے اونچے آسن پر بیٹھنے والے شاعر کی تہہ در تہہ احساسات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ یہ مصنوعی تزئین اور موروثی آرائش کو ہی شعری زبان سمجھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ندا کے ہاں ایک لفظ ''گھر'' بار بار استعمال ہوا ہے۔

چار دیواروں پہ گھر باندھ کے جب وہ اُترا
جسم تھا اُس کا پسینے سے شرابور مگر
اُس کو آرام کی مہلت نہ ملی

(نئے گھر کی پہلی نظم)

شہر تو بعد میں ویران ہوا
مرا گھر خاک ہوا تھا پہلے

یہاں گھر صرف چار دیواری اور چھت کا ہی نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ جس میں سکون، تحفظ کا احساس اور تنظیم ہے۔ ندا فاضلی کے ہاں "گھر" کی نوعیت دیگر شاعروں سے مختلف ہے۔ ندا نے اپنے گھر کو دو بار کھویا ہے۔ پہلی بار اس سے یہ گھر سیاست کی چیرہ دستیوں نے چھینا تھا۔ جس کا ذکر ندا نے اپنے پہلے مجموعہ "لفظوں کا پُل" کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اور دوسری بار بہت دِنوں کے بعد جب وہ کراچی گیا تو اُسے اپنے ہی گھر میں اپنا گھر نہیں ملا۔

میں برسوں بعد
اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا اپنے گھر پہونچا
لیکن اب میرے گھر میں
میرا گھر نہیں تھا (گھر ستارہ)

یہ بے گھری ایک فرد کی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی ہے۔ بے گھری کے اِس احساس کو جب ہم خدا کے تصور سے ملا کر دیکھتے ہیں تو بات زیادہ واضح اور واشگاف انداز میں سامنے آتی ہے۔

گھر سے مسجد ہے بہت دُور چلو یوں کرلیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

روز میں چاند بن کے آتا ہوں
دِن میں سورج سا جگمگاتا ہوں

کھنکھناتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں

(انتقام)

مسجدوں میں سجدوں کی مشعلیں ہوئیں روشن
بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں

یہ خدا ہے جو ایک جیسے جمائے معلوم سے معاشرے کی ہر چیز میں جلوہ نمائی کرتا رہا ہے۔ اس خدا کو آسمانی دھندلکوں میں ڈھونڈنے کے بجائے ندا نے زمین پر سانس لیتے رشتوں میں تلاش کیا ہے جو وحدانیت کے تصورِ خدا سے زیادہ قریب ہے۔ رشتوں کی اس تنظیم کے ٹوٹ جانے اور اس کے ساتھ انسانی فطری معصومیت کی دردناک موت کے بعد انسانی ضرورت سے زیادہ تنہا اور غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔

یہیں تھا وہ
یہیں بچوں کی آنکھوں میں
لہکتے سبز پیڑوں میں
وہ رہتا تھا
ہواؤں میں مہکتا تھا
ندی کے ساتھ بہتا تھا

(خدا کا گھر نہیں کوئی)

تو کیا اب خدا قصۂ پارینہ بن چکا ہے؟ نہیں...! آج کا انسان ہی اپنی بصیرت کھو چکا ہے۔ اس کی نگاہیں اب روشن نہیں رہیں۔ اس تیز رفتار اور تجارتی معاشرے نے اس سے کائنات کے اندرونی روابط اور رشتوں کو دیکھ سکنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔

ہمارے پاس وہ آنکھیں کہاں ہیں
جو پہاڑی پر چمکتی بولتی آواز کو دیکھیں

ہمارے واسطے اب پھول ہنستے ہیں، نہ کونپل گنگناتی ہے
نہ خاموشی اندھیروں میں سنہرے گیت گاتی ہے

ہمارا عہد ماں کے پیٹ سے اندھا ہے، بہرا ہے
ہمارے آگے پیچھے موت کا تاریک پہرا ہے
(خدا کا گھر نہیں کوئی)

گھر، خدا اور شہر، ندا فاضلی کی شعری رامائن کے تین کردار ہیں۔ اس تکون کا ڈرامائی منظر نامہ ہی

اس کی شاعری ہے۔ایک طرف اپنے دَور کی کوتاہیوں، محرومیوں کا احساس اور دوسری طرف اپنے خوابوں کی جمی جمائی دُنیا کی آرزو ندا پر نہ صرف خواب اور حقیقت کے درمیان فاصلوں کو واضح کرتی ہے بلکہ اسے موجودہ زندگی کے اندرونی تضادات کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے۔ یہ تضاد صرف ایک فنکار کی خیالی اور حقیقی دُنیاؤں ہی میں نہیں بلکہ عام زندگی میں بھی قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ بھرے پُرے شہروں میں تنہائی کے احساس، دوستوں اور محبتوں کے کھوکھلے پن، روحانی اقدار کے زوال اور تہذیبی استحصال کے ماحول میں زندگی کرنا آج کے شعور کا مقدر ہے۔

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ   دِل ملے نہ ملے ہاتھ ملاتے رہئے
تیرا سچ ہے ترے عذابوں میں   جھوٹ لکھا ہے سب کتابوں میں

لیکن ندا کی شاعری جدید شاعری کے عام چہرہ کی طرح ہر دم رونے بسورنے کی قائل نہیں ہے۔ وہ زندگی کے درد و کرب کو زندگی کا مقدر نہیں سمجھتا ہے۔ اس کے لہجے کا نکیلا پن اور طنزیائی جھلاہٹ زندگی سے ریاکارانہ سمجھوتہ نہیں بلکہ اسے اپنے طور پر نہ بدل پانے کا غم بن کر اُبھرتی ہے۔ اِس غم میں خودفریبی کی جگہ خود آگہی کی چمک ہے۔ اِس غم کا رشتہ ذات کے حدُود سے باہر آ کر دوسروں کے غموں سے جڑ جاتا ہے۔

دُنیا نہ جیت پاؤ تو ہارو نہ خود کو تم   تھوڑی بہت تو ذہن میں ناراضگی رہے

تمہاری شکایت بجا ہے
مگر تم سے پہلے بھی دُنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے
یہی کل بھی ہوگی
تمہیں بھی اِس اینٹ پتھر کی دُنیا میں
پل پل بکھرنا ہے
جینا ہے، مرنا ہے
مگر جب تلک یہ شکایت ہے زندہ
یہ سمجھو زمیں پر محبت ہے زندہ

(شکایت)

ہمیں بھی شوق ہے اپنی طرح سے جینے کا

ہمارا نام بھی کیجئے عتاب میں شامل

دُنیا کو اپنے طور سے جینے کی یہ کوشش مزید زخموں اور تلخیوں کے سوا کچھ نہیں دے پاتی۔ زمانے سے کچھ دِن کی دوستی تو ممکن ہے لیکن شعوری بلوغت کے ساتھ یہ زیادہ دُور تک ساتھ نہیں دے پاتی۔

ہم ہیں کچھ اپنے لئے، کچھ ہیں زمانے کے لئے
گھر سے باہر کی فضا ہنسنے ہنسانے کے لئے

یہ جھوٹی اور دِکھاوے کی ہنسی خود فریبی کی ایک اور کوشش ہے جس کا مقدر ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں۔ چنانچہ ندا کے ہاں پھر ایک بار زندگی کو از سرِ نو سمجھنے کی کوشش ملتی ہے۔

اِس اندھیرے میں تو ٹھوکر ہی اُجالا دے گی
رات جنگل میں کوئی شمع جلانے سے رہی

گذرو جو باغ سے تو دُعا مانگتے چلو
جس پہ کھلے ہیں پھول وہ ڈالی ہری رہے

شاعری جب اظہار کا وسیلہ بنتی ہے تو ہیئت، لفظیات اور فارمولوں کے حصار سے باہر نکل آتی ہے۔ اسی لئے ہم کسی شاعر کے کلام کو محض ٹکڑوں میں دیکھنے کے بجائے اس کے تخلیقی عمل اور تخلیقات کو کل کی شکل میں دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہر سچے اظہار کے پیچھے ایک شخصیت کارفرما ہوتی ہے جو مسلسل تغیر و تخریب کے ردّ و بدل سے گذرتی رہتی ہے۔ اس تبدیلی کا اظہار فن میں ہوتا رہتا ہے۔ ندا کے ہاں اس کا احساس ''لفظوں کا پُل'' کی زمینی قربتوں ''مور ناچ'' کے فرد اور سماج کے ٹکراؤ اور نئی نظموں اور غزلوں میں زندگی کو اپنے طور سے سمجھنے اور سمجھانے کے عمل میں ملتا ہے۔ اکثر صورتوں میں معنوی تبدیلیاں شاعر کی پسندیدہ ہستیوں اور ڈکشن میں اندر ہی اندر سرایت کرتی رہتی ہیں۔ شاعر کا اسٹائل اور انداز تو کم و بیش وہی رہتا ہے لیکن اس میں ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ نئی نئی تہوں اور جہتوں کا اضافہ ہو جاتا ہے جسے عام زبان میں تہہ داری کہتے ہیں۔

ندا کی ابتدائی شاعری میں قصباتی معصومیت اور سادگی ملتی ہے۔ بڑے شہر میں آنے کے بعد اس سادگی کا تصادم یہاں کے تجارتی تعلقات اور اس سے پیدا ہونے والی ریاکاری سے ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ندا کے ہاں جھنجھلاہٹ اور ہر چیز سے لڑ جانے کا انداز جنم لیتا ہے۔ لیکن ''ٹھوکر'' سے اُجالا کشید کرنے کے شعور میں پھر ایک نئی دُنیا کی جھلک دِکھائی دیتی ہے۔ جس میں سبھی ایک درد کے مارے ہیں۔

تضادات، دُکھ، درد یہاں بھی ہیں لیکن یہ کسی ایک فرد کا المیہ نہیں ہے۔ اِسے ندا نے اپنی فنی سوجھ بوجھ سے اپنے المیہ کو پورے معاشرے کا المیہ بنا دیا ہے۔

جو ملا خود کو ڈھونڈتا ہی ملا   ہر جگہ کوئی دوسرا ہی ملا

رشتوں کے ریگزار میں ہر سر پہ دُھوپ ہے
ہر پاؤں میں سفر ہے مگر راستہ بھی ہو

کیا ضروری ہے کہ ہر پردہ اُٹھایا جائے
میرے حالات بھی اپنے ہی مکاں سے سنئے

غم نہیں سوتا آدمی کی طرح   نیند میں بھی یہ جاگتا ہی ملا

ندؔا کی نئی نظموں، غزلوں اور گیتوں میں فکری کینوس بہت پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں اطراف کے نقوش زیادہ واضح اور روشن نظر آتے ہیں اور اس کے اشعار شخصی ہوتے ہوئے بھی غیر شخصی انداز لئے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ندؔا کی شاعری میں اب تیسرے ابعاد کا ایک خوش گوار اضافہ ہو رہا ہے۔

جو پائے وہ کھوئے اسے، جو کھوئے وہ روئے اسے
یوں تو سبھی کے ساتھ ہے' کس کی ہوئی ہے زندگی

ہر راستہ انجان سا، ہر فلسفہ نادان سا
صدیوں پرانی ہے مگر ہر پل نئی ہے زندگی

ہر اِک تلاش یہاں فاصلوں سے روشن ہے
حقیقتیں کہاں ہوتی ہیں خواب میں شامل

ممکن ہے سفر ہو آساں' اب ساتھ بھی چل کر دیکھیں
کچھ تم بھی بدل کر دیکھو، کچھ ہم بھی بدل کر دیکھیں

نظر کی یہ وسعت اسے زندگی اور زندگی کرنے کے ایک نئے انداز سے آشنا کرتی ہے اور دُنیا اسے قابلِ نفرت نہیں بلکہ ہمدردی کی مستحق نظر آتی ہے۔

یہ ہی زمین سفر ہے
یہ ہی زمیں منزل

نہ تم تلاش کرو مجھ میں جو نہیں ہوں میں
نہ میں تلاش کروں تم میں
جو نہیں ہو تم

(جو نہیں ہو تم)

اِس انداز میں ہاتھ ملاتے رہنے والی ریاکاری کی جگہ شعوری ہوش مندی محسوس ہوتی ہے۔ ندا کا شعری سفر ایک وسیع تر شاہراہ پر جاری ہے۔ ابتدائی شاعری کی جھلاہٹیں جیسے ۔

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

اوروں جیسے ہو کر بھی ہم باعزت ہیں بستی میں
کچھ لوگوں کا سیدھا پن ہے، کچھ اپنی عیاری ہے

اس قسم کے اشعار میں ممکن ہے فوری اپیل ہو ممکن ہے یہ کسی واقعے کے فوری ردعمل کے طور پر بھلے لگیں لیکن رُک کر اور واقعات کو زیادہ گہرائی سے دیکھنے والوں کے لئے ان میں ایک معصوم سی ناراضگی کے علاوہ کچھ نہیں ۔ اگر ندا کا ذہنی سفر یہیں رُک جاتا تو یہ بڑی ٹریجڈی ہوتی لیکن وہ اس موڑ سے صحیح سلامت گذر گیا۔ اب بھی قدم قدم پر حادثوں کا سامنا تو ہے لیکن اُن کے تعلق سے شاعر کا ردعمل فوری نہیں بلکہ سوچا سمجھا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی شعری نظر ظاہر موجودات کے پیچھے کارفرما تو اتر تک اُترتی نظر آتی ہے۔ اب زندگی اسے صرف سیاہ اور سفید کے خانوں میں تقسیم نظر نہیں آتی بلکہ وہ اس کے ہر دم بدلتے رنگوں کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کے لہجے میں ایک مخصوص ٹھہراؤ اور گمبھیرتا ملتی ہے اس کے موضوعات آٹا گوندھتی یا کچن میں پیالی توڑتی لڑکی تک محدود نہیں رہے۔

ندا انسانی تعلقات کی پیچ در پیچ نوعیتوں اور اپنے ساتھ دوسروں کی اُلجھنوں اور مجبوریوں کے شعور کے ساتھ مختلف اصناف میں ایک ساتھ طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اب انھیں زندگی ایک آنکھ سے ہنستی اور ایک آنکھ سے روتی نظر آنے لگی ہے۔ یہ آنسو اور مسکراہٹ کا سنگم ہی ان کی شاعری کی پہچان ہے جس میں چاند پھول، شاعر سب ایک ہی زندگی کے مظہر بن جاتے ہیں۔

چاند سے، پھول سے یا میری زباں سے سنئے
ہر جگہ ایک ہی قصہ ہے جہاں سے سنئے

کیا ضروری ہے کہ ہر پردہ اُٹھایا جائے
مرے حالات بھی اپنے ہی مکاں سے سنئے

نکلے تھے جب سفر پہ تو محدود تھا جہاں
تیری تلاش نے کئی عالم دِکھائے ہیں

زندگی کی معنویت کی یہی تلاش ندا کی شاعری کے سفر کی داستان ہے اور یہ سفر اب ایک نئی سمت اختیار کر رہا ہے اور یہ سمت وہ ہے جو بڑی شاعری کی بشارت ہے۔

●●

نیا شہر ہے اور کچھ دِن رہو
یہ سارا ملمع اُتر جائے گا

ندا کی شاعری میں شہر

(اچھی نہیں ہے شہر کے رستوں کی دوستی)

● انور خان

انتظار حسین نے اپنے "روزانہ" کالم میں ایک بار لکھا تھا۔

"اس شہر کا شاعر وداع ہوتے درختوں کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔"

پچھلے برس اُسی مال پر انارکلی جانے والی سڑک کے موڑ پر کھڑا بزرگ درخت کارپوریشن کی زد میں آیا تھا تو میں نے اس کا ذکر بیرسٹر افسانہ نگار سے کیا۔ بیرسٹر موصوف نے کہا "تم Nostalgia میں مبتلا ہو۔ اپنی بستی کے املی کے پیڑوں کا نوحہ کرتے کرتے لاہور کے درختوں کے بارے میں جذباتی ہونے لگے مگر یہ کوئی قصبہ نہیں ہے۔ یہ نیا شہر ہے اور ہم بیسویں صدی میں رہتے ہیں۔"

املی کا پیڑ مجھے ندا فاضلی کی یاد دلاتا ہے۔ ندا خودنوشت "دیواروں کے بیچ" میں اپنے گھر کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

"صبح کے دھندلکوں سے گوالیار کا ایک محلہ دھیمے دھیمے ابھر رہا ہے 'نئی سڑک'، بڑے دالان اور آنگن، کئی کشادہ کمروں کا ایک اونچی دیواروں کا پرانا گھر۔ اس گھر میں دائیں بائیں کئی دروازے ہیں' سامنے املی کا درخت ہے جس میں بارہ مہینے کھٹے کتارے جھولتے ہیں۔ ان کو پوری دوپہر محلے کے بچے مل کر مار مار کر گراتے ہیں۔ ان کتاروں کی چھینا جھپٹی میں ہر روز کئی چھوٹی بڑی لڑائیاں ہوتیں۔ ان لڑائیوں میں کبھی کبھی عورتیں بھی شامل ہو جاتیں۔ اسی املی کے پیڑ کا ایک بڑا بھائی اور بھی ہے۔ گھر کے بائیں دروازے کے سامنے لمبے، چوڑے پیٹ اور کئی موٹے بھاری ہاتھوں والا نیم کا درخت...... یہ دونوں عمر کے لحاظ سے بزرگ ہیں۔ ان کی عمروں کا اب کوئی اس محلے میں نہیں ہے۔"

درخت ہماری تہذیب کا یا تیسری دنیا کی تہذیبوں کا مرکزی علامیہ ہیں۔ کوفی اونور کی نظم کیتھیڈرل ملاحظہ ہو۔

On this dirty patch
a tree once stood
shedding incense on the infant corn

its boughs streched across heaven
brightened by the last fires of a tribe
They sent surveyors and builders
who cut that tree
—planting in its place
A huge senseless cathedral of doom

(Kofi Awoonnor)

بہر حال خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں ۔ دنیا پہلی ہو' دوسری ہو یا تیسری' سارے ہی ممالک موڈرنائزیشن کے زیراثر ہیں کہ معاشیات' جدید ٹکنالوجی کے تقاضوں سے بچنا اب ناممکن ہو چکا ہے۔ بڑے شہرئی ٹیکنو پولیٹن ثقافت کے مظہر ہیں اور کسی دیوزاد مقناطیس کی طرح انسانوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔شہر جہاں انسان اپنی پہچان اپنا حسب ونسب،نام و پتہ حتیٰ کہ کبھی کبھی اپنی انسانیت تک کھو بیٹھتے ہیں ۔بس ایک نمبر، مشین کا ایک پُرزہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ بقول' ہاردے کاکس':

''کالج کا ایک لڑکا بھی جانتا ہے کہ آج کا جدید انسان محض ایک بے چہرہ صفر ہے۔''

ایک عدد یا آئی۔بی۔ایم کارڈ میں چھوٹے چھوٹے سوراخوں کا ایک سلسلہ جوئی۔ایس۔ایلیٹ کے بنجر ویرانے' ویسٹ لینڈ' میں اپنی شناخت تلاش کر رہا ہے۔کافکا، کیرکے گار، آلکے بھی نے شہروں کی بے شخصیت زندگی سے پیدا ہونے والے روحانی Metaphysical خوف کا ذکر کیا ہے۔اب تیسری دنیا بھی اس عذاب کا شکار ہو چلی ہے۔بمبئی، کلکتہ، کراچی، ڈھاکہ، سنگاپور، کولمبو، ہانگ کانگ سب اس جدید کاری کا شکار ہیں جو ایک ناگریز ضرورت بن چکی ہے۔

اکثر جدید مہانگروں میں گاؤں اور بیسویں صدی کے انتہائی ترقی یافتہ صنعتی معاشرے کے لوگ پہلو بہ پہلو سانس لیتے نظر آتے ہیں ۔ بھابھا ایٹمک انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے والے سائنس دانوں کی کالونی کے پیچھے ممکن ہے دربھنگہ سے آئے لوگوں کی جھونپڑیاں ہوں ۔ کام، بہتر حالات، آسائشوں، سہولتوں اور سنہری زندگی کا سحر انسانوں کو شہروں کی طرف کھینچ لاتا ہے۔امیدیں پوری نہیں ہوتیں' لیکن جادو باقی رہتا ہے۔بقول:'پیٹر برجز' ''ایک چھوٹے سے گاؤں میں کوکا کولا کا اشتہار بھی گاؤں کی صدیوں کی روایتی شناخت اور قدروں میں دراڑ ڈال سکتا ہے۔لاشعور پر میڈیا اور اشتہاروں کے زیراثر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ بہتر زندگی تو بس شہروں میں ہے۔معمولی سا بال پوائنٹ پین یا کلائی پر بندھی گھڑی بھی اس نئی ثقافت کے پیغامبر ہو سکتے ہیں۔اب گاؤں کے بچے بھی ماؤں سے میگی نوڈلس (فوری غذا) کی ضد

کرتے ہیں۔

ایک حساس، ذہین انسان جب چھوٹے سے قصبے سے بمبئی یا کلکتہ جیسے شہر میں پہونچتا ہے تو ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ اردو شاعری میں شہر کی ہیبت ناکی اور غیر انسانی رویے کا ذکر کوئی نیا نہیں۔ اختر الایمان، سردار جعفری، جاں نثار اختر، باقر مہدی، عزیز قیسی، عمیق حنفی، شہاب جعفری اور دوسرے کئی شعراء کے یہاں اس کا ذکر مل جائے گا۔ شہری مزاج، مجلسی اخلاق اور شہری قدروں اور رویوں پر البتہ بہت کم نظمیں، غزلیں ملیں گی۔ شاید چند مثالیں اختر الایمان، باقر مہدی یا بلراج کومل کے یہاں مل جائیں گی۔ ندا فاضلی کا یہ خاص موضوع ہے۔

ندا فاضلی ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرتضیٰ حسین (دعا ڈبائیوی) علی گڑھ کے پاس ایک چھوٹے سے قصبے ڈبائی کے رہنے والے تھے۔ والدہ جمیل فاطمہ دلی کی تھیں۔ ماہنامہ 'عصمت' اور 'رہنمائے تعلیم' میں ان کی غزلیں مخفی تخلص کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ ندا کا بچپن گوالیار میں گذرا جہاں ان کے والد ملازم تھے۔ شاعری کا چسکا لڑکپن میں پڑ گیا۔ لکھتے ہیں:

''گھر کا ماحول اور والد کے ساتھ شعری نشستوں میں شرکت نے ندا فاضلی میں بھی ادبی ذوق پیدا کر دیا ہے۔ سمجھ بوجھ کیا خاک ہے ہاں چھوٹی سی عمر میں وزن میں مصرعہ جوڑنے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔ نصاب کی کتابوں سے زیادہ قافیوں کی تلاش میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ یادداشت اچھی ہے۔ داغ، نوح اور اپنے والد کے بہت سے شعر یاد ہو گئے ہیں۔ انھی کو اُلٹ پھیر کر شعر بنا لیتے ہیں۔

گوالیار میں آئے دن نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ اچھا خاصہ ادبی ماحول ہے۔ اساتذہ میں ضیا۔ عباس، حکیم احمد، کپتان تاباں نارائن پرشاد مہر، غنی گوالیاری، ریاض جیوری، دعا ڈبائیوی ہیں۔ جاں نثار اختر حال ہی میں تعلیم مکمل کر کے آئے ہیں اور وکٹوریہ کالج میں لکچرار منتخب ہو گئے ہیں۔ ان کی شراب نوشی کی طرح ان کا عشق بھی مشہور ہے۔ یہ عشق بھی غیر روایتی ہے۔ ایک شادی شدہ خاتون کو موضوع سخن بنائے ہوئے ہیں۔ جاں نثار کی نئی شاعری اور شاعرانہ زندگی نے ان کے ارد گرد نوجوان شاعروں کا حلقہ پیدا کر دیا ہے۔'' داغ، نوح ناروی، دعا ڈبائیوی اور جاں نثار اختر کی رومانی شاعری نے ندا کو شعر کہنا تو سکھا دیا، لیکن خود اپنا لہجہ انھوں نے پایا کبیر، سورداس، میرا اور ہندی کے نئے شعراء سے اس کی وجہ خود انھوں نے اس طرح بیان کی ہے:

''بی۔ اے کے پہلے سال میں ندا کو مجبوراً اُردو کے بدلے ہندی لینی پڑتی ہے۔ اس کا خالی وقت

لائبریری میں گذرتا ہے۔لائبریری میں بھی ان کتابوں کے ساتھ جن کا تعلق شاعری سے ہے، یہ شاعری کی کتابیں داغ، ان کے معاصرین اوران کے شاگردوں تک محدود ہیں۔ زبان کے چٹخارے کے ساتھ سیدھی شوخ باتیں اچھی لگتی ہیں۔ یہ شعر سننے سنانے میں بہت لطف دیتے ہیں مگر ان کی اجتماعی نے انفرادی جذبوں کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ اس کا احساس ندا کو کالج کی ایک لڑکی مس ٹنڈن کو دیکھ کر ہوتا ہے۔"

اُردو غزل میں محبوب سے گفتگو کا ایک شائستہ، مہذب اور تربیت یافتہ لہجہ ہے، گفتگو چاہے عورت سے ہو یا خدا سے عشقیہ جذبات، عشقیہ مراحل، رویئے اپنی تمام تر نزاکتوں کے ساتھ، باریکیوں کے ساتھ شاعر صدیوں سے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتے رہے ہیں۔لیکن اب عوام ان جذبوں، رویوں اور بیان کرنے کے انداز اور لب ولہجہ سے اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ ان میں نیا پن محسوس نہیں ہوتا۔ ہمارے نوجوان اور بزرگ شاعر البتہ مسلسل کوشش کرتے رہے ہیں کہ غمِ محبوب اور غمِ روزگار اپنی تمامتر بدلی ہوئی کیفیت کے ساتھ شاعری میں آسکیں۔اس کے لیے انھوں نے غزل کی زبان، اس کے لب ولہجہ کو بھی بدلنے کی کوشش کی ہے۔مگر یہ کام روز بروز مسلسل مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔

ندا فاضلی نے غزل کی لفظیات جو روایت کا حصہ بن چکی ہیں، لی ہی نہیں۔ اس لیے وہ اس منزل سے آسانی کے ساتھ گزرے۔نوجوانی کی ترنگیں، آوارہ مزاجی، بدلتے موڈ اور بےفکری کے ساتھ خالص ہندستانی امیجری، فارسی تراکیب سے گریز، قصبات کی فضا اور گھریلو نیم روحانی موضوعات نے زبان و موضوع دونوں سطح پر ندا کو دوسرے اُردو شاعروں سے بالکل مختلف کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ بقول فضیل جعفری اپنے پہلے مجموعے کی اشاعت سے قبل ہی انھیں ایک اہم شاعر تسلیم کر لیا گیا۔ندا کی شاعری میں گلی کوچوں، قصبوں یا صبح وشام کے بیان سے ذہن میں تصویر بنتی ہے وہ واضح طور پر یہ احساس دلاتی ہے کہ یہ کسی ہندوستانی گاؤں، شہر یا قصبے کی ہی ہو سکتی ہے۔

شور کرتا ہوا
چھت پر گراما نجھے کا سرا
ننھے پیروں سے
لپٹنے لگی خاموش گلی

شام ہونے کو ہے
پیلی دھوپ

چھجے سے اُتر کر
اون کے گولے سی بستر پر پڑی ہے

رنگ میں ڈوبی دشائیں
پتیوں میں سرسراتی اپسرائیں
تم نہیں ہو

صبح کی دُھوپ
ڈھلی شام کا روپ
فاختاؤں کی طرح سوچ میں ڈوبے تالاب

میر انیسؔ پر اپنے ایک مضمون میں سلیم احمد نے لکھا ہے کہ:

"میر انیس کے انسان کو ہم اُردو شاعری میں پہلی بار اس کے خاندانی رشتوں میں دیکھتے ہیں۔ یہ رشتے عملی زندگی میں جو کچھ بھی ہوں لیکن میر انیسؔ کے سوا کسی اور شاعر نے انہیں اتنے احترام، اتنی محبت، اتنے دُکھ کے ساتھ نہیں دیکھا کہ وہ تخلیق کا موضوع بنتے جدید تنقید میں سماجی انسان کا بہت شور مچا ہوا ہے مگر اُردو میں کسی شاعر نے سماجی انسان پیش کیا ہو تو میر انیسؔ نے یہاں انسان اپنے بنیادی ماحول میں ہے باپ، بیٹا، بھائی، چچا، بھتیجا، ماموں، بھانجے، ماں، بیٹی، ساس، بہو، نند بھاوج، شوہر بیوی، دوست احباب۔۔۔۔ یہ رشتے تجریدی اور سوچے سمجھے نہیں ہیں۔ میر انیسؔ نے انہیں ذہن سے پیدا نہیں کیا ہے نہ جذبات سے، یہ تو میر انیسؔ کی روح میں موجود ہیں۔"

ندؔا فاضلی کی شاعری میں خاندانی رشتے ہندوستانی مزاج کی پوری رنگینی اور عصری انتشار اظہار کے ساتھ آتے ہیں، گھر اور رشتوں کے تصور کو آج کے کسی شاعر نے شاید ہی اس قدر شدت سے محسوس کیا ہو جس قدر ندؔا نے۔

رُخصت ہوتے وقت
اُس نے کچھ نہیں کہا
لیکن ایرپورٹ پر اٹیچی کھولتے ہوئے
میں نے دیکھا

میرے کپڑوں کے نیچے
اُس نے
اپنے دونوں بچوں کی تصویر چھپا دی ہے
تعجب ہے
چھوٹی بہن ہو کر بھی
اس نے مجھے ماں کی طرح دُعا دی ہے

(رخصت ہوتے وقت)

میری ماں
ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے
ادھر اُدھر سے مٹی لا کر
گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے
بے چاری کتنی ڈرتی ہے
میری ماں کتنی بھولی ہے
برسوں کی سیلی دیواریں
چھوٹے موٹے پیوندوں سے
آخر کب تک رُک پائیں گی
جب کوئی بادل
گرجے گا
ہر ہر کرتی ڈھے جائیں گی

(کچی دیواریں)

مہندی لگے ہاتھوں میں توے کی کالوچ
آنکھوں کے ہرن قید میں گھبراتے ہیں

روتے ہوئے بچے پہ نظر پڑتے ہی
چولی کے کئی ٹانکے اُدھڑ جاتے ہیں

میرا جی ان نظموں کو پڑھتے تو یقیناً جھوم اُٹھتے۔ یہ نظمیں اساطیر اور تاریخ کو مس کیے بغیر ہماری معاشرتی زندگی کے ایسے رُخ پیش کرتی ہیں جو صدیوں سے ہماری زندگی کا خاصہ رہے ہیں' جن سے ہماری سانسوں کا رشتہ ہے۔ مگر یہ تصویریں ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ آج یہ خاندانی ادارے جس قدر تناؤ اور دباؤ کا شکار ہیں' اس کا پورا احساس ندا فاضلی کو ہے اور اس کا وہ اپنی شاعری میں کھل کر اظہار کرتے ہیں۔

کچے بخیوں کی طرح رشتے اُدھڑ جاتے ہیں
لوگ ملتے ہیں مگر مل کے بچھڑ جاتے ہیں

نہ جانے کون سے لمحے کی بد دعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

چراغ جلتے ہی بینائی بجھنے لگتی ہے
خود اپنے گھر میں ہی گھر کا نشاں نہیں ملتا

گھریلو رشتے، گھر آنگن، ہندوستانی مزاج و موسم کا عکس ندا کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں مگر اس سے بھی اہم عنصر جو انھیں اپنے نوع کے دوسرے شاعروں سے الگ کر دیتا ہے وہ ہے ان کی شاعری میں آج کے عہد کے انسان کی ذہنی کش مکش کا بھرپور اظہار۔ شاید وہ بھی اور بہت سے شاعروں کی طرح اپنے بنائے ہوئے دائروں میں محصور ہو جاتے مگر بمبئی شہر کی ہنگامہ خیز، پُر آشوب زندگی نے انھیں ایک بڑے تجربے سے دوچار کیا۔ ہلکی پھلکی رومانی نظموں سے اب وہ انسان کو درپیش ذہنی، روحانی مسائل پر آگئے۔ اپنے عہد کی حشر سامانی کو انھوں نے محسوس بھی کیا اور اس کا اظہار بھی کیا۔ اس تجربے نے انھیں اپنے معاصر شاعروں سے بھی مختلف کر دیا۔ ندا کی شاعری آج کے ناقابل برداشت عہد میں ایک ذہین انسان کی اپنے پورے ہوش و حواس و ادراک کے ساتھ زیست کرنے کی کوشش ہے۔ وہ منیر نیازی کی طرح فطرت کے اسرار کا شیدائی نہیں۔ نہ وہ ناصر کاظمی کی طرح ماضی کے بسیروں میں جینے کا قائل ہے۔ بڑے شہروں کے مسائل، بے چہرگی، تنہائی کا احساس، مجلسی اخلاق اور ریاکاریاں، منافقتیں اور سماجی تحفظات۔ ان سب سے گھبرا کر وہ کوئی خیالی دنیا نہیں بساتا۔

تمہاری شکایت بجا ہے

مگر تم سے پہلے بھی
دنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے
یہی کل بھی ہوگی
تمہیں بھی اسی اینٹ پتھر کی دنیا میں
پل پل بکھرنا ہے
جینا ہے
مرنا ہے

یہ مسلسل مکالمہ' جینے کی یہ کوشش آج کی شہری مجلسی زندگی کے تلخ حقائق سے ہمارا سامنا کرواتی ہے ۔ ہم اس شاعری سے خود کو بہت قریب پاتے ہیں یہی اس کی مقبولیت کا راز بھی ہے اور اس کی انفرادیت کی پہچان بھی ۔

چمکتے کپڑے ، مہکتا خلوص ، پختہ مکان
ہر ایک بزم میں عزت حفاظتیں مانگے

شائستہ محفلوں کی فضاؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم

کسی سے خوش ہے' کسی سے خفا سا ہے
وہ شہر میں ابھی شاید نیا نیا سا ہے

اوروں جیسے ہو کر ہم بھی باعزت ہیں بستی میں
کچھ لوگوں کا سیدھا پن ہے کچھ اپنی عیاری ہے

دنیا نہ جیت پاؤ تو ہارو نہ خود کو تم
تھوڑی بہت تو ذہن میں ناراضگی رہے

بڑے شہروں کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے' اسے سمجھنا آسان نہیں ۔ پرانی اخلاقیات سے مہانگروں کو زندگی کو ناپنا غلط ہوگا ۔ ہاروے کاکس نے اپنی کتاب Secular City میں ایک دلچسپ

واقعہ بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "پروٹسٹنٹ پادریوں نے فلک بوس عمارتوں والے ایک علاقے میں سروے کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسے علاقوں میں چونکہ لوگوں کے اپنے پڑوسیوں سے تعلقات کم یا برائے نام ہوتے ہیں، کوشش کی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہوسکیں۔ انھیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ لوگ خود ہی ایک دوسرے سے قریبی تعلقات قائم کرنے کے خواہش مند نہیں تھے۔ پہلے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ایک مریضانہ صورتِ حال ہے۔ لیکن غور کرنے پر انھیں سمجھ میں آیا کہ شہروں میں بچاؤ کی خاطر یہ ہنر بھی لازمی ہے۔ شہر کے لوگ تعلقات بنانے میں خاصے محتاط ہوتے ہیں اور اپنی ضروریات اور مشاغل کے تحت ہی دوستیاں بناتے ہیں۔ اس کے لئے پڑوس میں رہنا ضروری نہیں۔ اس طرح اپنے وقت اور توانائی کو حسبِ منشاء صرف کرتے ہیں۔"

شہر میں سینکڑوں آدمیوں سے ملنا ہوتا ہے بنک کلرک، کیشیئر، دودھ لانے والا، صفائی کرنے والا۔ شہری آدمی کیشیئر کو کیشیئر کی حیثیت سے ہی جانتا ہے، جبکہ گاؤں یا قصبے کا آدمی لوگوں کو ہمیشہ ان کے نام سے پہچانتا ہے۔ شہر کا آدمی ہر شخص سے قریبی تعلقات قائم نہیں کرسکتا۔ قریبی تعلقات محض چند مخصوص لوگوں سے ہی ہوتے ہیں جن سے وہ ہم آہنگی محسوس کرتا ہے۔ ایک چھوٹے شہر یا قصبے میں لوگ ایک دوسرے کے بارے میں جاننے اور مزید جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ بڑے شہر کا آدمی پرائیویٹ اور پبلک اُمور میں فرق قائم رکھتا ہے۔ وہ دوسروں کے مسائل میں ٹانگ نہیں اڑاتا، نہ دوسروں کی مداخلت پسند کرتا ہے۔ یہ آزادی اسے اپنے طور پر جینے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

بقول جین جیکسن "شہر ایسے لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جن سے ایک حد تک رابطہ مفید یا دلچسپ ہے اور آپ کو اچھا لگتا ہے لیکن آپ انہیں اپنے بالوں میں پسند نہیں کرتے نہ وہ آپ کو اپنے بالوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ہر شخص سے ملنے جُلنے لگیں تو زندگی آپ کے لئے وبال ہوجائے۔" شہری زندگی کا یہ رُخ جو باہر سے آئے ہوئے آدمی کو عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ اسے دوہری زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں۔ اچھے بُرے دونوں پہلو ندؔا کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔

ملنے جُلنے کا سلیقہ ہے ضروری ورنہ
آدمی چند ملاقاتوں میں مر جاتا ہے

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا کئی بار دیکھنا

وہ آدمی تھا کتنا بھلا کتنا پُر خلوص
اُس سے بھی آج لیجئے ملاقات ہوگئی

تمام شہر میں ایسا نہیں خلوص نہ ہو
جہاں امید ہو اِس کی وہاں نہیں ملتا

ضروری کیا ہے ہر اِک محفل میں بیٹھیں
تکلف کی رواداری سے بچیئے

اچھی نہیں ہے شہر کے رستوں سے دوستی
آنگن میں پھیل جائے نہ بازار دیکھنا

مِل جُل کے بیٹھنے کی روایت نہیں رہی
راوی کے پاس کوئی حکایت نہیں رہی

ندؔا کی شاعری میں ایک لفظ بار بار آیا ہے۔ 'سفر' اصرار اس بات پر ہے۔
اَپنی تلاش ، اَپنی نظر ، اَپنا تجربہ
رستہ ہو چاہے صاف ' بھٹک جانا چاہیئے

ظاہر ہے یہ سفر ذہنی ہے 'تصوراتی ہے۔
کہاں ہر ایک کو آتی ہے راس بربادی
نئے سفر کی مسافت ذہانتیں مانگے

جن میں کھو جانے کا خدشہ تھا بہت
ہم نہ کھو پائے وہ میلے کھو گئے

ہر اک سفر کو ہے محفوظ راستوں کی تلاش
حفاظتوں کی روایت بدل سکو تو چلو

کیا اس سفر کی کوئی منزل بھی ہے؟

نکل آئے کدھر منزل کی دُھن میں
یہاں تو راستہ ہی راستہ ہے

دو چار گام راہ کو ہموار دیکھنا
پھر ہر قدم پہ اک نئی دیوار دیکھنا

یہ سوچ، یہ سفر ندا کو کہاں لایا ہے؟

یہ زندگی!
جو آج تمہارے
بدن کی چھوٹی بڑی نسوں میں مچل رہی ہے
تمہارے پیروں سے چل رہی ہے
تمہاری آواز میں
گلے سے نکل رہی ہے
تمہارے لفظوں میں ڈھل رہی ہے
یہ زندگی جانے کتنی صدیوں سے
یونہی چہرے بدل رہی ہے
بدلتے چہروں
بدلتے جسموں میں
چلتا پھرتا یہ اِک شرارہ
جو اس گھڑی نام ہے تمہارا
اسی سے ساری چہل پہل ہے
اسی سے روشن ہے ہر نظارہ
ستارے توڑو
کہ گھر بساؤ
قلم اُٹھاؤ

کہ سر جھکاؤ
تمہاری آنکھوں کی روشنی تک ہے کھیل سارا
یہ کھیل ہوگا نہیں دوبارہ

اس انکشاف میں کوئی بہت ندرت نہیں۔ ندرت بس اس انکشاف میں ہے کہ ندا کا اصرار ہے کہ ہر چھوٹی بڑی سچائی تک خود اپنے تجربے سے پہونچنا چاہئے۔ کتابی سچائی تو بس کتابی ہوتی ہے' انسان کے ظاہر و باطن میں اس سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ اتنی بڑی مذہبی، علمی اور فلسفیانہ کتابیں پڑھ کر بھی کورے کیوں رہتے؟ مشکل یہ ہے کہ آج ہماری سوچ ہمیں دور تک نہیں لے جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم دائروں میں سفر کر رہے ہوں۔ باطن کا سفر اکثر نرگسیت کی تاریک بھول بھلیوں میں پھنسا دیتا ہے اور ہمیں علم بھی نہیں ہوتا' آج تحلیل نفسی ایک فیشن بن چکا ہے۔ بقول شخصے ہر امیر آدمی کا آج ایک سائیکو انالسٹ ہے۔ گذشتہ تیس برسوں سے اعترافی نظمیں زیادہ کہی جا رہی ہیں۔ کرسٹوفر لیش کے خیال میں اعترافی فارم ایک ایمان دار ادیب کے لئے ہمارے عہد کے روحانی افلاس کا دہشت ناک بیان ہوتا ہے لیکن ایک سہل پسند ادیب کے لئے بسا اوقات بے حیائی کا مظاہرہ بن جاتا ہے۔ خصوصاً فکشن میں جو افشا کے بجائے بہت کچھ چھپا جاتا ہے۔

نرگسیت آج کے دور کا خاص روگ ہے۔ تحلیل نفسی کے ماہرین کا کہنا ہے کہ آج جو مریض ان کے پاس آ رہے ہیں انھیں ہسٹریا، بار بار ہاتھ دھونا ایسی شکایتیں ہیں۔ یہ لوگ نرگسیت کا شکار ہیں' اپنی زندگی میں خالی پن محسوس کرتے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی کا فقدان ہے، لوگوں سے قریبی تعلقات نہیں قائم کر پاتے۔ نرگسیت کے شکار لوگ اس لئے تحلیل نفسی کے ماہرین کی نظروں میں آ جاتے ہیں کہ یہ لوگ گورنمنٹ اداروں، بزنس کارپوریشنوں اور بعض تحریکات میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ ناولسٹ اور ڈرامہ نگار آج خود اپنی تخلیقات کے مصنوعی ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ بہت سے ادیب اپنی یاد داشت کے تجزیے کے بجائے اعترافات کو زیادہ آسان سمجھتے ہیں اس سے قاری کے تجسس کو کہ وہ مشہور لوگوں کے ذاتی معاملات اور نجی زندگی کے متعلق جانے' تسکین ملتی ہے۔

نارمن میلر اور ان کے مقلدین کی تحریروں میں جو مصنف کی اپنی خواہشات اور امنگوں کے تنقیدی تجزیے سے شروع ہوتی ہیں' اس بات کا اعتراف ہوتا ہے کہ وہ بہ طور ادبی شخصیت کے لافانی ہونے کا خواہش مند ہے۔ یہ تحریریں خودکلامی پر ختم ہوتی ہیں جو ان کے اپنے مشہور شخص Celebrity ہونے کے۔

بارے میں ہوتی ہے۔ ایک بار پبلک کی توجہ مل جائے تو ادیب کو سچے اعترافات کی تیار مارکیٹ مل جاتی ہے۔ ایریکا جونگ نے جنس پر مردوں کی طرح غیر جذباتی انداز میں لکھ کر مقبولیت حاصل کی اور اگلا ہی ناول ایک ایسی جوان عورت پر لکھ ڈالا جو ایک ناول لکھ کر مشہور ہو گئی ہے۔

ندا کی شاعری میں اس قسم کی نرگسیت نہیں ملتی لیکن ان کا شعری مواد اور لہجہ بار بار اس خطرے سے دوچار کرتا ہے۔ خود تنقیدی اور سہل پسندی کے بیچ ایک مہین خط ہے جس کا ہمیشہ خیال رکھنا مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ کبیر، سورداس، غالب اور ایسے دوسرے کئی شاعر ذہن کو ایک نوع کی آزاد خیالی سے روشناس کرواتے ہیں اور محدود فکر کے دائروں سے رہائی حاصل کرنے میں مدد کرتے ہیں لیکن آج کی اشیاء پرستی کے دور میں زندگی کو زیادہ معنی خیز بنانا آسان نہیں۔ صوفی اور بھگتی شعرا بھی ایک حد سے آگے اس معاملے میں مددگار ثابت نہیں ہوتے۔ آج کا انسان ہر بات کا تجزیہ کرنا چاہتا ہے، اسے عقلی سطح پر پرکھنا چاہتا ہے، اس کے بعد ہی وہ کسی بات کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے جبکہ زندگی بڑی پُر اسرار شے ہے۔ ہر تجزیہ ادھورا اور نامکمل ثابت ہوتا ہے اور انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ سمندر سے چُلّو بھر ہی لے پایا ہے۔ دوسری طرف اشیاء سے زیادہ سے زیادہ لگاؤ اس کی زندگی کو کوئی معنی نہیں دے پاتا بلکہ انسانوں سے بامعنی اور جاندار تعلقات کے بغیر زندگی اپنے معانی کھو دیتی ہے۔ آج کا انسان دوسرے انسان سے معنی خیز اور بے حد قریبی تعلق قائم نہیں کرتا، وہ ایک فاصلہ باقی رکھتا ہے اور جب اس فاصلے کو کم ہوتے دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے چاہے وہ تعلق دوستی کا ہو یا کسی عورت سے عشق یا لگاؤ کا ہو۔ دیوانگی میں بھی وہ اپنے ہوش و حواس باقی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ وابستگی Commitment سے گھبراتا ہے۔ کسی عورت سے بھی وہ عشق کرتا ہے تو تعلق کی سطح اس قسم کی رکھتا ہے کہ کسی بھی وقت الگ ہو سکے۔ وابستگی اور قربت Commitment کے بغیر زندگی زیادہ دلچسپ اور معنی خیز نہیں ہوتی اور ایک خلا، ایک تشنگی سی محسوس ہوتی ہے جسے انسان مسلسل اشتہاری نعروں، فلموں، دواؤں اور موسیقی، جنس اور ٹی وی پروگراموں کے مسلسل ہیجان سے پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن نہ خلا بھرتا ہے نہ تشنگی دور ہوتی ہے۔ بار بار وہ بورڈم کا شکار ہو جاتا ہے۔

چار چھ دن میں
میری آنکھوں نے
پی لیا اس کے پورے چہرے کو
وہ بھی ممکن ہے میرے چہرے کو

اپنی آنکھوں سے پی چکا ہوگا
وہ بھی بے چہرہ
میں بھی بے چہرہ
صرف آنکھوں کے خول باقی ہیں
جن کے اندر دھنسی ہوئی آنکھیں
بس یونہی چند بار دیکھیں گی
اور پھر رفتہ رفتہ
کچھ دن میں
یہ بھی ایک دوسرے کو پی لیں گی

(گھٹتے ہوئے رشتے)

یہ ایک دوسرے کو پی لینے کا المیہ آج کی کنزیومر سوسائٹی کا المیہ ہے' جہاں دوستی، محبت، وفاداری ہر چیز ایک بے جان شے کی طرح استعمال ہوتی ہے اور اغراض کا شکار ہو جاتی ہے۔

محبت میں وفاداری سے بچیے
جہاں تک ہو اداکاری سے بچیے

ہر اِک صورت بھلی لگتی ہے کچھ دن
لہو کی شعبدہ کاری سے بچیے

صوفی یا یوگی انسانوں سے کنارہ کش ہوکر خدا تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ آج کا انسان محض مجرد سوچ کے ذریعہ منزل پالینا چاہتا ہے۔ اس لئے زندگی اس کے لئے بس سرابوں کا سفر ہے۔

زندگی جاگی ہوئی آنکھوں کا رنگین فریب
جو بھی گذرا وہ سرابوں کے سفر سے گذرا

ندؔا فاضلی کا یہ سفر انھیں اس نتیجے تک تو لے آیا لیکن فطری بے اطمینانی اب انھیں Mysticism کی طرف لے آئی ہے۔ فطرت سے قریب ہونے' کائنات سے جُڑ جانے کی خواہش کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے منبع کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ ان کا دائرہ مکمل ہوا یا اب وہ بھکتی شعراء کو پہلے سے بہتر سمجھ پا رہے ہیں اور آج کی پیچیدہ زندگی میں اس کی معنویت کو پہلے سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ آج کا

انسان جو Monads کی مانند الگ تھلگ محسوس کرتا ہے اس تضاد کو کیسے دور کر پائے گا؟

ندا کے یہاں مسلسل سفر کا احساس ہوتا ہے جب انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ ٹھہر سے گئے ہیں تو وہ پھر نئی منزلوں کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ نظم، غزل، گیت اور دوہوں پر انھیں یکساں قدرت ہے۔ گیتوں کو انھوں نے ایک نیا موڑ دیا ہے۔ ہلکے پھلکے رومانی گیتوں سے آگے بڑھ کر انھیں عصرِ حاضر کی حسیت سے روشناس کرایا ہے ادھر انھوں نے بہت اچھے دوہے کہے ہیں۔ ان کی شاعری میں میر و غالب اور سودا و آتش کے ساتھ میرا، کبیر اور تلسی داس کی شعری روایتیں مل کر ایک خوبصورت روپ اختیار کرتی ہیں جوان کی شاعری کا شناس نامہ ہے۔ اپنے عصر کے تلخ اور سنگین حقائق کا اظہار انھیں جدید شاعروں میں ایک ممتاز و منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ ان کی شاعری ایک ذہین قاری کے دل و دماغ کو مہمیز کرتی ہے اور اس کے جمالیاتی ذوق کی آبیاری کرتی ہے۔ (بشکریہ ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ ۱۹۹۱ء)

••

گھاس پر کھیلتا ہے اک بچہ
پاس ماں بیٹھی مسکراتی ہے
مجھ کو حیرت ہے جانے کیوں دنیا
کعبہ و سومنات جاتی ہے

ندا فاضلی کی شاعری کے چند پہلو

• پروفیسر ظہیر علی

ندا فاضلی کا شمار اُردو کے اُن جدید شعراء میں ہوتا ہے جنھیں ترقی پسند تحریک کے دم توڑنے کے بعد شہرت اور وقعت ملی۔ اُردو شاعری کے عصری منظر نامے میں ندا ایک منفرد اور خاصے اہم مرتبے کے حامل ہیں، ساتھ ہی وہ عوام بشمول اُردو سے نابلد عوام میں بھی خاصی شہرت رکھتے ہیں، جس کا سبب اُن کی فلموں، ٹی وی سے وابستگی اور عوامی مشاعروں سے اُن کا تعلق ہے۔

ندا فاضلی کا شمار گو جدید شعراء میں ہوتا ہے اور اُن کی شاعری موضوعاتی اور اُسلوبی نقطہ ہائے نظر سے یقیناً ترقی پسند شاعری سے یکسر مختلف ہے۔ تاہم وہ ترقی پسند تحریک کے فکری دھارے کے مخالف نہیں ہیں جس کا مقصد بہر کیف مجبور اور تہی دستی طبقات کے مفادات کی حفاظت کرنا ہے۔ اپنے طالب علمی کے زمانے میں وہ اسٹوڈنٹ فیڈریشن (Student's Federation) کے سرگرم رُکن رہے تھے جو کمیونسٹ پارٹی سے ملحق تھی۔ بعد ازاں برسوں تک اُن کا تعلق کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے بھی رہا۔ وہ آج بھی مارکسزم کے اُس پہلو کی ستائش کرتے ہیں جس میں انسان دوستی کا عکس جھلکتا ہے اور خود کو ایک ایسا شاعر مانتے ہیں جو اپنے اِردگرد کے سماجی ماحول سے بے بہرہ نہیں ہے۔ لیکن وہ ادب میں کسی بھی نوعیت کی تبلیغ کے سخت مخالف ہیں اور تخلیقی ادب کے ضمن میں کسی طرح کی مفاہمت کے قائل نہیں ہیں۔

ندا فاضلی کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔ اُن کے والد دُعاؔ ڈبائیوی ایک قابل قدر شاعر تھے اور جانشین داغؔ، نوحؔ ناروی کے ممتاز شاگردوں میں سے ایک تھے۔ اِس طرح بچپن ہی سے ندا کی پرورش شعری اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ شروع ہی سے اُن کے کان مصرعوں کی کھنک اور غزلوں کے آہنگ سے آشنا تھے۔ اِس طرح کے ماحول میں ندا کا شاعری کی طرف مائل ہونا ایک فطری عمل تھا۔ لڑکپن میں جب ندا نے شعر گوئی کی ابتدا کی تو لازماً اُسی طرح کے مصرعے موزوں کرنے لگے جو دبستان داغؔ کی پہچان ہوا کرتے تھے۔ وہی صحتِ زبان پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کا وطیرہ، روزمرہ محاورہ کی چاشنی، سلاست بیان اور موضوعات کی حد تک سطحی عشقیہ جذبات کا اظہار۔

اگر یہی سلسلہ اُن کی جوانی میں بھی جاری رہتا تو نہ آج ندا فاضلی کا شمار اُردو کے اہم ترین جدید شعرا میں ہوتا' نہ اُنھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا جاتا اور نہ ہی مجھے یہ مضمون لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ لیکن اِسے اُردو شاعری کی خوش بختی ہی سمجھئے کہ ندا فاضلی کی شاعری میں انقلابی تبدیلی کا سبب ایک سانحہ تھا' جس نے پہلی دفعہ اُنھیں جذباتی ہیجان اور رُوحانی کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔

کالج میں طالب علمی کے زمانے میں اُن کی ایک ہم جماعت لڑکی' جس پر ندا دل و جان سے فدا تھے' کا اچانک انتقال ہو گیا۔ نوجوان ندا پر اُس سانحے کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اُنھوں نے اپنے شدید کرب کا اظہار شاعری میں کرنے کی بہت کوشش کی' لیکن دبستان داغ کی روایات میں تربیت یافتہ شعری صلاحیت نے ایسے شعروں کی تخلیق کی جن میں شوکت لفظی، اسلوبی شان، سلاست بیان اور نغمگی تو تھی لیکن اُس شدید ذہنی اور رُوحانی کرب کا شائبہ تک نہیں تھا جو اُس وقت ندا فاضلی کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔ دبستانِ داغ کے سکہ بند تغزل نے اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن ایسا کیوں ہوا تھا' یہی وہ سوال تھا جس نے اُن کے نظریۂ شعر کو سراسر بدل دیا۔ اُسی زمانے میں کسی بھجن کا ایک مصرعہ اُن کے کانوں تک پہنچا۔

مدھوبن تم کت رہت ہرے

اِس مصرعے کو سن کر ندا فاضلی پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اب وہ اپنے ذاتی کرب میں کائنات کی ہر شئے کو شریک کرنا چاہتے تھے۔ اس مصرعے میں جس چیز نے ندا کو بے حد متاثر کیا تھا وہ یہی احساس تھا کہ اگر انسان اپنے ذاتی کرب یا مسرت میں مظاہر فطرت کو بھی شریک کر لے تو وہ ذہنی طور پر خود کو اِس وسیع کائناتی خاندان کا ایک فرد محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس طرح جب خوشی یا غم کے لمحات کو اپنے ہی افرادِ خاندان میں بانٹ کر اُسے ایک ذہنی طمانیت اور اعصابی سکون حاصل ہوتا ہے' اُس احساس کے علاوہ ندا فاضلی کو بھجن کے اِس مصرعہ کا سیدھا سادا اور معصومانہ طرزِ اظہار بے حد پسند آیا تھا۔ ایک ایسا اُسلوب جو غیر ضروری تکلفات اور شعوری طور پر کی گئی تزئین سے پاک تھا، ایسی لفظیات کا انتخاب ہوا تھا جس کے ہر لفظ سے معصومانہ استعجاب کے ساتھ ساتھ خلوص اور سچائی عیاں تھی۔ اسی طرح ندا نے اُردو کی پُر تکلف شعری روایات سے برگشتہ ہو کر ایک کھرے، غیر مصنوعی اور زمینی طرزِ اظہار کو اختیار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں جو اُنھیں بالآخر صوفی سنتوں کی شعری روایات اور لوک گیتوں کے دیار تک لے گئیں۔

اب تک ندا کے چار شعری مجموعے ''لفظوں کا پُل''، ''مور ناچ''، ''آنکھ اور خواب کے درمیان''

اور ''کھویا ہوا سا کچھ'' شائع ہو چکے ہیں۔ اِن مجموعوں کا بغائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ندا کا یہ تخلیقی سفر ہمیشہ ارتقاء پذیر رہا اور یہ عمل اب بھی جاری ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو کھری شاعری اور ایک بیدار ذہن کی نشاندہی کرتی ہے۔ تبدیلی اِس کائنات کا اساسی اُصول ہے۔ ہر لحظہ یہ کائنات تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ معاشرے کی اقدار بدلتی جاتی ہیں اور اُن تمام تغیرات کے ساتھ ایک بیدار ذہن شخص شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے نظریات، ترجیحات اور اقدار بدلتا رہتا ہے۔ جہاں تک تخلیق کار کا تعلق ہے تو اُس کے ہاں تبدیلی کا یہ عمل صرف نظریات یا اقدار تک محدود نہیں رہتا بلکہ اُس کا اُسلوب اور وسیلۂ اظہار بھی بدلتا رہتا ہے۔

ندا فاضلی نے اپنے کسی بھی شعری مجموعے میں ''پیش لفظ'' کے نام پر اپنی شاعری کے رموز و نکات سے قارئین کو آگاہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں اِسے ایک بہت ہی احسن فعل سمجھتا ہوں کیونکہ اس رویے سے اِس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے فن پر مکمل اعتماد ہے۔ جب کلام کے اوصاف اپنے تعارف کی اہلیت رکھتے ہوں تو شاعر کو کلام کا تعارف پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ''پیش لفظ''، ''حرفے چند''، ''اپنی بات''، ''تعارف'' وغیرہ قسم کے عنوانات قائم کر کے اکثر شعراء مجموعہ کے شروع میں خود کا تعارف پیش کر کے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی شاعری کے محاسن گنوانے لگتے ہیں یا نظریۂ شعر کی تشریح کے بطور کسی خاص مکتبِ نظر کی تبلیغ اور دوسرے تمام مکاتبِ فکر کی تنقیص کرنے لگتے ہیں۔

مثال کے طور پر یگانہ چنگیزی کے اوّلین مجموعہ ''آیاتِ وجدانی'' میں شیرازی کے فرضی نام سے خود یگانہ کا تحریر کردہ دیباچہ اور اختر الایمان کے شعری مجموعوں کے دیباچے پڑھ لیجئے۔ (یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ میں اُن دونوں شعراء کو اُردو کے اہم ترین شعراء میں شمار کرتا ہوں) ندا فاضلی کے پہلے مجموعہ ''لفظوں کا پل'' کے شروع میں ''حرفِ اوّل'' کے نام سے چند سطریں شامل ضرور ہیں تاہم اِس مختصر لیکن بے حد دلکش تحریر میں ندا فاضلی نے صرف ایک بھیانک سماجی منظرنامے میں گرفتار اُس بے حد اکیلے شخص کی بات کہی ہے، جس سے اُس کا گھر اور اُس کا ماحول چھین لیا گیا تھا۔ اُس تنہا شخص کی ''بے منزل کی مسلسل تلاش ہی اُس کی منزل'' قرار پائی تھی۔ ندا نے مختلف مباحثوں، مذاکروں اور ملاقاتوں میں اپنے نظریۂ شعر سے بحث تو ضرور کی ہے لیکن ادب کے ایک سنجیدہ قاری کی طرح اُنھوں نے کسی مکتبِ فکر کے مبلغ کے بطور نہ تو کبھی اپنے نظریۂ شعر کا ڈھنڈورا پیٹا اور نہ اُردو کے کلاسیکی اور ترقی پسند شعری سرمایے کو یک قلم رد کیا۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے وسط میں جب ترقی پسند تحریک کی سانس پھولنے لگی تو اُردو میں جدیدیت کا واویلا شروع ہوا تھا۔ جدیدیت کی تحریک یورپ میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی ہی میں کمزور ہونے لگی تھی اور عالمی تناظر میں دُنیا کے کسی ادب میں بھی جدیدیت کی ابتدا مارکسزم کی مخالفت کے طور پر نہیں ہوئی تھی، لیکن اُردو ادب میں جدیدیت کو لازماً ترقی پسند تحریک (جس پر مارکسی شعراء و ادباء کا غلبہ تھا) کی ضد اور ردِ عمل کے بطور پیش کیا گیا۔ بعض جدید شعراء اور نئے ناقدین نے نومسلمانیت کے جوش میں اپنے پیش رو شعراء بشمول اساتذہ کے شعری سرمایے کو مہمل، غیر معیاری اور پروپیگنڈہ لٹریچر کہہ کر سرے سے ادب کے دائرے سے خارج کر دیا تھا۔

بعض جدید شعراء نے شاعری کے نام پر دُور از کار اور بیشتر اَوقات انتہائی نجی علامتوں اور استعاروں میں شعری معموں کی تخلیق کو ہی عظیم اور جدید شاعری کی انتہا سمجھ لیا تھا۔ لیکن حقیقی معنوں میں تازہ کار اور جدید شعراء نے نہ تو اُردو شاعری کے کلاسیکی سرمایے کو رد کیا اور نہ ترقی پسند شاعری کی بے جا مخالفت میں اپنی توانائی صرف کی۔ کھرے جدید شعراء کا موقف صرف یہ رہا کہ کسی بھی نوعیت کی تبلیغ کے لئے شاعری کو آلۂ کار بنانا ایک غیر شاعرانہ اور غیر تخلیقی عمل ہے۔ ان معنوں میں اُنھوں نے ہر قسم کی تبلیغی شاعری پر ایک معروضی نقطۂ نظر سے تنقید کی۔ ندا فاضلی کا شمار اِسی قبیل کے جدید شعراء میں ہوتا ہے۔

ندا کے نزدیک شاعری درحقیقت اس کائنات میں جمال اور احساسِ جمال کی ترویج اور تحفظ کی تخلیقی کوشش ہے، اس لئے ایک شاعر کا یہ فریضہ ہے کہ اپنے اِردگرد کے سیاسی اور سماجی ماحول سے باخبر رہنے کے ساتھ ساتھ اس کائنات اور انسانی تہذیب کے ورثے کی ہر حسین و جمیل شئے، احساسِ فکر، قدر اور فن کی تشہیر و حفاظت کرے۔ ندا کے نزدیک یہ بہت ہی اہم اور مشکل فریضہ ہے کیونکہ انسانی تاریخ کے ہر دور میں اربابِ حل و عقد کبھی توہم پرستی کا جال بچھا کر، کبھی مذہب کا لاسا لگا کر، کبھی وطن پرستی کا سوانگ بھر کر اور کبھی کسی مخصوص سیاسی آدرش کا مکھوٹا پہن کر انسانیت اور انسانی تہذیب سے جمال اور احساسِ جمال چھین لینے کے درپے رہے ہیں۔

ندا جمال اور احساس جمال کو ایک وسیع معنوں میں برتتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جمال درحقیقت صحت مند اور مثبت انسانی قدروں کا ترجمان ہے اور احساس جمال انسانی رشتوں کے تقدس کا احترام کرنے کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ بشمول شاعری کے ذریعہ جمال کے تحفظ کی شعوری کوشش۔ شاعری کی ماہیت اور فریضۂ شاعری اہمیت کی اس وضاحت کے بعد شاعری اور پیغمبری کی حدود ایک دوسرے میں

مدغم ہونے لگتے ہیں۔ ندا کا خیال ہے کہ مہاتما بدھ کی تلاش حق کی جستجو بھی درحقیقت اِس کائنات کے جمال کے تحفظ کی خاطر ایک فرد کی ذاتی کوشش تھی۔ ندا کے شعری رویے کے ادراک میں غالب کے تعلق سے اُن کی رائے بھی مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔ ندا کا خیال ہے کہ" غالب اپنے ہم عصر اور پیش رو شعراء سے اِن معنوں میں مختلف تھے کہ غالباً وہ اُردو کے پہلے شاعر تھے' جنھوں نے اپنی ذہنی استعداد اور آپنے مشاہدے کی روشنی میں اِس کائنات کے رموز و نکات کو روایتی مآخذاتِ علم کی مدد کے بغیر سمجھنے کی کوشش کی۔" ندا فاضلی بھی جُزدانوں میں لپٹے دیمک گزیدہ آدرشوں کی جگالی کئے بغیر اِس وسیع کائنات میں اسیر انسانی وجود کی اُلجھنوں کو شخصی سطح پر سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

جب بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے اخیر میں ندا کا اوّلین شعری مجموعہ "لفظوں کا پل" شائع ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے اُردو کی پر تکلف محفلوں اور تہذیبی شائستگی سے مزین ادبی نشستوں کی گھٹی ہوئی فضا اور بند ایوانوں میں کہیں کوئی چھوٹا سا دریچہ کھلا ہو جس سے تازہ ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا ہو۔ تازگی کا یہ احساس ندا فاضلی کے اُسلوب کی ندرت اور اُن کی شاعری کے قصباتی ماحول کا مرہون منت تھا۔ ایسا نہیں کہ ندا سے قبل اُردو کے شعری سرمایے میں قصباتی یا چھوٹے شہروں کا ماحول یا گاؤں کے متعلق شعری شہ پاروں کا وجود نہیں تھا۔ تاہم جو چیز ندا کے پہلے شعری مجموعے میں شامل بیشتر نظموں اور گیتوں کو اِسی نوعیت کے اگلے شہ پاروں سے مختلف ٹھہراتی ہے' وہ ہیئت، اُسلوب اور لفظیات کی حد تک اُن کی تازہ کاری تھی۔

ندا فاضلی نے قصباتی اور چھوٹے شہروں کے موضوعات کو نظم کرنے کے لئے ایک ایسا طرزِ اظہار اختیار کیا جو لوک گیتوں کی سی کشش رکھتا تھا۔ اِس طرح کا اُسلوب ہندوستان کی دوسری زبانوں، خصوصاً ہندی میں تو موجود تھا لیکن اُردو شاعری میں تقریباً مفقود تھا۔ ظاہر ہے یہ شعری اُسلوب مختلف ہونے کے باوجود ہوا کے ایک تازہ جھونکے کی طرح آیا تھا اور اِسی سبب اُن کے پہلے شعری مجموعے کی اُردو حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی تھی۔

"لفظوں کا پل" میں شامل بیشتر منظومات ندا فاضلی کی ممبئی میں آمد سے قبل کی تخلیق کردہ ہیں۔ اِسی لئے اُن کے موضوعات زیادہ تر نیم شہری ماحول سے متعلق ہیں۔ علاوہ ازیں شعری اظہار میں مستعمل علامتیں، محاورے، تشبیہات اور استعارے بھی اکثر و بیشتر قصباتی ماحول کے پیدا کردہ ہیں۔ کہیں کہیں تو طرزِ اظہار لوک گیتوں کی طرح سادہ و شفاف لیکن دلکش اور بصیرت افروز ہو گیا ہے۔ اُسلوب کی حد تک ندا نے ہمیشہ ہی راست، بیانیہ یا خطیبانہ پیرایۂ اظہار سے گریز کیا۔ وہ اکثر استعاروں اور علامتوں کے تخلیقی

استعمال سے اپنی منظومات میں معنوی تہہ داری پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں کھڑکیاں باتیں کرتی ہیں، بوڑھے دروازے سوچ بچار میں مصروف نظر آتے ہیں، ایک شہر ماں کا استعارہ بن جاتا ہے تو دوسرا بیٹے کا، سگریٹ کا دھواں بآوازِ بلند گفتگو کرنے لگتا ہے اور سوئی کا دھاگا الفاظ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

علامتوں اور استعاروں کا استعمال ہمیشہ ہی شعری اُسلوب کا جزوِ خاص رہا ہے' تاہم اُنھیں تخلیقی طور پر برتنے کا ہنر شاعر کی خلاقی کا ضامن ہوتا ہے۔ دیہاتوں اور قصبوں میں اکثر ان پڑھ عورتیں، مرد اور بچے اپنے جھونپڑوں کی دیواروں پر اپنے ہاتھوں اور انگلیوں سے موقلم کا کام لیتے ہوئے مختلف نقش و نگار بناتے ہیں۔ جانوروں، انسانوں، دیوی دیوتاؤں، درختوں، ندیوں، پہاڑوں، چاند اور سورج وغیرہ کی یہ تصویریں بظاہر اعلیٰ آرٹ کا نمونہ پیش نہیں کرتیں لیکن انگلیوں کی پوروں اور ہاتھ کی ہتھیلیوں سے بنائی ہوئی یہ تصویریں اپنے اِردگرد کے لینڈ اسکیپ سے فطری مطابقت رکھنے کے سبب ایک مخصوص تہذیب کا طاقتور استعارہ بن جاتی ہیں۔ ''لفظوں کا پل'' میں شامل بیشتر منظومات بھی ایک نیم دیہی، نیم شہری ماحول کی عکاسی کے لئے جس تصویری زبان میں بات کرتی ہیں اور جس طرح کے امیجز کو اُبھارتی ہیں وہ بھی کہیں کہیں شکستہ، ٹیڑھے، میڑھے اور مبہم سے ہیں۔ تاہم ندا کی امیجری اُن کی شاعری کے موضوعات سے مکمل مطابقت رکھنے کے باوصف اُس زمینی تہذیب کی بھرپور عکاسی کرنے پر قادر ہے جو اُس کی تخلیق کا محرک ہے۔

جب چارپائی کا بان مروڑا جائے، سُوپ ناچ اُٹھیں، آنگن آنگن رُوپ گھونگٹ کاڑھے چھم چھم کرتا پھرے، کنواری اپنی گودی میں ایک بھیڑ کا بچہ لئے گھومتی نظر آئے، پنجرے کا طوطا رٹی رٹائی باتیں دہراتا رہے یا فٹ پاتھوں پر تھکی تھکائی گائیں اونگھتی دکھائی دیں تو ہم خود کو اُس ''بھارت'' میں پاتے ہیں جو صدیوں سے اِسی طرح آباد ہے اور جس میں تغیر کے عمل کی رفتار بے انتہا دھیمی ہے۔ یہ تہذیبی جمود جہاں توہم پرستی اور پچھڑے پن کا سبب بنا وہیں انسانی رشتوں کے تقدس، زندگی کی بنیادی سچائیوں اور چھوٹی موٹی خوشیوں کے تحفظ کا ضامن بھی رہا۔ ''لفظوں کا پل'' کی شاعری اسی ''بھارتی'' تہذیب کے دونوں پہلوؤں کا اِحاطہ کرتی ہے۔

ترقی پسندوں نے پسماندہ طبقات کے مسائل اور مفادات کی بات تو کی تھی لیکن درحقیقت اُردو کے ترقی پسند شعراء اور ادیب اپنے طبقے کے مسائل ہی کو فردو عوام کے مسائل بنا کر پیش کرتے رہے۔ اُن میں بیشتر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے' کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل تھے، عوام اور خصوصاً

بچھڑے ہوئے عوام سے اُن کی واقفیت اکتسابی تھی، وہ ذہنی اور جذباتی سطح پر کبھی بھی اُس ''بھارت'' کا حصہ نہیں رہے تھے جہاں صرف ایک طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال نہیں کرتا بلکہ گھر سے لے کر چوپال تک استحصال کی مختلف صورتیں بدلتا رہتا ہے۔ ترقی پسندوں کے اِکتسابی علم نے اُن کے جذبے کو نعرہ اور اُن کی بصیرت کو خطابت کی سطح سے اونچا اُٹھنے نہیں دیا تھا۔ اُن کی شاعری میں جیتے جاگتے، زندگی بھوگتے، حقیقی انسان نہیں بلکہ خیر اور شر کی ... میں بٹے ہوئے افراد روبوٹ کی طرح طے شدہ خطوط پر اپنے اپنے کردار نباہتے نظر آتے ہیں۔ ندا ''لفظوں کا پل'' میں جس دیہی اور قصباتی تہذیب سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں' وہاں فرد طبقاتی تقسیم، معاشی استحصال یا سماجی جکڑ بندیوں کے تعلق سے اتنا باشعور نہیں ہے جتنا ترقی پسند شاعری میں نظر آتا ہے۔

ندا نے سماج کی عکاسی صرف سیاہ و سفید رنگوں میں نہیں کی بلکہ زندگی کی خوشیوں، الیوں، محرومیوں، حسرتوں، کامیابیوں، ناکامیوں، آرزوؤں، دُعاؤں، گالیوں، خوابوں اور خوابوں کے پاش پاش ہونے کے مختلف رنگوں سے پورے ماحول کو سجایا ہے۔ نہ تو کوئی رنگ کسی دوسرے رنگ کی ضد ہے اور نہ کوئی رنگ کسی دوسرے رنگ سے بہتر یا بدتر۔ اکثر یوں لگتا ہے جیسے ایک رنگ میں کسی دوسرے رنگ کی آمیزش ہے اور یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کسی ایک عکس میں کون سا رنگ کتنی مقدار میں موجود ہے۔ اس تہذیبی وحدت کی شعری عکاسی صرف اِسی اُسلوب اور ڈکشن میں ممکن تھی جو اِسی زمینی تہذیب کا پیدا کردہ ہے۔ یعنی شعری موضوعات نے خود اپنا اُسلوب اور ڈکشن پیدا کیا۔ اِسی سبب ''لفظوں کا پل'' کا شعری اُسلوب ہمیں زیادہ فطری لگتا ہے۔ یہ طرزِ اظہار پرتکلف اُسلوب اور مفرّس ڈکشن کے مقابلے زیادہ تازہ کار بھی ہے۔ کئی نظموں اور گیتوں میں ہندی الفاظ فراخدلی سے استعمال ہوئے ہیں جو اکثر جگہوں پر معنوی اور جمالیاتی پہلوؤں کو چمکاتے ہیں لیکن بعض جگہوں پر ناگوار بھی لگتے ہیں۔

''لفظوں کا پل'' کی بعض نظموں اور بیشتر گیتوں میں نسوانی، خصوصاً جوانی کے حدود میں قدم رکھتی ہوئی لڑکی کی نفسانی خواہشات اور اُلجھنوں کا بہت ہی بصیرت افروز اظہار ہوا ہے۔ یہ منظومات 'سنا ہے میں نے'، 'بے خواب نیند'، 'جیون کا دُکھ'، 'محبت' اور تقریباً سارے گیت اپنے تہذیبی پس منظر، اُسلوب، لفظیات، امیجری وغیرہ کے باوصف تخلیقی شہ پارے تو یقیناً ہیں ہی لیکن موضوعاتی نقطۂ نظر سے بھی اُردو کے شعری سرمایے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ندا فاضلی کا دوسرا شعری مجموعہ ''مور ناچ'' قصباتی اور شہری تہذیبوں کی جدیدیات کا شعری

اظہار ہے۔ اِس مجموعہ میں تہذیبی پس منظر کی تبدیلی کے سبب نہ صرف شاعر کے فکری زاویے مختلف ہیں بلکہ موضوعاتی تغیر کے ساتھ ساتھ طرزِ اظہار اور ڈکشن بھی خاصہ مختلف ہے۔ دیہی اور قصباتی تہذیب کے پروردہ فرد کے معصومانہ استعجاب کی جگہ اب ہمیں احتجاج، غصہ اور شکست خوردگی کا احساس ملتا ہے۔ تاہم ''مورناچ'' کے شاعر کا احتجاج یا غصہ ایک ایسے فرد کا ردِعمل ہے جو لاکھوں انسانوں سے معمور ایک مہانگر میں خود کو بالکل تنہا پاتا ہے۔ یہ تنہائی اُس وقت اور بھی کربناک اور اندوہناک بن جاتی ہے جب ہر ہر قدم پر اُسے احساسِ محرومی اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اِن معنوں میں یہ احتجاج یا غصہ کسی سیاسی جماعت یا کسی مزدور سبھا کے رُکن کے ردِعمل سے قطعی مختلف ہے۔ ''مورناچ'' کا شاعر احتجاج یا غصہ کا اظہار کرتے وقت نہ تو نعرے لگاتا ہے اور نہ کسی مخصوص سیاسی منشور کے نفاذ پر اصرار کرتا ہے۔ وہ سماج کی بے حسی اور اپنی محرومی کو انفرادی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب اُس کی فراست اور بصیرت، جھوٹ، مکاری، ظلم، ریاکاری، ضمیر فروشی، مفاہمت، مذہبی جنون اور سیاسی پینترے بازی کی گتھیوں میں جکڑے ہوئے معاشرے سے اُسے متعارف کراتی ہے تو اُسے اپنی ہی طرح ہر فرد (بشمول وہ تمام افراد جو بظاہر معاشی، سماجی اور سیاسی اقتدار پر قابض ہیں) مجبور و محروم اور حالات کا شکار نظر آتا ہے۔ اُس کی بصیرت اُسے کسی حتمی جواب سے مطمئن کرنے کی بجائے اُس کے ذہن میں لاتعداد سوالوں کو جنم دیتی ہے اور وہ ہر سوال کے جواب کی تلاش میں ایک نیا سوال پوچھتا رہتا ہے۔ فرد اور معاشرے کے رشتے کے معنی و مفہوم کو سمجھنے کی اُس لایعنی جستجو کا تخلیقی اظہار ''مورناچ'' میں شامل بمبئی، جنگ، نیا روگ، اپنا گھر، میوزیم، راتے کی منطق، پہچان، بس یونہی جیتے رہو، سوال پوچھتے رہو، آخری سہارا، مشینیں، اشتہاری ستون، وقت کی خالی آنکھ، مرثیہ، گھستے ہوئے رشتے، فریب، اتنی پی جاؤ، اکیلا غم، نئی ڈائری کا ایک ورق، خودکشی، حادثہ، معجزہ اور آخری خط جیسی نظموں میں بہت شدت سے ہوا ہے۔

ندا فاضلی کی شاعری کا ایک اور وصف جس کا عکس ہمیں اُن کے اوّلین مجموعہ میں بھی ملتا ہے وہ ہے اُن کی منظومات میں پایا جانے والا طنز اور ستم ظریفی کا نشتر۔ بعض بداحتیاط یا کم سواد قارئین اُن کی نظموں کے بعض مصرعوں یا غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار کے سطحی معنوں پر اکتفا کرتے ہوئے یہ مطلب اخذ کرتے ہیں یا دوسروں کو یہ باور کراتے ہیں کہ شاعر خودغرضی، مفاہمت، ابن الوقتی، کم ہمتی، بے وفائی، عیاری، مکاری، چالبازی اور دھوکہ دہی وغیرہ قسم کے منفی اقدار کو فروغ دے رہا ہے۔ درحقیقت ندا فاضلی اپنی تمام تر بنجارہ مزاجی اور شعوری بے راہ روی کے باوجود انسانی دُکھ درد کے حوالے سے معاشرتی زندگی

سے جڑے ہوئے ہیں۔اُن کی شاعری، اُن کی ذات اور احساسات کا عکس ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے اِردگرد کے ماحول میں زندگی بھوگتے مسائل سے جوجھتے ہوئے انسان کی جدوجہدِ مسلسل کا تخلیقی اظہار بھی ہے۔اُن کی شعری تخلیقات کے بین السطور میں ہم انسان دوستی اور دردمندی کی وہ پرچھائیں دیکھ سکتے ہیں جس نے اُن کی شاعری کے شخصی اور انفرادی پہلو کو ایک آفاقی بُعد عطا کیا ہے۔ندا فاضلی کی اکثر نظموں میں طنز یا ستم ظریفی کی زیریں لہر محسوس کی جاسکتی ہے۔

جس نظم کے عنوان سے ندا فاضلی کے دوسرے مجموعے کا نام مستعار ہے۔یعنی'' مور ناچ'' وہ سراسر استعاراتی اور علامتی طرزِ اظہار کی وجہ سے خاصی اُلجھی ہوئی نظم ہے۔یہ پیرایۂ اظہار چونکانے والا اِس لئے ہے کہ ندا کا اُسلوب بالراست علامتی اور استعاراتی ہونے کے باوجود کبھی گنجلک یا مبہم نہیں رہا۔ نظم'' مور ناچ'' اِن معنوں میں اُن کی دوسری نظموں سے مختلف ہے کہ'' مور ناچ'' کسی بھی احساس، جذبے یا شئے کا استعارہ ہوسکتا ہے۔یعنی اسے پڑھنے کے بعد مختلف قارئین اِس کے مختلف مفاہیم نکال سکتے ہیں۔ایک کھرا شاعر اِستعاراتی اُسلوب درحقیقت فکری اور جذباتی پیچیدگیوں کے سبب لاشعوری طور پر استعمال کرنے لگتا ہے اور اِس طرح وقتی موضوع یا انفرادی احساس زماں ومکاں کی حدود سے آزاد ہوکر ہمہ گیر اقدار کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے۔لیکن اُسلوبی اور موضوعاتی پیچیدگیوں کے سبب ترسیل کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اور تخلیقات کسی حد تک مبہم ہوجاتی ہیں۔پہلی قرأت میں ندا فاضلی کی نظم'' مور ناچ'' اتنی مبہم بھی نہیں لگتی۔عنوان کی مناسبت سے مصرعہ در مصرعہ مربوط تلازمے آتے جاتے ہیں۔مثلاً: سات رنگوں کا ریشم،، بجلیاں، بنجر زمینوں کا ہرا ہونا اور جنگل وغیرہ۔اِس طرح بڑے محتاط طریقے سے ڈھالے ہوئے مصرعے ایسی فضا بندی کرنے میں یقیناً معاون ثابت ہوتے ہیں۔جو'' مور ناچ'' سے مناسبت رکھتی ہو۔اِس کے علاوہ نظم کا آہنگ بھی بہت دلکش ہے اور یہ دونوں حقائق بجائے خود نظم کی تخلیق کا جواز ہیں۔تاہم مشکل اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم'' مور ناچ'' کے لغوی معنوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اِس کے علامتی یا استعاراتی پہلو پر غور کرنے لگتے ہیں۔اگر ہم اسے اِس وسیع کائنات میں انسانی وجود اور اِس وجود کی بقا کے لئے انسانی تگ ودو کی علامت قرار دیں تو نظم کی ابتدا بڑی اُمید افزا اور خوش گوار طریقے سے ہوتی ہے۔جیسے جیسے ناچ کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے نظم میں برتے گئے مختلف الفاظ انسانی تہذیب وتمدن اور ترقی کے مختلف مظاہر کی علامتیں بن کر اُبھرنے لگتے ہیں۔لیکن جب دسویں مصرعے میں مور کی آنکھ سے پہلا آنسو گرتا ہے تو نظم کی تہہ داری مزید بڑھ جاتی ہے۔پوری نظم

میں یہی ایک لفظ'' آنسو'' کلیدی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ شاعر کے موقف بلکہ شاعر کے نظریاتی جھکاؤ کا اندازہ ہمیں اُسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم لفظ'' آنسو'' کے استعاراتی مفہوم کی تہہ تک پہنچیں۔ اب نقدِ شعر میں ایسا کوئی بندھا ٹکا اُصول یا طریقہ کار تو موجود نہیں ہے (اور نہ اُسے ہونا چاہیئے) کہ کون سا لفظ کس سیاق وسباق میں کس شئے، احساس یا جذبے کا استعارہ بنتا ہے۔ یہ تو قاری یا ناقد کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کسی علامت یا استعارے کو کیا مطلب پہناتا ہے۔ اب اگر ہم لفظ'' آنسو'' سے جوہری ہتھیار مراد لیتے ہیں تو شاعر کا نظریاتی جھکاؤ انسان دوستی، امن پسندی اور بشری اخلاقیات کے قریب نظر آئے گا اور اگر اِسے قیامت یا یوم الحشر کے معنی پہناتے ہیں تو نظم'' مورناچ'' مذہبی اقدار کی ترویج کا ذریعہ نظر آئے گی۔ اِس تمام قیاس آرائی کی اساس تو'' مورناچ'' کو انسانی جدوجہد اور بقائے انسانی کے لئے فرد کی تگ ودَو کا استعارہ قرار دینے پر قائم ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس نظم کی تخلیق کے وقت خود ندا کے ذہن میں بھی یہی سب کچھ رہا ہو یا قاری اس نظم کی تفہیم انہی خطوط پر کرے۔'' مورناچ'' بزم آرائی کا استعارہ بھی ہوسکتا ہے اور مباشرت کا بھی۔ اہم بات یہ کہ ندا کا شعری اُسلوب اس نظم میں بمقابلہ اُن کی پچھلی نظموں کے زیادہ علامتی اور پیچیدہ ہے اور اُسلوب کی اِس تبدیلی نے اُن کی آئندہ نظموں میں مزید گہرائی اور تہہ داری پیدا کردی ہے۔

یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ شاعر کے موضوعات اُس کے محور پر ہی چکراتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اُس کی تخلیقات اُس کی فطرت، عادات، حالات، افکار و حادثات کی من وعن ترجمانی بھی کرتی ہوں۔ ہر شاعر کی بہترین تخلیقات اُس وقت جنم لیتی ہیں جب وہ مختلف احساسات اور فکری دھاروں کے جدلی عمل سے گذر کر ایک حزنیہ آگہی کی منزل پر پہنچتا ہے۔ آگہی کی نوعیت یا ماہیت مختلف فنکاروں کے نزدیک مختلف ہوسکتی ہے تاہم اگر کوئی فنکار واقعتاً آگہی کی منزل پالیتا ہے تو اُس کی سوچ، مزاج اور تفکر میں حزن کا بُعد ضرور پیدا ہوگا۔ ندا فاضلی نے بھی گاؤں کی چوپالوں، شہر کی فٹ پاتھوں، خوشحال گھریلو زندگی کے تحفظات، بے گھر کی مشکلات، محبت کی سرشاری، محبت کی ناکامی و بےقراری، افلاس کی ذلت اور فارغ البالی کی نعمت کے مختلف النوع تجربات سے گذر کر بالغ نظری اور آگہی کی وہ منزل پائی ہے جس کا اظہار اُن کے تیسرے'' آنکھ اور خواب کے درمیان'' اور چوتھے'' کھویا ہوا سا کچھ'' شعری مجموعوں کی منظومات میں ہوا ہے۔ یہ دونوں مجموعے ندا کی بہترین شاعری کے مظہر ہیں۔ ان دونوں مجموعوں میں بڑی حد تک اُسلوبی اور موضوعاتی یکسانیت بھی ہے۔'' آنکھ اور خواب کے درمیان''

کی چند نظموں میں ہمیں دُنیا کی بوالعجبیوں کے تعلق سے طنز و اضطراب، حیرت و استعجاب کا ردِعمل بھی ملتا ہے لیکن بیشتر اُس آگہی کی تخلیق کردہ ہیں جو ندا نے بھوگ کر حاصل کی ہیں۔ ان تخلیقات میں ہمیں شاعر کے نرم و گرم اور سخت و سست تجربات کا نچوڑ ملتا ہے۔ ساتھ ہی اُسلوب، لفظیات بھی موضوعات کے پیشِ نظر متجانس ہیں۔ ان مجموعوں میں شاعر کا علامتی اور بالراست شعری اسلوب، لاشعوری استعمال کے سبب بہت زیادہ فطری اور خوش آہنگ لگتا ہے۔ لفظیات کے استعمال میں 'لے سانس بھی آہستہ' کے مصداق بے حد احتیاط نظر آتی ہے۔ نہ تو کوئی لفظ غیر ضروری طور پر استعمال ہوا ہے اور نہ کوئی ایسی صفت یا تشبیہ نظر آتی ہے جو موضوع کے جمالیاتی پہلو کو اُجاگر نہ کرتی ہو۔ ندا فاضلی کے شعری اسلوب میں مرئی حقائق غیر مرئی احساسات و جذبات میں ایسے مدغم ہو گئے ہیں کہ سُکھ دُکھ، محبت و نفرت، غم و غصہ، ہنسی، مسکراہٹ، آنسو، تنہائی اور اضطراب مکالمہ کرتے ہیں۔ زمین، آسمان، پیڑ پودے، پھول پتے، ندی، سمندر، میز، کرسی، فرج، الماری وغیرہ بہت ہی واضح انداز میں گفتگو کرتے ہیں دوڑتے بھاگتے، ہنستے کھیلتے، لڑتے جھگڑتے انسان لاکلامی کا شکار نظر آتے ہیں۔

ندا فاضلی کی شاعری ہمیشہ نظریاتی ہٹ دھرمی اور ادعائیت سے پاک رہی۔ ان دونوں مجموعوں کی منظومات بھی اسی رویے کی غمازی کرتی ہیں۔ جیسا اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ ندا فاضلی کی بالغ نظری اور حزن گزیدہ آگہی اُنھیں اپنی بات تخلیقی اور جمالیاتی پیرایے میں کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اُن کی بالغ نظری یا تفکر کا اظہار فلسفیوں جیسے منطقی پیرایے میں نہیں ہوتا۔ وہ حقائق کو اِس طرح بیان بھی نہیں کرتے جیسے وہ نظر آتے ہیں یا جس طرح اُنہیں کیمرے کی آنکھ مقید کر لیتی ہے۔ اُن کا فن درحقیقت سجے سجائے، بنے بنائے نقوش کو درہم برہم کر کے ایک ایسے کولاج کی تخلیق کرتا ہے جس پر مختلف زاویوں سے نظر کرنے پر مختلف عکس نظر آتے ہیں، مختلف احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ انسان کی عیاری، فرد کی تنہائی، سیاستدانوں کی چالبازیاں، فرقہ واریت کا زہر، فسادات کی لہر، مذہب کی تجارت، محبت، نفرت، وفاداری اور بے وفائی اور بالآخر ایک حساس انسان کے مقدر کی تنہائی، غرض سب کچھ اِس کولاج کا حصہ ہیں' صرف ان عکسوں کو دیکھنے والی آنکھ چاہیئے۔

اِس کولاج پر اگر ہم ناقدانہ نظر ڈالیں تو بعض نظموں میں خوشی الم کا، کامیابی ناکامی کا، حقیقت گمان کا، سچ جھوٹ کا، اخلاص عیاری کا، محبت نفرت کا، امن تشدد کا اور جاہ و حشمت افلاس کا پیکر بن کر اُبھرتے ہیں۔ اِس مقام پر پہنچ کر لفظ اپنے معنی کھو کر نئے نئے مکھوٹے لگاتے ہیں، حقیقت سراب میں

تبدیل ہو جاتی ہے اور ایک نئے حساس شاعر اِس بوالعجبی پر حیرت اور استعجاب کا اظہار کرتا رہ جاتا ہے۔ استعجاب کے مرحلے سے گذر کر جب وہ اِس بوالعجبی کو اپنی ذات میں انگیز کر لیتا ہے تو اُسے ہر شاکھ کی کوکھ میں ایک نئے دُکھ کا حمل ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے۔ اِس احساس کا اظہار ندا فاضلی کے تیسرے مجموعے'' آنکھ اور خواب کے درمیان'' کی ان نظموں' وقت سے پہلے، نئے گھر کی پہلی نظم، فاصلہ، سمجھوتہ، تماشا، نئی بیماری، آئینہ، دُور کا ستارہ، فاتحہ، اتفاق، تیسرا آدمی، سماجی شعور، سچائی، سونے سے پہلے، پرانے کھیل اور علاج وغیرہ بہت ہی تخلیقی اور جمالیاتی اسلوب میں ہوا ہے۔

اِس فکری نہج کی نمائندہ نظمیں اُن کے چوتھے مجموعے'' کھویا ہوا سا کچھ'' میں بھی ہیں' جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: کہیں کچھ کھو گیا ہے، نئی تلاش، ہمیشہ یونہی ہوتا ہے، میرا گھر، فرد کی موت، نیا دیوتا، جو ایک درد ہے، فرق اگر ہے تو اتنا ہی، ایک قومی رہنما کے نام، ایک افسانہ، جرمانہ، غلط نشانہ، یہ بستی ہے کیسی بستی اور سمجھدار لوگوں سے کہہ دو وغیرہ۔

ندا فاضلی کی شاعری میں جو فکری دھارا شروع ہی سے کہیں نہ کہیں موجود رہا ہے اور جو اُن کے تیسرے اور چوتھے مجموعے میں بہت نمایاں ہوا ہے وہ اُسی خواہش کی کوکھ سے جنما تھا جو کسی بھجن کے اس مصرعے '' مدھوبن تم کت رہت ہرے'' کو سن کر اُن کے دل میں پیدا ہوئی تھی اور جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ کائنات کے تمام مظاہر فطرت کو اپنی ذات میں ضم کر لینا یا اپنی ذات کو کائنات کی وسعت میں مدغم کرنے کی خواہش نے جہاں ندا فاضلی کے شعری اسلوب کو لوک گیتوں کی بصیرت افروز سادگی دی ہے وہیں اُن کی ذہنی تربیت میں بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ندا فاضلی کے تفکر کی اساس اس کائنات کے عضوی تصور پر مبنی ہے جس کی رُو سے تمام کائنات ایک نامیاتی اکائی قرار پاتی ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص مختلف واسطوں اور رشتوں سے تمام مظاہر فطرت سے اُسی طرح جڑا ہوا ہے جس طرح مختلف اعضا ایک جسم کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس تفکر کا منطقی اختتام خدا کو اپنی ذات یا خود کو خدا کے وجود میں محسوس کرنے پر ہوتا ہے۔

خدا کی اطاعت اور مذہب کی پیروی کا ایک عام تصور تو وہ ہے جس کو مذہبی قوانین کے تحت نافذ کئے گئے تمام احکامات کی تعمیل اور فرائض کی تکمیل ہی کو عین مذہب سمجھا جاتا ہے۔ یعنی فرد کے ظاہری اعمال پر ہی اُس کے مذہبی تشخص کا تعین کیا جاتا ہے۔ مذہب کے اس نوعیت کے تصور میں حقیقت مطلق بھی تمام کائنات میں جاری وساری نہ رہ کر صرف ایک مخصوص گروہ یا ملت کی تادیب وتہذیب کا منبع قرار پاتی ہے۔ ایک وسیع المشرب اور حساس فرد کے لئے جو خود کو اِس کائنات سے اسی طرح جڑا ہوا محسوس کرتا ہے جیسے

ایک پتہ کسی پیڑ کا حصہ ہوتا ہے' جو نہ صرف انسانوں بلکہ کائنات کے تمام مظاہر سے اپنی ذات کا رشتہ قائم کرتا ہے' مذہب کا یہ مسلمہ تصور نا کافی پڑتا ہے کیونکہ وہ مذہب کے اِس محدود نظریے سے خود کو روحانی اور جذباتی طور پر ہم آہنگ نہیں کر پاتا۔ ایسے شخص کی روحانی پیاس دینیات سے نہیں بلکہ تصوف سے بجھتی ہے۔ ندا فاضلی کی روحانی اقدار کو وحدت الوجود یا وحدت الشہود جیسی اصطلاحات کے حوالے سے سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش کرنا کچھ نامناسب سا لگتا ہے۔ اُن کے تفکر میں اسلامی تصوف اور ہندوستانی بھگتی کے دھارے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک ہمہ گیر انسانی اخلاقیات کی تشکیل کرتے ہیں جس میں حقیقتِ مطلق کائنات اور اِس کے تمام مظاہر ایک عضوی نظام کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ وہ جہاں رابعہ بصری کی طرح اِس نقطۂ نظر کے حامی نظر آتے ہیں کہ'' ذاتِ حقیقی کی محبت نے مجھ پر وہ عالم طاری کیا کہ اب میرے دل میں محبت یا نفرت یا اور کسی طرح کا احساس باقی نہیں رہا۔'' وہیں میرا بائی کے بھجنوں سے بھی اُنھیں تحریک ملتی ہے۔ وہ کبیر داس کی طرح ہندو مت اور اسلام کی انسان دوست روایات سے یکساں طور پر متاثر ہیں اور کبیر ہی کی طرح مذہبی رسوم و رواج، مذہبی قوانین اور مذہبی فرائض میں مقید مذہبی تصور سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ جب مندروں میں گھنٹیاں بجتی ہیں یا مسجدوں میں سجدوں کی مشعلیں روشن ہوتی ہیں تو وہ بے چراغ گلیوں میں خدا کو کھیلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ ذاتِ حقیقی کا جلوہ ہمہ وقت چاند، سورج، ماں کی مسکان، مزدور کے پسینے، موسموں کی تبدیلی اور محبوبہ کی رفاقت میں دیکھتے رہتے ہیں۔ جب نسلوں، ذاتوں، ریتوں، رواجوں اور مذہبوں میں بٹے ہوئے انسان اِس عضوی نظام کائنات میں اپنی شر پسندی اور تخلیق کاری سے خلل ڈالتے ہیں تو حقیقت مطلق خدا کی شکل میں زمین اور زمین باسیوں پر قہر نازل کرتی ہے۔

ٹیگور کی طرح ندا فاضلی بھی اپنے اخیر کے دونوں شعری مجموعوں میں کبیر داس سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں اور یہ اثر اُن کے اُن دونوں مجموعوں کی کئی تخلیقات پر بہت نمایاں ہے۔ اُن کے تیسرے مجموعے'' آنکھ اور خواب کے درمیان'' کی اِن نظموں: شکایت، انتشار، انتقام (قہار)، گلاب کا پھول، کھلونے، پیسے کا سفر، خدا کا کوئی گھر نہیں، فیصلہ، والد کی وفات پر وغیرہ کے علاوہ اکثر غزلوں اور بیشتر گیتوں اور چوتھے مجموعے'' کھویا ہوا سا کچھ'' کی اِن نظموں: شناخت کی دُعا، جو اِس گھڑی نام ہے تمہارا، ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی، کوئی اکیلا کہاں ہے، حمد، سپنا زندہ ہے، پہلی چنگاری، نئے سال کی پہلی نظم، چھوٹا آدمی، آخری سچ، روشنی کے فرشتے، ہم رُتبہ، ناجائز اولاد، مجھے یاد ہے، صورت سے مورت تک، آکاش

دغیرہ کے علاوہ کئی غزلوں اور تقریباً تمام دوہوں پر تفکر کی وہ چھاپ نظر آتی ہے جو کبیر داس کے گیان اور ندا فاضلی کی عصری بصیرت کے جدلی عمل کی پیدا شدہ ہے۔ ندا فاضلی نے شعوری طور پر اپنی تخلیقات کو روایتی، پُر تکلف اور درباری اندازِ بیان سے محفوظ رکھا ہے۔ اِن کے اُسلوب کی تازگی اور لفظوں کی سادگی نے اُن کی شاعری کو ایک منفرد کردار بخشا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود ندا فاضلی نظموں، گیتوں اور دوہوں کے ساتھ ساتھ شروع سے ہی غزلیں بھی کہتے رہے ہیں۔ صنفِ غزل جس کی مشاطگی بڑی حد تک درباروں میں ہوئی اور جس کی ہیئتی جکڑ بندیاں اور روایتی لفظیات بظاہر ندا فاضلی کی بنجارہ مزاجی سے میل نہیں کھاتیں، ندا کی شاعری میں بھی اپنا جادو جگاتی ہے۔

ندا فاضلی غزل کی روایتی پرداخت کے باوجود اس سخت جان کا فرادا صنفِ سخن کے حمایتی ہیں۔ وہ اِس کے فارم میں اصلاح یا تبدیلی کے داعی بھی نہیں ہیں۔ اسی سبب اُنھوں نے کبھی ''آزاد غزل'' کہنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اُنھوں نے غزل کی ہیئت کا احترام کرتے ہوئے وسعت مضامین اور نئی لفظیات (اُردو غزل میں عام طور پر غیر مستعمل ڈکشن) کے ذریعہ اپنی غزل کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اُن کی اکثر غزلیں بحر، ردیف، قافیہ، مطلع غرض صنفِ غزل کی تمام پابندیوں کو نباہنے کے باوجود اُردو کی روایتی غزل سے مختلف ہیں۔ اُن کی غزلوں کی تازہ کاری کا سبب بڑی حد تک اُن کی لفظیات میں پوشیدہ ہے۔ اُردو غزل کی تاریخ میں غالب وہ پہلا اہم شاعر تھا جس نے غزل کی لفظیات اور مضامین میں انقلابی تبدیلیاں کی تھیں۔ غالب کی دانشوری اور تفکر کا اظہار اُن سے پیشتر روایتی ڈکشن میں ممکن نہیں تھا اور اسی سبب اُن کی کئی غزلوں میں ہمیں بہت زیادہ مفرس ڈکشن کا استعمال نظر آتا ہے۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود غالب کو صنف غزل کی کم مائیگی کا احساس تھا اور اِس لئے اُن کی یہ شکایت بڑی حد تک بجا بھی ہے۔

بہ قدر شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالب کے بعد حالی نے بھی اصلاحِ غزل پر زور دیا تھا لیکن اُن کی اصلاح کا دائرہ صرف غزل کے موضوعات کی حد تک تھا۔ حالی نے غزل کی ہیئت یا لفظیات میں اصلاح کی بات نہیں کی تھی۔ لیکن اقبال نے نہ صرف اُردو غزل کے روایتی مضامین سے گریز کیا بلکہ اپنی بات کے اظہار کے لئے بالکل یہ مختلف تشبیہیں، استعارے اور الفاظ استعمال کئے۔ اقبال کی غزل کے درج ذیل رنگ و آہنگ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

کو سننے کے بعد حفیظ جالندھری جیسے شاعر نے (جو اقبال کی شاعری کے بے حد دلدادہ تھے) اقبال کی غزل کو غزل ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ تاہم دُنیا نے دیکھا اور وقت نے ثابت کر دیا کہ صنفِ غزل میں اس کی ہیئت کا احترام کرنے کے باوجود تخلیقی تجربات کے امکانات موجود ہیں۔

ندا فاضلی غزل میں اسی قسم کے شعری تجربات کر رہے ہیں۔ غزل کے مضامین یا فکری اثاثے پر ضرورت سے زیادہ زور دینا کسی ایک شعر میں بیان کئے گئے کسی خاص نکتہ یا فکری رویے کی بنیاد پر شاعر کے نظریۂ حیات پر حتمی فیصلے صادر کرنا کچھ نامناسب طرزِ عمل ہے۔ غزل میں بات اشاروں، کنایوں میں ہوتی ہے' ایمائیت اِس صنف کا خاصہ ہے۔ علاوہ ازیں استعاروں، تشبیہوں اور رموز و علائم کے استعمال سے غزل کے شعروں میں معنوی تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے اور بسا اوقات یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک شعر میں مفہوم و معنی کی کون سی تہہ قطعی اور آخری ہونے کا درجہ رکھتی ہے۔ اِس لئے موضوعات یا مضامین کی حد تک ندا کی بیشتر غزلوں میں انہی فکری رویوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے جن کا ذکر اُن کی نظموں پر بحث کرتے وقت کیا گیا ہے۔ غزل کی ساخت اور ہیئت ویسے بھی وحدتِ خیال یا فکری تسلسل کے منافی ہے۔ اس کے اشعار میں کوئی موضوع یا مضمون بالتفصیل بیان ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ کسی فکری رویے کی ایک جھلک یا کسی احساس کی ایک رمق دو مصرعوں میں دکھائی جاتی ہے اور قاری کے ذہن میں کسی خیال یا احساس کی روشنی کا ایک ننھا سا دیا روشن ہو جاتا ہے۔

غزل کی ریزہ خیالی یا اس صنفِ سخن کا حسن بھی ہے اور اِسی وصف کی بنا پر یہ مطعون بھی رہی ہے۔ ریزہ خیالی سے حسن ایسے پیدا ہوتا ہے کہ غزل کے مختلف اشعار میں مختلف مضامین اور احساسات کے بیان سے مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کا ایک گلدستہ بن جاتا ہے اور اِس طرح ہم ہیئتی وحدت میں مضامین کی کثرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تاہم غزل کے معترضین اس کی ریزہ خیالی کے سبب ہی اِس سے نالاں ہیں۔ اُن کی رائے میں چونکہ غزل اپنی ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے وحدتِ خیال کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔ اِسی لئے یہ صنف بڑی شاعری (جس میں فکر کی گہرائی اور تخیل کی پرواز کے امتزاج سے کوئی عظیم الشان شعری شہ پارہ تخلیق کیا گیا ہو) کے لئے قطعی ناموزوں ہے۔ یعنی غزل بڑے کینوس کا نہیں بلکہ مینارۂ نور کا آرٹ ہے۔ تاہم ندا فاضلی کی کئی غزلوں میں ہمیں وحدتِ خیال نہ سہی وحدتِ تاثر کا احساس

ضرور ہوتا ہے۔ نہ صرف روایتی نقطہ نظر سے بلکہ بیشتر عصری ناقدین کی رائے میں بھی یہ شعری نگارشات درحقیقت غزل کے فارم میں لکھی گئی نظمیں ہیں لیکن ندا فاضلی اِس رائے سے متفق نہیں ہیں۔ اُن کی غزل کا ہر شعر مضمون کی حد تک ایک اِکائی ضرور ہوتا ہے اور اِس معنوں میں غزل کے شعر کی تعریف میں آتا ہے لیکن خود مکمل غزل میں کسی مخصوص احساس یا تاثر کی ایک زیریں لہر بہتی رہتی ہے اور یہی وحدت تاثر اُن کی غزل کو معنوی تہہ داری اور جمالیاتی شان عطا کرتی ہے۔ اُن کی بعض غزلوں کے اشعار کی قرأت سے اِس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ جو جذبہ، نکتہ یا مضمون لفظوں میں بیان ہوا ہے اُس کے پسِ پردہ ایک مختلف جذبہ، نکتہ یا مضمون بھی موجود ہے جس کے اظہار کے لئے الفاظ استعمال نہیں ہوئے لیکن اِس کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ غزل کے شعر کا یہ وصف ہمیشہ ہی قابل قدر شعر کی علامت رہا ہے۔ یعنی شعر کا مفہوم وہاں سے شروع ہوا جہاں الفاظ کے لغوی معنوں کی حد ختم ہوجائے۔ ندا فاضلی اِسے فلیش بیک تکنیک کا نام دیتے ہیں۔ اِس اصطلاح سے اُن کی مراد یہ ہے کہ اِس قماش کی غزلوں کے ہر شعر کی جڑیں کسی واقعہ، واردات یا کہانی میں پیوست ہوتی ہیں۔

گو کہانی یا واقعہ کا براہ راست اظہار شعر میں استعمال شدہ الفاظ سے نہیں ہوتا لیکن ایک باذوق قاری بین السطور میں بہت کچھ پڑھ لیتا ہے۔ مثلاً (نظموں پر بحث کرتے ہوئے میں نے طوالت سے بچنے کے لئے اقتباسات نہیں دئے بلکہ صرف عنوانات پر اکتفا کیا لیکن غزل کے سلسلے میں مجبوری ہے اِس لئے چند اشعار نقل کرنا ضروری ہے)

کہیں کہیں سے ہر چہرہ تم جیسا لگتا ہے
تم کو بھول نہ پائیں گے ہم ایسا لگتا ہے

بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا
جو بیت گیا ہے وہ گذر کیوں نہیں جاتا

ندا فاضلی کی غزلوں کی سب سے اہم خصوصیت اُن کی نئی لفظیات ہے اور اِس اعتبار سے اُنھوں نے نہ صرف بڑی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غزلوں میں عام فہم، سیدھی سادی، ہندی آمیز زبان کا استعمال کیا بلکہ تشبیہیں، استعارے، پیکر اور علامتیں بھی ہندوستان کے دیہاتوں، قصباتی محلوں اور شہر کی فٹ پاتھوں سے چنے ہیں۔ اُن کی غزلیں جیتی جاگتی ہندوستانی تہذیب کی آئینہ دار ہیں اور اپنے ذکشن اور وحدتِ تاثر کے سبب گیتوں سے قریب لگتی ہیں۔ چند غزلوں کے مطلع دیکھئے۔

نیل گگن میں تیر رہا اُجلا اُجلا پورا چاند
ماں کی لوری سا ، بچوں کی دودھ کٹوری جیسا چاند

پیا نہیں جب گاؤں میں
آگ لگے سب گاؤں میں

ساجن جنگل پار گئے ' میں چپ چپ راہ تکوں
بچھیا بیٹھی تھان میں اونگھے ' کس سے بات کروں

خط ہے کہ بدلتی رُت یا گیتوں بھرا ساون
اِٹھلاتی ہوئی گلیاں ' شرماتے ہوئے آنگن

دُکھ میں نیر بہادیتے تھے ' سُکھ میں ہنسنے لگتے تھے
سیدھے سادے لوگ تھے لیکن ' کتنے اچھے لگتے تھے

گرج ، برس ، پیاسی دھرتی پر ' پھر پانی دے مولا
چڑیوں کو دانے ، بچوں کو ' گڑ دھانی دے مولا

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں

یہ ڈکشن اُردو غزل کے لئے یقیناً نیا ہے۔ اِن غزلوں میں استعمال کی گئی تشبیہیں ، استعارے ، پیکر اور علامتیں بھی اُردو غزل میں مروج صنائع بدائع سے مختلف ہیں۔ یہ غزلیں ہمارے دیس کی تہذیب کی عکاس ہیں اور اِسی سبب اُنہیں پڑھ کر یا سن کر ہمیں اِن سے ایک جذباتی ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اِس ڈکشن کی وجہ سے اِن غزلوں میں ایک تازگی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ اِن معنوں میں ندا فاضلی نے اُردو غزل کے سرمایے میں یقیناً ایک قابلِ تحسین اضافہ کیا ہے۔

اُردو غزل کے ڈکشن کو تبدیل کرنے کا اُن کا یہ جرآت مندانہ تجربہ کس حد تک کامیاب ہوگا یہ تو ظاہر ہے وقت ہی بتائے گا' لیکن اتنا ضرور ہے کہ ندا فاضلی نے اُردو غزل کے مہکتے چمن میں اپنے دیس کی بو باس بھی شامل کر دی ہے جو ایک قابل ستائش عمل ہے۔

●●

آنکھ اور خواب کا منظر کش......ندا فاضلی

● رفیعہ شبنم عابدی

"آنکھ اور خواب کے درمیان" ندا فاضلی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل کے دو شعری مجموعے "لفظوں کا پُل" اور "مور ناچ" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس لحاظ سے ندا فاضلی ایک ایسا نام ہے جس کا ذکر ادبی تحریروں، مشاعروں اور ادبی محفلوں میں اکثر و بیشتر سنائی دیتا ہے۔ بعض اُسے انتہائی بدمزاج، منھ پھٹ اور بدسلیقہ قرار دیتے ہیں، بعضوں کے نزدیک وہ بڑا اصاف گو اور حقیقت پسند ہے جو زہر ہلاہل کو قند نہ کہہ سکنے کے باعث اپنوں کو خفا اور بے گانوں کو ناخوش کرتا ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک وہ بالکل غیر مہذب، ناشائستہ اور Uncultured ہے۔

مگر ان مختلف آراء کے باوجود اس حقیقت کا سب اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ایک طباع، ورخلاق ذہن کا مالک ہے اور بلا کا ذہین۔ ندا کی ذہانت ایک خداداد عطیہ ہے، جس کی قدر وہ خود کرے نہ کرے البتہ اُس کے احباب و متعلقین ضرور کرتے ہیں۔ یہ ذہانت "لفظوں کا پُل" سے لے کر "آنکھ اور خواب کے درمیان" تک بکھری ہوئی ہے۔ اُس کی باتوں، لفظوں، فقروں، جملوں، لطیفوں، شعروں، غزلوں، نظموں اور گیتوں میں ہر جگہ اُس کی ذہانت کا مظاہرہ ہوتا ہے لیکن اس ذہانت میں تھوڑا کرب، تھوڑا تمسخر اور تھوڑی تلخی موجود ہے۔ یہ تلخی کچھ تو اپنی فطرت کی پیدا کردہ ہے اور کچھ وقت اور حالات کی دین ہے، جس کا اعتراف وہ خود بھی کرتا ہے۔

دُنیا نہ جیت پاؤ تو ہارو نہ خود کو تم
تھوڑی بہت تو ذہن میں ناراضگی رہے

لیکن یہ عجیب سی بات ہے کہ یہ ناراضگی ایک خول ہے، ایک نقاب ہے، ایک دِکھاوا ہے۔ وہ بظاہر کڑوا مگر حقیقتاً ایک مخلص انسان ہے اور "دل ملے نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیئے" کی تبلیغ ضرور کرتا ہے، لیکن خود کسی سے بغیر دل ملے، ہاتھ ملانے کو تیار نہیں۔ مگر جس سے اور جب تک ملتا ہے، دل ہی سے ملنے کا قائل ہے۔ رسم دُنیا نباہنے کے لئے رشتوں کی تجارت کرنا اُسے قطعی پسند نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ملاقات کی

یکسانیت سے بہت جلد اُوب جاتا ہے اور نقشہ اُٹھا کر نیا شہر ڈھونڈنے لگتا ہے۔ ''ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی اُس کا شیوہ ہے۔''

زندگی کے تئیں ندؔا کے اِسی رویّے نے اُس کی شاعری میں جدت طرازی کو جنم دیا ہے۔ وہ اچھوتے اور نئے موضوعات کی دُھن میں سیاست، مذہب، سماجیات، فلسفہ اور نفسیات تک کے میدانوں کی سیر کرتا ہے اور آخر کار اِسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

ذہانتوں کو کہاں کرب سے فرار ملا
جسے نگاہ ملی اُس کو انتظار ملا

ندؔا کی یہ منتظر نگاہ اِس ''تیسری آنکھ'' کی حیثیت رکھتی ہے جو جوگی بن کر جنگل، جنگل، بستی، بستی حقیقتوں کی تلاش میں نکل پڑتی ہے اور وہ تمام منظر دیکھ لیتی ہے جن پر سے سائنٹفک، تکلفات اور تہذیبی وثقافتی روایات نے دبیز پردے ڈال رکھے ہیں۔ یہ کیفیت ایک ایسے خواب زار میں لے جاتی ہے۔ جہاں ندؔا کو اُس سکون کا احساس ہوتا ہے جو بُدھ کو گیا کے درخت کے نیچے اُس وقت ہوا تھا جب وہ دُنیا تیاگ کر گھر سے چلا تھا۔ ایک گرہست زندگی سے فرار اور تجرّد کا میلان۔ مگر بہت جلد آنکھ اور خواب کے درمیان کا یہ فاصلہ ندا کو اِس حقیقت سے رُوشناس کرا دیتا ہے کہ تجرّد عرفان کی منزل نہیں' اُس راہ کا ایک چھوٹا سا مرحلہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ سنگ میل ہے۔ عرفان اور گیان تک پہنچنے کے لئے خود آ گہی اور خدا آ گہی ہی کافی نہیں ہے بلکہ آدم آ گہی اور عالم آ گہی بھی ضروری ہے' جس کا مرکز گھر ہے۔ ندؔا کو یہ احساس ہوتا ہے گھر میں رہنے کی عبادت گھر چھوڑ جانے سے کہیں بڑی ہے۔ اِس لئے وہ فیصلہ کرتا ہے کہ۔

اپنا غم لے کے کہیں اور نہ جایا جائے
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سنوارا جائے

ندؔا کی شاعری میں ''گھر'' کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ غزلیں ہوں، گیت ہوں یا نظمیں' ہر جگہ ندؔا ایک گھر..... جو صرف سجی ہوئی دیواروں، ٹی وی، فرج اور صوفے سے ہی عبارت نہیں بلکہ لبوں کے خم جھکی آنکھوں کی بولتی تصویریں، بہن کی شوخ ہنسی، ماں کے پیار کا درپن، بھیگے دوپٹوں، مہندی کے بوٹوں اور شاخوں پر پھول کی طرح کھلے ہوئے بچوں سے مزین ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بنجارہ مزاج ندؔا کے اندر کہیں ایک 'گرہست'' موجود ہے جو ایک گھر کے ساتھ ساتھ ایک اچھی سی گرہستن کا خواہش مند ہے۔ جیسے ریشم کا کیڑا اپنے لُعابِ دہن سے خود اپنی

محافظت کے لئے ایک خول بناتا ہے جس کے اندر وہ ساری دُنیا سے چھپ کر رہتا ہے اور جب چاہتا ہے اُس میں سے جھانک کر دُنیا کو دیکھ لیتا ہے۔ یہ گھر ندؔا کی پوری شاعری میں موجود ہے بلکہ اُس کے ہر احساس کے پیچھے اُس گھر کی پرچھائیں ملے گی۔ مختلف رنگ لئے قدم قدم پر یہ گھر اُسے اپنے پاس بلاتا ہے، آواز دیتا ہے۔

کس سے پوچھوں کہ کہاں گم ہوں کئی برسوں سے
ہر جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے مجھے گھر میرا

ہم ہیں کچھ اپنے لئے' کچھ ہیں زمانے کے لئے
گھر سے باہر کی فضا' ہنسنے ہنسانے کے لئے

اُس کو رُخصت تو کیا تھا' مجھے معلوم نہ تھا
سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جانے والا

گھر کی دہلیز سے گیہوں کے کھیت تک
چلتا پھرتا کوئی کاروبار آدمی

چاند میں کیسے ہوئی قید کسی گھر کی خوشی
یہ کہانی کسی مسجد کی اذاں سے سنئے

ندؔا کے یہ تمام اشعار پڑھئے تو ہندوستان کے اُس گھر کی کہانی ہماری سمجھ میں آجاتی ہے جس گھر کی دیواروں کی زینت کے لئے ہر مرد دہلیز سے" گیہوں کے کھیت" تک کا سفر کرتا ہے اور یوں گھر کی دیواریں ہی اُس سے اُس کا گھر چھین لیتی ہیں اور ہر گھڑی بھاگتے رہنا اُس کا مقدر بن جاتا ہے۔ ندؔا بھی اُسی گھر کی تلاش میں اُس گھر سے نکلا تھا لیکن شاید اُسے گھر پہنچنے میں دیر ہوگئی اور دیر ہو جانے پر کھویا ہوا گھر آسمان کا ستارہ بن گیا جو دور سے بلاتا تو ہے لیکن پاس نہیں آتا۔

تم جو سوچو وہ تم جانو' ہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر جانے میں ورنہ گھر کھو جائیں گے

بنجارا مزاجی کے تمام مزے لوٹنے کے بعد ندؔا اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ساری دُنیا انسان کا گھر ہے' انسان جہاں بھی رہتا ہے اُس کا گھر اُسے واپس بلا ہی لیتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جسے آج کا" سائنس

گزیدہ''نا آسودہ فرد مشکل ہی سے سمجھ پاتا ہے۔

تم جہاں بھی رہو
اِسے گھر کی طرح سجاتے رہو
گلدان میں پھول لگاتے رہو
دیواروں پر رنگ چڑھاتے رہو
سجے بنے گھر میں
ہاتھ پاؤں اُگ آتے ہیں
پھر تم کہیں جاؤ
بھلے ہی تم اپنے آپ کو بھول جاؤ
تمہارا گھر
تمہیں ڈھونڈ کر واپس لے آئے گا

یہ گھر جو ایک فرد کو ڈھونڈ کر واپس لے آتا ہے' دراصل وہی اُسے رشتوں کی ڈور سے باندھتا ہے وہ مستحکم اور پاکیزہ رشتے جو جسموں سے روحوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور سارے عالم کو منتشر ہونے سے بچاتے ہیں۔ حقیقت اور مجاز کے مابین خدا اور ہمارے بیچ آنکھ اور خواب کے درمیان یہی رشتے تو ہیں جو کائنات کی لایعنیت اور خوفناک سناٹے کو ایک معنویت اور شیریں شور وغل عطا کرتے ہیں رشتوں کا یہ چکر ہی زندگی کی خوشیوں اور سچائیوں کا ضامن ہے۔ ندا اُن بنتے بگڑتے، ٹوٹتے جڑتے رشتوں کا سچا قدر دان ہے اور اُن کی حقیقتوں کا عرفان رکھتا ہے۔

یہ میرا تمہارا
جو رشتہ ہے
اِک راستہ ہے
میں تم سے گذر کر ہی
تم تک پہنچنے کی رفتار ہوں
میرا آغاز تم
میرا انجام تم

تمہیں دیکھ کر میں تمہیں سوچتا ہوں
تمہیں پا کے ہی
میں تمہیں کھوجتا ہوں
تم اپنے بدن کے سمندر میں
صدیوں سے پوشیدہ
اِک خواب ہو
اور میں
خون کی تیز گردش میں بنتی ہوئی آنکھ ہوں

ان رشتوں کی سچائی کا جیتا جاگتا روپ انسان کی معصومیت ہے جو کسی بچے کی شکل میں مسکراتی ہے۔ بچہ جو سچائی ہے ندؔا اس بچے کی تلاش میں مسجدوں، مندروں، بے چراغ گلیوں، ساحلوں اور چاند ستاروں تک پہنچتا ہے۔

مسجدوں مندروں کی مشعلیں ہوئیں روشن
بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلوں یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

اے شام کے فرشتو! ذرا دیکھ کے چلو
بچوں نے ساحلوں پہ گھروندے بنائے ہیں

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

ندؔا کو اپنے آس پاس اس بچے کی کمی اُس وقت محسوس ہوتی ہے جب رُخصت ہوتے وقت اُس کی چھوٹی بہن اٹیچی میں کپڑوں کے نیچے چپکے سے اُسے اپنے بچوں کی تصویر رکھ دیتی ہے اور ائرپورٹ پر اٹیچی کھولنے پر جب یہ تصویر ندؔا کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے تو اُس کے احساس میں دُور دُور تک ایک عجیب سی اُتھل پتھل ہوتی ہے۔ یہ خیال اُسے چین نہیں لینے دیتا کہ چھوٹی بہن ہو کر بھی اُس نے ماں کی طرح دُعا دی ہے۔ یہ انسانی زندگی کی ایک ایسی سچائی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاید اس نظم کے اندر وہ معصوم

خواہش دبی ہوئی ہے جو گھر اور گرہستی کے خوابوں میں گھرے ہوئے ایک لاابالی، نا آسودہ شاعر کے دل کی پکار ہے جو زندگی کی آویزشوں سے برسرِ پیکار ہے اور گھر کی صدا پر لبیک کہہ کر لوٹنا چاہتے ہوئے بھی نہیں لوٹ پاتا۔ گھر، بچہ اور رشتوں کے علاوہ بھی ندا کی غزلوں کے کچھ اور موضوعات ہیں۔ مثلاً:

''شہری زندگی کا کرب جو وہ برسوں سے جھیل رہا ہے۔ ذات کی شکست و ریخت کا احساس اور جھنجھلاہٹ، محبت اور اُس کی ناکامی کے سماجی و معاشی اسباب و عِلل، عہدِ حاضر کی خودغرضی اور مطلب پرستی، دوسرے کو گرا کر خود آگے بڑھنے کی روِش، انسانیت اور امن پسندی کے خواب اور اُن کا انتشار''۔ وغیرہ وغیرہ۔

اپنی طرح سبھی کو کسی کی تلاش تھی
ہم جس کے بھی قریب رہے دُور ہی رہے

یہ شہر ہے کہ نمائش لگی ہوی ہے کہیں
جو آدمی بھی ملا بن کے اشتہار ملا

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

میرے تیرے چولہوں میں تو اتنی آگ نہیں تھی
جس سے سارا شہر جلا ہے' کوئی پرچم ہوگا

''آنکھ اور خواب کے درمیان'' کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ گیتوں کا ہے، دوسرا غزلوں کا اور تیسرا نظموں کا' اور اسی میں ندا کا ذہنی سفر بھی منزل منزل آگے بڑھتا ہے۔ ندا کے گیتوں میں دھرتی کی بُو باس ہے، گاؤں کی زندگی کا حسن ہے، موسموں کی دلکشی ہے، جذبات کی معصومیت ہے اور ترشح ہے جو پہلی بارش کے بعد زمین کو مہکا دیتا ہے۔ اِن گیتوں کو پڑھنے سے ایک احساس جاگتا ہے جیسے جاڑوں کا موسم ہے اور دُور کہیں ہلکے ہلکے شعلے اُٹھ رہے ہیں یا ساون کا مہینہ ہے، آسمان پر بدلیاں چھائی ہیں اور ہلکی ہلکی رِم جھم کھیتوں اور کھلیانوں کو شاداب کر رہی ہے۔ آموں کے پیڑوں پر کوکتی کوئل کے نغموں جیسے گیت ہیں۔ ندا کے تصورات اُبھرتے ہیں تجریدی عکس بناتے ہیں اور اُن عکسوں کے گڈمڈ ہو جانے سے کئی سمعی، بصری اور لمسی پیکر جنم لیتے ہیں۔ خوبصورت اور دلکش پیکر۔ مثلاً:

'' ہاتھ میں آگ لئے بیچ ندی میں نہاتی ہوئی رات، تتلی کے اُڑتے رنگوں میں جھولا ڈالنے والا ساون، برکھا کے ہاتھوں سے دُھلی ہوئی، پیڑوں میں چھپ چھپ اُودھم مچاتی ہوئی ہوائیں، انگوٹھا دِکھاتا ہوا مہندی کا بوٹا، آنچل سے منہ ڈھک کے سوتی ہوئی دوپہر، وغیرہ۔ ہندوستان کے دیہاتوں کی ساری رومانی، دلکشی اِن گیتوں میں سما گئی ہے۔ ندا کی غزلوں میں غنائیت نہیں ملتی' اُن میں تلخی ہے، ترشی ہے، طنز ہے، کرب ہے، بے رحمی ہے، جھنجھلاہٹ ہے اور تشدد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ندا کے گیتوں کا گاؤں، اُس کی غزلوں میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ وہاں صرف شہر ہے، شہر کی بھاگتی ہوئی زندگی، بھاگتے ہوئے لوگ، دوڑتی ہوئی کاریں، نقابوں میں چھپے ہوئے چہرے، تکلفات سے بھرپور تعلقات، جذبات کی جھوٹی نمائشیں اور ریاکاری اور مکروہ سیاستیں ملتی ہیں۔ فلموں تک آتے آتے ندا کا ذہنی سفر اور آگے بڑھتا ہے۔ اب اُن کی نظر نہ صرف اپنے گاؤں پر ہے نہ محض شہر تک، اُس کی نگاہ محدود ہے۔ ندا کی آنکھ اب سارے عالم کی سیر کرتی ہے اور اس وسعتِ نظر کے لئے غزل کا تنگ مایہ کافی نہیں ہوتا۔ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لہٰذا ندا نظموں کے فارم کا سہارا لیتا ہے۔ نظمیں جو آزاد بھی ہیں اور نثری بھی۔ اُن میں وہ اپنے خیالات کو آزادانہ طور پر پیش کر سکتا ہے۔ ندا کی نظموں میں دُنیا ملتی ہے، عالمی انتشار ملتا ہے۔ اِس سرے سے اُس سرے تک پھیلی ہوئی سیاست، اقتدار کی جنگ، ایٹمی باداوں کا نزول، سائنٹفک ترقی کی رحمتیں اور زحمتیں، سماجی تصویریں، فلسفے کی موشگافیاں، نفسیاتی اُدھیڑبن، امن و انسانیت کی ظاہری باتیں، جنگ کی تباہ کاریاں وغیرہ۔ ان میں کچھ نظمیں ایسی ہیں جو خالص رومانی کہلائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً:

'' وقت سے پہلے''، '' ایک خط''، '' شکایت''، '' بےخبری''، '' فاصلہ''، '' دیوانگی باقی رہے''، '' انتظار'' اور '' سمجھوتا'' وغیرہ۔ اِن میں بعض جگہ نفسیات کی بڑی دلکش تصویریں ملتی رہتی ہیں۔ خصوصاً حسن کی نفسیات لیکن اِن نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عشق و محبت کے بارے میں بھی ندا کا رویہ عام انداز سے ہٹ کر ہے۔ اُس کی محبت بیمار نہیں بلکہ صحت مند جذبات کی حامل ہے، وہ ہر حقیقت کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کو تیار ہے۔

فقط ایک تم ہی نہیں ہو
یہاں جو بھی اپنی طرح سوچتا ہے
زمانے کی نیرنگیوں سے خفا ہے
ہر اِک زندگی اِک نیا تجربہ ہے

تمہاری شکایت بجا ہے
مگر تم سے پہلے بھی
دُنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے
یہی کل بھی ہوگی

کچھ نظمیں سماجی موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ مثلاً

''نئے گھر کی پہلی نظم''، ''گلاب کا پھول''، ''پیسے کا سفر''، ''سماجی شعور''، ''لگاؤ''، ''کامیاب آدمی''، ''محبت''، ''تماشہ''، ''سونے سے پہلے'' وغیرہ۔ کچھ نظموں میں ندؔا کا انداز فلسفیانہ ہے۔ مثلاً:

''جسم کی جستجو''، ''فاتحہ''، ''اتفاق''، ''سچائی''، ''علاج'' وغیرہ۔ ''عمر کا فرق'' Generation Gap پر ایک خوبصورت نظم ہے۔ اِس مجموعہ کی بہترین نظمیں وہ ہیں جو عالمی موضوعات کا اِحاطہ کرتی ہیں۔ مثلاً: ''انتقام''، ''خدا کا گھر نہیں کوئی''، ''فیصلہ''، ''جنگ''، ''قومی یکجہتی''، ''پرانے کھیل'' اور ''شرط'' وغیرہ۔ اِن تمام غزلوں، نظموں اور گیتوں سے گذرنے کے بعد ایک شاعر کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے جو ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ حساس بھی ہے اور دل دردمند بھی رکھتا ہے۔ اِسی احساس نے اِس کے لفظوں میں تلخی اور تندی پیدا کردی ہے۔ مگر لہجے کی شاعرانہ دلکشی اُسے مجروح ہونے نہیں دیتی۔ ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' سے گذرتے ہوئے ندؔا کا یہی شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے

گذرو جو باغ سے تو دعا مانگتے چلو
جس میں کھلے ہیں پھول وہ ڈالی ہری رہے

(حرف حرف چہرے)

●●

خوش حال گھر، شریف طبیعت، وطن پرست
وہ شخص تھا زیادہ مگر آدمی تھا کم

زندگی کی کشتی اور ندا فاضلی

● انور ظہیر خاں

نہیں یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں.........وہ تو
نہ جانے کون تھے؟
یہ سب کے سب تو میرے جیسے ہیں
سبھی کی دھڑکنوں میں ننھے ننھے چاند روشن ہیں
سبھی میری طرح سے وقت کی بھٹی کے ایندھن ہیں
جنھوں نے میری کٹیا میں اندھیری رات میں گھس کر
میری آنکھوں کے آگے
میرے بچوں کو جلایا تھا
وہ کوئی اور تھے
وہ چہرے تو کہاں اب ذہن میں محفوظ جج صاحب!
مگر ہاں!
پاس ہوں تو سونگھ کر پہچان سکتی ہوں
وہ اسی جنگل سے آئے تھے
جہاں کی عورتوں کی گود میں
بچے نہیں ہنستے.........!

جلگاؤں کے فساد میں ایک عورت ہاجرہ بیگم کے جیتے جاگتے چار بچوں کو آگ میں بھسم کر دیا گیا تھا۔اس پس منظر میں کہی گئی یہ نظم جب بھیونڈی کے فساد ۱۹۷۰ء کے فوراً بعد ماہنامہ ''شاعر (بمبئی)اور روزنامہ ''انقلاب'' (بمبئی) میں چھپی تو اس کی معنویت اس لحاظ سے کئی گنا بڑھ گئی کہ بھیونڈی میں فساد

کے دوران وحشت و بربریت کا جو ننگا ناچ ہوا وہ رُڑکیلا اور رانچی، جبل پور اور جلگاؤں کے فساد کو شرما رہا تھا۔اس کے چھپتے ہی ''میں'' اور ''میری'' کی تکرار کے باوجود نظم اور صاحبِ نظم کی دھوم مچ گئی۔ گھروں، دفتروں، چائے خانوں، غرض بوڑھوں اور نوجوانوں میں گفتگو کا موضوع بنی۔ نظم ہنگامی موضوع پر تھی، مگر اپنی تاثیر کی وجہ سے مقبول ہوئی۔ میں اس زمانے میں آٹھویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ نظم نوکِ زبان ہو گئی تھی۔

بمبئی کی ایک شام' دن بھر کا تھکا ماندہ سورج رات کی آغوش میں سونے جا رہا ہے ابھی کچھ ہی دیر میں دودھیا اور ہلکے نارنجی قمقموں کا اُجالا دور تک پھیل جائے گا۔ میں اپنے اسکول کے ساتھی راشد شیخ اور احمد منظور سے باتیں کر رہا ہوں کہ مارواڑی چال کی راہداری سے دو آدمی مولانا آزاد روڈ کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ راشد نے آنکھ کے اشارے سے کہا۔'' وہ دیکھو نور احمد! (ن۔ا۔ناظر) کے ساتھ ندؔا فاضلی چلے آرہے ہیں میں نے بڑھ کر ادب سے آداب کے بعد عرض کیا۔'' ندؔا صاحب آپ کی نظم'' جنگل کے لوگ'' پڑھی بڑی پُر اثر نظم ہے' مبارک ہو۔'' اُنھوں نے شاعرانہ افتخار اور بے نیازی کے ملے جلے رنگ میں شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گئے کہ شام بے قرار کر رہی تھی۔ وہ ن۔ا۔ناظر کے ساتھ تھے تو یقیناً انھیں میخانے کی دھومیں آواز دے رہی ہوں گی اور کیا عجب کہ اپنے کاشانے سے کوئی شہنازِ لالہ رُخ بھی اشارے کر رہی ہو......!

مجھے ان کی یہ ادائے معشوقانہ اچھی نہیں لگی۔ دل نے کہا خُدایا! کیا یہی ندؔا فاضلی ہیں؟ وہ ندؔا فاضلی جو جدید شاعر ہیں، ترقی پسندی کے کٹر مخالف، انسان دوست اور مظلوموں کے ہم نوا ہیں۔ انھیں ایسا تو نہیں ہونا چاہیئے......؟ وہ ہماری کچی عمر تھی۔ اس وقت نہیں مگر بعد مدت کے معلوم ہوا کہ بڑا بننے یا بڑا ظاہر کرنے کے لئے پندار اور انکسار، سرشاری اور بیداری، ناز و بے نیازی کا ایک ہالہ سا بنائے رکھنا پڑتا ہے۔ قد جب بُلندی کے مراحل طے کر رہا ہو تو بعض لوگ بالا قدروں کے بیچ پنجوں کے بل کھڑا ہونے میں بھی عار نہیں سمجھتے۔

ندؔا فاضلی کے وہ دن' بمبئی کے بڑے بُرے دن تھے' جب جدو جہد کے باوجود جیب اور پیٹ میں تال میل ذرا مشکل سے ہو پاتا تھا۔ وہ ہاتھ میں کوئی ڈائری، کوئی کتاب یا کوئی رِسالہ لئے دن بھر شہر کی سڑکیں ناپتے اور ادب نوازوں سے محبت اور عقیدت کا وظیفہ وصول کرتے پھرتے تھے۔ اُس وقت اُن کے ملنے جُلنے والوں میں فلمی، کم علمی اور ادبی لوگ زیادہ تھے۔ اب ادبی اور علمی کا تناسب گھٹ کر فلمی کا

تناسب بڑھ گیا ہے' لیکن علم وادب سے بیگانگی اختیار نہیں کی ہے۔ گویا وہ پورے طور پر فلمی نہیں ہوئے ہیں حالانکہ بہت کچھ مشاعروں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ مگر مشاعرے باز قسم کے شاعر نہیں ہیں اور نہ گلے بازی کرتے ہیں۔ لیکن اسٹیج پر بعض اوقات اپنے جسم کے اعضا یوں ہلاتے ہیں گویا الگنی پر لٹکے ہوئے دوپٹے شوخ وشریر ہوا کی زد پر ہوں اور ٹیلی ویژن کے اسکرین پر تو ندا فاضلی کے ساتھ اسٹیج' اسٹیج پر براجمان لوگ ،ہال میں بیٹھے سامعین۔ غرض سارا منظر کبھی ہلتا ڈولتا کبھی ناچتا سا نظر آتا ہے۔

مشاعرے کسی لت یا علت کی طرح ان کی ذات سے چپک کر رہ گئے ہیں۔ وہ کہیں بھی ہوں گھر میں، سفر میں، کسی کے دفتر میں، بزم میں یا بازار میں' اپنے بس میں نہیں رہتے۔ کبھی اپنی عادت سے کبھی سامنے والے کے اصرار سے شعر سنانے پر اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ پھر شعرا اپنے ہوں، اپنوں کے ہوں یا غیروں کے' بے تحاشہ سناتے اور داد لیتے ہیں۔ طرہ یہ کہ بیداد کو بھی داد سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔ کسی مشاعرے میں ان کے کلام پر داد کے ڈونگرے نہیں برستے تو وہ سامعین کو مخاطب کر کے اعلان کر بیٹھتے ہیں۔ ''حضرات! میں قبرستان میں اذان دینے نہیں آیا ہوں۔'' پاکستانی شاعر وناقد سلیم احمد مرحوم کے شعر سے مستعار لئے گئے اس خیال اور ان لفظوں پر ہال ہو یا پنڈال' قہقہہ زار بن جاتا ہے۔ اس پھڑکتے اور پر اثر جملے کے بعد بھی اگر داد نہیں ملتی تو سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر داد حاصل کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ وہ وصف ہے جو معمولی دل گردے والے کا کام نہیں۔

ندا فاضلی کا دہانہ چوڑا ہے، کندھے مضبوط ہیں، باڑ اہل پنجاب کا سا ہے، جوانی میں بید مجنوں تھے اب بانس ہو گئے ہیں۔ سینہ فراخ اور دل بھی کسی صاحب خیر کی طرح فراخ ہے۔ اب جب کہ پچاس پچپن کے پیٹے میں ہیں گوشت نے ہڈیوں کو ڈھک لیا ہے۔ گال نہ گول ہیں نہ گلگلے، البتہ بھرے بھرے سے ہیں۔ کہاوت ہے قاضی جی کیوں دُبلے، شہر کے اندیشے سے۔ لیکن ندا فاضلی نہ قاضی ہیں نہ تو قائد، لہٰذا انھیں اس طرح کا کوئی اندیشہ ہی نہیں۔ البتہ ندا فاضلی جوانی میں دبلے تھے، اپنی بیکاری کے ہاتھوں۔ اب فربہ اندام ہیں مشاعروں، نغمہ نگاری، مکالمہ نویسی اور سر شام جام کی بدولت۔ پان، تمبا کو، سگریٹ اور شراب کسی سے احتراز نہیں۔ سرخی مائل بڑی بڑی آنکھیں، مے نوشی اور شب بیداری کا خمار لیے ہوئے۔ آواز کھردری مگر سماعت پر بار نہیں۔ کشادہ پیشانی بلکہ آدھا سر پیشانی میں شامل۔

اُردو مشاعروں میں پہلے اور اکیلے ہوٹنگ کرنے والے شاعر جنھیں نظم، گیت، غزل اور دوہے پر یکساں قدرت ہے۔ ہندی حلقوں میں اتنے ہی مقبول جتنا کہ کوئی ہندی فنکار۔ طبیعت میں کھلنڈراپن

ہے۔ گفتگو میں شوخی، طنز و تمسخر سے پر، علمی اور سنجیدہ گفتگو کے وقت دانشورانہ سنجیدگی کا پیکر۔ جملے اس قدر ترشائے کہ شاعری کا رنگ و مزہ لیے ہوئے۔ کبھی پینٹ شرٹ اور پتلون کرتے میں ملبوس، سینے کے بٹن کھلے اور بال جھانکتے ہوئے۔ گلے میں سونے کی چین ایک کلائی میں سنہرے رنگ کی گھڑی اور دوسری میں طلائی بریسلیٹ۔ بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کی بغل والی انگلی میں یاقوتی انگوٹھی۔ چہرے مہرے سے شاعر سے زیادہ بمبئی کے چھڑے دکھائی پڑتے ہیں۔ ادبی جرگوں میں نام، پیارے انسان اور پیارے شیطان دونوں حیثیتوں سے مشہور، دین دھرم سے ان کا کوئی سمبندھ نہیں لیکن انسانیت پر یقین پختہ ہے۔ روتے ہوئے بچے کو ہنسانا عبادت سے کم نہیں سمجھتے۔ اعصاب فولادی ہیں مگر کسی شناسا کی پھٹی قمیص دیکھ کر بے کل ہو جاتے ہیں۔ ہندی، اُردو، انگریزی کی ڈھیر ساری کتابیں پڑھنا اور کم لکھنا ہابی ہے۔ شاید بولنے کا ہوکا بسیار نویسی سے بچائے ہوئے ہے۔ چہرہ داڑھی مونچھ کی گراں باری سے عاری ہے۔ مزاج لڑکپن سے عاشقانہ، کھلتا ہوا گیہواں رنگ ہے۔ اگر اس حلیے کے کوئی صاحب مکتبہ جامعہ (بمبئی) میں ہفتے کی شام براجے، باتیں بگھارتے، کھار کے امرا پارٹمنٹ میں سوتے جاگتے، لکھتے پڑھتے، کھار ڈانڈا پر سمندر کے کنارے مارننگ واک کرتے، ہندی کے کوی سمیلنوں اور دنیا بھر کے اُردو مشاعروں کے اسٹیج پر گاہ ہوٹنگ کرتے، گاہ ہزار اداؤں سے اناؤنسنگ کرتے، گاہ اوپری دھڑ کے ہر حصے کو حرکت دے کر شعر سناتے، کسی بیئر بار میں ہم مشربوں کے ساتھ ساغر چھلکاتے اور ساقی کو تاڑتے نظر آجائیں تو سمجھ جایئے کہ وہ مُرغے کی چونچ میں سورج اُگانے والے شاعر رسیلے اور سجیلے نثر نگار ندا فاضلی ہیں۔

ندا فاضلی! ان دونوں میں ندا ہی سب کچھ ہے اور یہی تخلص ہے' فاضلی تو فاضل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ندا کو فاضلی سے کوئی فیض پہنچا اور نہ ہی فاضلی کو ندا سے کوئی فائدہ۔ جس طرح دنیا میں بہت سی انمول، بے فیض اور فاضل چیزیں پائی جاتی ہیں اسی طرح یہ فاضلی بھی بے جوڑ ہے۔ اکثر میاں بیوی کے مانند۔ بے فائدہ ہے سدا کی کڑک مُرغی کی طرح اور فاضل ہے بانجھ گائے کے سمان۔ بے جوڑ بیوی، کُڑک مُرغی اور بانجھ گائے سے کبھی کبھی کچھ حاصل ہو ہی جاتا ہے مگر یہاں تو حاصل صفر ہے اور اس لا حاصلی کا ندا فاضلی کی ذات سے کیا تعلق؟ جو جھیں، گر بوجھیں تو ہمیں بھی بتائیں۔

ندا فاضلی کو بات کرنے کا 'گر' آتا ہے' متاثر کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ دوران گفتگو وہ ایسے دلچسپ انوکھے اور ادبی چاشنی سے پُر فقروں کا بگھار لگاتے ہیں کہ تیز، تیکھی، کڑوی اور کسیلی بات بھی ذائقہ دار لگنے لگتی ہے۔ لیکن بہت بولتے ہیں کہ لوگ جی بہلانے اور بوریت کا اظہار کرنے کے لئے اِدھر اُدھر

تاکنے جھانکنے لگتے ہیں مگر وہ اُس وقت کچھ ایسے موڈ میں ہوتے ہیں کہ "اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا" وہ سامنے والے کو لب کشائی اور اپنی سمع خراشی کا موقع ذرا مشکل سے دیتے ہیں۔ اگر موقع دے دیا تو گویا اپنی دانست میں احسان کیا۔ وہ جب نہیں بولتے تو خموشی کو اپنی زبان دے دیتے ہیں۔ اس سے منہ کھل کے گول ہو جاتا ہے' زبان دانتوں اور داڑھوں سے کھیلتی ہے' کبھی تالو کی طرف لپکتی ہے' کبھی اپنے نیچے پھیلی بساط پر لپلپاتی یا یوں جھومتی ہے جیسے بین کے بجنے پر سانپ جھوم جاتا ہے۔ جب بولتے بولتے تھک جاتے ہیں تو تر و تازہ ہونے کے لئے پان پراگ کھانے لگتے ہیں۔ جب چلتے چلتے سانس دھونکنی تیز ہو جاتی ہے تو کسی بس اسٹاپ پر، کسی پان کی دوکان پر ستانے کھڑے ہو جاتے ہیں یا کسی ہوٹل میں چائے کے نام پر پٹرول لینے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ "یعنی آگے چلیں گے دم لے کر"۔ جب وہ سوچتے ہیں تو آنکھوں کی ڈبیاں مزید بڑی کر کے خلاء میں' خلاء نہ میسر ہو تو چھت میں گھورتے گھورتے کچھ ڈھونڈتے، چند لمحوں کے لئے کھو سے جاتے ہیں۔ آدمی اگر جنم جنم کا پیاسا ہو اسے پیٹ بھر روٹی اور ہوس بھر بوٹی نہ ملے تو ناتمام آرزو جستجو، چھین جھپٹ، ہپاہپ پر اُکساتی ہے۔ اگر یہ بھی نہیں تو مجبوری کا دوسرا نام فاقہ ہے۔ ندا فاضلی پر یہ حالتیں گذر چکی ہیں۔ کیا پتہ کہ بعض اب بھی گاہے بہ گاہے گذرتی ہوں۔

ندا فاضلی کوئی لڑنے جھگڑنے والے آدمی نہیں ہیں۔ انھیں گدگدانے سے زیادہ چٹکیاں بلکہ بکوٹے لینے میں مزہ آتا ہے کہ مقابل اول بیزاری کا پھر ناراضگی کا اظہار کرتا ہے۔ مگر ان کی چہل پہل، بکوٹا سب جاری رہتے ہیں۔ آخر کار نشانہ بنا ہوا فرد گالم گلوچ، جوتم پیزاری کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور ندا ہیں کہ "گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا" کا نمونہ نظر آتے ہیں۔ اُف! کس قدر شنیدنی اور دیدنی ہوتا ہے وہ منظر..... اگر کسی تحقیق کے مرد میداں کو میری بات پر شک ہے اور یا وہ ثبوت تک پہنچنا چاہتا ہے تو وہ عزیز قیسی کے گھر نہ جائے کہ یہ اب مرحوم ہو چکے ہیں البتہ باقر مہدی اور سریندر پرکاش صاحبان سے اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

ندا فاضلی ایک شادی شدہ آدمی ہیں۔ گویا ان معنوں میں کنوارے نہیں ہیں کہ ستر کنویں جھانکنے کے بعد بھی ایک کنوارہ' کنوارہ ہی رہتا ہے۔ شادی تو انھوں نے سوجتن سے کی مگر بیوی کے سُکھ سے، گھر آنگن کے لُطف سے محروم ہی رہے۔ وہ اس مہانگر کی دھوپ میں پگھل رہے ہیں اور ان کی بجنی کسی نگری کی چاندنی راتوں میں جل رہی ہے۔ پہلے کنوار پن انھیں گھاٹ گھاٹ بھٹکاتا تھا۔ اب شادی شدہ زندگی کی محرومی ہر اس گھاٹ پر پہنچنے پر مجبور کرتی ہے جو سامنے ہو۔ کلیاں ہوں، پھول ہوں یا بلستی پنکھڑیاں انھیں

سب سے لگاؤ ہے۔ غرض جس شاخ جھکا پاؤں جھکا لے جاؤں، نہ جھکے تو جائے جھک مارے ان کی بلا سے۔ وہ بظاہر رشتوں کی تہذیب کے قائل ہیں اور نہ ہی تہذیب کے رشتوں کے۔ حالانکہ ''لفظوں کا پُل'' ہو''مور ناچ'' ہو'' آنکھ اور خواب کے درمیان'' ہو'' ملاقاتیں'' ہو یا'' دیواروں کے بیچ'' ان کی ہر شعری اور نثری تصنیف میں رشتوں کی تہذیب اور تہذیب کے رشتوں کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ عورت کے ساتھ اگر تنہائی میسّر ہو تو وہ'' زمین آسمان کو سمیٹنے کا معجزہ'' جگانے لگتے ہیں۔ ان کا خیال کچھ ایسا ہے کہ جب تک منہ میں دانت ہوں اور پیٹ میں آنت ہو تب تک خوب کھاؤ پیو اور جب تلک رگوں میں لہو کی گردش تیز اور بدن میں قوت و حرارت ہے سیر سپاٹے، موج مزے اور رَت جگے رہنے چاہییں کہ نہ جانے کب رگوں میں دوڑتا پھرتا لہو تھم جائے اور بدن کا ہیٹر آف ہو جائے۔

اکیلے پن کی آگ ایک بہت بری بلا ہے۔ یہ سارے وجود کو جہاں تہاں سے جُھلسا کے رکھ دیتی ہے۔ پھر آدمی کسی کام کا نہیں رہ جاتا ہے۔ جُھلسا ہوا مکان ہو، پیڑ ہو کہ آدمی، سب میں بدصورتی سا جاتی ہے۔ یہ منظر نامے سے کٹ کے رہ جاتے ہیں۔ تنہائی کی آگ میں جُھلسا ہوا آدمی غیروں ہی نہیں اپنی بھی نظر میں بے وقار، بے لباس، بے چہرہ، ٹھہرتا ہے...... ندا فاضلی نے اپنے اکیلے پن کی آگ پر پانی ڈالنے کے لئے کتابوں، کتابی چہروں، یار دوستوں، کسی کی یاد کی طرح اُترتی گہری ہوتی شام اور شیشہ و جام کا سہارا لیا...... کبھی چھوٹے چھوٹے، وقتی، کمزور اور جھوٹے سہارے بھی کتنے پائیدار معلوم ہوتے ہیں ...... اگر کسی کا دستِ شفقت، ممتا بھرا احساس، گوشت اور گرمی سے پُر بدن نہ ہو تو آس پاس کی ہر چیز، ہر منظر ایک وجود بن جاتا ہے اور تنہائی کا مارا آدمی ایش ٹرے میں سُلگتی سگریٹ، سنکتی ہوئی ہوا، سرسراتے پردے، ڈھلتی پرچھائیں، چائے کی پیالی، انگلیوں میں دبے قلم، کورے کاغذ اور شبدوں کی ریکھاؤں سے بات کرنے لگتا ہے۔ اپنے اندر اور باہر کی یاترا شروع کر دیتا ہے۔ اگر آدمی ہوش مند ہو، سب کچھ سہن کر جانے والا ہو تو اس طرح کا جیون بھی جینے کا سلیقہ دے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دیکھئے اس پچپن برس کی عمر میں بھی ندا فاضلی کی بچپن کی سی شوخیاں جاری رہتی ہیں اور جوانی کی اُٹھان کے سے بے لگام قہقہے اُبلتے رہتے ہیں۔ اس مزاج کے لوگ نامرادیوں میں بھی لمحے لمحے سے خوشی کی بوندیں نچوڑ لیتے ہیں۔

تہذیبی رکھ رکھاؤ میں قدرے بے ترتیبی، بنجارا مزاجی اور آزاد خیالی، دوٹوک بیانی اور خوش کلامی، گھر آنگن کے ماحول سے محرومی، دربدر کی ٹھوکریں، سکوں سکّوں اور بوسوں کی طلب، ذہانت و فطانت

میں آلودگی اور لطافت، سنجیدگی اور ظرافت کے ملے جلے رنگوں کا خوش نما، کچھ بدنما، چنچل اور بے چین فنکار پیکر ایسا ہی ہوتا ہے، جس میں حسن لطافت اور حسن تنظیم کے ہزار زاویے چھپے ہوتے ہیں۔ اگر اپنے بکھراؤ کو سینت اور سمیٹ کر رکھنے کی صلاحیت، اُمنگ اور ہمت نہ ہوتی تو ندا فاضلی مجاز کی طرح شعلہ زاروں میں جوانی جلا چکے ہوتے، میرا جی کی طرح زندگی گھناؤنی ہو چکی ہوتی کہ ان پر روک ٹوک لگانے والے (گھر والے) سارے کے سارے پاکستان منتقل ہو چکے تھے ...... گویا بکھراؤ اور بگڑاؤ کے سارے سامان موجود تھے۔ ان حالات میں وہ کہیں نظر چُرائے، جسم و جاں بچائے ہوئے گذرے اور کہیں ہوس کی دنیا سجاتے ہوئے اپنی بے مہار بے سمت زندگی کو سمت دے کر سنوار لی۔. ایسے میں بڑا کٹھن ہوتا ہے اپنی فطری مناسبتوں اور دلچسپیوں کو ذرا ڈھیل دیتے ہوئے "زندگی سنوار لینا"۔ ہزار دام سے ایک جُنبش میں نکلنا اور ہزار دام اپنی شخصیت کے گرد بُن دینا...... یہی ہے ندا فاضلی کا لائف اسٹائل۔

ندا فاضلی کے لائف اسٹائل کی بات چلی ہے تو یہ بھی جتا دینا چاہئے کہ انھیں کسی کا سواگت کرنا ہے تو تالیاں، کسی کو داد دینی ہے یا بے داد کرنی ہے تو تالیاں، پروگرام کے آغاز پر تالیاں، اختتام پر تالیاں، بات بے بات پر تالیاں، ہاتھ پر تالیاں، تالیوں پر تالیاں ...... غرض ہنسی ٹھٹھا، طنز، تلوار، تشکر، سب کا مطلب تالیاں... ان کے لائف اسٹائل کو تالیوں سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

ندا فاضلی جغرافیائی حد بندیوں اور سرحدوں پر کھینچی گئی لکیروں کے قائل نہیں ہیں۔ مٹی کا رنگ اور آب و ہوا مختلف ہو سکتی ہے لیکن ہے تو مٹی ہی، خواہ چوماسے کی ہو یا چوبارے کی، ہاٹ بازار کی ہو یا قبرستان کی، ہندو پاک کی ہو یا انڈونیشیا کی۔ سچ ہے سیما میں خود نہیں بنتیں بنائی جاتی ہیں۔ دھرتی خود نہیں بٹتی بانٹ دی جاتی ہے اور اس کا کوئی دھرم نہیں ہوتا البتہ سماج ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ شہری، دیہی اور جنگلی سماج!

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں کدھر کے ہم ہیں

سورج کی لال ٹکیہ سر کی سیدھ میں پہنچ کر پچھم کی طرف ڈھلنے لگی تھی۔ میں چرچ گیٹ اسٹیشن پر ٹرین سے اُتر کر انسانی ریلے میں بہتا ہوا آل انڈیا ریڈیو کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اُردو سیکشن میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ سعید راہی صاحب (اناؤنسر آل انڈیا ریڈیو، بمبئی) ندا فاضلی کا غالب پر فیچر ریکارڈ کر رہے ہیں۔ ریکارڈنگ روم میں پہنچ کر اشاروں اشاروں میں آداب کیا اور خیریت دریافت

کی۔ ریکارڈنگ جاری تھی کہ دودھیا لباس میں دودھیا داڑھی والے ایک بزرگ آہستگی سے آکر دیوار سے لگ جاتے ہیں۔ ریکارڈنگ ختم ہوئی تو ندا فاضلی نے اِن بزرگ صورت سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''آپ ہیں ایاز جھانسوی صاحب!'' میں چونکا، سنبھلا اور بولا ''مگر پندرہ برس پہلے تو آپ ایسے نہیں ہوا کرتے تھے؟'' میں نے اُن کی سفید داڑھی اور بالوں سے بے نیاز چمکتی ہوئی چندیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ندا نے فرمایا۔ ''ہاں جناب! زمانہ بڑے بڑوں کو بدل دیتا ہے۔ آپ نے انھیں پندرہ بیس سال پہلے مشاعروں میں دیکھا ہوگا۔ اُس وقت آپ قبلہ محترم جان جوان تھے، چہرہ بالوں کے گچھے سے عاری تھا اور ترنم کے بل بوتے پر مشاعرہ لوٹ شاعر ہوا کرتے تھے۔ اب ان کے اور مشاعروں کے درمیان داڑھی حائل ہوگئی ہے۔'' یاد کے کیمرے نے اُس لمحے کو قید کرلیا تھا۔ اب جو تصویر نکالی تو ایاز جھانسوی جھینپے جھینپے سے کھڑے ہیں، میں مُسکرا رہا ہوں، سعید راہی ہنس رہے ہیں اور ندا فاضلی کے کھلے ہوئے منہ سے قہقہے اُبل رہے ہیں۔

ہم لوگ ریڈیو اسٹیشن سے نکل کر چرچ گیٹ جانے والی سڑک پر ہولیے۔ لوگ چل پھر رہے تھے ......کوئی سوچ میں گُم، کوئی ہنستا مُسکراتا، کوئی اپنے ساتھی/ ساتھیوں سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا....... یہ بمبئی ہے یہاں کی عورتیں چہار دیواری اور تنہائی سے زیادہ دیر نباہ نہیں کر پاتی ہیں۔ دھان پان سی گدرائے اور کچے بدن کی کچی عمر والی لڑکیاں اور پکی عمر کی عورتیں گذر رہی تھیں..... ہرنیوں کی طرح گذرتی کالج کی گرلس کی ایک ڈار کو اپنی نگاہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے ندا فاضلی نے سوال داغ دیا۔

''ایاز صاحب! اِس عمر میں آپ کو عورتیں کیسی لگتی ہیں؟''

ایاز جھانسوی بے چارے کیا جواب دیتے، انھیں تو اپنی داڑھی اور بزرگی کا خیال تھا، بے بسی سے مُسکرانے لگے۔

ا۔ظ۔خ (انور ظہیر خاں): ندا صاحب! عورتیں ہر عمر اور ہر روپ میں اچھی لگتی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ عمر کے ساتھ دید کے زاویے بدل جاتے ہیں۔

ن۔ف (ندا فاضلی): نہیں! میرا مطلب کچھ اور ہے۔

ا۔ظ۔خ: کچھ اور سے مراد کیا 'بدن سے بدن تک کی یاترا'؟ لیکن جسموں کی بھی تو ایک تہذیب ہوتی ہے۔ جسے سماجی رشتوں نے کچھ معنی، کچھ نام دے رکھے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو ہم کیسے پہچانیں کہ یہ

فلاں ہے یا اس کا فلاں سے یہ سمبندھ ہے۔میری آنکھیں ندا فاضلی کی پیازی اور بڑی بڑی آنکھوں کے کنارے پر جاکے ٹھہر گئیں اور دیکھا کہ شوخی اور شرارت کے پرندے تیر رہے ہیں اور کھلے منہ سے چھوٹے چھوٹے قہقہے نکل رہے ہیں۔

ن۔ف: سوال بدن کی تہذیب کا یا سوشل ریلیشن شپ کا نہیں ہے بلکہ اپنی ایک کیفیت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے پھول جیسے چہرے اور چہرے جیسے پھول اچھے لگتے ہیں۔ اِن دِنوں تو یہ سب کچھ زیادہ ہی بھلا لگتا ہے۔

ا۔ظ۔خ: ندا صاحب! کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ جاتی بہار بھری بہار سے زیادہ سہانی لگتی ہے کہ کیا کچھ نہ دامن میں سماجائے۔ میں نے انھیں چھیڑتے ہوئے کہا۔

ن۔ف: It may be, but I don't feel and think in such a way. Now a days I have become more romantic, enthusiastic and creative. Why it is happening is not known to me.

اب دیکھئے اسی رومانٹک موڈ کی میں نے حال میں چند نظمیں کہی ہیں۔

(ایک مُسکراہٹ)

چمکتے بتیس موتیوں والی مُسکراہٹ
کُھلا ہوا بادبان جیسے
دُھلا ہوا آسمان جیسے
سحر کی پہلی اذان جیسے
پتا نہیں نام کیا ہے اُس کا
خبر نہیں کام کیا ہے اُس کا
وہ ٹھیک چھ بج کے پانچ منٹ کی ایک جگمگاہٹ
اُتر کے ہونٹوں سے
یوں مرے ساتھ چل رہی ہے
نہ چھاؤں کچھ کم ہے راستوں سے
نہ دھوپ زیادہ نکل رہی ہے

میں جس طرح سوچتا تھا
بستی اسی طرح سے بدل رہی ہے
یہ ایک ستارہ
جو میری آنکھوں میں دیر سے جگمگا رہا ہے
اسے سمندر بلا رہا ہے

(چھوٹی سی ہنسی)

سُونی سُونی تھی فضا
میں نے یوں ہی
اس کے بالوں میں گُندھی خاموشیوں کو چھولیا
وہ مُڑی
تھوڑا ہنسی
میں بھی ہنسا
پھر ہمارے ساتھ
ندیاں، وادیاں
کُہسار، بادل
پھولوں کی کونپل
شہر، جنگل، سب کے سب ہنسنے لگے
اِک محلے میں
کسی گھر کے کسی کونے میں
چھوٹی سی ہنسی نے
دور تک پھیلی ہوئی دنیا کو روشن کر دیا ہے
زندگی میں
زندگی کا رنگ پھر سے بھر دیا ہے......!

اتوار کا دن ہے' شام کا وقت ہے۔ ندا فاضلی اپنے فلیٹ میں تنہا ہیں اور کلیات قلی قطب شاہ کے

مطالعے میں محو ہیں۔ میں پہنچتا ہوں، اٹھا کے حال احوال پوچھنے کے بعد کہتے ہیں۔'' چائے پی جائے؟''
اور یہ کہہ کر سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا۔'' کیوں زحمت کرتے ہیں؟''

کہنے لگے۔'' زحمت کی کیا بات ہے' آپ کے بہانے میں بھی پی لوں گا۔ ویسے شام ہو رہی ہے چائے کا وقت بھی ہے۔'' میں نے عرض کیا۔'' وقت جام کا بھی ہے۔' مُسکرائے اور پوچھا۔'' کیا آپ بھی ڈرنک کرتے ہیں؟'' میں نے جواب دیا۔'' پان، بیڑی، سگریٹ، شراب غرض جتنی اچھی عادتیں ہیں وہ میں نے اختیار نہیں کی ہیں۔'' زور سے ہنسے اور کچن کا رُخ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں گرما گرم بھر کپ چائے لئے برآمد ہوئے۔ میں نے پوچھا'' کیا ان دنوں قلی قُطب شاہ زیر مطالعہ ہیں۔'' فرمایا'' جی ہاں! ادب کی تاریخ میں دکنی زبان کے شاعر کی حیثیت سے اس کا ذکر تو آتا ہے لیکن اس کے یہاں موضوعات کی جو رنگا رنگی، نشاط اور سرشاری کی جو کیفیت ہے، جیتے جاگتے معشوقوں کی جو تصویر ہے اور سب سے اہم مٹی کی جو بو باس ملتی ہے' اس کی بدولت اس کا قد اونچا ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے قد کی صحیح پیمائش ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے عرض کیا'' گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شاعری صرف فکر سے نہیں بلکہ جذبات کی موہنی تصویروں، پاس پڑوس کی فضا آفرینیوں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، غموں، ہلچل پیدا کرنے والے لمحوں سے بھی پیدا ہوتی ہے۔''

ندؔا نے کہا'' یقیناً فکری شاعری ذہن کو اور بڑی شاعری بڑے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے' لیکن ایک شاعری وہ بھی ہوتی ہے جو بڑی نہ ہو مگر اچھی ہوسکتی ہے جس میں ہمارے شہروں کی چہل پہل، دیہاتوں کا خاموش اور پُرسکون ماحول، ہماری مٹی کی سُگندھ، ہماری سنسکرتی اور سبھیتا کی چاپ پھرت ہوتی ہے۔ خسروؔ، کبیرؔ، گرونانکؔ، میرابائی، قلی قطب شاہ، نظیرؔ اکبرآبادی اور ٹیگور وغیرہ کی شاعری پوری طرح اپنی مٹی اور پانی سے جُڑی ہوئی ہے اور قلی قطب شاہ کے یہاں یہ سب کچھ ایک خاص رنگ و آہنگ میں ملتا ہے۔''

میں نے پھر چھیڑا'' ندؔا صاحب! دراصل یہ بات آپ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ہماری شاعری کی تمام اصناف پر غزل ہمیشہ چھائی رہی ہے۔ ظاہر ہے غزل وِستار کا نہیں اختصار کا فن ہے۔ یہ منی ایچر آرٹ ہے۔ ہمارے یہاں کچھ زیادہ ہی تہذیب و تصنع کا التزام رکھا جاتا ہے یہاں پردہ دری سے زیادہ پردہ داری کی پاسداری کی جاتی ہے۔ جذبات اور احساسات کو برملا اور بے تحاشہ بیان نہیں کیا جاتا۔ رمز و کنایے کی چلمنوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ شاید ہمارے فیوڈل اور بورژوا کلچر کی دین ہے جو ہماری مجبوری تھی اور ہے

۔لیکن سوال یہ ہے کہ طِلسم ہوش رُبا، مِیر امن کی باغ و بہار اور رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب میں ہی نہیں، نذیر احمد کے قصوں اور مرزا رُسوا کے ناولوں میں اور تو اور سحر البیان، خواب و خیال، زہر عشق، مثنوی گلزار نسیم، انیس و دبیر کے مرثیوں میں کیا ہندوستانی باغوں، راگوں، ہاٹ بازاروں کی فِضا نہیں ملتی؟ دوسرے آپ نے اُردو شاعری میں صرف خسرو قلی قطب شاہ اور نظیر کا نام لیا ہے۔ گویا غالب اور اقبال کی شاعری اپنے کلچر کی نمائندہ نہیں ہے۔ کیا ان کے فکر و فن میں ہمارا کلچر، ہماری تہذیب سب مل کر تحلیل و تطہیر ہو کر نہیں آئے ہیں۔ دراصل بڑا فنکار جغرافیائی حدیں پھلانگ جاتا ہے لیکن اس کے افکار اور آرٹ کا خمیر اُٹھتا ہے۔ اس کی اسی دھرتی اور اس معاشرے سے جہاں اس کے وجود کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔''

ندا اپنے مخصوص انداز کے ساتھ خلا میں گھورتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ قلی قطب شاہ اور نظیر اکبر آبادی کے علاوہ اُردو کے تمام فن کار اپنے کلچر سے کٹے ہوئے ہیں۔ جو فن کار اپنے کلچر سے کٹ جاتا ہے وہ زیرو بٹا زیرو ہو جاتا ہے۔ میرا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ ہمارے کلچر کے وہ بنیادی روپ و رنگ، وہ ارضیت، بولی ٹھولی کے آکار کھل کر پورے طور پر ہمارے فنکاروں کے ہاں نہیں آئے ہیں اور انھوں نے زبان کو فارسی ترکیبوں مرکبوں سے اس قدر بوجھل بنا دیا ہے کہ افعال، ماضی، مستقبل، حال کے صیغے ہٹا دیجئے تو عربی آمیز فارسی ہے۔ آج کے بعض فنکار اس بات کو محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے موضوع اور اظہار دونوں میں تبدیلی نظر آ رہی ہے۔ لیکن بہت سے فن کار ابھی بھی پردے سرکاتے اور جالے ہٹاتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ اور یہ اُردو کے پنپنے کی باتیں نہیں ہیں۔ اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے ہمیں اپنے کلچر کو فوکس کرنا ہوگا تمام تر خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ۔ ہندی سے اُردو نے بہت کچھ لیا ہے اور اسے ابھی بہت کچھ لینا ہے۔''

''ندا صاحب! میری مطلوبہ کتابیں کہاں ہیں.......؟''

''دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ لائبریری نما بیڈ روم میں جا کے ڈوب گئے۔

میں نے ہانک لگائی۔ ''میں آ جاؤں......؟''

آواز آئی۔ ''نہیں.......میں ابھی آیا۔'' کچھ دیر کے بعد وہ کئی کتابیں لئے ہوئے طلوع ہوئے۔

میں نے کتابیں اٹھاتے ہوئے خدا حافِظ کہا اور فلیٹ سے نکل گیا۔ اب رات شام پر حادی ہو چکی تھی۔ سیاہ سائے گہرے ہو گئے تھے۔ مگر بمبئی میں تو رات بھی دن کا منظر پیش کرتی ہے۔ میں آٹو رکشا میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جب میں پہلی مرتبہ ندا صاحب کے گھر گیا۔ بڑے باادب بڑے مہذب لگ رہے

تھے۔اپنے ہاتھ سے بنا کر چائے پلائی۔کیا یہ وہی ندؔا فاضلی ہیں جو ہر شخص پر اپنے تیر ونشتر آزماتے رہتے ہیں۔جو ہر جگہ اپنے بے کل اور کھلنڈرے نیچر کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔جہاں کتابیں رکھی تھیں' ندا صاحب نے مجھے وہاں تک پہنچنے نہیں دیا۔آخر وجہ کیا؟ جو شخص باہر کھلی کتاب کی طرح رہتا ہے وہ اپنے گھر میں اس قدر محتاط اور لیئے دیئے نظر آئے' خیر کوئی بات نہیں۔یہ تو گھر پر جانے کا پہلا موقع تھا۔'' اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں''

ایک سہ پہر ندؔا فاضلی کے فلیٹ کی بیل کا سوئچ آن کیا۔ندؔا فاضلی نے ریشمی تہمد اور ململ کا کُرتا پہنے دروازہ کھولا، بٹھایا۔اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پینتیس سال کی گوری چٹی سی گدرائے بدن کی خاتون ریشم کی لنگی اور ہلکے آسمانی رنگ کا کُرتا زیب تن کئے بیڈروم سے ہال میں چھم سے آگئیں۔ندؔا فاضلی نے اِن سے میرا تعارف کرانے کے بعد ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔یہ میری فرینڈ مالتی ہیں' بہت اچھا گاتی ہیں۔کیا آپ کچھ سنیں گے۔''میں نے کہا'' صلواتوں کے سوا سب کچھ۔''چند ثانیے کے لئے کمرے کی سنجیدہ فضا ہم سب کے قہقہوں سے آباد ہوگئی۔میں مخاطب ہوا۔'' ہاں تو مالتی جی! کچھ ہو جائے۔''لیکن وہ بھی کچھ سنانے پر آمادہ نہیں ہوئیں' نہ ندؔا نے زور دیا، نہ میں نے اصرار کیا۔وہ کچھ شرمائی سی کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھیں۔اُنھوں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔'' آپ لوگ باتیں کیجئے میں ابھی آئی۔''

وہ دراصل چائے بنانے کچن میں چلی گئی تھیں۔

''ندؔا صاحب! آپ کی شاعری پر قصباتی سے زیادہ شہری زندگی کا پرچھاواں پڑتا نظر آتا ہے اور آپ کے ہم عصروں، ہم سنوں کے یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے۔''وہ پہلو بدلتے ہوئے بولے۔ ''میرا اور ہم عصروں کا کیا ذکر۔پریم چند اور ان کے چند معاصرین کو چھوڑ کر اُردو کا سارا نثری و شعری ادب شہری مزاج کا حامل ہے اور یہی نہیں بلکہ اُردو زبان بھی شہروں کی ہی پیداوار ہے۔البتہ میرے معاصرین کے یہاں شہری زندگی کی آویزش، کشمکش War of survival آپا دھاپی، تیز رفتاری اور تھکاوٹ کا احساس، میکانکی شب و روز، تعلق میں لاتعلقی اور لاتعلقی میں تعلق کا اظہار، بجھے دلوں کی طرح بجھی ہوئی زندگی، جس کا مقصد چند سکے، چند لقمے اور خوشی کے چند لمحے ہیں۔نہ راستوں کا پتہ ہے اور نہ ہی سمتوں کی جانکاری۔رشتوں کی قید اور اس قید خانے کی پگھلتی ہوئی سلاخیں، یا تر اا پنے اندر اور باہر کی، یہ سب ہم نے کیا، دیکھا بھالا اور جھیلا ہے۔اسی لئے یہ سب کچھ ہمارے عہد کی شاعری، افسانے، ناول، ڈرامے اور فلم کا

موضوع ہے۔ یہ سب ہم اس لئے نہیں پیش کر رہے ہیں کہ ہم نے مغرب کے لٹریچر میں پڑھا ہے۔ بلکہ یہ کسی حد تک ہمارا اور ہمارے تخلیقی ہم سفروں کا برتا ہوا ہے۔ ہم لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ آج کے دور کا رزمیہ سا ہے۔"

"ندا صاحب! رزمیہ میں طوالت اور ترتیب ہوتی ہے۔ ایک واقعے سے لگا ہوا دوسرا واقعہ، ایک منظر سے جھانکتا ہوا دوسرا منظر اور کردار ہیں کہ کھوے سے کھوا رگڑ کے چلتے، ایک دوسرے سے جھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سنسکرت، فارسی اور یوروپی ادب میں رزمیوں کی ایک شاندار اور صحت مند روایت ملتی ہے اور معاف کیجئے ہمارے یہاں تو رزمیے سرے سے ملتے ہی نہیں۔"

ندا نے پھر پہلو بدلا۔ نہ جانے کہاں سے اُٹھا کر سنجیدگی کی موٹی سی چادر اوڑھی اور ایک لمبی سانس کھینچ کر سینے میں ہوا بھری جو پنکچر ہوتے ہوئے ٹیوب کی طرح نکل گئی۔ وہ ڈھیروں پڑھنے اور گہری سوجھ بوجھ رکھنے والے فن کار ہیں۔ اس موضوع پر وہ دل جمعی سے دیر تک بول سکتے تھے۔ مگر وہ اس کا عکس اپنی شاعری کی جھلملی سے دیکھنے اور دکھانے لگے۔ "ہاں صاحب! یہ ضرور ہے ہمارے یہاں رزمیے نہیں ملتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ اشاروں، کنایوں میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ اسی لئے تفصیل اور تسلسل کے ساتھ مختلف زمانوں کی کہانی نہیں ملتی، مگر مختلف اصناف میں مصرع، مصرع جو داستان بکھری ہوئی ہے اِن میں رزمیہ پہلو چھپے ہوئے ہیں۔ اگر انہیں سمیٹا اور یکجا کیا جائے تو ہر عہد کا کرب، تضاد اور تصادم ملے گا۔"

"تو گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے عہد کا غالب شعری رجحان، نظم معرّا اور آزاد نظم، غزل اور افسانے سے ملتا ہے۔ اس میں ہمارے رنج والم، بے باکی، ہولناکی، ہوس ناکی اور کشمکش کی آئینہ داری ہو رہی ہے۔"

"جی ہاں بالکل، ہماری دلچسپیاں، ہمارے معاشقے، ہماری دلداریاں، بے تابیاں سب آج کے ادب میں موجود ہیں۔ آج انسان کے ظاہر اور باطن میں جنگ جاری ہے اور وہ جس طرح سُرخ رُو اور پامال ہو رہا ہے، جس طرح وہ اندر سے ٹوٹ رہا ہے، ہم لوگ اسی ٹوٹے ہوئے انسان کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔"

رستے میں وہ ملا تھا ' میں بچ کر نکل گیا
اس کی پھٹی قمیص مرے ساتھ ہوگئی

دشمنی لاکھ سہی ' ختم نہ کیجئے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ' ہاتھ ملاتے رہیئے

آوارہ مزاجی نے پھیلا دیا آنگن کو
آکاش کی چادر ہے' دھرتی کا بچھونا ہے

دیکھتے دیکھتے
ٹی وی
فریج،صوفہ بن کے
آدمی کھو گیا،عزت کا تماشا بن کے

ہر گھڑی بھاگتے رہنا ہے مقدر اس کا
گھر کی دیواروں نے ہی چھین لیا گھر اس کا

"یہ تو آپ نے اپنی شاعری کے حوالے دیئے ہیں۔ کچھ اس سے بہتر حوالے بھی؟" مگر ندا خاموش تھے اور آنکھیں سوال کر رہی تھیں' کیا اس سے بھی بہتر شاعری ہوتی ہے؟

ندا فاضلی کے گھر پہنچنے پر وہ آپ کے مزاج کے مطابق چائے، چنے اور مے سے آپ کی تواضع کریں گے۔ایک مٹ میلی شام ہے سادگی سے آراستہ اپنے فلیٹ میں وہ ایک فلم ڈائرکٹر دوست کے ساتھ گدے پر آلتی مالتی مارے بیٹھے ہیں۔سامنے تپائی پر Dunhill کا پیکٹ،خوبصورت سالائٹر،اسٹیل کی ایش ٹرے،ایش ٹرے پر دو عدد سگریٹیں رکھی ہیں۔جن کی بو اور دھوئیں کے مرغولوں سے کمرہ پراسرار بنا ہوا ہے۔شام کا میالا پن مزید گہرا ہو گیا ہے۔تپائی کی دوسری جانب سوڈا واٹر کی دو بوتلیں اور کانچ کے دو گلاس رکھے ہیں۔

ندا بائیں ہاتھ سے گدے پر تھاپ لگا رہے ہیں' داہنے ہاتھ میں وہسکی کی بوتل ہے۔جس کا منہ گلاس میں ہے اور قُلقُل مینا کی صدا سنائی دے رہی ہے۔" آیئے' آیئے آپ کے لئے پیگ بناؤں؟"

"میں تو پیتا نہیں۔"

"تو آپ کو صاحبِ ایمان کئے دیتا ہوں۔"

"نہیں جناب! آپ مومن بنے رہیں' میں بے ایمان ہی بھلا۔"

"اچھا تو آپ شراباً طہوراً کے قائل ہیں؟"

''خدا جانے وہ بھی نصیب میں ہے یا نہیں۔''

''اچھا تو حُسن کی شراب سے تو شوق کرتے ہوں گے۔''

''ہاں اس سلسلہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ''کم' کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے''

''یہ لیجئے بڑے چٹپٹے چنے ہیں' کھایئے۔''میں نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔

''آپ جھجک کیوں رہے ہیں۔ یہ شراب میں نہیں پانی میں پکے ہیں۔''پھر زوردار قہقہے ندا فاضلی اوران کے دوست کے بُلند ہوئے جن میں میری کھسیانی ہنسی بھی شامل تھی۔

ہر فنکار کو اپنا فن پیارا ہوتا ہے' مگر ندا فاضلی کو اپنی شاعری ہو یا نثر دونوں کچھ زیادہ ہی پیارے ہیں۔ جوں' جوں شام رات کے قریب ہوتی جارہی ہے' نشہ بھی آہستہ' آہستہ گہرا ہوتا جارہا ہے۔ اب وہ اپنی شاعری کی زبان میں بات کرنے لگے ہیں۔

یہ زندگی جو آج تمہارے
بدن کی چھوٹی بڑی نسوں میں مچل رہی ہے
تمہارے پیروں سے چل رہی ہے
تمہاری آواز میں
گلے سے نکل رہی ہے
تمہارے لفظوں میں ڈھل رہی ہے
یہ زندگی جانے کتنی صدیوں سے
یوں ہی چہرے بدل رہی ہے

یہ مندرجہ بالا مصرعے وہ چار مرتبہ دہرا چکے ہیں۔''ہاں تو یوں چہرے بدل رہی ہے'' کے بعد کیا......؟

بدلتے چہروں
بدلتے جسموں میں
چلتا پھرتا یہ اِک شرارہ
جو اس گھڑی نام ہے تمہارا
اسی سے ساری چہل پہل ہے

اسی سے روشن ہے ہر نظارہ

(پھر ایک طویل وقفہ) عرض کیا۔ ''ندا صاحب! آگے بھی کچھ ہوگا؟''

ستارے توڑو

کہ گھر بساؤ

قلم اُٹھاؤ

کہ سر جھکاؤ

تمہاری آنکھوں کی روشنی تک ہے کھیل سارا

یہ کھیل ہوگا نہیں دوبارہ!

ندا اِن مصرعوں (نظم) کو بار بار دہرا کے، ہر کردار، تمام اشیاء، تمام مناظر کو اپنی اُمنگوں، ترنگوں، جذبوں اور جولانیوں کی نٹ کھٹ، البیلی اور نکیلی زبان دے دینا چاہتے ہیں کہ ہر چیز ان کی آواز میں آواز ملائے، اِن کے لہجے میں بات کرے، ملاقات کرے۔ اب وہ اپنی ذات کے حصار اور شاعری کے ہالے سے نکلنا نہیں چاہتے۔

ایک منظر یاد آتا ہے کہ اپریل یا مئی کا مہینہ ہے۔ سنہری اور سُرخی مائل شام دبے پاؤں شہر پر اُتر رہی ہے۔ باندرہ اُردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج میں ندا فاضلی کے سوانحی ناول ''دیواروں کے بیچ'' پر گفتگو کے لئے یار دوست اکٹھا ہیں۔ صدارت ہے ہندی کے کوی اور کہانی کار کمل شکل صاحب کی۔ مہمان خصوصی ہیں جناب سُریندر پرکاش۔ مضمون پڑھنے والے ہیں ان کے ہم عصر فنکار مشتاق مومن، مُقدر حمید اور قدرے سلام بن رزاق صاحبان کو چھوڑ کے انور خان اور انور قمر صاحبان کے مختصر مضامین تنقیصی ہیں اور کچھ تنقیدی بھی۔ انور خان تو شروع ہی کچھ اس طرح کے جُملے سے ہوتے ہیں۔

''دیواروں کے بیچ کی نثر Readable ہونے کے باوجود، ندا کی اس کتاب نے ہمیں سخت مایوس کیا ہے۔''

انور قمر نے بھی لگ بھگ اسی انداز کی باتیں لکھی تھیں، مگر لہجہ نسبتاً نرم تھا۔ ہر مضمون پر جم کے بحث ہوئی۔ حاضرین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ رَن میں خوب دھول اُڑی، رہی سہی کسر سُریندر پرکاش نے پوری کر دی۔ تعریف کے ساتھ عیب چینی کرنے والے نہ جانے کس جونجھ میں کیا 'کیا کہہ گذرے۔ بعض کہنے والوں کے چہروں سے عیاں تھا کہ انھیں اپنی بات پر مکمل بھروسہ نہیں، سو ایک عجیب سا تاثر پیدا ہو رہا

تھا۔اس بھری محفل میں چند مجھ جیسے بے مایہ اور دور سے جلوہ دیکھنے والے بھی موجود تھے۔جو حیرت کا پُتلہ بنے اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں ندا فاضلی اب کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے......!

ندا بڑے سکون سے بیٹھے کچھ کھاتے چباتے رہے اپنی کھلی آنکھوں اور کُھلے کانوں سے سب کچھ دیکھتے رہے اور سنتے رہے۔کچھ خاص موقعوں پر بعض چہروں پر لکھی ہوئی تحریر پڑھی نہیں جاسکتی محسوس کی جاسکتی ہے۔میں نے اپنی نگاہوں کا فوکس آن کیا تو دیکھا کہ ندا کے یہاں نہ اضطراب ہے نہ انتشار، نہ غضب ہے نہ ملال، نہ آہ ہے نہ واہ۔البتہ بات بات پر ہنسی کی جگہ ایک گہری سنجیدگی نے لے لی ہے۔

جب ان کے بولنے کی باری آئی تو بڑے آرام سے کھڑے ہوئے بڑے اطمینان سے پندرہ سولہ منٹوں میں ایک ایک سوال، ایک ایک اعتراض کا جواب دے ڈالا۔جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ آپ کی بات میں رتی ماشہ تولا کتنا وزن ہے۔تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا۔دراصل ایک چیز ہوتی ہے۔''کولاژ'' جس میں چیزوں کو جوڑ کر ایک تصویر بنادی جاتی ہے۔میں نے تصویریں بنائی ہیں وہ اگر مکمل نہیں تو دھندلی بھی نہیں ہیں۔پسند اور ناپسند کا معاملہ بڑا گمبھیر ہوتا ہے دوستوں کو دوستوں کی تحریر پر اعتراض کا پورا پورا حق ہوتا ہے۔یہ اپنے زاویہ نگاہ، ظرف اور حوصلے کی بات ہے۔میں اپنے لکھے پر نادم نہیں ہوں۔

ندا فاضلی نے آج کی اُردو شاعری کو ایک نیا ڈکشن اور ٹرینڈ دیا ہے جس میں عوام اور عوامی گیتوں کا سا سُبھاؤ ہے۔وہ ایک خوش فکر شاعر ہیں، نہایت ذہین آدمی ہیں، حافظہ بلا کا تیز ہے، سینہ بے کینہ ہے، دِل کی بستی مہر و مُروّت سے آباد ہے، آڑے وقتوں میں دام و درم سے قدم و قلم سے، کلام سے.....غرض ہر طرح سے لوگوں کے کام آتے ہیں۔آج جب کہ ہمارے روز و شب منافقوں کے درمیان بسر ہو رہے ہیں۔ہر فرد کو اپنے مفادات سے غرض ہے۔یہ خلوص و وفا، یہ ایفائے دوستی، بند مٹھی کو مصیبت کے مارے کی جیب میں کھول دینا' انسانیت نہیں تو اور کیا ہے۔ندا ان لوگوں میں سے ہیں جو محتاجوں، مصیبت کے ماروں، ہم عصر فنکاروں کا دُکھ درد بانٹ لیتے ہیں جیسے کوئی قریبی عزیز اپنی بساط بھر، اپنی سی تدبیر اپنوں کے ساتھ کرتا ہے لیکن یہاں تو خون کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔البتہ تین رشتے ہوتے ہیں' انسانیت، فنکاری اور دوست داری کا رشتہ۔ ندا فاضلی یہ تینوں رشتے خوب نبھاتے ہیں غرض ندا کی ہر نوا ہے نوائے عاشقانہ اور ہر ادا ہے ادائے دلبرانہ!

ندا فاضلی جتنے اچھے شاعر ہیں' اتنے ہی اچھے نثر نگار ہیں۔شاعری میں وہ زیادہ واشگاف نہیں ہوتے کہ رمزیت کی چلمنیں پڑی ہوتی ہیں۔لیکن نثر میں تمثیلوں اور استعاروں کی ایک حد مقرر ہے۔آگے

بڑھے تو مقصد بدک کے دُور کھڑا ہو جاتا ہے اور بچارے الفاظ جس تس کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ ادب کا اصول یہ ہے کہ راوی یا مصنف جس قدر اپنے آپ کو چھپائی رکھے بہتر ہے۔ ''ملاقاتیں'' ہو یا ''دیواروں کے بیچ'' دونوں جگہ میں کی گہباریوں سنائی دیتی ہے جیسے رات کے اندھیرے میں ہاتھی کی چنگھاڑ۔ ندا نئے پن اور چونکانے پر یقین رکھتے ہیں۔

''ملاقاتیں'' میں وہ شخصیات جو اس کتاب کا موضوع ہیں جہاں ان سے ملاقات ہوئی ہے وہیں ندا فاضلی کے تیور اور تیہے کو بھی ہم بھانپ لیتے ہیں۔ ''دیواروں کے بیچ'' میں ہم ان کی جلوتوں کے تماشائی اور خلوتوں کے محرم راز تو بنتے ہیں، مگر اب بھی بہت سے گوشے ہیں جن پر انھوں نے اپنے قلم کی سرچ لائٹ نہیں ماری ہیں۔ لیکن ''میں'' یہاں بھی موجود ہے۔ ہائے بوالعجبی کہ ''لفظوں کا پُل'' بنا کر ظاہر و باطن کی گذشتہ، موجودہ اور نا آفریدہ زمانوں کی سیر کرنے کرانے والے، آنکھ اور خواب کے درمیان کڑوی سچائیوں کی تعبیر کرنے والے، بے باک، بے لاگ، بے جھجک ندا فاضلی ''دیواروں کے بیچ'' سے گذرتے ہوئے دیواروں پر لٹکتے جالوں، دیواروں پر لگے پورٹریٹس پر جمی جھائیوں، مہاسوں اور چیچک کے داغوں کو، دامن و دل پر لگے دھبوں کو کیوں مزید نمایاں کر کے پیش نہ کر سکے۔ جہاں سے سوالوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ یہ پردہ داری ہے یا قلم کی مجبوری۔ کچھ بھی ہو ندا فاضلی کا مقام یہ نام برس دو برس کی نہیں، برسہا برس کی محنت کا پھل ہے۔ جو میٹھا زیادہ ہے کڑوا کم۔ اس کے حصول کے لئے نہ جانے کتنی چپلیں گھس گئیں، نہ جانے کتنی راتوں کا لہو صرف ہو گیا اور نہ جانے کتنے قلم ٹوٹ گئے۔ سچ ہے اگر ذہانت کو عمل سے جوڑ دیا جائے تو منزل زیادہ دور نہیں رہتی۔

''کشتی کو کھینے کا قرینہ سب کو کہاں آوے ہے''

(مت سہل ہمیں جانو)

●●

میں نہیں سمجھ پایا آج تک اس الجھن کو
خون میں حرارت تھی یا تری محبت تھی
قیس ہو کہ لیلیٰ ہو، ہیر ہو کہ رانجھا ہو
بات صرف اتنی ہے آدمی کو فرصت تھی

ملنے گئے کسی سے مل آئے کسی سے ہم

● مقصود حمید

مشرقی کرلا سے چمبور تک ہم لوگ اکثر پیدل جایا کرتے تھے۔ ابھی شہر کے اِس مضافات میں اِس سرے سے اُس سرے تک کانکریٹ کا جنگل کھڑا نہیں ہوا تھا، بیچ میں کھاڑیاں تھیں جھاڑیاں تھیں، آبی پرندوں کی ڈاریں تھیں، گھنے درختوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی قطاریں تھیں۔ ایسے میں لطیفے سناتے، تبصرے کرتے، چلتے چلاتے ایک طرح کی پک نِک ہو جاتی تھی۔ آر۔ کے اسٹوڈیوز سے ذرا آگے' چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں پانجراپول کا علاقہ تھا اور وہی ہماری منزل تھی۔ اِس لئے کہ یہیں ایک چال کے چھوٹے سے کمرے میں صبا فاضلی رہائش پذیر تھے۔ صبا سے کب اور کیسے ملاقات ہوئی ٹھیک سے یاد نہیں غالباً کرلا میں سنسار ہوٹل کے پاس جہاں محمود دُرّانی چوک کا بورڈ لگا ہے' وہیں اُن دِنوں یہ چوک ادیبوں اور شاعروں کا اڈّا ہوا کرتی تھی' اور شام سے لے کر رات گئے تک یہاں بڑی گہما گہمی ہوتی' ادبی، سیاسی معرکے سر کئے جاتے' خوب مباحثے ہوا کرتے تھے۔

ایک شام ہم سارے دوست' ڈاکٹر برہان الدین جو اُن دِنوں میڈیکل کالج کے معلم تھے' یوسف حسن ریلوے میں تھے۔ ابراہیم نظیر اور راقم الحروف' جب صبا فاضلی کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ برآمدے میں ایک حضرت آنکھیں بند کئے سوچوں میں غرق چارپائی پر آدھے لیٹے ہوئے ہیں۔ دراز قامت، کشادہ پیشانی، سردار جعفری ٹائپ لمبی زلفیں، کرتے پائجامے میں ملبوس۔ صبا کہیں نظر نہیں آئے تو اُن سے پوچھ بیٹھے' صبا فاضلی ہیں؟ اِسی طرح آنکھیں میچے' زبان ہلائے بغیر' اندر کی طرف اشارہ کر دیا اور اِسی بے نیازی سے لیٹے رہے۔ ع

آوازوں کے بازاروں میں خاموشی پہچانے کون

صبا کمرے کے اندر سے بولے۔ ''آؤ، آؤ مہاپرشو! بس دو منٹ.....! ابھی چلتے ہیں۔'' تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کر نکلے اور ساتھ ہو لئے' تو ہم نے پوچھا۔ ''یہ کون ہیں جو باہر لیٹے ہوئے تھے؟ عجیب آدمی ہیں' بات ہی نہیں کرتے۔ آپ کو پوچھا تو ہاتھ سے اشارہ کر دیا اور بس۔ جتنی دیر ہم آپ کے انتظار میں

وہاں کھڑے رہے وہ یوں ہی گم سم اور بے نیاز سے رہے جیسے ہمارا کوئی وجود ہی نہ ہو۔"

"یہ بس ایسے ہی ہیں۔"

"لیکن ہیں کون؟"

"ہمارے بھائی ہیں ندا فاضلی' کچھ ہی دِن ہوئے اُنھیں آئے۔"

وہ تصویر آج بھی نظر میں ہے۔ ایک چارپائی' چاروں طرف بے شمار کتابیں' ایک دراز قامت شخص جو بولتا ہی نہیں تھا۔ صبا اُن دِنوں واڈیا موویٹون میں پروڈکشن کنٹرولر تھے۔ اُن کا دفتر بسنت اسٹوڈیوز میں تھا۔ اُن کے گھر سے پانچ دس منٹ کے فاصلے پر۔ شامیں اکثر صبا کے ساتھ گذرتی تھیں۔ موضوع گفتگو ادب اور شاعری ہوتا' فلم نہیں۔ ہم صبا سے کہتے۔

"یہ ندا بولتے کیوں نہیں؟"

"یہ بس ایسے ہی ہیں۔"

ایک روز پتہ چلا کہ صبا فاضلی سرحد پار کر گئے ہیں اور کچھ عرصہ گذرنے کے بعد ہم بے حد حیران ہوئے جب ندا بولے اور پھر اُس کے بعد سے آج تک بولے جا رہے ہیں۔ لوگ باگ آج بھی اُن کے گرد گھیرا ڈالے رہتے ہیں کہ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی۔ پہلی ملاقات میں ندا کی چارپائی کتابوں سے بھری نظر آئی تھی یہاں تک کہ ندا اپنے دبلے پتلے وجود سمیت اُن کے بیچ چھپ سے گئے تھے۔ کوئی ندا کو دیکھنا چاہتا تو ندا کم کتابیں زیادہ نظر آتیں۔ آج بھی اُن کا ڈرائنگ روم کتابوں رسالوں سے اَٹا ہوا ہوتا ہے لیکن ندا اُن میں نمایاں ہوتے ہیں۔

دھوپ میں نکلو گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

ندا شروع سے پڑھتے رہے ہیں اور اب بھی بہت پڑھتے ہیں۔ گفتگو کلاسیکل کے متعلق ہو یا معاصرین کی تخلیقات پر' ندا بے تکان بحث کرتے ہیں۔ پچھلے دِنوں مختلف زبانوں سے ترجمے کئے' جاپانی' ملیشیائی' کوریائی' چینی۔ یعنی تیسری دُنیا کا ادب جو فرانسیسی' جرمنی اور انگریزی یلغار کے باعث نگاہوں سے اوجھل رہا تھا۔ ندا نے اِس مختلف اندازِ نظر کو، خیال کو لفظوں میں منتقل کرنے کے دِلآویز طریق کار کو اُردو والوں سے قریب کیا۔ ندا اکثر و بیشتر محمود دُرّانی چوک پر سرِ شام مل جاتے۔ وہ فلمی دُنیا میں جد و جہد کر رہے تھے اور پیغمبری دور سے گذر رہے تھے۔ لیکن چہرے کی بشاشت، گفتگو میں ظرافت، موقع محل کی

نزاکت، ادبی مباحث میں متوازن و بے لاگ فراست، شخصیت کے ایسے پہلو تھے جو زندگی کے تلخ حقائق کی پردہ پوشی میں کامیاب معاونت کیا کرتے تھے۔

جو دیکھتی ہیں نگاہیں وہی نہیں سب کچھ
یہ احتیاط بھی اپنے بیان میں رکھنا

ترقی پسندی کا غلبہ تھا' ہمارے بیشتر ساتھی تحریک سے جڑے ہوئے تھے بلکہ باقاعدہ پارٹی ورک کرتے تھے۔ نظریے سے عقیدت کی شدتیں ایسی تھیں کہ ہم نے ادب میں بھی ''ہم'' اور ''وہ'' کی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں' جو منشور سے متفق نہیں' وہ ہم میں سے نہیں۔ ہم نے ادب کو اِنہی طے شدہ پیمانوں سے ناپنا اپنا شعار بنالیا تھا۔ ندا نے ادب کے تعلق سے جب بھی زبان کھولی، ادعائیت اور جانبداری سے حتی الامکان گریز کیا۔ ادبی تخلیق کو ادب کے معیار سے جانچا پرکھا اور کبھی گروہی حد بندیوں کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ تعمیم سے گریزاں رہے اور نئے اور پرانے تخلیق کاروں کو محدود زاویوں سے بالاتر ہو کر گفتگو کا موضوع کیا۔ اُن دِنوں فرصتیں کچھ زیادہ ہی تھیں اور مل بیٹھنے کے بہانے نہیں ڈھونڈنے پڑتے تھے' لیکن رفتہ رفتہ اِس کا چلن کم ہوتا چلا گیا۔

پھر یوں ہوا کہ کبھی کبھار مکتبہ جامعہ پر، پھر ابراہیم نظیر کی معیت میں تصدیق بھائی کے مکان پر' ندا کی گُل افشانیٔ گفتار سے محظوظ ہونے کے مواقع ملتے' حافظہ غضب کا ہے۔ قدیم شاعری ہو یا جدید، بے تکان اشعار quote کرتے چلے جاتے ہیں۔ صرف شاعری ہی نہیں افسانہ بھی جو اکیسویں صدی کی امتیازی صِنفِ ادب کے طور پر سامنے آیا اور جس کی فوقیت دیگر زبانوں میں بھی تسلیم کی جارہی ہے' ندا کے یہاں تسلسل کے ساتھ' عہد بعہد زیرِ مطالعہ رہا ہے۔ ہندی اُردو افسانے پر بالخصوص' اُن کی اچھی نظر ہے۔ لکھنے والا نیا ہو یا پرانا' مقبول و معتبر ہو یا گوشۂ گمنامی کا مکیں' اگر تخلیق عمدہ ہے تو ندا کی زبان پر اُس کا ذِکر ضرور آئے گا اور وہ مختلف پہلوؤں کی نشان دہی اپنے مخصوص انداز میں بلا تاخیر و تردّد کریں گے۔

مشاعرے کا اسٹیج ہو یا ٹی وی شو یا کوئی اور ادبی/ سماجی نشست' ندا ہمیشہ ایک عمدہ اور باصلاحیت پرفارمر کی صورت سامنے آتے ہیں' اپنی بات کہتے ہیں اور اکثر اِس انداز سے کہ وہ مروجہ سانچوں میں ڈھل کر سامع تک پہنچنے کے بجائے عمومی بہاؤ کی مخالف سمت میں شناوری کے کرتب دِکھاتی ہے۔

میں اپنی ہی اُلجھی ہوئی راہوں کا تماشا
جاتے ہیں جِدھر سب' میں اُدھر کیوں نہیں جاتا

ملاقاتیں پہلے کی بہ نسبت کم ہوتی جا رہی تھیں اور اس بیچ ندؔا ابراہیم نظیر اور دیگر رفقاء کے ساتھ نیو رائٹرس پبلی کیشنز نامی ادارے سے جڑ گئے تھے۔ اُن کا مجموعہ کلام ''لفظوں کا پُل'' اور بعد ازاں نثری تخلیق ''ملاقاتیں'' شائع ہوکر زبان زد خاص و عام ہو رہی تھیں۔ اُن کا ایک خاصا بدنام اور بے حد مشہور شعر تقریباً ہر ادبی محفل میں بحث کا موضوع بنا ہوا تھا۔

سورج کو چونچ میں لئے مُرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دئے رات ہوگئی

اُدھر ''ملاقاتیں'' تہلکہ ثابت ہوئی تھیں۔ ہمارے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کے انٹرویوز پر مشتمل ایسے ہفت رنگ خاکے شاید اس سے پہلے کبھی احاطۂ تحریر میں نہیں لائے گئے تھے۔ ایک طرف تو اُردو کے قاری کے ہاتھ عمدہ نثر کا ایک ایسا نمونہ لگا جو بے ساختہ، منفرد اور نئے زاویۂ نگاہ کا حامل تھا تو دوسری طرف ندا کے قلم کی چوکھی تیشہ زنی نے بہتوں کو ناراض بھی کیا تھا۔

روزگار کے سلسلے راقم الحروف کو بیرون ملک لے گئے اور ایک عرصہ تک ندؔا سے ملاقاتوں کا سلسلہ ٹوٹ سا گیا۔ بس جہاں تہاں اُن کی تحریریں یا پھر غزلوں، گیتوں، دوہوں کے کیسیٹ باعث ربط بنے رہے۔ جب میں لوٹا تو ابراہیم نظیر نے اطلاع دی کہ ندؔا پانجراپول اور باندرہ ایسٹ سے اُٹھ کر کھار کے اپنے ذاتی فلیٹ میں رہائش پذیر ہوگئے ہیں۔ میں جب بغرض ملاقات اُن کے گھر پہنچا تو وہی ندؔا تھے۔ وہی کتابوں کے انبار تھے اور ہم عصر احباب کے ساتھ شریکِ گفتگو تھے۔ میر و غالب، کبیر، میرؔا، تلسی، داغؔ دہلوی اور نوح ناروی اور ندؔا کی مہمان نوازی شام سے لے کر رات کے پچھلے پہر تک خندہ پیشانی کے ساتھ ہر ایک سے بلا امتیاز و تخصیص، ستائشی کلمات، مزاح اور طنز و طعن کی نشریات، خلوص و اپنائیت کی بہتات کی ملی جلی کارفرمائیوں کے ساتھ گلے مل رہی تھی۔

وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی

ندؔا کی شعری تخلیقات، گیت، دوہے، نظمیں، غزلیں، ادب کے سنجیدہ قارئین کو متوجہ کرتی رہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اُن کی شاعری مسلسل موضوعِ بحث رہی اور اُردو ہندی دونوں زبانوں میں اپنا اعتبار قائم کیا۔ لیکن جس نے پڑھنے والوں کو چونکایا وہ ''ملاقاتیں'' کی نثر تھی۔ کردار نگاری کے اس انداز نے جو تعظیم و تکریم کے چبوتروں پر ایستادہ بتوں کو زمین پر لا کر اُن کے مکھوٹے اُتار کر بشریت کے چہرے عطا کرتا اور آدمی' آدمی کی نظر سے اپنی تمام خوبیوں، خامیوں، برائیوں اور کوتاہیوں سمیت، دیکھنے اور دکھانے

کے عمل کا امین تھا' ادب میں تخلیق اور تخلیق کار کو سمجھنے، پرکھنے کی شمولیت بخشی اور حقائق کو عقیدتوں، مصلحتوں اور مصالحتوں کے حصار سے اوپر اُٹھ کر دیکھا اور دِکھایا۔ اِس طرح صحیح تناظر میں افہام و تفہیم کی فضا سازی کا جواز پیدا کیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ "ملاقاتیں" کو تخلیقی خاکہ نگاری میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہوئی اور خوب پذیرائی کی گئی۔ اِدھر بعد کی نثری تخلیقات میں "دیواروں کے بیچ" اور "دیواروں کے باہر" دونوں نئے انداز کے سوانحی ناوِل ہیں جن میں ندا ہوتے ہوئے بھی نہیں ہیں اور جہاں جہاں جتنے ہیں' وہاں عہد و اَدوار، واقعات و کردار کے حوالے سے ہیں۔ زمانی ربط و تسلسل کی غیر ضروری قیود سے آزاد' ایک پورا عہد چیدہ چیدہ اِن نثری تخلیقات میں تصویر ہوا ہے۔

اگلے وقتوں کے لوگ، اقدار کی پاسداری، انسانی دردمندی کے شانہ بشانہ بڑے شہروں میں تیز رفتار زندگی کے تقاضوں کے نتیجے میں پامال ہوتی ہوئی انسانی قدریں، خواہشات کی تکمیل و آسائشوں کے حصول کی چوہا دوڑ' صارف معاشرے کا استحصال' لیکن اِن اندھیرے گوشوں میں بھی کہیں کہیں اِنسانی سرِشت میں دندناتے، شر پر فتح یاب ہوتے خیر کے جگنو، مختلف کرداروں کی صورت ورق ورق اپنا آپ منواتے ہیں۔ دیواروں سے باہر کا ہر باب زندگی کی بوالعجبیوں کا غماز ہے۔ کہیں حیرت و استعجاب کے باد گرد تو کہیں تربیہ اختتام لیکن اکثر ابواب حالات کے جبر کا کا المیہ اُجاگر کرتے ہیں۔ اِن اختتامیہ Pathoes کے ساتھ متعلقہ ہم رشتہ و ہم احساس شعری کاوشیں، تناظر کی فراہمی کے باعث، قرأت کے ایک اور ڈائمنشن سے روشناس کراتی ہیں۔ "دیواروں سے باہر" میں ایک مقام پر ندا نے راجندر سنگھ بیدی کے متعلق لکھتے ہوئے اُن کا یہ مکالمہ تحریر کیا ہے۔ جو فلموں میں چل جاتا ہے وہ ادب سے نکل جاتا ہے۔ لیکن ندا کے ساتھ ایسا نہیں ہوا' وہ فلم اور ٹی وی سے برابر جڑے ہوئے ہیں بلکہ اُردو حلقوں کے باہر ندا کی پہچان ہی چھوٹے اور بڑے اسکرین کے توسّط سے ہے' تاہم اُنھوں نے تنے ہوئے رسّے پر کرتب کرتے ہوئے نٹ کی طرح اپنا توازن برقرار رکھا ہے۔ اپنی دوہری شخصیت Duel Personality کو کچھ اِس طرح برتا کہ ایک کے دوسرے سے گڈمڈ ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ ادب دوستوں کے درمیان ہوتے ہیں تو فلمی کامیابیوں کی ڈینگ نہیں مارتے۔ ایسے موقعوں پر اپنے بڑوں اور چھوٹوں کے بیچ وہ صرف اور صرف ادب کی گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں۔ فلمی صنعت کے ذِکر سے اِن کا احتراز بیّن ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رام پنڈت کے الفاظ میں ندا نے اختر بھائی (اختر الایمان) کی طرح خود کو ادب سے کٹنے نہیں دیا۔" ندا تھکے نہیں۔ وہ آج بھی بہتیرے معاصرین سے زیادہ فعال ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے "چہرے" کے عنوان سے

وہ سلسلہ وار کالم لکھتے رہے، جسے بے حد سراہا گیا۔ ان میں مشاعروں کے وہ فرومایہ یا بلند پایہ شاعر جو وقت کے دُھندلکوں میں گم ہوتے جا رہے تھے، نہایت دِلکش، دِلچسپ اور حقیقت پسند انداز سے یکے بعد دیگرے یادگلی میں قاری کے روبرو ہوتے ہیں، کبھی اشعار کا، کبھی آواز کا، کبھی انداز کا جادو جگاتے ہیں۔ ایک پورے عہد کے تہذیبی منظر نامے کو نگاہوں میں بساتے ہیں۔ دوستوں کا خیال ہے کہ جو لوگ ندا سے قریب رہے ان میں راقم الحروف بھی شامل ہے۔ لیکن میں پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو دوریوں اور ملاقاتوں کے طویل اور مختصر دورانیے کے ساتھ ندا کو اُتنے ہی فاصلے پر کھڑا پاتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جس ندا سے ملنے جلنے کا سلسلہ رہا ہے وہ تصویر کا محض ایک رُخ، شخصیت کا ایک پہلو تھا۔ میرا خیال ہے یہی ندا کا مزاج ہے۔

بدلا نہ اپنے آپ کو جو تھے وہی رہے
ملتے رہے سبھی سے مگر، اجنبی رہے

●●

ندا... ایک آئس برگ

م۔ ناگ

۶۹ ء ۱۹۶۸ ء کا زمانہ ناگپور میں مورس کالج کے احاطے میں' ایک گھنیرے درخت کے نیچے مدحت الاختر اور عبدالرحیم نشتر کے ساتھ میں' جدید ادب پر بحث جاری ہے۔ ندا فاضلی کے گیت اور نظمیں پڑھ کر متاثر ہو رہے ہیں، خوش ہو رہے ہیں' کہ پُرانے بُت ٹوٹ رہے ہیں، نئے قائم ہو رہے ہیں۔ ندا فاضلی کا تازہ کار لہجہ، بیان کی بولڈنیس اور نئی لفظیات متاثر کر رہی ہے۔

لوہارن لوہے کو پیٹے
لگے ہتھوڑا من پر
مٹی کے گھڑے میں بھی پانی
ندیا جیسا ہے
جب سے تم پردیس گئے ہو
بہت اندھیرا ہے

اور پھر وہ شعر' جسے جدید دَور کا بدنام شعر قرار دیا گیا۔

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہوگئی

سارا منظر نامہ بدل گیا ہے، نئے پیمانے تخلیق ہو رہے ہیں، نئی بساط بچھ رہی ہے، ذہن کو جھنجھوڑ دیا گیا ہے، خوابوں کو جیسے الفاظ مل رہے ہیں۔ اور وہ نظم۔

میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسا لیا
تم نے پڑوس میں نیا بھائی بنا لیا

ندا فاضلی کے ساتھ ساتھ عادل منصوری، شہریار بانی اور بشیر بدر متاثر کرتے ہیں۔ مگر ندا ایک طرف فیشن پرستی سے دُور تو دوسری طرف ترقی پسند فکری انجماد سے بھی الگ ہیں۔ اُن کے لفظوں میں سچائی

نظر آتی ہے۔ پھر آتا ہے شعور، پھر آتا ہے مورچہ اور شاخسار اور کلام حیدری کا ایک اور ماہنامہ '' آہنگ''، پھر آتا ہے '' گلوب''، پھر آتا ہے نئے نام' سب میں ندا فاضلی ہے۔ اِس لئے بار بار پڑھتا ہوں اور لگتا ہے کہیں کوئی خلاء ہے جو بھرتا جا رہا ہے۔ '' شب خون'' میں فُضیل جعفری اور عبدالرحیم نشتر کی جدید شاعری پر بحث چل رہی ہے۔ شاہد اور ندرت کی ترتیب دی ہُوئی کتاب '' چاروں اور'' کا اِجراء ہے۔ اور پہلی بار ناگپور کی تاریخ میں ایک جدید مشاعرہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ صادِق ناندیڑ سے، ممبئی سے، بشر نواز اورنگ آباد سے، عبدالمتین نیاز بھوپال سے آتے ہیں اور مشاعرہ شروع ہو جاتا ہے..........

۱۹۷۵ء میں بمبئی آتا ہوں، چمبور میں رُکا ہوں۔ صرف سلام بن رزّاق اور ندا کو اُن کی تخلیقات کے حوالے سے جانتا ہوں۔ وہ لوگ مجھے نہیں جانتے۔ ندا گورنمنٹ کالونی، باندرہ میں پیئنگ گیسٹ کے طور پر رہتے ہیں۔ بھاگم بھاگ دروازے کی کال بیل بجاتا ہوں۔ ندا چونک جاتے ہیں کہ یہ کون سی مصیبت آگئی ہے، دوست احباب کی باتیں، افسانوں کی باتیں، وہ مجھے ایک ساؤتھ انڈین ہوٹل میں ناشتہ کراتے ہیں۔ پھر میں اُن سے روزگار کے متعلق بات کرتا ہوں۔ ندا وعدہ کرتے ہیں اور میری جیب میں دس روپے کا نوٹ رکھ دیتے ہیں، اُس زمانے میں دس کا نوٹ سو کے برابر ہوتا تھا۔ آگے جا کر یہ دس رُوپے کا نوٹ بڑا انمول ثابت ہوتا ہے اور بہت دِنوں تک خرچ نہیں ہوتا۔ اُسے میں خرچ کرتا' مگر پھر دیکھتا کہ جوں کا توں جیب میں پڑا ہے۔ اس بات پر مجھے آج بھی حیرت ہے۔ بہت دِنوں تک وہ میری جیب میں پڑا رہا۔ مگر پھر اچانک غائب ہو گیا۔ میں نے جیب میں کافی تلاش کیا۔ اُسے اُلٹا کر کے پھر دیکھا 'مگر نہیں ملا۔ مجھ سے یہ بھول ہُوئی کہ میں نے یہ یاد نہیں رکھا کہ وہ کب غائب ہُوا؟ ندا بھیڑ میں غائب ہو گئے ہیں اور میں اکیلا کھڑا ہُوں۔ سلام کے گھر آتا ہوں اور وہ انور قمر سے ملاتے ہیں پھر میں گوا چلا جاتا ہوں۔ اور میں بھی بھیڑ میں گم ہو جاتا ہُوں۔

ابراہیم نظیر، سلطان شعلہ اور سلام! ندا عادت کے مطابق مجھے پھر نہیں پہچانتے (یا نہ پہچاننے کا ڈرامہ کرتے ہیں) مگر مجھے ندا پر غصہ ہوتا ہے۔ مگر دِل کہتا ہے' وہ جو لکھتا ہے' اپن کو تو اُس سے کام ہے اور یہ سوچ کر میں مطمئن Relax ہو جاتا ہوں۔

۱۹۸۰ء میں ندا سے با قاعدہ ملاقاتیں شروع ہوتی ہیں۔ کھار ڈانڈا کے فلیٹ میں وہ شفٹ ہو چکے ہیں' وہاں ایک نوکر بھی ہے جو جھاڑ پونچھ کے علاوہ ندا کے لئے آملیٹ اور دوستوں کے لئے چائے بناتا ہے۔ '' دھرم یُگ'' میں نظمیں اور مضامین لکھنے'' گفتگو'' میں کام کرنے کے علاوہ اب ندا کو فلمیں بھی

ملنے لگی ہیں۔ ابراہیم نظیر اور ظفر گورکھپوری، انور خان اور عنایت اختر مجھے ندا کے اسٹرگل کی باتیں کبھی سنجیدگی کے ساتھ تو کبھی لطیفوں کے انداز میں سناتے ہیں۔

ندا کا گھر اور کھچڑی

دوستوں کے درمیان ندا کے گھر بننے والی کھچڑی کا ذکر ہوتا ہے۔ آنجہانی دوست کتھا کار کمل شکل نے تو ندا کے یہاں جمنے والی دوستوں کی محفل پر کہانی بھی لکھی تھی ''گھونگے'' جو ''سب رنگ'' میں شائع ہوئی۔ اور اس کہانی میں خوب مزے لے لے کر کھچڑی کا ذکر کیا تھا۔

ندا نے اپنی فطرت کو اب ایڈجسٹیبل بنالیا ہے۔ وہ یار باش ہیں، زندہ دل ہیں۔ ندا سے ملنے جاتا ہوں، وہ مالتی جوشی کا تعارف مجھ سے کراتے ہیں۔ ''یہ سیّدہ حنا' پاکستان سے آئی ہیں۔''

دو چار ملاقاتوں میں مالتی جوشی کھل جاتی ہیں۔ ''میری ماں کا انتقال ہوا، یہ میرے لئے بہت بڑا صدمہ تھا ماں سے دور جانے کے تصور سے میں نے شادی بھی نہیں کی تھی' ماں اب ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ ندا سے پرانے تعلقات تھے۔ ندا کو پتہ چلا تو آئے اور زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ ڈیڑھ ماہ تک اُنھوں نے مجھے اپنے پاس ہی رکھا، سمجھایا، اور ایسے ٹریٹ کیا کہ میں اس صدمے سے باہر نکل آئی تب سے ندا کا گھر میرا گھر ہو گیا۔ شروع میں تھوڑا ہنگامہ ہوا ہو گا لیکن اب لوگوں نے سمجھ لیا ہے ہمارے تعلقات کو۔''

مالتی جوشی گانے کا ریاض کر رہی ہیں، مالتی جوشی مجھے بتاتی ہیں۔ ''میاں بیوی کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے اور سمجھنے سے ہوتا ہے۔ کیا صرف پنڈت کے سامنے اگنی کے سات پھیرے لینے یا نکاح پڑھنے سے شادی ہو جاتی ہے؟ میں آپسی اعتماد اور سمجھداری کو اہم مانتی ہوں۔''

ندا صاحب کہتے ہیں کہ ''کسی کے ساتھ شادی کر کے رہنا اور کسی کے ساتھ بغیر شادی کے رہنا .... رشتے کی سمجھداری زیادہ اہم ہے' بجائے قانونی بندھن کے، میرے لئے ایسا رشتہ جس پر دل کی مہر لگی ہو' اہم ہے۔''

پرسنل طور پر بتاؤں کہ ندا اور مالتی جی جب ساتھ ساتھ رہنے لگے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ندا نے پھر سماج کو انگوٹھا دکھایا ہے۔ خود مالتی جی کا کہنا ہے کہ ندا اُن کی ڈھال بنے ہیں اور وہ اُن کا سہارا۔

جب وزیر اعلیٰ کا چہرہ بجھ گیا

۱۹۹۸ء لال قلعے میں ۱۵ ر اگست کا مشاعرہ اسٹیج پر اُردو ہندی کے شاعر موجود ہیں۔ خود دہلی کے وزیر اعلیٰ بھی ہیں۔ اور بی۔ جے۔ پی کے اہم لیڈران بھی۔ مشاعرہ کا انعقاد دہلی اُردو اکادمی نے کیا ہے، مشاعرہ

جاری ہے۔ منتظم اُردو کے ایک مشہور شاعر کو مائک پر بلاتے ہیں۔ شاعر مائک پر آتا ہے۔ سننے والے فرمائش کررہے ہیں۔ کہ فلاں نظم سُنایئے۔ مگر شاعر کی مسکراتی آنکھوں میں سنجیدگی اُتر آتی ہے۔ اور مسکراتے چہرے اور سنجیدہ آنکھوں سے وزیر اعلیٰ کو دیکھتا ہے۔ "ایک نئی نظم سنیئے۔ نظم کا عنوان ہے" ایک قومی رہنما کے نام" جیسے جیسے شاعر نظم پڑھتا جاتا ہے۔ وزیر اعلیٰ اور دیگر لیڈران کے چہروں کا رنگ بدلتا جاتا ہے۔ نظم ختم ہوتی ہے۔ تو سامعین واہ واہ! کی داد سے آسمان سر پر اُٹھالیتے ہیں۔ لیکن وزیر اعلیٰ کا چہرہ جیسے بُجھ سا جاتا ہے۔

مشاعرے کے منتظمین کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہے۔ شاعر سامعین کی داد کے پھولوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنی جگہ آکر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ شاعر تھا ندا فاضلی۔ اور وہ نظم تھی:-

مجھے معلوم ہے/تمہارے نام سے منسوب ہیں/ٹوٹے ہُوئے سُورج/شکستہ چاند.................

ندا فاضلی نے پاکستان سے لوٹ کر بتایا تھا۔ "میں نے دیکھا' کراچی کی فٹ پاتھ پر ایک بھکاری پڑا سسک رہا ہے، اُس کا نام رحیم تھا۔ جب بمبئی لوٹا تو چرچ گیٹ کے سامنے اُسی بھکاری کو گڑ گڑا کر بھیک مانگتے دیکھا۔ میں نے اُس کا نام پُوچھا۔ تو اُس نے اپنا نام رام بتایا' میں سوچتا ہوں' کہ اگر رام اور رحیم کو بھیک ہی مانگنا تھا تو پھر اس ملک کی تقسیم کس لئے ہُوئی تھی۔

شام کا ندا یا ندا کی شام

شہر کے یار باش، محفل کی جان، منفرد شاعر دوست ندا فاضلی۔ گلے میں سونے کی موٹی چین، ہاتھ میں کڑا، کلف لگا کرتا، پانجامہ پہنے ملک بھر کے مشاعروں میں شرکت کرنے والے ندا فاضلی، سیریلوں اور فلموں میں گیت لکھنے والے، نئی سے نئی کتاب کو پڑھنے اور ان پر گفتگو کرنے والے اور ملک کے بگڑتے حالات پر پریشان ہونے والے ندا فاضلی۔

ندا کی شامیں تنہا نہیں گذرتیں۔ اگر کوئی دوست نہ رہا تو وہ آس پاس کے کسی بھی شناسا کو بلا لیتے ہیں اور تاش کھیلتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کیونکہ دوست احباب شراب پینے پہنچ جاتے ہیں۔ ایک اور بات ہے ندا اگر چار لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہیں تو اُن میں سے ایک کے ساتھ "کھیلتے" ضرور ہیں۔ اُس کی بے وقوفیوں کا مذاق اُڑا کر بے تحاشہ قہقہہ لگاتے ہیں۔

میرا روڈ پر ندا کا ایک فلیٹ ہے۔ کبھی کبھی شام بتانے وہ وہاں بھی جاتے ہیں۔ میرا روڈ میں رہنے والے ہندی کے کچھ پکّے صحافی اور شاعر دوستوں کو اکٹھا کر لیتے ہیں۔ خوب محفل جمتی ہے۔ (اب سنا ہے یعقوب راہی، سلام بن رزّاق اور وقار قادری بھی اُن کی میرا روڈ کی شام کے ساتھی بن گئے ہیں۔)

ندا جو کوٹا ہے اُتنا ہی پیتے ہیں۔ دُنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں، کبھی چھالیا کترتے ہیں، کبھی آٹو میٹک مشین میں سوڈا بناتے ہیں۔ بہر کیف جی کھول کر پلاتے ہیں۔ اور گھڑی کو دیکھتے جاتے ہیں۔ لطیفے سناتے ہیں اور ہنستے ہنساتے ہیں۔ پھر دوستوں کے سامنے کھچڑی پروسی جاتی ہے۔ گنگناتے رہتے ہیں۔

بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا جو بیت گیا ہے وہ گذر کیوں نہیں جاتا

ندا نئی نظم سنانا چاہتے ہیں، لیکن "کراچی میری ماں"، "پیسہ"، "چٹنی جیسی ماں" سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ جو دوست زیادہ پی لیتا ہے وہ وہیں لُڑھک جاتا ہے اور صبح نہا دھو کر ناشتہ کر کے وہاں سے نکلتا ہے۔

ھوتا ھے شب و روز تماشا

ایک صحافی کی حیثیت سے ندا سے کئی ملاقاتوں میں اُن سے اُن کے خیالات جاننے کا موقع ملا ہے۔ آج کے حالات میں ادباء و شعراء پر آپڑی ذِمہ داری کے تعلق سے اُنھوں نے کہا تھا کہ پوری کائنات ایک خاندان ہے، چاند، ستارے، درخت، ندیاں، پرندے، انسان' سب ایک دُوسرے کے رِشتے دار ہیں۔ یہ رِشتے اب ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ اقدار ملیامیٹ ہوگئی ہیں۔ مشین نے آدمی کو بندھوا بنالیا ہے۔ آج کے ادیب اور شاعر کا فرضِ اوّلین ہے کہ وہ ان رِشتوں کو جوڑے۔ اور جو رِشتے ٹوٹ رہے ہیں اُنہیں ٹوٹنے سے بچائے۔ رِشتوں کی بازیافت، آپسی تال میل اور شناخت عطا کرنے کا کام آج کے ادیب و شاعر پر آن پڑا ہے۔ یہ ایک بڑی ذِمہ داری کا کام ہے۔ بقول غالب ؎ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے۔

ادیب تماشے کو دیکھا کرے اور رِشتوں اور قدروں کا تحفّظ کرے۔ رُخصت ہوتے درخت، غائب ہوتے پرندوں کی حفاظت کرے۔ جو لُغت وِرثے میں ملی تھی' آج اُس کے الفاظ معنی کھو چکے ہیں۔ آج سارے سیاق وسباق بدل گئے ہیں۔ آج الفاظ کو نئے معنی و مفہوم دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارا ادیب و شاعر یک رُخا رویہ چھوڑ کر وسیع وِژن اپنائے۔ آج سچ اور جھوٹ کی شناخت نہیں رہ گئی ہے۔

ندا کا کہنا ہے کہ درد کے اِظہار کے دو طریقے ہیں۔ یا تو وہ آنکھوں سے بہے یا مسکراہٹ کے ذریعہ باہر آئے۔ مسکراہٹ والا راستہ مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ ؎

ہنستے ہُوئے چہروں سے ہے بازار کی زینت رونے کی یہاں ویسے بھی فرصت نہیں ملتی

ندا کی شاعری میں کبیر کے فلسفہ حیات کی وہ اقدار نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں' جو مذہبیت کے مروجہ فلسفے سے زیادہ بلند و برتر ہیں۔ اور انسانی دردمندی میں جس کا جوہر نمو پاتا ہے۔ ندا پوری دُنیا کو ایک کنبہ اور انسانوں کو سرحدوں سے آزاد ایک آفاقی حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اپنی شاعری کے

بارے میں ندا خود کہتے ہیں۔ ''میری شاعری نہ صرف ادب اور اُس کے قارئین کے ادبی رشتے کو ضروری مانتی ہے' بلکہ اِس کے معاشرتی سیاق کو اپنا معیار بھی بناتی ہے۔ میری شاعری بند کمروں سے باہر نکل کر چلتی پھرتی زندگی کا ساتھ نبھاتی ہے۔ اور ان حلقوں میں بھی جانے سے نہیں ہچکچاتی۔ جہاں روشنی بھی مشکل سے پہنچ پاتی ہے' میری شاعری ماں کے ہونٹوں سے مسکراتی ہے۔ اور بہن کے آنچل سے سرسراتی ہے۔ بچوں کے ساتھ اسکول جاتی ہے، جوانی کے ساتھ اٹھلاتی ہے، دُھوپ میں جھلستی ہے، برسات میں نہاتی ہے اور وقت آنے پر ناانصافیوں کے خلاف آواز بھی اُٹھاتی ہے۔ اپنی زبان کے تعلق سے ندا کا کہنا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ زبان جو پڑھے لکھوں کی ہوتی ہے وہ جھوٹی زبان ہے۔ میں اپنی زبان تلاش کرنے سڑکوں پر گلیوں میں جہاں شریف لوگ جانے سے کتراتے ہیں' وہاں جا کر اپنی زبان لیتا ہوں۔ جیسے میر، کبیر اور رحیم کی زبانیں۔ میری زبان نہ چہرے پر داڑھی بڑھاتی ہے' نہ پیشانی پر تلک لگاتی ہے۔

پہلے مجموعہ ''لفظوں کا پل'' سے ندا نیوز میں ہیں۔ مشاہیر ادب کے انٹرویوز کی کتاب'' ملاقاتیں'' اپنی اسلوبِ نگارش کے سبب آج بھی پسند کی جاتی ہے۔ اور انٹرویو کے باب کی تاریخ میں ایک نئی باب کا اضافہ کرتی ہے۔ ندا اپنی شعری انفرادیت کی طرح اپنی نثر کے انوکھے انداز سے بھی پہچانے جاتے ہیں، شعری کامیابی کے ساتھ اپنی بات کو اپنے ڈھنگ سے کہنے کا ہنر نثر میں اظہار و بیانات کے نئے امکانات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شاہد ماہلی نے لکھا ہے۔ '' اپنے سوانحی ناول کے ذریعہ ندا نے ان حیرتوں کو روشن کرنے کی سعی کی ہے' جنھیں ہمارے فیشن زدہ دانش مندوں نے بجھا دیا ہے۔''

آج ندا عالمی سینیر یو پر نظریں جمائے، نئی اور پُرانی نسلوں کے ساتھ برابر رابطہ قائم کئے ہُوئے ہیں۔ جب اُنھیں ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا تو میں نے اُنھیں مبارک باد کا فون کیا۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا۔'' مجھے خوشی اِس بات کی ہے کہ جو کام کیا ہے۔ وہ سراہا گیا ہے۔ اور سب سے خوشی کی بات تو یہ ہے کہ میرے نام کے انتخاب پر بھی حلقے خوش ہیں۔ انعامات زندگی میں اہمیت نہیں رکھتے' لیکن اتنا ضرور ہے کہ لکھنے اور اپنے آپ کا جائزہ لینے کی تحریک دیتے ہیں۔''

ندا کی باتیں بہت ہیں۔ تلخ بھی اور شیرین بھی۔ کچھ اپنی بھوگی ہُوئی' کچھ دوستوں سے سنی ہُوئی۔ لیکن آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں اور مضمون کو کہیں نہ کہیں تو ختم ہونا ہی ہے۔ اس لئے آخر میں یہی کہوں گا کہ ندا ایک آئس برگ ہیں' جس کے سات حصے پانی میں ہیں اور آٹھواں اُوپر۔ لیکن وہ بھی پورا کہاں اُوپر ہے۔ اِس لئے ندا پر کچھ لکھنا بڑا مشکل بھی ہے اور بہت آسان بھی۔

●●

- آپ نے دلت مراٹھی کہانیوں کے تراجم کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ کہانیوں کے انتخاب میں آپ نے ذہنی فراست کا ثبوت دیا ہے اور اُن کے ترجمے بھی بڑی محنت سے کئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر یہ قطعی نہیں لگتا کہ یہ ترجمہ کی ہوئی ہیں۔ آپ نے اصل سے انہیں بالکل قریب کر دیا ہے۔ میں آپ کی محنت کی داد دیتا ہوں۔

شمس الرحمن فاروقی

- کہانیوں کا انتخاب آپ نے اچھا کیا ہے۔ ان میں سے کچھ کہانیاں میری پہلے کی پڑھی ہوئی ہیں۔ مراٹھی میں دلت ادب کا جو جائزہ آپ نے لیا ہے وہ بڑی معروضی اور جامع ہے۔ اُردو میں اس طرح کی کتابوں کی ضرورت ہے۔

گوپی چند نارنگ

- ......کم از کم اُردو والے مراٹھی ادب کے اس نئے رنگ سے واقف تو ہو جائیں گے۔ آپ نے یہ اچھا کیا کہ کہانیوں کے آخر میں کہانی کا اصل نام بھی لکھ دیا۔

سیدمحمد عقیل

- آپ نے اُردو داں حلقے کو دلت ادب سے روشناس کرانے کی قابلِ تعریف کوشش کی ہے۔ یہ بڑا اہم کام ہے۔

اصغر علی انجینئر

- "دلت کتھا کا اجمالی جائزہ" جو دس صفحوں پر مشتمل ہے پہلے پڑھئے۔ وقار قادری نے کتاب کی ترتیب و تالیف کے لئے اتنا زیادہ اور کارآمد ہوم ورک کیا ہے، اس کا اندازہ مجھے نہیں تھا۔ یہ ابتدائیہ شہر ممبئی کی BEST کے اس مطبوعہ گائیڈ کی طرح ہے جو باہر سے آنے والے مسافر نقشہ دیکھ کر کتاب میں دی ہوئی معلومات پر عمل نہ کریں تو وہ جتنے دن اس شہر میں رہیں گے بس بھٹکتے ہی رہیں گے۔ اس اجمالی تبصرے کے مطالعے ہی کی وجہ سے میں دلت کہانیوں اور کہانی کاروں سے صحیح طور پر واقف ہوا۔

یوسف ناظم

- آپ نے نمائندہ کہانیوں کا ترجمہ کر کے دلت کہانی کو پڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ زبانیں اسی طرح ثروت مند ہوتی ہیں۔

زبیر رضوی

- شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ کہانیاں پڑھنے کا موقع دیا۔ آپ کا ترجمہ بڑا سبک اور اوریجنل ورژن کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور کہانیوں کا انتخاب نمائندہ۔ اورنگ آباد میں چودہ برس رہنے کے بعد میں ان کرداروں سے کافی مانوس ہوں اور آپ کی یہ کہانیاں پڑھ کر ان کے تناؤ کے اسباب کے تعلق سے میری جانکاری اور گاڑھی ہوگئی ہے۔

جوگیندر پال

- ......بعض مقامات پر مترجم کو بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ جہاں مختلف انسانی جذبات کا بے لاگ بیان مراٹھی زبان سے اُردو زبان کے سجے سنورے روپ میں ڈھل گیا ہے۔

انور قمر

- پہلی بار اُردو والوں کو یہ احساس ہوا ہے کہ اب تک اُردو اشرافیہ ادب ہی پیش کرتی رہی ہے۔ اسے دلت ادب بھی پیش کرنا چاہئے۔

شفق

- دلت کتھا کی مراٹھی کہانیوں کو وقار قادری نے جس فنی چابکدستی اور فنکاری سے اُردو میں ڈھالا ہے، یہ اُن کے کامیاب مترجم ہونے کی شہادت فراہم کرتے ہیں۔

یحییٰ نشیط

- آپ نے ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے، یوں لگتا ہے کہ آپ نے تخلیق کی ہے۔ ایسی روانی، ایسا بہاؤ کہ نظر ادھر اُدھر نہیں ہوتی۔

مظہر الزماں خان

.... تبصروں اور خطوط سے اقتباسات

مسافر، خوش آمدید!

● سُلطان سُبحانی

مالیگاؤں سے ممبئی جاتے وقت۔

جب بس ویران، سپاٹ اور بے رونق راستے کو طے کرتی ہوئی کسارا گھاٹ پہنچتی ہے اور ہزاروں فٹ گہری وادیوں کے درمیان سے ایک محتاط اور ابر خرام حسینہ کی طرح گذرنے لگتی ہے تو میں اپنی سیٹ پر بیٹھے سوچنے لگتا ہوں۔

"راجندر سنگھ بیدی کی نثر کا سفر ختم اور اب یہاں سے ندا فاضلی کی نثر کا سفر شروع ہو گیا ہے۔"

مسافر اپنی نشستوں پر سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بس سبز پوش پہاڑیوں پر گشت لگاتے ہوئے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ برسات کے دنوں میں سڑک پر بادل بھی چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ منظر پر دھند چھا جاتی ہے یوں لگتا ہے جیسے وادیاں، پیڑ پودے سب مخمل نشیں ہو گئے ہوں اور اس عالم میں جہاں جہاں وادیوں پر جھرنے گرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں چاندی کی مسحور کن انگڑائی نظر آتے ہیں لیکن یہ سفر بے حد خطرناک بھی ہے۔ ڈرائیور کی ذرا سی غفلت سب کو ہزاروں فٹ نیچے لے جا کر دھماکوں میں تبدیل کر سکتی ہے۔ میں نے اکثر ان وادیوں سے گاڑیوں کے ملبوں کو کرین سے کھینچتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ مدہوشی کی حالت میں اس مقام پر ڈرائیونگ خطرے سے خالی نہیں۔ خدا جانے بعض نقادوں کی گاڑیاں ادھر سے صحیح وسلامت کیسے گذر جاتی ہیں؟ حیرت میں ہوں!

ندا کی نثر بھی بار بار خطرے کے نشان کی طرف بڑھتی ہے لیکن محتاط رویہ کے باعث دھماکہ نہیں ہوتا۔ بریکیں چیختی ضرور ہیں مگر کچھ عجیب طرح کا دھماکہ ہو جاتا ہے۔

ع کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

میں ادب کا ایک ایسا نظر باز مگر پریشان حال راہ رو ہوں کہ ہمیشہ نثر نگار ڈھونڈتا رہا ہوں۔ ماضی کے پڑاؤ سے حال کے بہاؤ اور چڑھاؤ تک ہزاروں آفتاب ماہتاب نظر آتے ہیں لیکن چند ہی نام میری تلاش پر دستخط کرتے ہیں۔ کرشن چندر، منٹو، ظ۔انصاری، عصمت چغتائی اور ان چاروں کے بعد ندا فاضلی

کچھ قریب آتے دکھائی دیتے ہیں، یعنی جستجو ابھی ششِ جہاں تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ میں دراصل معنی خیز اور تخلیقی نثر کا پرستار ہوں۔ کچھ طنز و مزاح، کچھ ادب کی چاشنی اور چٹخارا، کچھ حُسن و جمال، کچھ اشارے کنائے، کچھ انشاء پردازی اور کچھ سادگی و گہرائی وغیرہ۔ کیونکہ ان خوائص کے بغیر فنکارانہ نثر جلوہ گر نہیں ہوتی۔ خدا جانے کیوں عصرِ نو کے افسانہ نگار ان خوبیوں سے خالی دامن یا دامن کشا ہیں۔

کرشن چندر نے کہا تھا۔ ''وہ نثر ہی کیا جس میں ظرافت نہ ہو۔'' لیکن میری دانست میں وہ نثر ہی کیا جس سے شاعری بھی آنکھ چُرانے اور جسم بچانے نہ لگ جائے اور ''اُوئی'' کر کے نہ رہ جائے۔ شاعری تو بے چاری اوزان و بحور اور ردیف و قافیوں وغیرہ جیسی بہت سی پابندیوں میں حبس دوام کے پیرہن بُن رہی ہے اور مُسلسل ''خود اپنے کام پر سر دُھن رہی ہے۔'' لیکن نثر اپنی جگہ آزاد اور خود مُختار ہے، اس کی راہ میں سلاخیں اور چار دیواریاں نہیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ سلاخوں اور دیواروں کے کچھ شائقین صحافی وہاں پہنچے اور نام کمانے کے لئے اپنی نثر کو چابک بدست کر دیتے ہیں اور پس سلاخ ہو کر بے باک ہونے کی سند حاصل کر ہی لیتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کہیں کہیں ندؔا بھی کافی بے باک ہو جاتے ہیں لیکن فوراً محتاط رویہ کے دروازے پر دستک دے دیتے ہیں۔ اندر سے آواز آتی ہے ''کون ہے؟''

ندا کہتے ہیں۔ ''میں ندا فاضلی ہوں۔''

جواب ملتا ہے۔ ''اخاہ آپ......؟ فوراً اندر آجایئے۔ ہتھیلیوں پہ جان لے کے پھر رہے ہیں سب یہاں۔'' یہی وجہ ہے کہ ندؔا بے باکی کی طرف پیش قدمی کے بعد بھی پُرسکون نظر آتے ہیں اور باقر صاحب کی تعریف بھی کرتے ہیں کہ وہ بھی پُرسکون رہیں۔

ندؔا سے میری مراسلت کبھی نہیں رہی، اگر رہی بھی ہوگی تو میں شاید بھول گیا ہوں۔ ہاں زندگی میں ان سے دوسرسری سی ملاقاتیں ضرور ہوئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہیں وہ بھول گئے ہوں لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۶۵ء میں جب ندؔا گوالیار سے ممبئی منتقل ہوئے تھے اس وقت مرزا عزیز جاویؔد مجھے مکتبہ جامعہ کے قریب یعقوب اسٹریٹ لے گئے تھے۔ وہاں اُس وقت عنایت اختر، پروفیسر ابراہیم رنگلا اور ندؔا، احمد ہمیش کی مجنونانہ سرگرمیوں پر گفتگو کر رہے تھے۔ عزیز جاویؔد نے جب سب سے میرا تعارف کروایا تو ندؔا نے میری نوعمری کا جائزہ لے کر مجھ سے بے ساختہ پوچھا۔ ''شاعر میں آپ کا افسانہ ''ہتھوڑا'' کس سن ء میں شائع ہوا تھا؟''

میں چونک گیا۔ مجھے اِس بات پر حیرت ہوئی کہ نظمیں، غزلیں اور گیت لکھنے والے شاعر ندا نثر بھی پڑھتے ہیں اور یاد بھی رکھتے ہیں' میں نے جواب دیا۔ ''اُنیس سو.....اتنا کہہ کر میں رُک گیا اور سن یاد کرنے لگا۔ ندا میری طرف دیکھتے رہے۔ چند ثانیہ بعد اچانک مجھے یاد آیا اور میں نے کہا'' چونسٹھ میں۔''

ندا نے کہا۔'' آپ جب سن یاد کررہے تھے تو میں ڈر رہا تھا کہ کہیں آپ ۱۹۰۱ء نہ کہہ دیں۔''میں ہنس پڑا۔ پھر ندا نے کہا۔'' واہ صاحب! آپ کا افسانہ پڑھ کر لگتا ہے کہ آپ مارکسسٹ ہیں۔''میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دوسری ملاقات تقریباً دس سال بعد تصدیق سیو ہاروی صاحب کے مکان پر ہوئی۔ اس وقت وہاں ندا کے ساتھ بلو بیدل (جتیندر بلو) بھی موجود تھے اور ایک انگریزی ناول پر اظہار خیال چل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم وہاں سے نیچے آکر قریب کے ایک چائے خانے میں گئے جہاں ندا نے ایک خوبصورت سی نئی نظم سنائی۔ بس یہ دو ملاقاتیں ہوئیں لیکن ممبئی کی ادبی دنیا میں میری ایک ملاقات ایسی بھی ہوئی ہے جو ناقابل فراموش ہے' جس کا ندا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو زیرِ نظر مضمون سے خارج بھی ہے لیکن حیرت انگیز ہونے اور غائبانہ طور پر ندا سے ٹکرا جانے کے باعث اسے تحریر کرنا ضروری سمجھ رہا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ میں باقر مہدی صاحب سے ملنا چاہتا تھا۔ لہٰذا ۱۹۷۲ء میں اپنے دوست رزاق عادل اور سیّد عارف کے ہمراہ دوپہر میں ان کے مکان پر پہنچا۔ ہمیں وہاں پہنچانے والے نشاط انور تھے (اب نہیں رہے اور افسوس کہ رزاق عادل بھی نہیں رہے) باقر صاحب ہم سے بہت تپاک سے ملے۔ خود اپنے ہاتھوں سے قہوہ تیار کر کے بڑی شائستگی سے ہمیں پیش کیا۔ بہت دلچسپ باتیں بھی کیں لیکن جب ہم رُخصت ہونے لگے تو باقر صاحب نشاط کو الگ لے جا کر میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہنے لگے اور یہ منظر میں نے اپنے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جب ہم زینے اتر کر نیچے آئے تو میں نے نشاط سے پوچھا۔'' باقر صاحب کیا کہہ رہے تھے؟''

نشاط نے کہا۔'' باقر صاحب تمہارے بارے میں نہایت ناراضگی سے کہہ رہے تھے کہ یہ آدمی کمیونسٹ لگتا ہے۔ آئندہ کبھی اسے اپنے ساتھ یہاں لے کر مت آنا۔''

میں سوچنے لگا۔'' ندا نے مجھے مارکسسٹ کہا تھا اور باقر صاحب کمیونسٹ کہہ رہے ہیں تو میں اصل میں ہوں کیا؟ میری اپنی شناخت کہاں چلی گئی؟ میں اپنی دریافت کرنے کے لئے مالیگاؤں واپس ہو گیا۔

اس واقعاتی تحریر پر اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ بین السطور میں ان دونوں شخصیات کے درمیان خوبصورت امتزاج کی بجائے ایک حسین تضاد موجود ہے اور یہ حسین تضاد اتنا ہوش رُبا ہے کہ اس میں میں سرے سے ہی کھو گیا ہوں مگر خوش ہوں کہ رزاق عادل اور نشاط انور کی طرح کہیں اور نہیں گیا۔

یہاں مجھے اس بات کا بھی احساس ہو رہا ہے کہ میں نے تذکرہ چھیڑا تو تھا ندا کا اور بات پہنچ گئی باقر مہدی صاحب تک۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلم میں بانکی ترچھی ہوائیں بھی چلتی ہیں، بادبان بھی پھڑپھڑاتے ہیں۔ ''ہیّا ہو ہیّا'' کی آوازیں بھی آتی ہیں اور کشتی یعنی سفینۂ تحریر کسی اور سمت چل پڑتا ہے، لیکن چونکہ یہ عمل فطری ہے، لٰہذا میں اسے رد کرنے سے گریز کرتے ہوئے یونہی ''چلا جا رہا ہوں کنارے کنارے''

''ملاقاتیں'' اور ''دیواروں کے بیچ'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ندا کے پاس نثر کی طرزِ ادا موجود ہے جو خوبصورت بھی ہے اور منفرد بھی۔ اس منفرد اسلوب کا احاطہ مضمون کی زیریں رو میں خود بخود ہوتا ہوا چلتا رہے گا۔ اس وقت اہم مسئلہ یہ ہے کہ ندا کی شاعری اور نثر میں کتنا فاصلہ ہے اور ندا زیادہ کامیاب کس جانب ہیں؟

مجھے یاد آتا ہے کہ مُدیر ''شاعر'' نے جب مجھ سے اسی قسم کا سوال کیا تھا تو میں نے جواب میں ہنس کر تحریر کیا تھا۔ ''نثر اور شاعری'' یہ دونوں میری بیویاں نہیں ہیں کہ میں ان کا موازنہ کروں۔''

لٰہذا نثر اور شاعری کا موازنہ کیوں کیا جائے۔ کیوں نہ دونوں کو اچھی نگاہ سے دیکھا جائے کہ فن کار نے دونوں پر یکساں توجہ دی ہے اور یکساں ریاضت کی ہے۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ دل و دماغ میں ستارہ چمکانے اور پھول کھلانے والے ایک شاعر کے لئے نثر کی کنکریاں چننا کتنا مُشکل ہے؟ کوئی شاعر جب شاعری سے نثر کی طرف جاتا ہے یا کوئی نثر نگار نثر سے شاعری کی طرف آتا ہے تو اس آنے اور جانے کے درمیان ہی پتہ چل جاتا ہے کہ۔

جھونکے ہوا کے بالوں میں چاندی پرو گئے

کیونکہ یہ دونوں اصناف دو الگ الگ زمانوں کے مماثل ہیں جن کے درمیان جست نہیں لگائی جاسکتی بلکہ اپنے اندر فکر و فن کی اگنی پریکشا سے گذرنے کا حوصلہ پیدا کرنا پڑتا ہے اور اس پریکشا میں کوئی کوئی ہی کامیاب ہوتا ہے۔ باقی سب ''آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا'' کا انکشاف کرنے کے لئے اپنی پیش رفت سیاست کی طرف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ وہاں دل بدلی کا بہت شاندار انتظام

ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔

ان دونوں زمانوں کے دوش بدوش چلنے میں ندا کامیاب اس لئے ہیں کہ ان کا ذہن تخلیقی ہے۔ فکر تخلیقی ہے اور کسی شئے کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا عمل بھی تخلیقی ہے۔ کسی زمانے میں ''ملاقاتیں'' جب میرے ہاتھ لگی تو میں نے اس کا دوپٹہ کھینچ کر پوچھا'' کیوں ری نٹ کھٹ! مرکز نگاہ بننے کے لئے تو نے اتنا میک اپ کیوں کر رکھا ہے؟'''' یہ فقرہ تو بس ایک مذاق خاکسارانہ ہے لیکن یہ میک اپ کوئی لیپاپوتی ہرگز نہیں ہے کیونکہ ادبی تناظرات میں یہ آرائش جمال دراصل اس کتاب کے باطن میں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کتاب ''ملاقاتیں'' مجموعہ انٹرویوز ہونے باوجود جگہ جگہ تخلیقی زبان وتحریر کے نشانات ثبت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ان دنوں ''نشاط بک سینٹر'' کے نام سے میں کتب فروشی کا ''رہین ستم ہائے روزگار'' تھا۔ میں نے ''ملاقاتیں'' کی کافی جلدیں مکتبہ جامعہ سے طلب کر کے فروخت کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری دکان کے اندر ایک اور دوکان جو کہ مباحث اور اظہار خیال کی تھی کھل گئی۔ پڑھنے والوں نے تعریفیں بھی کیں اور اعتراضات بھی کئے۔ میں خود بھی ان میں دونوں طرف شامل تھا۔ انہیں دنوں بشیر بدر اپنی ناموری اور مقام کے تعین کے لئے کافی متحرک تھے۔ کئی رسائل کو انھوں نے اشتہار بازی کا محور بنا دیا تھا جس کے احتجاج میں چار صفحات کا ایک طویل خط تحریر کر کے میں نے ماہنامہ 'کتاب' لکھنؤ (شمارہ مئی جون ۷۸ء) میں چھپوا دیا۔ اس خط میں ایک جگہ ندا کا تذکرہ بھی در آیا میں نے لکھا۔

''بلٹز میں ندا فاضلی نے قرۃالعین حیدر کے متعلق لکھا تھا کہ 'ہاؤسنگ سوسائٹی'' لکھ کر انھوں نے اپنا قد تمام افسانہ نگاروں سے اونچا کر لیا ہے کچھ اس طرح کہ ان کا قد منٹو کے قد پر کھڑا ہو گیا ہے۔'' یہ اور بات ہے کہ ایک سال بعد جب ''ملاقاتیں'' چھپی تو ندا نے یہ ٹکڑا حذف کر دیا۔''

ندا کا محولہ بالا ٹکڑا حذف کرنا اس احتیاط پسندی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا تذکرہ اس مضمون کے آغاز ہی میں کر چکا ہوں۔ یہ اقدام انتہا پسندی کی تنسیخ بھی کرتا ہے اور فنکارانہ دانشمندی کا اعلان بھی۔ کاش! وارث علوی صاحب بھی اپنے بہت سے اقتباسات اسی طرح حذف کرتے رہتے اور نظام صدیقی صاحب اپنے اقتباسات کے ترجمے بھی پیش کر دیا کرتے۔

ہاں تو بات چل رہی تھی تخلیقی نثر کی۔ نثر لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسکول کے سارے بچے نثر ہی لکھتے رہتے ہیں لیکن تخلیقی نثر پیش کرنا سلگتے ہوئے صحرا میں پھول کھلانے کے مترادف ہے اور یہ کام

تخلیقی فنکار ہی کر سکتا ہے۔ ہمارے بعض نثر نگار خصوصاً پہاڑی قسم کے نقاد ہم شریفوں کو مرعوب کرنے کے لئے بھاری بھرکم الفاظ کے پتھروں کو بیان کے کریشر کے حوالے کرتے ہیں اور ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ اردو نثر لکھ رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ نا معلوم کیوں ان کے جملے کئی کئی کلومیٹر لمبی مسافت طے کرنے کے بعد بھی مکمل نہیں ہو پاتے۔ ان باتوں سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ خاکسار کو نقادوں سے کوئی طرح کا بیر ہے۔ نہ تو ہم انھیں چھیڑ رہے ہیں اور نہ ہی اپنا مخالف بنا رہے ہیں۔ اپنے مخالف تو وہ خود ہی ہو گئے ہیں کہ جن نکات اور نظریات کو پیش کرتے ہیں دس بارہ برس بعد انھی کو رَد اور کنڈم کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ان میں چند نقاد تو اتنے عجلت پسند ہیں کہ ایک ہی مضمون میں اپنی ہی لکھی ہوئی باتوں کو آگے چل کر رَد کر دیتے ہیں لہٰذا ان سے دبنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے ہمارے پاس ادب کے پس منظر میں رہنے کے علاوہ اور کوئی دوسرا ملک ہے ہی نہیں' لہٰذا ہم جانتے ہیں کہ '' ہم سے خلاف ہو کے زمانہ کرے گا کیا؟''

ان تمام باتوں کے پیشِ نظر اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ندا کا موضوع اتنا زرخیز ہے کہ اس میں دیگر بہت سارے مسائل، معاملات اور سخن شناسی وغیرہ۔ '' خود بخود مئے ہے کہ شیشے میں بھری آوے ہے'' کے مصداق پیمانۂ تحریر کو لبریز کر رہے ہیں۔ ندا صاحب کا شکریہ!

'' دیواروں کے باہر'' ندا کا سوانحی ناول ہے۔ یہ '' ناول'' کیوں کر ہے؟ اس میں ناول کی تکنیک کا کہاں قیام ہے اور کلائمکس کس مقام پر ہے؟ ان نکات پر میں نے کافی غور کیا۔ کلائمکس کو تلاش کرتے جب میں آخری صفحہ پر پہنچا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ نیچے قوسین میں '' جاری'' لکھا ہوا ہے۔ پھر میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ اس ناول میں جو بے شمار کردار ہیں کیا یہ اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں؟ یہ کردار جو زندگی کے سفر میں اِدھر اُدھر پتھروں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں' کیا ان سے کوئی فنی دیوار کھڑی کی گئی ہے یا انہیں یونہی اِدھر اُدھر پڑا رہنے دیا گیا ہے؟ تو احساس ہوتا ہے کہ یہ تمام کردار دیواروں کے باہر ہیں اور محض تذکرے کے طور پر کتاب کے صفحات پر موجود ہیں اور اس حد تک موجود ہیں کہ مرکزی کردار ندا منظر میں بہت کم ہیں اور پس منظر میں زیادہ اور بہت سے مقامات پر تو پس منظر میں بھی نہیں ہیں۔ اس لئے مجھے سوچنا پڑ گیا کہ یہ سوانح کیوں کر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی بکھرے ہوئے حالات کا مجموعہ ہے۔ یہ بھی تسلیم کہ زندگی کی باگ اور رکاب ہمارے اختیار میں نہیں ہے لیکن زندگی کے ان بکھرے ہوئے حالات و واقعات کو مناسب انداز سے ترتیب دینا تو فن کار کے بس میں ضرور ہے اور اگر یہ شکستگی اور بکھراؤ تجرید ہے تو یہ شعوری یا لاشعوری نہیں محسوس ہوتی بلکہ عجلت، لاپروائی اور بے توجہی کے باعث پیدا شدہ محسوس ہوتی ہے۔ میں اس

بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ناول کسی مخصوص فارمولہ کا پابند نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اپنے خمیر اور لوازمات کا ضرور تابعدار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں واقعات کے بہاؤ کو مسخ کر دیا گیا ہے۔

جو کردار دنیا سے اُٹھ گئے ہیں وہ پھر جیتے جاگتے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ ماضی سے حال اور حال سے ماضی کی طرف مسلسل پھرے، مراجعت، پیش قدمی یا آمد و رفت کے تانے بانے اور ایک عجیب سی اُلجھن پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ باتیں میں اس لئے تحریر کر رہا ہوں کہ اسے ناول کے خانہ میں رکھا گیا ہے۔ یہاں میں ''چاندنی اور کلیاں'' کا تذکرہ کروں گا جس میں اے۔ حمید نے بغیر کسی واقعہ کو بیان کئے ایک لڑکی کے احساسات کو سینکڑوں ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کر دیا کہ ایک احساساتی ناول بن گیا۔ میری دانست میں ''دیواروں کے باہر'' کو اگر سوانحی ناول نہ لکھا جاتا تو یہ سوالات ہرگز نہ اُٹھتے۔ ہمارے نقاد اسے خود ہی فکشن میں شریک کر لیتے۔

''دیواروں کے باہر'' کی طرزِ ادا بیانیہ ہے، زبان افسانوی ہے۔ کہیں کہیں تلمیحات اور نثر میں شاعری بھی ہے۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں بلکہ ہنر مندی ہے کہ جہاں جیسی فضا ہے اسے اُبھارنے کے لئے ویسا ہی طرزِ سخن اختیار کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ماحول نگاری بہت ہی فنکارانہ ہے۔ کسی شئے کو بیک وقت ایک فنکار، ایک بچے اور ایک مفکر کی آنکھ سے دیکھنا ارتکازِ فکر و نظر کی جلوہ گری ہے۔ اسی باعث میں نے پیچھے کہیں لکھا ہے کہ ندا کے دیکھنے کا انداز بھی تخلیقی ہے۔

''مولسری کے پیڑ میں چھپی چڑیاں دوپہر کی گپ شپ میں مشغول ہیں۔ مندر میں گھنٹیوں کی آواز کی گونج سے چونک کر ایک ساتھ کئی چڑیاں باہر نکلتی ہیں اور ان کے پروں کی سرسراہٹ سے بہت سارے پھول شاخوں سے ٹوٹ کر ہوا میں جھولتے ہوئے فرش پر بکھر جاتے ہیں۔ ڈوبتے سورج کی دھوپ اپنے اُجلے ہاتھوں میں اُن پھولوں کو لئے مندر کی دیوار پر کھڑی آرتی کا انتظار کر رہی ہے۔''

اس کتاب میں جگہ جگہ چمکتے ہوئے جملوں کی شعاع اندازی، امیجری اور استعارہ سازی کی روشن مثالیں بھی ہیں۔ ''اکیلے گھر میں شام ڈرائنگ روم میں بیٹھی دھوپ کے خط میں آخری سطر میں لکھ رہی ہے۔'' اور اسی قسم کے چبھتے ہوئے جملے بھی ہیں۔

''دو بوتل شراب لاتا ہے اور ان سب کو پلاتا ہے جو اس کے افلاس پر ترس کھا کر ادھار مانگنا چھوڑ چکے ہیں۔''

''لڑائی کبھی کبھی پولس اسٹیشن پہنچ جاتی ہے اور باقی رات وہیں آرام کر کے سویرے ہوٹل میں

واپس آجاتی ہے۔''

کہیں کہیں سُبھر پوش رُومانی انداز کی جھلکیاں بھی ہیں جو صاف اور واضح نہ ہونے کے باعث پُرکشش محسوس ہوتی ہیں۔

''سورج انگور کی بیل کی تلاشی لیتا ہے۔ اسے وہاں دو جسموں کی تھوڑی سی خوشبو، چند گرم سانسیں اور کچھ خاموشی اور سرگوشیاں بھی ملتی ہیں۔''

صاحب یہ رُومانی انداز بھی عجیب شئے ہے' کوئی رزمیہ ہو، کوئی انقلاب یا کوئی مذہبی تاریخی ناول ہو اس میں بلا اجازت دَر آتا ہے اور یہ سورج بھی عجیب بہروپیا ہے کہ کہیں ''چارہ گر'' بن کر'' ایک چنبیلی کے منڈوے تلے'' کے سُلگتے ہوئے ماحول میں تاک جھانک کرتا ہے اور کہیں لحۂ خوش گوار کی علامت بن کر انگور کی بیل کو ٹٹولتا ہے مخول کرتا ہے کیونکہ اوپر جانے کا راستہ ہی بند کر دیا جاتا ہے۔

''دیواروں کے باہر'' میں بے شمار ادبی کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مرزا عزیز جاوید، باقر مہدی، تصدیق سہاروی، مجروح سُلطان پوری، سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، تاباں جھانسوی، حسن نعیم، کُمار پاشی، وحید اختر مخدوم محی الدین، عمیق حنفی محمود ہاشمی، باقی، عزیز قیسی، جون ایلیا، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، راہی معصوم رضا، ظ۔ انصاری، اختر الایمان اور پانڈو۔

یہ پانڈو کون ہیں؟ میں نہیں جانتا۔ اسی طرح کئی فلم ڈائریکٹر، پرڈیوسر اور ایک دو بھکاری وغیرہ بھی ''دیواروں کے باہر'' یعنی کتاب کے اندر موجود ہیں۔ ندا نے ان میں سے بعض کا قلمی پورٹریٹ بہت عمدہ تیار کیا ہے۔ تذکرے بھی رواں دواں ہیں لیکن کسارا گھاٹ سے ممبئی کی طرف جانے والی گاڑی کی بریکیں کئی جگہ خطرے کے نشان کی طرف بڑھ کر چیخ اُٹھتی ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو۔

''عزیز جاوید جس جھونپڑی سے صبح سو کر نکلتے تھے وہ ایک کچی شراب کا دھندا کرنے والے جوان کی بیوہ کی تھی۔ شروع میں وہ وہاں نمک کے ساتھ کچی شراب سے غم بہلانے جاتے تھے اور بعد میں لمبے ادھار کے بدلے میں بیوہ کو ماں بننے کی عزت بخش کر اس کے ساتھ مرد کی حیثیت سے رہنے لگتے ہیں۔'' (یہی اندازِ تحریر آگے چل کر عزیز جاوید کی لڑکی کے بارے میں بھی ہے۔)

''بیوی کی جائداد تصدیق (سُہاروی) کو شوہر سے بیوی اور ان کی اہلیہ رضیہ کو بیوی سے شوہر بنا دیتی ہے۔ بنا آپریشن کے جنس کی یہ تبدیلی سماجی اور اقتصادی حقیقت ہے۔''

یہ اقتباسات چاہے جتنے تیکھے اور حقیقت نگاری پر مبنی ہوں لیکن اپنے ہی رفیقوں کے تعلق سے

(جو اور دوسروں کے رفیق ہوں) یوں جارحانہ انداز اختیار کرنا ندا جیسے ادبی سمجھ بوجھ رکھنے والے فن کار اور وسیع الظرف انسان کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

(وسیع الظرف انسان کی وضاحت آگے پیش کروں گا)

میری اس بات کے جواب میں منٹو کی بعض تحریروں کا حوالہ دینا کسی طرح درست نہ ہوگا۔ کیونکہ منٹو ادب اور سماج میں ایک ذہنی بغاوت کی نمائندگی کر رہے تھے اور اردو کے افسانوی ادب کو جنس کی لذت سے آشنا بھی کر رہے تھے۔ اس میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے اس کا فیصلہ ''قارئین کی عدالت'' میں آج تک نہیں ہو سکا۔ منٹو کے بعض جنسی افسانے کچھ نقادوں کے لئے کتبِ مقویٔ خاص کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ اس پہلو پر غور نہیں کرتے کہ منٹو کے افسانوں کا اطلاق پوری انسانی برادری پر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ ایک مخصوص طبقہ کو (جس میں رنڈی، بھڑوے اور غنڈے وغیرہ شریک ہیں) کو اپنے افسانوں کا محور بنائے ہوئے تھے۔ پریم چند اور کرشن چندر کی طرح منٹو بھی مجھے بے حد عزیز ہیں لیکن اپنی کردار نگاری فنی چابک دستی، زبان و بیان، واقعہ کی تشکیل اور مرکزی خیال کی تجسیم کی بنیاد پر ...اور یہی وہ باتیں ہیں جن کے باعث منٹو ایک اہم افسانہ نگار ہیں ورنہ جنس نگاری اور سماجی بغاوت تو بہت سارے فن کار کرتے رہے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ ان ہی رجحانات پر اُردو افسانہ ختم نہیں ہو جاتا۔ تمنا کا دوسرا قدم تلاش کرنے والے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ گذشتہ کسی سطر میں میں نے ندا کو وسیع الظرف کہا ہے۔

''دیوار کے باہر'' کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ندا نے بہ حیثیت شاعر یا فلمی نغمہ نگار کہیں بھی اپنے قد کو کسی سے بُلند کرنے یا فن کی سیڑھیوں سے کسی کو گرانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ کسی کے ساتھ معاندانہ رویہ بھی اختیار نہیں کیا' کسی کو رد بھی نہیں کیا' بلکہ جس کے بھی فکر و فن پر لکھا بہت فیاضی سے لکھا۔ جس مرزا عزیز جاوید کی نجی زندگی پر چند قابل اعتراض جملے تحریر کئے اسی عزیز جاوید کے فن پر یوں رقم طراز ہیں۔

''ان کے یہاں غزل کے سکہ بند موضوعات ولفظیات سے شعوری گریز ان کی تخلیقی بیداری کی گواہ ہے لیکن اس تبدیلی کو اور زیادہ رچانے اور گہرانے کی وقت نے انھیں مہلت نہیں دی۔''

جون ایلیا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''زبان و بیان پر قدرت موروثی ہے۔ زود گوئی بھی رئیس امروہوی جیسی لیکن مجموعہ میں شعری ذہانت پر کتاب کی ضخامت حاوی ہوگئی اور کتاب وقت سے پہلے کھوگئی' بازار میں جاگتی رہی' جاگنے والوں

کے لئے سوگئی۔''

''وہ منقسم برصغیر کا ایک مرثیہ ہیں۔مشترکہ تہذیب کا بٹوارہ ان کا کرب ہے جو ان کی شاعری میں جہاں تہاں جھلکتا ہے' درد بن کر کسکتا ہے۔''

یہ اقتباسات ندا کی اعلیٰ ظرفی کی مثال ونشاندہی کے لئے کافی ہیں۔کچھ عرصہ قبل سریندر پرکاش کی خود نوشت پڑھنے کے درمیان دوسرے فن کاروں کے تعلق سے بہت سارے گلے شکوے قطار اندر قطار براجمان نظر آئے۔افسوس! یہ افسوس سریندر پرکاش پر ہے یا اُن دوسرے فنکاروں پر؟ میں اچھی طرح نہیں جانتا۔ادبی دنیا میں دراصل وہ سرگرم دنیا ہے جس کے بارے میں خود ندا نے کہا ہے۔؎

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

لیجئے یہ شعر بھی ایک ثبوت ہی ہے جناب ندا کے ظرف کا۔ ع

لہٰذا اب میں ذرا اپنا رُخ بدل کے چلوں

اِدھر کچھ عرصہ سے سوانح عمریاں لکھنے اور سنانے والوں نے محفل ادب پر سناٹا طاری رکرکھا ہے۔یہ سناٹا زمانے کے بڑے شوق سے سننے کی وجہ سے ہے یا سنانے والے کے سوجانے کی وجہ سے؟ یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔واقعہ یہ ہے کہ درجن بھر ادباء اس کام سے فارغ ہوچکے ہیں۔آل احمد سرور، حمایت علی شاعر، ادا جعفری، کشور ناہید زُبیر رضوی، ایوب جوہر اور نفیس بانو شمع وغیرہ۔میری دانست میں اتنے سارے ادباء کا خود پر کام کرنا زیادہ اہم نہیں ہے۔قابل غور بات یہ ہے کہ نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے ہر ایک کو منفرد قرار دیا ہے' لہٰذا میں یہ سوچ رہا ہوں کہ'' دیواروں کے باہر'' کو بھی منفرد لکھنے سے کہیں اس کی انفرادیت ختم نہ ہوجائے۔اس لئے اسے منفرد قرار دینے سے دانستہ گریز کررہا ہوں۔

سوانح عمریوں کے اس میلے میں حمایت علی شاعر کی منظوم خودنوشت میرے مطالعے سے گذر چکی ہے۔وہ یقیناً ایک اہم ادبی کارنامہ ہے کہ آدھی دنیا کے عوامی، سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی تناظرات کو جلو میں لئے منظر عام پر آئی۔'' دیواروں کے باہر'' اور'' گردش پا'' (زُبیر رضوی) اپنے زبان وبیان، حقیقت اور واقعہ نگاری کے باعث وقیع اور دوش بدوش ہیں۔افسوس کہ ادا جعفری کی کتاب'' جو رہی سو بے خبری رہی'' میرے مطالعہ میں آنے سے ابھی تک بے خبر ہے۔

'' دیواروں کے باہر'' کی کچھ سطریں نامعلوم کیوں دیواروں کے بہت اندر چلی گئی ہیں۔ایک

رقاصہ کا ہیجان انگیز رقص پیش کرنے کے بعد لیٹ جانا اور تماشائیوں کا اس کے جسم پر بھوکے گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑنا کتاب کی سنجیدگی کو متاثر اور معیار کو مجروح کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کے مکروہ اور گھناؤنے مناظر ہماری دنیا میں چاروں طرف تاریکی میں بکھرے ہوئے ہیں اور فن کار سماج کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر بھی کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ حقیقت بیانی تو ہے لیکن ان پہلوؤں کا سدِ باب ہرگز نہیں ہے اور نہ ہی فن کی معراج۔ کیونکہ اس کا ردِ عمل چٹخارے کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔ فن کار اپنے مرتبہ پر ہر حال میں ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت سے براجمان ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے اپنی خود نوشت میں اپنی جنسی ہیجان اور شہوت پرستی کا اظہار بہت زور و شور سے کیا ہے۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا۔ بہت سارے ادباء نے اپنی زندگی کے جنسی تجربے کو اپنا اہم فرض سمجھ کر بیان کیا ہے۔ میں نہیں جانتا یہ کون سا آرٹ ہے اور وہ قارئین کو کیا باور کرانا چاہتے ہیں۔ ادب میں کن کن موضوعات کی ملاوٹ ہوتی رہے گی؟ بوسہ بازی اور چوما چاٹی والی شاعری کیا چیز ہے؟ وصل و راحت کیا مسئلہ ہے؟

پچھلے دنوں ایک میگزین میں عذرا عباس کی کچھ غیر ادبی، غیر فنی اور عریاں نظموں پر میں نے اور دیگر خواتین وحضرات نے اعتراضات کئے تھے۔ میرے ایک دوست نے جواب میں تحریر کیا۔ ''ادب بہشتی زیور'' کی طرح سر پر پلو ڈال کر پڑھنے کی چیز نہیں ہے۔'' میں نے ان کے جواب میں عرض کیا..... ''لیکن ادب بند کمرے میں برہنہ ہو کر پڑھنے کی بھی کوئی چیز نہیں ہے۔'' افسوس کہ میرے دوسرے مدیر دوست نے میرا وہ خط نظر انداز کرتے ہوئے شائع نہیں کیا۔ اچھا ہی کیا ورنہ آگے چل کر بحث یہ رُخ اختیار کر سکتی تھی کہ ادب باوضو ہو کر پڑھا جائے یا اسے پڑھنے کے لئے بدن پر کن کن کپڑوں کا ہونا لازمی ہے؟

دیکھئے سلسلہ تحریر ''دیوارں کے باہر'' کی زرخیزی کے اعتراف میں پھر کچھ نکات کھینچ لایا۔ واقعی کتاب ہو تو ایسی کہ اس کے مطالعہ کے بعد بات سے بات نکلتی چلی جائے اور کسی کو ناگوار بھی نہ گذرے۔ پچھلے صفحات میں کہیں میں نے ندا کے دیکھنے کے انداز کو تخلیقی قرار دیتے ہوئے ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کو بھی تخلیقی کہا۔ اس کی مثال میں صرف دو اقتباسات کافی سمجھ کر پیش کر رہا ہوں۔

''ندا جب سے ممبئی آیا ہے تب سے شاخوں میں کھلنے والے پھولوں کی گنتی مسلسل کم ہوتی جارہی ہے اور ان کی نقل کے پلاسٹک کے رنگ برنگے پھولوں سے کمرے زیادہ سجائے جارہے ہیں۔ تجارتی کلچر نے مذہبوں کو مقدس کتابوں اور عمارتوں سے نکال کر دوکانوں کی اشیاء میں ڈھال دیا ہے۔ رامائن کے رام اور گیتا کے کرشن ٹی وی سیریل میں اداکاری دکھارہے ہیں۔ قرآنی آیات کے پاسبان خدا اور رسولؐ کے

ناموں سے اپنا اپنا بیوپار سجا رہے ہیں۔ جیسے محمد یہ ریستوران اور الحمد جنرل اسٹور"

یہ احساسات بہت گہرے بھی ہیں اور بہت چمک دار بھی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے درمیان کچھ احساسات مجھ میں بھی بیدار ہوئے ہیں۔ جن صفحات پر ندا نے بہت سارے ادیبوں اور شاعروں کے تذکرے کیے ہیں انہیں پڑھتے وقت مجھے ایسا لگا کہ جو ادباء ہم میں اب نہیں رہے ندا نے انھیں دوبارہ ہمارے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ کوشش قابل ستائش ہے۔ اگر مرحوم ادیبوں کے اس طرح تذکرے نہ ہوں تو وہ فراموشی کے سمندر میں ہمیشہ کے لئے ڈوب جائیں گے اور آنے والی نسلیں ان کے نام سے بھی نا آشنا رہیں گی۔ عصری ادب کا المیہ یہ ہے کہ جانے والوں کو لوگ بہت جلد بھول جاتے ہیں یا ادب کے منظر نامہ سے ہٹا دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب نئے نقاد ادبی افق پر جلوہ گر ہوتے ہیں تو وہ اپنی انفرادیت کے لئے اور نئے منظر نامہ پر حاوی ہونے کے لئے نیا باجہ بجاتے ہیں اور ماضی کی طرف دیکھنے سے کتراتے ہیں کیونکہ زندہ رہنے کے لئے زندہ ادباء سے مراسلت اور ذاتی تعلقات قائم رکھنا ان کے نزدیک زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ ندا ایک ایماندار نقاد کی طرح عصر اور عہدِ گذشتہ دونوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ یہاں ایک رسمی سا مصرعہ یاد آرہا ہے۔ ؎ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اب کسارا گھاٹ سے ممبئی کی طرف سفر کرنے والے مضمون کو میں اس کی منزل پر پہنچانے کے لئے اس موضوع اور اس منحوس دن کی طرف دیکھ رہا ہوں جو ہندوستان کا ایک تاریخی المیہ ہے اور جس پر خود مجھے ایک افسانہ "شجر نور جاوداں" لکھنا پڑا۔

(مطبوعہ "انقلاب" ممبئی)

ندا نے اس المیہ کو اپنی فنی گرفت میں یوں لیا ہے۔

"چھ دسمبر پچھلے کئی سالوں سے مداری کی رسیوں سے بندھا الگ الگ جگہوں پر نظر آتا تھا۔ تماشائیوں کو تماشے دکھاتا' پھر مداری کے ساتھ رُخصت ہو جاتا لیکن اس بار مداری نے اسے رسیوں سے آزاد کر کے کھیل دکھایا تھا۔ ممبئی میں چھ دسمبر کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ چھ دسمبر ایودھیا سے سیدھا ممبئی آیا اور یہاں اسے کئی دن اسٹیٹ گیسٹ کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا۔ وہ جب تک رہا سارا شہر اسی کے گرد گھومنے میں مصروف رہا' نہ بچے اسکول گئے نہ بازاروں نے دوکانیں کھولیں نہ سرکاری دفتروں میں کوئی کام ہوا۔ ہر جگہ اسی کے قصے تھے' ہر طرف اسی کی باتیں تھیں۔ وہ شہر کے جن علاقوں سے گذر رہا تھا میڈیا کرکٹ میچ کی کمنٹری کی طرح اسے تصویروں میں دکھا رہا تھا۔"

اس تحریر کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف کچھ بہیمانہ طاقتیں انسانیت کے سورج کو غروب کرنے کے تماشے دکھا رہی ہیں تو دوسری طرف وہی سورج ندا اور ندا جیسے بہت سے حساس فن کاروں کے قلم سے دوبارہ طلوع ہو رہا ہے۔ اس لئے "دیواروں کے باہر" کے مصنف اور ان کے قلم دونوں کو "خوش آمدید!"

●●

دُشمنی ہوگی کسی سے کہ محبت ہوگی
زندگی ہے تو سہارے کی ضرورت ہوگی

یہ زندگی تو میرے کام میں نہیں آئی
شراب پھیل گئی، جام میں نہیں آئی

زمیں، جو کہیں دھوپ کہیں سایہ ہے

● کنہیالال نندن

بہ فضل خدا، ندا فاضلی کو میں تھوڑا بہت جانتا ہوں، چاہوں تو یہ دعویٰ بھی کرسکتا ہوں کہ ان کی تخلیقات کو تھوڑا قریب سے جانتا اور کہہ دوں کہ وہ میری نسل کے ادیبوں میں اُردو ہی نہیں، ایشیائی ادبی زبانوں میں عصرِ حاضر کی آواز ہیں۔اُن سے میری اَن گنت ملاقاتیں رہی ہیں۔انہیں پڑھا بھی ہے اور سنا بھی۔ان کے ساتھ مشاعروں اور کوی سمیلنوں میں شرکت بھی کی ہے اور کبھی کبھار تھوڑی بہت گفتگو بھی ہُوئی، لیکن میں ندا فاضلی کو ٹھیک ٹھیک اور پوری طرح سمجھتا ہُوں، یہ دعویٰ کرنا ذرا مشکل ہے۔ یہ مضمون انھیں صحیح ڈھنگ سے سمجھنے کی کوشش ضرور ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے، کہا بھی ہے اور لکھا بھی ہے کہ شاعر کی اصل شناخت اس کی شاعری، اُس کا ادب ہے، اِس لئے ہم شاعر کے کلام کو ہی اس کی شناخت تسلیم کرکے چلتے ہیں۔اپنے سوانحی ناول کے آغاز میں ندا نے ایک شعر پیش کیا ہے۔

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

اگر ندا کی آنکھ سے ہی دُنیا کو دیکھا جائے تو وہ ایک شیشے کا گھر ہے، جس کی دیواروں میں بھی چہرے نظر آتے ہیں۔اگر یہ جاننے کی خواہش ہو کہ ندا خود کو کس طرح سے دیکھتے ہیں تو ''دیواروں کے بیچ'' پڑھنے کی زحمت اُٹھانی پڑے گی۔جس کا مرکزی کردار خود ندا ہیں۔اس میں اُنھوں نے بڑی بے باکی اور کہیں کہیں تو بڑی بے دردی سے اپنا، اپنے خاندان، اپنے دین و دُنیا کا نقشہ کھینچا ہے۔اگر اُن کے نام کا تجزیہ کریں تو ندا کا مطلب ہے آواز۔اور ندا بے شک آج اُردو کی ایک مقبول، ممتاز اور معتبر آواز ہیں۔ اُن کے شعری مجموعے 'لفظوں کا پل' اور 'مور ناچ' میں اُن کی نظمیں، غزلیں، گیت اور دوہے ہیں، جو عوام کے احساسات اور جذبات کی تڑپ اور کرب کی تصویر نظر آئیں گے۔یہ آواز ایک زندہ اور جیتی جاگتی آواز ہے۔اُن کی جدت پسندی نے بھولی بسری یادوں کو ایک ناول کی صورت دے دی ہے۔ یہ سوانحی ناول ایک طویل سماجی تہذیبی دَور کے منظرنامے کا آغاز ہے، جس میں خود ندا فاضلی اہم کردار ہیں۔سب سے

پہلے ندا کے اِس انوکھے سوانحی ناول کے ذریعہ ندا اور اُن کے اسلوب کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ ندا فاضلی نے 'دیواروں کے بیچ' کو اِن یادوں سے منسوب کیا:

''جو حال میں ستاتی ہیں' جب ماضی بن جاتی ہیں تو لبھاتی ہیں۔ ممکن ہے حال سے ماضی بننے کے سفر میں ان یادوں میں کہیں کہیں وقت کی دُوریاں شامل ہوگئی ہوں اور یہ اب ویسی نہیں رہی ہوں جیسی پہلے تھیں۔ ان یادوں کا سلسلہ کافی طویل ہے' میں ایک ہی موڑ تک آ کر رُک سا گیا ہُوں۔''

مگر سچ یہ ہے کہ ندا کا فن کارو ہاں رُکا ہی نہیں' اُس نے صرف محسوس کیا تھا کہ وہ رُک سا گیا تھا۔ اپنی کہانی شروع کرنے سے پہلے اُس نے ایک نظم میں زندگی کی کہانی کو اپنے بچپن کی شرارتوں اور معصومیت سے جگنو کی طرح چمکتی آنکھوں سے دیکھ کر یوں پیش کیا ہے۔

سُورج اِک نٹ کھٹ بالک سا
دِن بھر شور مچائے
اِدھر اُدھر چڑیوں کو بکھیرے
چڑیوں کو چھتر ائے
قلم، دواتیں، برش، ہتھوڑا
جگہ جگہ پھیلائے
شام تھکی ہاری ماں جیسی
ایک دِیا ملکائے
دھیمے دھیمے ساری بکھری چیزیں
چنتی جائے.....

ندا نے اپنی زندگی کی کہانی میں اسلوب کے طور پر فکشن کے پیرہن میں حقیقت پیش کرنے کی اپنی تخلیقی قوت کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ اسی کے ساتھ اپنے پاس پڑوس، گھر پریوار کے ماحول میں مضبوطی سے قدم جمائے قدامت پرستوں وار رسم و رواج اور اندھے اعتقاد کے مکڑ جال کو کاٹ کر اپنی پوری زندگی کے حوالے سے ماضی اور حال کے بیچ کھڑے اِس بھارت کے اندرون میں جھانکنے کی کامیاب کوشش کی ہے' جس میں وہ خود جیے اور دُکھ سُکھ، محبت نفرت، رحم و بے رحمی اور انسانی دردمندی اور سفاکی کے سایے سے گذرتے، ہنستے، روتے اور سچائیوں کی گہرائیوں کو چھوتے، اپنے زندگی کے سفر پر آگے بڑھتے رہے،

دیواروں کے بیچ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر آپ سطروں کے درمیان بین السطور پڑھنے کا فن جانتے ہیں تو یہ ندا فاضلی کی زندگی اور فکر کا ایک ایسا دستاویز بھی ہے جس میں اپنے فطری اور بے حد پُرکشش طنزیہ قوت کے سہارے اُنھوں نے اپنی زندگی کے واقعات اور انسانی رشتوں کے کھٹے، میٹھے، پھیکے اور کڑوے تجربات کا ذکر اس آسانی سے کیا ہے' جیسے کوئی مچھلی کبھی پانی کی لہروں کے اوپر اور کبھی نیچے تیر کر مزے مزے میں اپنی جل یاترا جاری رکھتی ہے۔

ندا فاضلی تین شہروں کا بیٹا کہلانے کے مستحق ہیں' ایک ہے غالب اور میر کی دہلی، دُوسرا ہے تان سین اور اُن کے میگھ ملہار اور دیپک راگ کو سانسوں میں بسائے گوالیار اور تیسرا ہے ستاروں کی محفل سجانے والا، ہیروں اور موتیوں کی فلم نگری ممبئی۔ تینوں تاریخی شہروں نے ندا فاضلی کی نثر اور شاعری کو لہک مہک اور سُر تال عطا کیا۔

ندا اپنے جنم کو بیسویں صدی کے تیسری دہائی کے اوسط درجہ کے مسلم گھرانے کے بیٹے کی پیدائش کو واقعہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں' اسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ پیدا ہونے سے کچھ پہلے ہی' پھر پیدا ہوتے وقت اور اس کے فوراً بعد اس بچّے نے خاصی گہری نظر سے دیکھنا، پتلے کانوں سے سننا اور شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ دُنیا اور اس میں بسنے والوں کو دیکھنا شروع کر دیا تھا' جیسے آج کے ندا میں چھپا ماہر طنز نگار اور ادیب اسی ۱۲/اکتوبر ۱۹۳۸ء کے دِن پورے شعور اور حسیّت کے ساتھ پیدا ہُوا تھا' جب اس نے اپنی ماں کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ اب ندا ساٹھ کے پیٹے میں ہیں مگر اُنھوں نے اپنے قلم سے اپنی پیدائش، اپنے پریوار اور ...کو.... کے ساتھ اپنے جذبات اور احساسات کا بیان جس طرح کیا ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ ان کے اندر کا شیطان سے کھیلنے والا، شرارت سے مسکرانے والا بچہ آج بھی زندہ ہے۔ وہ پہلے یادوں کو جواہرات کی طرح تراشتا سنوارتا ہے اور اُنہیں اپنے ادبی سرمایے کا حصہ بناتا ہے اور پھر اس دولت کو بڑی سخاوت اور محبت سے دُوسروں میں بے ہچک بانٹ دیتا ہے' یہاں املی کے بھوت کا ذکر تھوڑی تفصیل چاہتا ہے۔

اِملی کا بھوت شاید ندا کی زندگی میں اندھی عقیدت کا احساس لے کر بچپن میں ہی داخل ہو گیا تھا۔ جب اُنھوں نے اپنی سوانح کا پہلا ہی باب لکھا تو اُن کے بچپن کا ساتھی، اِملی کا بھوت فوراً سامنے آ گیا' وہ بھوت اُن کے والد مرتضیٰ حسن کے علاوہ کسی سے نہ ڈرتا تھا۔ پیش ہے ایک صفحہ' ندا فاضلی کے خاندانی منظر نامے سے املی کے بھوت کا۔ اِس میں ندا کی بے لوث نثر، بیانیہ کا نمونہ بھی ملے گا اور ندا کا اپنے بچپن کا

ماحول بھی۔ سوان کی تھوڑی سی کہانی، انھی زبانی۔

''سورج غروب ہورہا ہے، ایک بے ہوش عورت کے اردگرد تین چار بچے، سہمے، ڈرے بیٹھے ہیں' بڑی بہن اُٹھ کر لالٹین کی چمنی صاف کر کے اسے روشن کرتی ہے' چاروں طرف چتکبری روشنی پھیل جاتی ہے، سامنے املی کے درخت پر ایک ڈراؤنا بھوت روز کی طرح آج بھی آ کر بیٹھ گیا ہے۔ لمبے، لمبے دانت، ٹیڑھے میڑھے ہاتھ پاؤں، ہوا سے شاخیں ہلتی ہیں تو اس کی گرم سانسیں بہت قریب محسوس ہوتی ہیں، دالان سے آنگن میں آتے بھی ڈر لگتا ہے۔

بڑی بہن بھوت کو دفع کرنے کے لئے اندر سے قرآن شریف لا کر باہر اسٹول پر رکھ دیتی ہے، بچوں اور بھوت کے درمیان اللہ کے کلام کی حد بن جاتی ہے، بھوت میں اس حد کو پھلانگنے کی ہمت نہیں ہے، لیکن جب بھی نظر اُٹھتی ہے، وہ املی کی شاخوں سے جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔

یہ بھوت قرآن کی حد میں داخل تو نہیں ہوتا' لیکن اپنی موجودگی کا احساس پھر بھی دلاتا رہتا ہے، اس خوف سے بھوک پیاس سب غائب ہو جاتی ہے۔

بھوت صرف مرتضیٰ حسن کے قدموں سے ڈرتا ہے، جیسے ہی گلی میں اُن کے قدموں کی آہٹ پھیلتی ہے' یہ آپ ہی آپ سمٹ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے' لیکن مرتضیٰ حسن کے آنے تک آدھی سے زیادہ رات گذر چکی ہوتی ہے اور آدھی رات تک نیند پلکوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔

بے ہوش عورت جوان بچوں کی ماں ہے، ہوش میں آتی ہے اردگرد بیٹھے ہوئے ان بچوں کو دیکھتی ہے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اُنگلی سے چاروں طرف حصار کھینچتی ہے، مرتضیٰ حسن آتے ہی اپنی شیروانی کھونٹی پر ٹانگ کر بستر پر دراز ہو جاتے ہیں۔

صبح کے دُھندلکوں سے گوالیار کا ایک محلّہ دھیمے دھیمے اُبھر رہا ہے، نئی سڑک، بڑے دالان، آنگن اور کئی کشادہ کھلے کھلے کمروں کا ایک اونچی دیواروں کا پرانا گھر، اس گھر میں دائیں بائیں کئی دروازیں ہیں، سامنے املی کا گھنا درخت ہے، جس میں بارہ مہینے کھٹے کتارے جھولتے ہیں، ان کو پوری دوپہر محلّہ بھر کے بچے پتھر مار مار کر گراتے ہیں، ان کتاروں کی چھینا جھپٹی میں ہر روز کئی چھوٹی بڑی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ ان لڑائیوں میں کبھی بڑی عورتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں، عورتیں آپس میں اُلجھ کر کئی دن تک ایک دُوسرے سے نہیں بولتیں، لیکن بچے تھوڑی دیر میں ہی پچھلی باتوں کو بھول کر ایک ہو جاتے ہیں۔

اِس املی کے پیڑ کا ایک بڑا بھائی بھی ہے، گھر کے بائیں دروازے کے سامنے لمبے چوڑے پیٹ

اور کئی موٹے بھاری ہاتھوں والا نیم کا درخت.... یہ دونوں عمر کے لحاظ سے بزرگ ہیں، ان کی عمروں کا اب کوئی اس محلے میں نہیں ہے، دوپہر بھر یہ دونوں چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور چوکیداری کرتے ہیں ، اس چوکیداری میں جنگلی کتے بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں یہ کتے اِتنے دِنوں سے اِس محلے میں ہیں کہ ہر ایک کو بنا نام کے پہچانتے ہیں، رات کے وقت جیسے ہی کوئی اجنبی اِس علاقے میں داخل ہوتا ہے' یہ چلا چلا کر طوفان سر پر اُٹھا لیتے ہیں، ان کو چپ کرانے کے لئے داخلے کا کارڈ دِکھانا پڑتا ہے اور یہ کارڈ ہوتا ہے محلے کا ہی کوئی آدمی.... مکان کے پیچھے ایک تنگ سی گلی ہے، اس گلی کے کونے پر ایک پرانا کنواں ہے، جس پر ہمیشہ پانی بھرنے والی لڑکیوں کا جمگھٹ رہتا ہے، یہ کنواں ساری لڑکیوں کا ہم راز ہے، یہ کسی کی بات دُوسرے سے نہیں کرتا، مگر ہے بہت مذاقیہ، دِن بھر اس کی باتوں پر لڑکیاں قہقہے لگاتی رہتی ہیں۔''

یہ ہے ندا فاضلی کے بچپن اور لڑکپن کے گولیار کے گھر پریوار اور اطراف کی تصویر' جس کا ایک نمونہ اُن کی شاعری سے جھوجھنے سے پہلے دینا میں نے اِس لئے مناسب جانا کہ قارئین کو پتا چل جائے کہ ندا فاضلی کے سوچنے کی زمین کیا ہے اور وہ اپنی شاعری میں ہی نہیں' اپنی نثر میں بھی اپنے ہم عصروں سے کتنے بے جوڑ لگتے ہیں۔

ندا کے والد مرتضیٰ حسن صاحب' سندھیا اسٹیٹ ریلوے میں ایک بڑے افسر تھے، وہی جن سے املی کے پیڑ کا بھوت ڈرتا تھا، ان کی تصویر خود ندا نے کچھ اِس طرح کھینچی:

''اچھی خاصی تنخواہ ہے، اس کے علاوہ اوپر کی آمدنی کی بھی ریل پیل ہے، شاعر بھی ہیں، داغ کے جانشین، نوح ناروی کے ممتاز شاگرد ہے، دو شعری مجموعے اور تاثیرِ دُعا (۱۹۳۸ء) کے مصنف ہیں۔ ان کی شاعری کا نمونہ بھی ندا نے پیش کیا:

مری جان مانگی تو کیا تم نے مانگی
مری جان کا کیا مری جان ہوگا
وہ خود بھی پریشان ہیں زندگی سے
اسے جو بھی لے گا پریشان ہوگا

....

شان کے لوگ کم رہ گئے
ایک تم ، ایک ہم رہ گئے

ندا اپنے والدین کی تصویر کھینچنے میں کسی جھجک سے کام نہیں لیتے ، بے درد حاکم کی طرح فیصلہ کن انداز میں والد کا خاکہ یوں کھینچتے ہیں:

" علی گڑھ کے پاس ایک چھوٹے سے ڈبائی نار کے قصبے کے رہنے والے ہیں ،اس رعایت سے اپنے تخلص دعا کے ساتھ ڈبائیوی بھی لگاتے ہیں ،کافی رنگین مزاج ہیں ، مجرے ،مشاعرے اور نئے عشق پرانے شوق ہیں ، گوالیار میں اپنے بہن بھائیوں سے دور تنہا رہے ہیں ، ان تنہائیوں کو جوانی کے ہاتھوں خوب تقسیم کیا ، کئی طوائفوں سے شناسائیاں ہیں ۔ ایک سے تو سنتے ہیں دولڑکے بھی ہیں ، لیکن ان ناموں میں ان کا نام شامل نہیں ہے ۔

گھر میں اچھی شکل وصورت کی بیوی ہے اور ساتھ میں سندھیا دربار کی مغنیہ کی زلفوں کے اسیر بھی ہیں ، اس مغنیہ کا نام زیب النساء ہے ، ریڈیوں سے بھی کلاسیکی موسیقی کا پروگرام دیتی ہے ، بچہ کوئی نہیں ہے ۔ مرتضٰی حسن کے بچوں کو جہاں دیکھ لیتی ہے ، ٹوٹ کے پیار کرتی ہے ، بلائیں لیتی ہے ، پیسے دیتی ہے ، لیکن ان سب کے باوجود بچوں کو وہ پسند نہیں ہے ۔"

ندا فاضلی نے بچپن میں ہی انسانی رشتوں کی الجھنوں کو تیکھی نظر سے دیکھنے کا ہنر پایا ۔ اس ہنر سے انھوں نے ان رشتوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ۔ محبت ، عزت ، ہمدردی اور بے باکی سے دور اور نزدیک دونوں کے واقعات اپنے اور بے گانوں کے دل کی گہرائیوں اور بیتی پرچھائیوں میں جھانک جھانک کر دیکھنے کا فن بچپن سے ہی ندا کے ذہن میں پھلنے پھولنے لگا تھا ۔ ندا نے الفاظ میں اپنی ماں کی تصویر یوں کھینچی ہے:

" بیوی کا نام جمیلہ فاطمہ ہے ۔ دہلی کے ایک سیّد گھرانے سے ہیں ، مزاج مذہبی ہے ، شعروشاعری کا ذوق رکھتی ہیں ، شعر کہتی ہیں اور خواتین کی نشستوں میں سناتی ہیں ۔ شعر کہنے کا جب موڈ ہوتا ہے تو جھاڑو دے رہی ہوں یا روٹی پکا رہی ہوں ، کاغذ پنسل ساتھ ہوتا ہے ، فکرِ سخن کی محویت کبھی روٹی جلا دیتی اور کبھی سالن میں نمک کا توازن بگاڑ دیتی ہے ۔"

آپ دیکھیں کہ اپنے والدین کے رشتوں کا ذکر بڑی ایمانداری اور غیر جانب داری سے کرتے ہیں ، اپنے والد کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے ندا نے لکھا:

" مرتضٰی حسن زندگی کے پینتیس سال گذار چکے ہیں ، گھر والوں سے دور ، گوالیار میں بنا روک ٹوک کے جیسے چاہا ' جئے ، آشنائیاں کئی ہوئیں ، لیکن کسی نے شادی کا روپ نہیں لیا ، تفریح کی آزادی ہے ،

لیکن شادی کے لئے ذات برادری کی اخلاقی پابندی ضروری ہے، دہلی کے ایک خاندان کی چھوٹی لڑکی کے لئے پیغام بھیجا جاتا ہے، زیادہ چھان بین کے بنا رِشتہ منظور ہو جاتا ہے اور جمیل فاطمہ دس سال کے فرق کے باوجود مرتضیٰ حسن کے حوالے کر دی جاتی ہیں' لیکن ان کی برسوں کی آزاد مزاجی کو گرہستی کی زندگی میں ڈھلنے میں کافی وقت لگتا ہے۔

جمیل فاطمہ جس معاشرے سے آئیں تھیں' اس میں عورت اور مرد کا رِشتہ آسمان پر طے ہو کر زمین پر اُترتا ہے۔ اِس رِشتے کے فرائض کے ساتھ زمین و آسمان بھی مختلف ہیں، شوہر اپنی مرضی کا مختار ہے، عورت گھر کی زینت ہے، ہونے والے بچوں کی ماں ہے، اسے شوہر کے معاملات میں شرکت کی آزادی نہیں ہے، مرتضیٰ حسن کی گھر سے باہر کی زندگی ان کی اپنی ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کے لئے وہ تیار نہیں ہیں، صبح آفس کے لئے نکلتے ہیں اور پھر آدھی رات تک لوٹتے ہیں۔

جمیل فاطمہ بھائیں بھائیں کرتے گھر میں اکیلی ایک نوکرانی کے ساتھ وقت گذارتی ہیں، دُور دُور تک کوئی رِشتہ داری نہیں ہے، محلے کی عورتیں شوہر کو بس میں کرنے کی نئی نئی ترکیبیں سمجھاتی ہیں، کہیں سے اچھی خاصی رقم دے کر تعویذ منگوایا جاتا ہے، کئی رات کو دیر تک پڑھنے والے مقامی بزرگ کی درگاہ پر حاضری دے کر منت مانگتی ہیں، ہر دُوسرے تیسرے دِن مراد کا روزہ رکھتی ہیں، جس مقصد کے لئے شادی کی گئی تھی وہ پورا ہوتا ہے، دو سال کی مدت میں مرتضیٰ حسن دو بچوں کے باپ بن جاتے ہیں، اب ان بچوں اور ماں کے درمیان پہاڑ سی ڈراونی رات ہے اور املی کا بھوت ہے۔''

ندؔا کی یہ طرزِ بیانی بتاتی ہے کہ ندؔا اپنوں کی کردار نگاری میں جہاں کافی بے باکی سے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں' وہیں اپنی ماں کی صورت میں قدامت پرست ہندوستانی معاشرے کے درمیانہ طبقہ کی شریف خاتون کے سماجی مرتبہ اور اس کے درد کے لئے اپنی بے پناہ ہمدردی بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے طنز میں بھی ہمدردی کا جذبہ ہے اور املی کا بھوت، دُکھ، شک اور بے یقینی کے خوف کی علامت ہے، خاندانی رزمیہ اور سوانحی ادب میں حقیقت کو بغیر توڑے موڑے مگر بے حد دِلچسپ بیانیہ بھی ندؔا کی سوانح کا خاص وصف ہے، جس طرح وہ اپنے والدین کے رِشتوں کا ذِکر کرتے ہیں، اس طرح خود اپنے جنم کو ایک واقعہ بنا کر یوں پیش کرتے ہیں کہ بچہ پیدا بھی ہو رہا ہے اور اپنی پیدائش سے جڑے ایک ایک واقعہ کو کھلی آنکھوں دیکھ بھی رہا ہے، اپنا حال سناتے ہُوئے ندؔا ایسا قلم چلاتے ہیں جیسے ایک جاسوسی ناول لکھ رہے ہیں:

'' ہر بچے کی پیدائش دہلی میں ہوتی ہے، جمیل فاطمہ اب تیسرے بچے کی ماں بننے والی ہیں، دو

کے بعد تیسرا بچہ ایسی حالت میں مناسب نہیں ہے' لیکن کیا کیا جائے۔ تین مہینے پورے ہو چکے ہیں، ایسے کام چھپ چھپا کر ہی کیے جاتے ہیں۔ کسی سنائی جڑی بوٹیوں سے ہی خدا کے کام میں دخل اندازی کی جاتی ہے۔ کئی گرم گرم دوائیں استعمال ہوتی ہیں، ابھی یہ سلسلہ جاری ہے کہ اچانک ایک دن دہلی میں اُن کے پانو تلے سے آبائی گھر کی چھت کھسک جاتی ہے، ہوتا یوں ہے کہ وہ صبح غسل خانے سے باہر آتی ہیں، لیکن جیسے ہی پانو بڑھاتی ہیں چھت دھنسنے لگتی ہے، وہ ٹوٹی چھت سے سیدھے نیچے فرش پر گرنے کو ہوتی ہیں کہ اُن کے ہاتھ میں لوہے کا سریا آجاتا ہے، اتفاق سے اُن کے بھائی اُس وقت نیچے ہی مکان کی مرمت کروا رہے تھے، پتھروں کے گرنے کی آواز سے وہ چونک کر اوپر دیکھتے ہیں اور اپنی بہن کو زمین و آسمان کے درمیان لٹکا ہُوا پاتے ہیں، وہ بانہیں پھیلا کر آگے بڑھتے ہیں اور بہن سے سریا چھوڑنے کو کہتے ہیں، کئی لوگ جمع ہیں، فرش پر روئی کے گدے، تولیے بچھا دیے جاتے ہیں، بچوں کے رونے، چلانے اور عورتوں کی چیخ پکار میں وہ آخر بھائی کی بانہوں میں گر جاتی ہیں، گرتے ہی بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ کیس نازک ہے۔ فوراً اسپتال لے جایا جاتا ہے، جہاں وقت سے پہلے جمیل فاطمہ اپنی مرضی کے خلاف تیسرے بچے کو جنم دیتی ہیں۔ اُس کا نام بڑے لڑکے مصطفیٰ حسن کے قافیہ کی رعایت سے مقتدا تجویز ہوتا ہے۔ یہی مقتدا حسن آگے چل کر خود کو قافیے کی پابندی سے آزاد کر ندا فاضلی بن جاتا ہے۔''

ندا کے اپنے الفاظ میں خاندان کا یہ خاکہ تفصیل سے دینے کی ضرورت اس لئے تھی کہ یہ اُن کی تربیت، سوچنے کی زمین اور تخلیقات کو سمجھنے میں بہت معاون ہو سکتا ہے، پھر یہ اُن کی بے حد حسین نثری اسلوب کا نمونہ بھی پیش کرتا ہے' جسے اُن کے شاعری کے شائقین اکثر بھول جاتے ہیں، اُن کی شاعری میں نظم، غزل، گیت، دوہے سبھی شامل ہیں، ہندوستان اور پاکستان میں اُن کی شاعری کے دیوانوں کی بڑی تعداد ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ بھرپور زندگی کے ادیب و شاعر ہیں اور اُن کی شاعری اور نثر کا مزاج سوانحی اور زندگی کے ذاتی تجربات کا ہے۔ اُنھوں نے اپنے وجود کو ماضی اور حال کے ساتھ یوں جوڑا ہے کہ اپنی تحریر اور شاعری کو پرانے اور نئے کے کٹہرے سے نکال کر عصری بنانے کی کوشش کی ہے۔ ابھی تک ان کی دو نثری تخلیقات 'ملاقاتیں' اور 'دیواروں کے بیچ' کے علاوہ چار شعری مجموعے بھی اُردو اور ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ لفظوں کا پل، مور ناچ، آنکھ اور خواب کے درمیان اور کھویا ہُوا سا کچھ

ندا کی شاعری ہو یا سوانحی انداز کا ناول، ندا زندگی کو ہر سمت سے، ہمہ جہت غیر جانب داری کے ساتھ دیکھتے ہیں، کبھی ایک بچہ کی معصومیت سے تو کبھی صوفی کی من مستی میں اُتر کر، اُن کا کلام اُن کی زندگی

کے تجربات کا سانس لیتا خاکہ ہے' جس میں اُن کا پڑھنا لکھنا خوشبو بن کر اُترا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ وہ اُردو شاعری کی روایت کو بھی پہچانتے ہیں اور جدید پتکے محاورے کو گڑھنے کا انداز بھی جانتے ہیں۔ ظفر اور غالب کو جس گہرائی سے کھنگال سکتے ہیں اُسی گرائی سے داغ کی شاعری اور اُن کی زندگی کی تصویر بھی گڑھ سکتے ہیں۔ اُن کا قلم جتنا بے لوث اپنی زندگی کا خاکہ اُتارنے میں ہے، اُتنا ہی بے لوث غالب اور داغ کی بے لوث تصویر پیش کرنے میں بھی۔ اپنی ماں کے بارے میں جیسی بے لوث تصویر' دیواروں کے بیچ' میں ندا اُتارتے ہیں' داغ دہلوی کی ماں کو بھی اسی انداز میں بیان کرتے ہیں۔

یہ ندا کا سچائیوں سے اٹکھیلیاں کرتا اسٹائل ہے، داغ کی ماں کا نام وزیر بیگم اور والد تھے شمس الدین خاں' جو انگریزوں کی ناانصافیوں کے خلاف آواز اُٹھانے کے جرم میں پھانسی چڑھادئے جاتے ہیں' ماں وزیر بیگم کئی برسوں تک انڈر گراؤنڈ رہیں اور پھر ان کی ملاقات مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے ہونے والے جانشین مرزا فخر الدین سے ہوتی ہے اور وزیر بیگم شوکت محل کا خطاب پاکر لال قلعہ میں ملکہ بن جاتی ہیں' اُن کا بیٹا لال قلعہ میں لایا جاتا ہے اور اس طرح مرزا خاں داغ، مرزا فخر الدین کی وفات تک لال قلعہ میں رہے۔ آگے کا بیان ندا فاضلی کے طرزِ بیان میں ہے:

''اُن کی وفات کے بعد بوڑھے بہادر شاہ کی جوان ملکہ زینت محل کی سیاست نے لال قلعہ میں اُنھیں نہیں رہنے دیا وہ پھر سے گھر سے بے گھر ہو گئے۔ لیکن اس بار وہ اپنے بچپن کی طرح اکیلے نہیں تھے' اُن کے ساتھ اُن کی ماں بھی تھیں، ماں کے ساتھ اُن کی جائز اولادوں کے ساتھ، اُن کے کشمیری حسن کی کچھ ناجائز سزائیں بھی تھیں۔''

ندا جب کہنے پہ آتے ہیں تو لفظوں کی ایسی خوب صورت چادر تانتے ہیں کہ ناگوار لگنے والی بات بھی ان کے نیچے سے بے پردہ ہو کر بے کھٹک نکل جاتی ہے۔ سچائیوں کو زیادہ چھپا کر رکھنے میں ندا یقین نہیں کرتے' لیکن ایسی سچائیاں اِس لئے بیان کی جاتی ہیں تا کہ زندگی کا کوئی گہرا عقدہ ہاتھ آئے۔ جاں نثار اختر کے ساتھ دہلی میں ایک ٹیکسی سے اُنھیں دوست کے یہاں چھوڑنے گئے۔ جب کئی گھنٹے برباد کرنے کے بعد بھی گھر نہ ملا تو پولس اسٹیشن جا کر پتا لیا اور ددمنٹ میں اُن کے دوست کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ آگے بہ قلم ندا:

''گھر دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی' جس گلی سے کئی بار گزر کر نکلے تھے' اُسی گلی میں وہ گھر تھا۔ میں نے اس بارے میں جب جاں نثار صاحب سے استفسار کے تو وہ بوتل کے آخری قطرے گلے میں اُنڈیلتے

ہُوئے بولے: ''بھائی! پوری ہاف بوتل تھی۔ اسے ختم کرنے کے لئے بھی تو وقت چاہیئے تھا' جس کے یہاں ٹھہرا ہُوں' اُن کے یہاں اِس وقت کیسے پیتا' اپنی ٹیکسی تھی' شان سے پی۔''

ندؔا کا اندازہ ہے کہ'' جاں نثار ٹیکسی سے اُتر کر چلے گئے' لیکن مجھے احساس ہُوا کہ میں اچانک اپنی عمر سے دُوگنا، چوگنا بوڑھا ہو چکا ہُوں اور جاں نثار مجھ سے کئی سال چھوٹے لگے۔ جاں نثار آخر دَم تک جوان رہے، بڑھاپے میں جوانی کا یہ جوش اُردو تاریخ کا ایک معجزہ ہے۔''

جتنی اچھی نثر ندؔا لکھتے ہیں' اس سے زیادہ خوب صورت لہجہ اُن کے بولنے کا ہے' جس کا لُطف تب دیکھنے کو ملتا ہے جب وہ کسی مشاعرے کی نظامت کر رہے ہوں۔ اس وقت منچ سے میرؔ، داغؔ، ظفرؔ اور غالبؔ کی شاعری کی خوشبو ہر نئے شاعر کو پیش کرتے مل جاتی ہے اور جب کبھی اپنا کلام پیش کرتے ہُوئے اُسی بلندی سے وابستہ ہوتے ہیں تو سامعین کے ذریعہ اس بلندی کو نہ پکڑ پانے کو ایک چہل میں ڈھال کر ایسا اشارہ دیتے ہیں کہ جیسے کچھ نہیں، بات آپ کے سر سے گذر گئی۔ جانے دو' آپ کے لائق دُوسری پیش کرتا ہُوں۔ ویسے اُن کی شاعری کو سمجھنے کے لئے سامعین کو بہت زحمت نہیں گوارا کرنی پڑتی۔ بات بڑی ہوتی، الفاظ بڑے نہیں ہوتے۔ سادہ سے شعر:

چند لمحوں کو ہی بنتی ہیں مصور آنکھیں
زندگی روزتو تصویر بنانے سے رہی
اِس اندھیرے میں تو ٹھوکر ہی اُجالا دے گی
رات جنگل میں کوئی شمع جلانے سے رہی

الفاظ ایسے جن کا مفہوم دیکھنے کے لئے، لغت دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے' لیکن معنی ایسے کہ ذہن کو تہوں تہوں میں اُترنا پڑے۔ اُن کے الفاظ میں:

صرف آنکھوں سے ہی دُنیا نہیں دیکھی جاتی
دِل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

نظارہ دیکھنے کا یہ ہنر انسان کو حاصل ہو جائے تو ندؔا کی یہ بات سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

یہ زمین
جو کہیں دُھوپ ہے
کہیں سایہ

یہی زمین ہو تم بھی

یہی زمین میں بھی

یہی زمین حقیقت ہے

اِس زمین کا سرا

کہیں بھی کچھ نہیں

بینائیوں کا دھوکا ہے

اور آخر تک پہنچتے پہنچتے وہ آپ کے ہاتھ میں وہ تلخ سچائی تھما دیتے ہیں جس کو تھامنا ہر کسی کو راس نہیں آتا۔ وہ کہتے ہیں:

یہی زمیں سفر ہے

یہی زمیں منزل

نہ میں تلاش کروں

تم میں

جو نہیں ہو تم

نہ تم تلاش کرو مجھ میں

جو نہیں ہُوں میں

احساس کی اِس زمین پر پہنچنے کے بعد ان کا وہ شعر جو بہت مشہور ہے: 'کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا' اور بھی معنی خیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ ندا کا یہ شعر کتنا معنی خیز ہے اِس کا ایک نجی واقعہ کے حوالے سے بیان کرنے کی جسارت کرر ہا ہُوں ۔ یہ واقعہ میری نجی زندگی میں ندا کی شاعری کے بے ساختہ لگاؤ کا ایک اتفاق بھی ہے اور اچھی شاعری کی مقبولیت کا ایک نمونہ بھی ۔ اپنی چھوٹی بیٹی کے لئے میں ان دِنوں بَر (دُولہے) کی تلاش میں تھا، کافی بھٹک چکا تھا، لیکن دِل کے مطابق کوئی لڑکا نظر نہیں آرہا تھا۔
یا خبار میں اشتہار دے کر کچھ امیدوار تلاشنے کی کوشش کی اور جب اے پلس یا اوّل درجہ میں کچھ ہاتھ نہ لگا تو دُوسرے درجہ پر اُتر آیا۔ ایک دِن ایک خاندان بیٹی کو دیکھنے گھر آیا۔ اُمیدوار بَر نے اپنی برتری بنائے رکھنے کے لئے اپنی سطح سے اُترنا مناسب نہ سمجھا' گھر بار اچھا ہوگا ایسا اندازہ تھا، معاشی حالت بھی قابل برداشت تھی ،لیکن بات چیت میں رکھ رکھاؤ اور مصنوعی پن ہونے کی بُر کی ضد مرے خاندانی ماحول کو راس

آتی محسوس نہ ہوئی، یہ سوچ کر کہ آئندہ سب ٹھیک ہو جائے گا میں نے سمجھوتہ کرنا چاہا، بیٹی کو بھی والدین کی پریشانی کا احساس تھا اس لئے وہ بھی اس سمجھوتے پر آمادہ ہو گئی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد جب میں بیٹی سے اس کی رائے جاننی چاہی تو اس نے ہاں کرنے سے انکار نہ کیا لیکن ساتھ ہی ندا فاضلی کا یہ شعر سناتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی کہ

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

ندا فاضلی مرے دوست ہیں یہ بیٹی جانتی تھی لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری بیٹی کی زندگی کے بارے میں ندا کا شعر میرے لئے ایک فیصلہ کن موڑ بن جائے گا۔ میں نے اپنا وہ فیصلہ تو بدل ہی دیا۔ اس خاندان سے معذرت چاہ کر فرصت پا گیا لیکن آئندہ کے لئے ایک سبق بھی سیکھ لیا کہ اب بیٹی کی شادی وہیں کروں گا جہاں اس کے زمین و آسمان دونوں اُسے حاصل ہوں۔

ندا کو کیا معلوم کہ اُن کی شاعری کہاں اور کتنوں کو اپنی زندگی سنوارنے میں کام آئی۔ جب کہ اُن کے حساب سے:

رنگ ہے جو بھی نظر میں
وہ کچا ہے
جو اشک درد ہے سانسوں میں
وہی سچا ہے
سنگھرش بھی ہے، خواب بھی ہے
لکھو کہ یہی اندھیروں کا
ماہتاب بھی ہے

اور اسی کے ساتھ زندگی کے بارے میں اُن کا یہ دوہا:

جیون بھر بھٹکا کیا، کھلی نہ من کی گانٹھ
اس کا رستہ چھوڑ کر دیکھی اُس کی باٹ

اُن کے دوہے کہیں کہیں اُن کے اشعار اور نظموں پر حاوی ہوتے ہیں جیسے اُن کی نثر کہیں اُن کی شاعری سے زیادہ حسین اور روشن لگتی ہے۔ اُن کا ایک دوہا:

ماٹی سے ماٹی ملے ، کھوکے سبھی نشان
کس میں کتنا کون ہے ؟ کیسے ہو پہچان

دہرادون میں کوی سمیلن تھا۔ ندا نے غزل اور نظم کے ساتھ کچھ دوہے بھی پڑھے، غزلوں میں وہ بھی تھی جس میں ہندوستان، پاکستان کا بیان ہے۔

انسان میں حیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی
اللہ نگہبان یہاں بھی ہے وہاں بھی

خوں خوار درندوں کے فقط نام الگ ہیں
شہروں میں بیابان یہاں بھی ہے وہاں بھی

ہندو بھی مزے میں ہیں، مسلماں بھی مزے میں
انسان پریشان یہاں بھی ہے وہاں بھی

اس غزل کے ایک ایک شعر پر جو ٹوٹ کر تالیاں بجیں کہ ندا کو فخر کا احساس ہوا کہ شاعری کا ماحول ابھی ملک میں مرا نہیں، ندا نے اس ماحول میں اور اونچی گرہ لگائی:

کبھی کبھی یوں بھی ہم نے اپنے جی کو بہلایا ہے
جن باتوں کو خود نہیں سمجھے اوروں کو سمجھایا ہے

پھر بھی صاحب! جو داد ندا کو ملی، اس سے محسوس ہوا کہ کوی سمیلن کو یہیں پر ختم کر دیا جائے۔ تبھی ندا نے کچھ دوہے سنانے کا فیصلہ کیا اور ان دوہوں سے سارا کوی سمیلن تصوف کی فضا میں سانس لینے لگا:

جیون کے دِن رَین کا کیسے لگے حساب
دیمک کے گھر بیٹھ کر لیکھک لکھے کتاب

سپنا جھرنا نیند کا ، جاگی آنکھیں پیاس
پانا ، کھونا ، کھوجنا ، سانسوں کا اِتہاس

اوپر سے گڑیا ہنسے ، اندر پولم پول
گڑیا سے ہے پیار تو ، ٹانکوں کو مت کھول

میں بھی ، تُو بھی یاتری ، آتی جاتی ریل
اپنے اپنے گاؤں تک سب کا سب سے میل

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دُکھ نے دُکھ سے بات کی ، بن چٹھی ، بن تار

بچہ بولا دیکھ کے مسجد عالی شان
اللہ تیرے ایک کو اتنا بڑا مکان

یہ دوہے جیون کا بہت بڑا سچ بھی بولتے ہیں اور سماجی حالات پر تبصرہ بھی کرتے ہیں' ان تبصروں میں کبیری ٹھاٹھ ہیں:

اندر مورت پر چڑھے گھی ، پوری ، مشٹھان
مندر کے باہر کھڑا ایشور مانگے دان

یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر کسی میں ایشور کا باس ہے' لیکن اس کے.... اس دوہے میں ندا نے اُجاگر کردیا ہے۔ اس طرح ندا کے کچھ شعر ہیں جو کیفیت بھی بیان کرتے ہیں اور عوامی برتاؤ کی آگہی بھی دیتے ہیں۔

نقشہ اُٹھا کے کوئی نیا شہر ڈھونڈیے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہوگئی

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو ' کئی بار دیکھنا

یہ اشعار عام بول چال کے محاورے بن چکے ہیں' محاورے اِس لئے بن چکے ہیں کہ یہاں زبان میں ہندو مسلم کا فرق ختم ہوجاتا ہے اور بات بالکل سہل ہوکر سامنے آتی ہے۔ اتنی سہل کہ اگر اسے نثر بنانا ہو تو وہی نثر بھی بن جاتی ہے۔ ان کا شعر یاد کریں:

گھر سے مسجد ہے بہت دُور چلو' یوں کرلیں
کسی روتے ہُوئے بچّے کو ہنسایا جائے

یہ صرف عبادت کا متبادل نہیں ہے۔ اِس کے سماجی پس منظر میں ایک سمت بھی ہے کہ عبادت اپنی جگہ' لیکن اگر ہم اپنے روتے ہُوئے معصوم کی زندگی میں مسکان نہیں بھر سکتے تو ہماری عبادت ، ہماری

ریاضت بے مصرف عمل ہے۔

ندؔا اس طرح سے اپنی زندگی کا فلسفہ ہمیں سمجھاتے ہیں' جس کے کئی رنگ ہیں، کئی انداز میں کیا ہُوا سفر ہے، جس میں شہر، گاؤں، دُھوپ، چھاؤں، آندھی، بجلی، طوفان، رِشتے ناطے، برسات، بادل، بسنت، پون، تہوار غرض کہ ایک بھٹکتے ہُوئے بنجارے کا منظرنامہ ندؔا کی شاعری ہے جو رروایت سے توانائی حاصل کرتی ہے اور جدیدیت سے یاری نبھاتی ہے اور اسی لئے اُردو کی جدید شاعری ندؔا کے ذِکر کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ ان میں ہندوستانی زندگی اپنے لوک رنگ کے لباس میں پورے وَقار کے ساتھ موجود ہے، یہ جدیدیت سے پوری طرح وابستہ ہے' لیکن مغرب پرست جدیدیت کے ان اصولوں کا دامن نہیں پکڑنا چاہتے۔ اپنی روایت، اپنی تاریخ، اپنے استعارے اور تلمیحات سے آزادی چاہتی ہے۔ ان کی شاعری زندگی کے جیتے جاگتے تجربوں کی ترجمان ہے' جن سے صحیح ڈھنگ سے دیکھنے کے لئے اپنے محدود دائرے سے باہر آنا ہوگا:

دُھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو
وہ ستارا ہے چمکنے دو یوں ہی آنکھوں میں
کیا ضروری ہے اسے جسم بنا کر دیکھو

(ہندی سے)

●●

عصرِ حاضر کا منفرد گیت کار

• ڈاکٹر پریمی رومانی

گیت ہندی شاعری کی دین ہے۔ اُردو شاعری میں جس طرح کی گداختی، خوبصورتی، نرماہٹ اور شیرنی کا احساس غزل میں ہوتا ہے۔ ہندی گیت ایسی ہی خصوصیات کا حامل ہے۔ اُردو میں گیت نگاری کا آغاز کہاں، کیسے اور کب ہوا؟ یہ ہماری بحث سے اس وقت خارج ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اُردو میں گیت، ہندی کے حوالے سے آیا۔ بعض لوگ اُردو گیت کے ڈانڈے ولی سے لے کر نظیر اکبرآبادی تک مختلف شاعروں کے کلام سے ملاتے ہیں۔ زبیر رضوی لکھتے ہیں کہ ہندی گیتوں کی لے پہلی بار اُردو میں نظیر اکبرآبادی کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ (ماہنامہ ''اقدار'' پٹنہ ص ۵ ر)

مجھے اُن کے خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو شاعری میں گیت کے واضح نقوش پہلی بار محمد علی قطب شاہ کی شاعری میں ملتے ہیں۔ اُن کے بعد وجہی، غواصی، ولی نظیر وغیرہ کی شاعری میں گیت کی لوچ پائی جاتی ہے۔ ۱۹ ر ویں صدی میں امانت کے ڈرامہ ''اندر سبھا'' میں اُردو میں حقیقی طور پر گیت ملتے ہیں۔ بیسویں صدی میں ن۔ م۔ راشد، میراجی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، مقبول احمد لاری، عبدالحمید بھٹی، قیوم نظر، قتیل شفائی، قمر جلال آبادی، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، سلام مچھلی شہری، مجروح سلطان پوری، بیکل اُتساہی، تاج سعید، مجید امجد، منور نقوی، اکرم افکار وغیرہ نے اس صنف کو آگے بڑھایا۔ حالیہ برسوں میں زبیر رضوی، منیر نیازی، ناصر شہزاد، بمل کرشن اشک وغیرہ نے بہت اچھے گیت لکھے اور اس صنف کو ایک مستقل صنف بنانے کی کوشش کی۔ ان ہی گیت کاروں میں ندا فاضلی کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ندا فاضلی شروع سے ہی ایک شاعرانہ ذہن لے کر آئے تھے۔ ان کی ذاتی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ خارزاروں سے گذرے ہیں اور زندگی کے شدائد کا مقابلہ مسلسل کرتے آئے ہیں۔ اس وجہ سے اُن کے کلام میں عجیب گداختگی، درد اور تڑپ کا احساس ہوتا ہے۔ شاید یہ اسی رنج والم کے شدید احساس کا ردِ عمل ہے کہ اُنھوں نے گیتوں کی طرف رجوع کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ زندگی سے لڑنے کا سب سے

آسان اور دلکش طریقہ شاعری ہے۔(ندا فاضلی کا ایک خط راقم الحروف کے نام)

ندا فاضلی گاؤں کی فضا میں پلے بڑھے ہیں اور اس کے ماحول اور زندگی سے واقف ہیں۔اس کے بعد جب وہ شہر کی مشینی زندگی سے متصادم ہوئے تو اُن کے ذہن نے عجیب انتشار کا تجربہ حاصل کیا۔ اسی لئے اُن کی شاعری میں جہاں ایک طرف اپنی گمشدہ شناخت کی بے معنی تلاش کا کرب ملتا ہے' وہاں دوسری طرف مشینی زندگی کے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے بھی وہ خوابوں میں بسے ہوئے شاداب گاؤں کی حسین یادوں میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔اُن کے خواب بکھر بکھر جاتے ہیں۔اُن کی شاعری کا ایک اہم موضوع انسانی تناؤ ہے جو مشینی قوتوں کے دباؤ اور خاص طور پر جنسی زندگی کی گھٹن سے پیدا ہوا ہے' وہ اپنے طبقہ کے لوگوں کے دبے ہوئے جنسی اور نفسیاتی کیفیات کو پیش کرنے کے روا ہیں۔اُن کا موضوع جنس زدہ ہے۔ اِسی لئے اُن کے گیتوں میں عام طور پر اِسی کیفیت کی بازیافت ملتی ہے۔جنس کو دراصل وہ ایک علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ زندگی کے دبے ہوئے ناسوروں اور مجروح خوابوں کو جنس کا موضوع بنا کر سامنے رکھتے ہیں۔ندا فاضلی کامیاب رومانی شاعر ہیں۔وہ جنسی مسائل پر بھی نہایت سنجیدگی سے سوچتے ہیں اور اس کو کامیابی کے ساتھ اپنے گیتوں میں اس طرح برتتے ہیں کہ اس کا زیر و بم اور لَے اور تال کی نرماہٹ روح کو برماتی ہے۔مثلاً

پتھر پتھر پانی چیخے
ریت بنی جل دھارا
گونگے، بہرے سناٹے
میں چیخ چیخ کر ہارا
اُتر، دکھن، پورب، پچھم
ہوا کرے من مانی
پانی رے او پانی

یہ سے بڑا ہرجائی
سے سے کون لڑا ہے بھائی
راجہ سینا لے کر گھومے، نگر نگر ہو آئے

جس مائی کو جیتے مورکھ، اُس میں ہی کھو جائے

نہ آئے کام کوئی چترائی

سمے سے کون لڑا ہے بھائی

ندؔا فاضلی کے گیتوں میں ارضی تشبیہات، ارضی کیفیات اور ایک خاص قسم کی امیجری ملتی ہے۔ ان کا مطالعہ کرتے ہوئے تمام پر پیچ راہیں خود بخود کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے ہم عصر شعراء میں ایسی تشبیہات و استعارات شاذ ہی نظر آتی ہیں' جو ندؔا کی شاعری میں ملتی ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں مصوری کرتے ہیں۔ اُن کے گیت پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے خود بہ خود روح کی پیاس بُجھ رہی ہو۔ بیلوں کی شیشہ آنکھیں، دھرتی کی چھاتی، جل دھارا، گونگے، بہرے سناٹے، ریت بنی جل دھارا، آنگن آنگن جلتی جوالا، ننگے بول وغیرہ جیسے الفاظ اور تراکیب کے تانے بانے سے وہ ایک نئی دُنیا آباد کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص سیاق و سباق میں ان تراکیب کا استعمال اس قدر مصورانہ ہے کہ حسین رنگوں کی آمیزش سے بنی ہوئی خوبصورت تصویریں آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ یہ خصوصیات اُردو کے بہت کم گیت کاروں کے حصے میں آئی ہیں۔ مثلاً

بیلوں کی شیشہ آنکھوں میں

پتھر پتھر بادل

کٹی پھٹی دھرتی کی چھاتی

دُور دُور تک جنگل

پربت، پربت وادی، وادی

ویرانی، ویرانی

پیاس بڑی دیوانی

لوہارن......لوہے کو پیٹے

لگے ہتھوڑا من پر

بڑھئی بچارا..........لکڑی چیرے

میں دیکھوں اُٹھ اُٹھ کر

نئی صراحی میں بھی پانی

ندیا جیسا ہے

جب سے تم پردیس گئے ہو............!

ندؔا فاضلی نے اُردو گیت کو ایک نئے آہنگ اور معنویت سے آشنا کیا ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ گیت میں مشینی دور سے لی گئی زبان اور لہجے سے کام لیتے ہیں۔ حامدی کاشمیری اُن کی اِس خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ندؔا فاضلی جدید تہذیب کی زد میں آئے ہوئے سیدھے سادے اور معصوم انسانوں کی اُداسیوں اور تنہائیوں کے شاعر ہیں۔

(''نئی حیثیت اور عصری اُردو شاعری'' از حامد کاشمیری، ص ۲۴۵)

یہی وجہ ہے کہ اُن کا لہجہ ہر وقت نرم، کومل اور احساسات سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس لہجہ سے وہ اکثر جگہوں پر نازک اور انسلاکاتی مفاہم کو جگاتے ہیں۔ اُن کی زبان فارسیت کے اثر سے آزاد ہے، وہ سادہ آسان اور روزمرّہ بولی جانے والی زبان کو تخلیقی لمس عطا کرتے ہیں، اُن کا لب ولہجہ سب سے الگ اور جداگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے گیتوں میں عمل اور ردِ عمل دونوں کیفیات ملتی ہیں۔ ندؔا فاضلی اپنے گیتوں میں وقت کے بربط کا سُریلا راگ الاپتے ہیں۔ وہ راگ جس میں محبت کا تاثر بھی ہے، محرومی کی کسک بھی ہے اور انقلاب کی پکار بھی ہے۔ اُن کے گیت اُس انسان کے نازک جذباتی اُتار چڑھاؤ کو پیش کرتے ہیں جو شہروں کی مصروف کاروباری زندگی میں سانس لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ندؔا فاضلی نے گیت کے کینواس میں زندگی کی بڑی حقیقتوں کو سمیٹ لیا ہے۔ وہ گیت کے اُن تخلیق کاروں میں سے ہیں جنھوں نے اس صنف کو مواد، ہیئت اور تکنیک سے آراستہ کیا ہے اور اس میں جوش ولولہ اور تازگی و توانائی پیدا کی ہے۔ راج نرائن رازؔ، ندؔا فاضلی کے گیتوں میں نظم کی سی وسعت پاتے ہیں۔ چنانچہ اس کا احساس ایک جگہ پر دِلاتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں۔

''جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے ندؔا ہمارے اُن معدودے چند شعراء میں سے ہیں جنھوں نے اِس صنف پر خاطر خواہ توجہ کی اور موضوع کے اعتبار سے اُسے نظم کی سی وسعت دی ہے۔''

(ماہنامہ ''آج کل''، دہلی، جولائی ۷۱ء، ص ۴۴)

ندؔا فاضلی کے گیتوں کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ ہر انسان کو ان میں اپنی ہی بات، اپنے ہی دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اُس کے اندر کی آواز ہے۔ ان گیتوں میں سنگین پختہ کاری

بھی ہے اور جذبات کی بے لگامی بھی ہے۔مثال کے طور پر اُن کے درج ذیل گیت نمونے کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

ہر معنی میں اُلجھا ریشم
ڈورے بھیتر ڈورا
باہر سُو گانٹھوں کے تالے
اندر کاغذ کورا
کاجل، شیشہ، پرچم، تارا ہر سودے میں گھاٹا
جیون شور بھرا سناٹا
ڈھلتا سورج دن لے جائے چندا رات چرائے
سانسوں کا انمول خزانہ یُگ یُگ لُٹتا جائے
لُٹیرا الو نے ہر انگنائی
سے سے کون لڑا ہے بھائی

ایک روپے کے سولہ آنے
دو آنے کا مول
بھائی، بہن.........پورب اور پچھم
ماتا پتا بے زار
گھونگھٹ میں سمٹی خاموشی
دو دھاری تلوار
گھر کی لاج کھڑی دروازے
کب سے سانکل کھول

ندا فاضلی کے گیتوں میں علامتی اسلوب ملتا ہے۔اُنھوں نے اپنے گیتوں میں ایک طرف سلیس اور رواں زبان کے ساتھ نئی تراکیب استعمال کی ہیں۔وہاں رمزیت اور اشاریت کے پہلو بھی اُجاگر کئے ہیں۔اس کے علاوہ اُنھوں نے لوک شاعری کا رنگ بھی اس میں بھر دیا ہے جس سے اُن کے گیت زیادہ

سُر یلے اور رس دار نظر آتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی اُن کے گیتوں کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

''اپنے زیادہ تر نئے گیتوں کے لئے اُنھوں نے لوک گیتوں (خاص کر گالی) کی دُھن اختیار کی ہے جو بہت ہی خوش گوار معلوم ہوتی ہے۔''

(ماہنامہ ''شب خون'' نومبر ۶۹ء ص ۷۸ ر)

ندؔا فاضلی کے گیتوں میں قاری ایک خاص قسم کی کیفیت پاتا ہے اور وہ ہے خود اپنے اندر جھانکنے کی کیفیت۔ اُن کے تراشے ہوئے مصرعوں کی ہم آہنگی اور مترنم آواز دلوں میں عزم و استقلال پیدا کرتی ہے۔ ان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان میں ایک خاص قسم کی لچک اور مدھرتا ہر جگہ ملتی ہے۔ اس طرح سے ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ندؔا اپنے احساسات قاری تک فوری طور پر پہنچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ استعارات اور تشبیہات پر وہ پوری دسترس رکھتے ہیں۔ اپنے گیتوں میں اُنھوں نے فنی خوبی اور جذبات کی شدت برقرار رکھی ہے۔ ندؔا کے اکثر گیتوں میں جہاں تناظر ہے وہاں مشاہدے میں کارفرمائی اور داخلی عوامل کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔ اُن کے گیتوں کی انفرادیت اور عظمت کا پورا اندازہ اُن کے لہجے اور اندازِ بیان سے ہوتا ہے۔ مثلاً

ابھی ابھی ٹوٹے گا پیالہ
پھر خود جڑ جائے گا
مڑ کر دیکھا تو
کھڑکی کا سریا مڑ جائے
کبھی لگے
بیت گئی رات
بندھے کاجل کے ڈورے سے چنچل ہرنی
کرسی کے ہتھے پہ چائے کی پیالی
کھانسی کی کھر کھر میں ادھ ننگی گالی
چھوٹ گئی ہاتھوں سے پوجا کی تھالی
بیت گئی رات

ندؔا فاضلی کی شاعری میں رُومانیت کی عنصر کے علاوہ غم کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ملتی ہے۔ اس کی وجہ

یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت ساری مشکلات کا مقابلہ کر کے زندہ رہنے کا سبق سیکھا ہے۔ یہ عمل کچھ تو شاعر کے ذاتی کرب سے پیدا ہوا ہے اور کچھ معاشرے کی ڈوبتی ہوئی نیا کے دُکھ سے اس بات کا اعتراف خود ندؔا فاضلی اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں۔

"۱۹۶۶ء میں گوالیار میں گھر فسادات کی نذر ہو گیا تب سے اکیلا ہوں۔" اس فساد میں ندؔا فاضلی کا گھر بار لُٹ گیا اور وہ زندگی کی دوڑ میں اکیلا سفر کرتا رہا۔ اسی لئے اُن کے گیتوں میں ان تمام حالات و واقعات کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دل کی ویرانیوں کا مرثیہ بڑے مؤثر انداز میں لکھا۔

ندؔا ایک جانے پہچانے شاعر ہیں۔ اُن کے گیت دلوں کو مسحور کرتے ہیں۔ ان میں پاؤں کی جھنکار بھی ہے اور گھنگروؤں کی آواز بھی ہے۔ عمل و عزم کا سبق بھی ان کے گیتوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ اُن کے الفاظ سے صدیوں کی بے خوابی ٹپکتی ہے۔ ندؔا کا جادو جگانے والا اسلوب اُن کے گیتوں کو خوشنما رنگوں سے مزین کرتا ہے۔ اُن کے گیتوں میں ہمارا سارا درد و کرب، ہمارے معاشرے کا کرب بلکہ ہمارے سارے عہد کا کرب رِس رِس کر ٹپک رہا ہے۔ مثلاً

جانے پہچانے......انجانے
اپنے اپنے گھاؤ
آنگن آنگن جلتی جوالا
سڑک سڑک
پتھراؤ
شبدوں کے سب چہرے زخمی
ننگے سارے بول

یا

بیت گئی رات، کھلی ندیا کے پانی میں
املی سے طوطے نے پھینکے کنارے
آنگن سے دوڑ پر سانجھ سکارے
پیتل کی ٹونٹی سے گرتے ستارے

ندؔا فاضلی نے اپنے گیتوں میں مرقع کاری کے اچھے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ اُنھوں نے نیا

علامتی اسلوب اپنا کر ماضی کے دھندلکے کو درخشاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اُن پر انگریزی اور ہندی شاعری کا بھی براہ راست اثر ہے۔ ندا کے گیت سُریلے، صاف اور خوشنما ہیں۔ اُن کے گیتوں میں افسردگی، تحیّر، گھٹن، آرزومندی، مترنم اور غنائیت بھی ملتی ہے۔ مختصر یہ کہ ندا فاضلی نے اپنے نئے اور انوکھے تجربات سے گیت نگاری کو بام عروج پر پہنچا دیا اور یہی کیا کم اہم ہے۔

●●

اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

● پروفیسر قاسم امام

بمبئی اس اعتبار سے اہم شہر ہے کہ یہ شہرۂ آفاق ادیبوں اور شاعروں کی پناہ گاہ رہا ہے۔ یہاں شب و روز گزرتے نہیں گزارنے پڑتے ہیں۔ مصروفیتوں اور جھنجھلاہٹوں کے درمیان گزرنے والی زندگی اور حالات کی سنگینی ہونٹوں کی مسکراہٹ چھین لیتی ہے۔ ایسے میں وہ دلچسپ لمحے جو کسی شخصیت کی بذلہ سنجی اور زندہ دلی سے وجود میں آتے ہیں، ذہن و دل میں نقش ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک مسکراتی، قہقہے بکھیرتی شخصیت ہے ندا فاضلی کی جو شہر بمبئی کے مضافات اندھیری کے سن رائز اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ پانجراپل، چمبور کے ایک چھوٹے کمرے سے اندھیری کے کشادہ فلیٹ تک کا سفر انہوں نے بڑے تلاش اور جدوجہد سے طے کیا ہے۔ معمولی دھات کی بنی تلاش (ابتدائی دنوں میں جسے ہر جملے کے بعد وہ گھمایا کرتے تھے) سے سونے کے بریسلیٹ تک پہنچنے والی ان کی زندگی نے جو دنیا دیکھی وہ ہری بھری بھی تھی اور ویران بھی۔

بنجارہ مزاج یہ شاعر صرف اپنی منفرد شاعری، عمدہ نثر، معتبر تنقید ہی نہیں اپنی دلچسپ گفتگو سے بھی زیر بحث رہتے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر وہ خوب جانتے ہیں۔ چھت کی طرف دیکھ کر موضوعات تلاش کرنا ان کا مخصوص اسٹائل ہے۔ ان کے شوخ جملے ہمیشہ ذہانت سے پُر ہوتے ہیں۔ شعر سنانے سے پہلے تمہید باندھنا وہ نہیں بھولتے بیشتر اوقات کلام کی تمہید میں کہے گئے جملوں سے وہ مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ باپ کی وفات پر کراچی نہ پہنچنے کا ملال، کراچی سے لوٹنے پر اس فقیر کا بمبئی میں ملنا، فساد کے دنوں میں اسکول جانے سے ڈرتے ہوئے بچے، لکشمن کے کارٹون کا عام آدمی، ان کے تمہیدی کلمات کے وہ موضوعات ہیں جو ہر بار ریپیٹ ہوتے ہیں اور نئے معلوم دیتے ہیں۔

دورانِ سفر ان کی شخصیت کے مختلف دلچسپ پہلو اور ابھر آتے ہیں۔ اردو کے چند نامور شعراء ان کی پسندیدہ خوراک ہیں۔ ایک سفر میں، میں بھی بشیر بدر، زبیر رضوی اور ندا فاضلی کے ساتھ تھا۔ زبیر صاحب کو جو شرارت سوجھی تو انہوں نے ندا فاضلی کی شاعری پر بشیر بدر سے رائے طلب کر لی۔ پہلے تو وہ

اپنے ''مخصوص انداز'' میں لجائے، تھوڑا سا مسکرائے پھر شال سے بنے کرتے کے دامن کو درست کرتے ہوئے کہا۔ ''ندا میرے بھائی ہیں... ان کی شاعری کیا؟ تھوڑا کبیر، تھوڑے نظیر، اور کچھ میر۔'' جواب میں ندا صاحب نے بشیر بدر کو ایسے دوڑایا کہ انہیں ڈبہ بدلنا پڑا۔

بار ہا ایسا ہوا کہ ریل کے جس ڈبے میں ندا صاحب بیٹھے ہوں وہاں سے دوسرے شعراء اپنی سیٹیں بدلوا لیتے ہیں۔ خاص طور پر گورکھپور کی ٹرین میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنی رائے کا بے دریغ استعمال کوئی ندا صاحب سے سیکھے۔ ان کی پہلی نثری کتاب ''ملاقاتیں'' میں شوخ جملوں کی وہ عمدہ مثالیں ملتی ہیں جو پڑھنے اور سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ خاص طور پر باقر مہدی، قاضی سلیم، سردار جعفری، اختر الایمان اور کیفی اعظمی کی شخصیات کا احاطہ بہت خوبصورت اور دلچسپ ہے۔ کیفی اعظمی کے بارے میں ان کے یہ جملے قابل ذکر ہیں ''کیفی اعظمی کا تعلق اسٹیج سے تیس پینتیس سال پرانا ہے۔ اور اب تو وہ اسٹیج کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اپنے گھر کے اکیلے کمرہ میں بھی آواز اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بے جان دیواروں تک کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔''

اختر الایمان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اسٹیل کی قینچی، موم کی گڑیا، جامع مسجد کا مینار، بیل گاڑی کے پہیے، لمبی لمبی پُر راہیں، سوکھی ہوئی ببول، گہرے غار، نرم مٹی، سفید اون کے لچھے، چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دیر دیر تک رکتی پسنجر ٹرین،...... میرا جی چاہتا ہے ان تمام مختلف چیزوں کو ایک گول گھیرے میں بند کر کے اس کے اوپر ایک نام لکھ دو ''اختر الایمان''۔

ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کی وہی چاشنی ہے جو ان کی گفتگو میں نظر آتی ہے۔ معنوی اعتبار سے بھی ان کے جملوں میں تہہ داری پائی جاتی ہے۔ ''ملاقاتیں'' میں سردار جعفری کی شخصیت پر لکھے ہوئے ان کے جملے خوب ہیں اور جعفری صاحب کو سمجھنے میں حائل دشواریوں کی جانب معنی خیز انداز میں اشارہ کرتے ہیں۔ ''چمبور سے سیتا محل کا راستہ تو خیر اتنا طویل نہیں مگر ان کے کمرے سے ان تک پہنچنے کا راستہ اکثر بری طرح تھکا دیتا ہے۔''

''ملاقاتیں'' کے علاوہ ان کے سوانحی ناول ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' کی نثر اور چہرے میں مرحوم شعراء کے خاکے، اردو میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ایسی نثر اور ایسے خاکے ندا صاحب کے قلم سے ہی نکل سکتے تھے۔ ابتدائی پریشانی کے دن انہوں نے اپنے بڑے بھائی صبا فاضلی کے ساتھ پانجرہ پل چمبور میں گزارے۔ مرزا میخوار ایرانی، مرحوم حبیب رضا میکش اور قیصر الجعفری و دیگر احباب

اکثر ان سے ملنے وہاں چلے جاتے تھے۔ روزانہ اپنے ہاتھوں سے سبزی بنانا اور بڑے بھائی کا انتظار کرنا کہ وہ گھر لوٹتے ہوئے پاؤ لائیں تو کھانا کھایا جائے ندا صاحب کا معمول تھا۔ ایک دن احباب دیر تک بیٹھے رہے۔ اس دوران ندا صاحب نے سبزی بنالی، رات کافی ہو چکی تھی بڑے بھائی کو پاؤ نہ ملا اور وہ خالی ہاتھ لوٹے۔ احباب رخصت ہوئے تھوڑی دیر بعد حبیب رضا روٹی لیکر دوبارہ حاضر ہوئے۔ تب تک سبزی ختم ہو چکی تھی۔ ندا صاحب نے خشک روٹی یہ کہہ کر چبالی کہ لاؤ یار، پیٹ میں دونوں مل جائیں گے۔

پانجرہ پل کا ایک دلچسپ واقعہ جس سے ندا صاحب کی ذہانت اور ظرافت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک صاحب ان سے ملنے گئے اور دیر تک گھر میں بیٹھے رہے۔ دونوں بھائی اس انتظار میں تھے کہ وہ صاحب رخصت ہوں تو کھانا نکالا جائے۔ اس کھانے میں تیسرے آدمی کی گنجائش نہیں تھی۔ کافی دیر انتظار کے بعد بھائی نے کہا، یار بھوک لگی ہے اب کھانا لگا دوں اور ہاں پلیٹیں بھی صاف کرلو۔ ندا صاحب نے جھٹ کہا، پلیٹیں صاف ہیں ابھی تو کتا چاٹ کر گیا ہے۔ یہ سن کر وہ صاحب کھانے میں شامل نہ ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

ممتاز راشد راوی ہیں کہ اودے پور کے ایک مشاعرے میں ندا فاضلی دیر سے پہنچے۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ کھانے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا منتظمین نے بمشکل کہیں سے چند چھوٹی چھوٹی پوریاں لا کر ان کے سامنے رکھ دیں اور کہا جناب شروع کیجئے۔ ندا صاحب نے فوراً کہا۔ یہ مت کہیے کہ شروع کیجئے یہ کہیے کہ ختم کر دیجئے کیونکہ شروع اور ختم کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ اس سائز کی پوریوں میں نہیں ہوتا۔

دوران سفر کسی بھی اجنبی کو '' رام '' یا '' شرما '' کہہ کر مخاطب کرنا اور پھر اس سے ماچس، سگریٹ یا بلا تکلف پانی طلب کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

ایک بار وہ اور ممتاز راشد سورت جانے کے لئے ۱۱ بجے دن میں باندرہ سے سوار ہوئے، بوریولی میں کچھ اور شاعروں کو آنا تھا۔ ندا صاحب نے سوچا شاید وہ لوگ کھانے کے لئے کچھ لیتے آئیں گے لیکن مایوسی ہوئی، گاڑی ویرار تک پہنچ گئی، دوپہر کی دھوپ اور پیٹ کی آگ نے ندا صاحب کو پریشان کر دیا۔ کچھ سجھائی نہ دیا... اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور سامنے بیٹھی ہوئی گجراتی فیملی جو اخبار بچھا کر بڑا سا ناشتہ دان لئے، کھانے میں مشغول تھی ان کے پاس جا کر عجیب و غریب مسکین صورت بنا کر اپنے پیٹ کو سہلایا.... ان کو ترس آیا اور انہوں نے جھٹ کچھ روٹیاں اور سبزی ہاتھ میں پکڑا دی۔ ندا صاحب نے خود بھی کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا بعد میں اس فیملی کو جب معلوم ہوا یہ مشہور کوی ندا فاضلی ہیں تو انہیں حیرت بھی ہوئی اور پشیمانی بھی۔

راجستھان (بوندی) کے ایک مشاعرے میں ندا فاضلی صدر تھے، مقامی شعراء کا اک طویل سلسلہ تھا جو ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا، تنگ آکر ندا فاضلی مائک پر آئے اور اعلان کیا کہ اب صدارت لیٹ کر ہوگی اور واقعی وہ اسٹیج پر سو گئے۔ جب سارے مقامی شعراء پڑھ چکے تو جناب صدر کو جگایا گیا اور زحمت کلام دی گئی۔

جعفر شریف جن دنوں ریلوے منسٹر تھے ان کی سالگرہ پر ایک مشاعرہ لال گارڈن بنگلور میں منعقد ہوا جس میں کئی اہم شعراء موجود تھے۔ دورانِ مشاعرہ کرناٹک کے ایک مشہور شاعر کو پاس بلا کر ندا صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ سنو! بمبئی چلو گے...؟ وہاں کوئی بھی تمہیں گھر کے کام کے لئے رکھ لے گا۔

راجیش ریڈی نے آکاش وانی رتنا گیری میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں ملک کے کئی اہم شعراء کے علاوہ مخصوص سامعین کی بھاری تعداد شریک تھی، مشاعرے کی نظامت میرے ذمہ تھی.... مشاعرہ کچھ ڈل جا رہا تھا۔ ندا صاحب بڑے شرارتی موڈ میں تھے،... افتخار امام، سعید راہی ان سے کچھ بچے بچے سنبھلے بیٹھے تھے۔ اچانک ندا صاحب اپنی نشست سے اٹھے، مجھے مائک سے ہٹایا اور خود نظامت کرنے لگے۔ دوستو! آج کا یہ مشاعرہ بڑا تاریخی ہے کہ اس مشاعرے میں

ایک ہے افتخار ایک سعید
دو ترنم میں ہاتھا پائی ہے
اور پھر مالتی بھی آئی ہے
میرے مولا تیری دہائی ہے

ندا صاحب کے ان برجستہ اشعار سے مشاعرے میں جان آگئی۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ دو عشق کرنے والوں پر اگر کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ بھائی بہن کے رشتے میں اپنے اس تعلقات کو چھپا جاتے ہیں، کرلا میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں اک نوجوان کو بالآخر خودکشی کرنی پڑی۔ ندا فاضلی کا، شاعری اور بمبئی کا ابتدائی دور تھا... انہوں نے کرلا کے ایک مشاعرے میں اپنی نظم ''پھر یوں ہوا'' سنائی جس کے آخری مصرعے تھے

پھر یوں ہوا کہ دھوپ کھلی ابر چھٹ گیا
میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسا لیا
تم نے پڑوس میں ''نیا بھائی'' بنا لیا

نظم کا پڑھنا تھا کہ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، ہنگامہ ہو گیا اور ہر دو خاندان کے لوگ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ ندا صاحب کو بمشکل وہاں سے بچا کر نکالا گیا حالانکہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا وہ اس پورے واقعے سے لاعلم تھے اس واقعے کے بعد دوستوں کے مشورے پر انہوں نے کئی دنوں تک کراا کا رخ نہیں کیا۔

بہت سے واقعات ہیں جن سے ندا فاضلی کی پہلو دار شخصیت کے دلچسپ رنگ ابھرتے ہیں.... وہ بنیادی طور پر سفر کے آدمی ہیں۔ لطیفوں کی مدد سے شخصیت کی تصویر بنانا اور کبھی کہانی، کبھی Gimmick سے ان تصویروں میں رنگ بھرنا ندا صاحب کی Hobby ہے۔ زمین سے جڑے ہوئے ہندی الفاظ اور ہندوستانی مٹی کی بوباس نے ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ اور آہنگ دے دیا ہے جس میں اپنائیت بھی اور بے ساختگی بھی۔ دوہے اور گیت جیسے پرانے اصناف کو بھی انہوں نے آج کے مسائل سے آنکھیں ملانا سکھایا، ان کی سوچ میں جدت اور مزاج میں کلاسیکیت ہے، کلاسیکی ادب پر ان کی اچھی نظر ہے۔ ندا صاحب کو ملنے والی کتابوں کی رائلٹی میں معصوم بچوں کا بھی بڑا حصہ ہے جنہیں وہ اکثر اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔

خاموشی سے ضرورتمند دوستوں کے کام آنا ان کا وصفِ خاص ہے۔ بمبئی کے کئی اہم شاعروں اور افسانہ نگاروں نے اپنی پریشانی کے دنوں میں ان کے گھر ہی ''مخصوص کھچڑی'' کھا کر اپنی بھوک مٹائی ہے اور چاندی کا گلاس دیکھ کر اپنی پیاس۔

اپنے ساتھ وہ دوسروں کی ''دال دلیا'' کا بھی خیال رکھتے ہیں....ادیبوں اور شاعروں کی فوری امداد کے لئے ایک فلاحی ٹرسٹ بنانے کی بات وہ ہر ملاقات میں دہراتے ہیں۔

شاعری کے تعلق سے ان کا اپروچ جتنا پرسنل ہے مشاعروں کے تعلق سے اتنا ہی پروفیشنل، وہ خسارے کا سودا بہت کم کرتے ہیں۔ ندا صاحب مقامی بولیوں سے اپنی شاعری اور گفتگو میں لفظوں کو نئے معنی پہناتے رہتے ہیں۔ ان دنوں ان کا محبوب لفظ ''پھاڑ دو'' ہے جو اپنے محل استعمال اور لہجہ سے مفہوم بدلتا رہتا ہے،

اکثر مشاعروں میں لفظ ''پھاڑ دو'' کو ندا فاضلی نے ''ارشاد'' کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت جب کوئی کمزور شاعر ان سے کلام سنانے کی اجازت طلب کرتا ہے۔

ندا فاضلی باہر سے جتنے بے نیاز اور آزاد نظر آتے ہیں اندر سے اتنے ہی محتاط اور پابند ہیں۔

دوحہ قطر کے عالمی مشاعرے میں ہم ساتھ ساتھ تھے۔ میرے محسن اور قطر کے مشہور ادب دوست حسن چوگلے نے اپنے بنگلے پر ہمارے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ ضیافت کے بعد رسماً شعر سنانے کی فرمائش کی گئی مگر ندا صاحب ٹال گئے نہ خود سنایا نہ دوسروں کو سنانے دیا۔ انہوں نے شعر کی حرمت کو عمدہ ضیافت پر قربان نہیں کیا۔ میزبان اور دعوت میں شریک ہندوستانیوں کی دل شکنی نہ ہو اس خیال سے ''قطر میں ہندوستانیوں کی خدمات'' پر ایسی مفصل و مدلل تقریر کی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ شاعرانہ دیوانگی میں جتنا ہوش مند میں نے ندا صاحب کو پایا بہت کم لوگوں کو دیکھا۔

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

●●

بات کم کیجئے...

● حامد اقبال صدیقی

''ہلو.... کیا ہو رہا ہے؟''

ندا فاضلی صاحب نے اپنے خاص انداز میں فون کیا۔ باوقار آواز جس میں کچھ شفقت، کچھ لاتعلقی، کچھ بے نیازی، کچھ سنجیدگی اور کچھ اکتاہٹ کا امتزاج ہے، میں نے عرض کیا کہ میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔ لمحہ بھر بعد آواز آئی'' کیوں؟'' اور میں سٹپٹا گیا۔ میں نے اپنے غریب خانے پر ایک دعوت کا اہتمام کیا ہے اور خواہش ہے کہ آپ بھی تشریف لائیں۔ پھر ایک لفظ گونجا'' کب؟'' جی وہ.... اس مہینے کی ستائیس تاریخ کو۔'' اس تاریخ کو میں شہر میں نہیں ہوں، گوالیار جا رہا ہوں۔'' گوالیار! جہاں کبھی ندا صاحب کا خاندان آباد تھا اور شاید جہاں ندا صاحب پیدا ہوئے تھے۔ وہاں آپ کے رشتے دار اب بھی ہوں گے'' نہیں کوئی نہیں ہے۔ سب یہاں وہاں بکھر گئے۔'' آواز کے اس کرب کو میں نے شدت سے محسوس کیا جو کبھی کبھی آگرہ کے ذکر پر مجھ میں اُبھر آتا ہے۔ اگر انسان یہاں وہاں بکھرتے نہیں تو یہ دنیا اتنی کب پھیلتی۔ یہاں کے نصیب کہ ندا صاحب جیسا فنکار'' یہاں'' ہے۔

ندا صاحب کی بڑی بڑی شریر آنکھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا بچپن کیسے گزرا ہوگا۔'' دیواروں کے بیچ'' میں انہوں نے اپنے تعلق سے جو کچھ بھی لکھا ہے، اس سے قبل تک ان کے بچپن اور جوانی کے تعلق سے شاید کوئی نہیں جانتا تھا۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی فنکار بہت مشہور ہو جاتا ہے تو اس کے بچپن اور نوجوانی کے نہ جانے کیسے کیسے انکشافات ہونے لگتے ہیں ہر کوئی خود کو اس فنکار کی ابتدائی زندگی کا راز دار ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ندا صاحب کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا، شاید ہر راوی، ہر راز دار انہیں پدم بھوشن یا گیان پیٹھ دیئے جانے کے انتظار میں ہے۔ خاکسار بھی اسی انتظار میں تھا لیکن خدا بھلا کرے اس وقار قادری کا جس نے وقت سے پہلے ہی مجھے مجبور کر دیا کہ میں ندا صاحب کی شخصیت پر کچھ لکھوں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ان کے بارے میں میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن شاید آپ نہیں جانتے کہ ہزار بار ندا فاضلی سے ملاقاتوں کے باوجود ان کا شخصی تجزیہ لکھنا ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل ترین ضرور ہے۔

بات بہت پرانی ہے، جب میں پانچویں چھٹی جماعت میں تھا، بابو جی (والد صاحب قبلہ اعجاز

صدیقی مرحوم) کے پاس ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، پلے ہاؤس پر واقع دیناتھ بلڈنگ میں دو کمروں پر مشتمل ہمارا گھر جو" شاعر" کا دفتر بھی تھا (اور آج بھی ہے) جس میں بابو جی، امی جان، ہم سات بھائی اور دو بہنیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کتابوں اور رسالوں کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ کتابیں اور رسالے ہی ہمارے کھلونے تھے، ہمارے دوست تھے، ہمارے گھر کا فرنیچر اور ڈیکوریشن بھی یہی کتابیں اور رسالے تھے۔ وہاں پورا عصری اردو ادب ہمارے ساتھ جیتا تھا، کھیلتا تھا، ہم بھائی بہنوں کے وجود پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا اور بیشتر اوقات ہم سے جیت بھی جاتا تھا۔ وہاں کرشن چندر، مہندر ناتھ، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، واجدہ تبسم، شیام کشن نگم، جاں نثار اختر، ظ انصاری اور دیگر نامورانِ ادب عام طور پر آیا جایا کرتے تھے لیکن ان کے علاوہ چند نوجوان قلم کار بھی ہوتے تھے۔ عبدالستار دلوی، یونس اگاسکر، یعقوب راہی اور بھی بہت سے۔ ایک صاحب نکلتے ہوئے قد کے، دبلے پتلے، لمبی گردن والے جس پر گھماؤ دار بال لٹکتے ہوں، منہ میں پان دبائے، اُٹنگا سا کرتہ پاجامہ پہنے اکثر سے بھی کچھ زیادہ آتے جاتے تھے۔ بابو جی اس جوان کی صلاحیتوں کی ہر ایک سے تعریف کیا کرتے تھے۔ ندا اچھے شعر کہتا ہے، ندا نے اچھی نظمیں لکھی ہیں، اس کو ہندی پر عبور حاصل ہے اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ ایک صاحب " شاعر" کی مجلس ادارت میں بھی شامل کر لئے گئے تھے، مسکراتے ہوئے آتے اور خوب باتیں کرتے۔ یہ دونوں صفات آج بھی ان کی شخصیت کا حصہ ہیں بلکہ مسکراہٹ کے بغیر اگر ندا صاحب کی کوئی تصویر دیکھیں تو شک گزرتا ہے کہ یہ ان کی نہیں ان کے کسی ہم شکل کی تصویر ہے۔ جس طرح مس قرۃ العین حیدر کی ہر تصویر میں چہرے پر ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ مسکراہٹ ندا صاحب کے چہرے پر چپک گئی ہے وہ کسی کی موت کی خبر بھی دیں تب بھی یہ مسکراہٹ ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

تو جناب جب میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھا، بابو جی نے ایک طویل نظم " خوابوں کا مسیحا" لکھی جو بیک وقت تین زبانوں میں چھپی، انگریزی ترجمہ ماہر اکبانی مرحوم نے کیا تھا اور اس نظم کو دیوناگری اسکرپٹ میں ندا فاضلی نے لکھا تھا۔ انہی دنوں ترقی پسند تحریک پر بھرپور جوانی پھوٹی تھی لیکن بھیگتی مسوں والا ایک اور ادبی محاذ بھی اپنے پر پیر نکال رہا تھا جسے بعد کے دنوں میں جدیدیت کہا گیا۔ پتہ نہیں ندا صاحب ان دنوں ترقی پسندوں کے حمایتی تھے یا جدیدیوں کے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام " لفظوں کا پل" ان دونوں رجحانات کے درمیان " پل" ہی لگتا ہے۔ مذکورہ کتاب کی شاعری مجھے زیادہ کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی اس وقت، وہ شاعری سمجھنے کی عمر بھی نہیں تھی، ہاں کچھ نظمیں پڑھنے میں بہت بھلی لگتی تھیں لیکن اختر شیرانی، مجاز اور ساحر لدھیانوی کی شاعری کے سحر والی عمر پر جلد ہی ندا فاضلی، محمد علوی، ناصر کاظمی، بشیر

بدر، عادل منصوری، شکیب جلالی، منیر نیازی، خلیل الرحمٰن اعظمی، احمد مشتاق، بشر نواز، کشور ناہید اور جون ایلیا وغیرہ حاوی ہو گئے تھے۔ ندا کا دوسرا مجموعہ ''مورناچ'' ان چند کتابوں میں سے ایک تھا جو مجھے بہت عزیز تھیں۔ ''مورناچ'' کی بیشتر نظمیں مجھے ازبر تھیں۔ ندا کا جادو مجھ ایسے نہ جانے کتنے نوجوانوں پر چلا ہوگا۔ دوستوں کی محفلوں میں ندا کے اشعار سنا سنا کر میں بہت خوش ہوتا تھا۔ دو جمع دو چار ٹائپ کی شاعری کے حامی ایک صاحب مجھ سے الجھ پڑے کہنے لگے'' میاں تمہارے ندا کی مورچ ناچ پڑھی، اس کتاب کا نام دراصل ''مشورے'' ہونا چاہئے تھا پوری کتاب میں انہوں نے منظوم مشورے دیئے ہیں۔ یوں کریں، ایسا کیجئے، یوں نہ کرو، یہ بھی کوئی شاعری ہوئی؟'' اب میں ان کو کیا سمجھاتا کہ بھائی میرے مجھے وہ شاعری متاثر نہیں کرتی جو زلف و رخسار سے گری اور مارکس اور لینن میں اٹکی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ نئے لکھنے والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ان دنوں ادب کے ساتھ خصوصاً شاعری کے ساتھ مذاق کرنے لگ پڑا تھا بہت سے لوگ تو اپنا جہل چھپانے کے لئے خود کو جدیدیئے کہلوانے لگے تھے۔ مجذوب کی بڑ اور رطب و یابس سے بھی گئی گزری شاعری کے خلاف ردعمل تو لازمی تھا لیکن صاحب لوگ باگ ڈھیروں کچرے کو چھوڑ کر جدیدیوں کی تضحیک کے لئے ندا صاحب کے ایک شعر کو ہی بطور مثال اچھالتے تھے۔

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہوگئی

وہ تو بہت بعد میں لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ندا وہ نہیں بلکہ ع

وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی

''مورناچ'' نے خوب خوب دھوم مچائی۔ ''ملاقاتیں'' شائع ہوئی تو ندا کی نثر نگاری نے بھی سب کو چونکا دیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ

نقشہ اٹھا کے کوئی نیا شہر ڈھونڈیئے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہوگئی

لیکن معاشی پریشانیوں اور اپنے ادبی تشخص کو برقرار رکھنے کی جدوجہد نے انہیں بہر حال اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ خود سے بھی ملاقات کرسکیں، چمبور کی رہائش، کرلا کی بیٹھکیں، فلم والوں کے گھروں پر دستکیں، مشاعرے، ادبی بحثیں، مذاق، قہقہے اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ جوجھتے رہے۔

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں

رخ ہواؤں کا جدھر کا ہے اُدھر کے ہم ہیں

میں نہیں جانتا کہ ہواؤں کا رخ انہیں فلمی دنیا میں لے گیا یا اس جانب انہوں نے منصوبے کے تحت رخ کیا۔ ''سویکار'' بحیثیت ڈائیلاگ رائٹر ان کی پہلی فلم تھی۔ ''ہرجائی'' کے لئے انہوں نے ایک گیت لکھا جو مجھے بہت پسند ہے۔

تیرے لئے پلکوں کی جھالر بنوں

کلیوں سا گجرے میں باندھے پھروں

دھوپ لگے تجھے جہاں سایہ بنوں

آجا ساجنا

کمال امروہی جیسے عظیم فلم ساز نے انہیں ''رضیہ سلطان'' میں موقع دیا اور ان کا گیت ''تیرا ہجر میرا نصیب ہے...'' پسند بھی کے گیا لیکن اسی فلم میں جاں نثار اختر مرحوم کا گیت ''اے دلِ ناداں آرزو کیا ہے'' سُپر ہٹ ہوا۔ ندا صاحب کے ساتھ ایسا سب کچھ ہوتا ہی رہا فلموں میں بہت کچھ نہیں ہو سکا۔ مستقل رہائش گاہ نہیں حاصل ہو سکی۔ ازدواجی زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ ایسے میں ایک فطری فنکار اپنے جذبات، احساسات اور محرومیوں کو اپنے اندر کب تک گھونٹ سکتا ہے، کب تک قہقہوں میں اڑا سکتا ہے۔ فلم ''آپ تو ایسے نہ تھے'' کے ایک گیت کے طور پر انہوں نے غالباً خود کو سمجھانے کی کوشش کی

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا

لیکن جگ دِکھاوا ممبئی میں آ بسنے والوں کا مقدر ہے اسی لئے مذکورہ گیت میں انہیں یہ بھی کہنا پڑا۔

یہ آسمان یہ بادل یہ راستے یہ ہوا

ہر ایک چیز ہے اپنی جگہ ٹھکانے سے

کئی دنوں سے شکایت نہیں زمانے سے

مجھے یاد ہے کہ جگجیت سنگھ غزلوں کا البم ''کم الائیو'' Come Alive بنا رہے تھے، انہی دنوں ندا صاحب کی غزل۔

دنیا جسے کہتے ہیں جادو کا کھلونا ہے

مل جائے تو مٹی ہے کھو جائے تو سونا ہے

''شاعر'' میں شائع ہوئی تھی۔ افتخار بھائی (افتخار امام صدیقی) نے وہ غزل جگجیت کو سنائی، وہ

باذوق آدمی ہیں، غزل سن کر بہت خوش ہوئے اور دوسرے ہی دن اس کی دھن بھی بنا ڈالی۔ تب سے آج تک ندا اور جگجیت نے ایک ساتھ کافی کام کیا ہے۔ ''شاعر'' اور مشاعروں کی وجہ سے ندا صاحب اور افتخار بھائی کے درمیان گہرے مراسم رہے۔ ندا صاحب کی بیشتر تخلیقات ''شاعر'' ہی میں شائع ہوئی ہیں یہ اور بات ہے کہ عروج کے زمانے میں ان کی نظرِ کرم ''شاعر'' پر کم کم ہی رہی۔ وہ عموماً صبح ۹ ربجے کے آس پاس تقریباً روزانہ ہی افتخار بھائی کو فون کرتے اور پھر ہمارے گھر کی خواتین کہتیں ''اب آدھے گھنٹے کی فرصت ''افتخار بھائی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' لیکن افتخار بھائی اور ندا صاحب کی نوک جھونک کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا کہ کس کا اسپ شہرت کتنا تیز دوڑ رہا ہے۔ جب افتخار بھائی نے ندا صاحب کا سوانحی ناول ''دیواروں کے بیچ'' شاعر میں قسط وار شائع کیا تو پوری اردو دنیا میں اس کی گونج ہوگئی۔ میرے خیال میں یہ واحد سوانحی ناول ہے جس کی اقساط پڑھنے کے بعد خود قارئین نے اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کا اصرار کیا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ ''دیواروں کے باہر'' اتنا مقبول نہیں ہوا۔

وہ مشاعروں میں بڑے احترام اور اہتمام سے بلائے جاتے ہیں گو کہ آج کل مشاعروں میں گلا بازوں، بھانڈوں، نقالوں اور متشاعروں کا بول بالا ہے لیکن ندا صاحب جیسے بعض اہم شعراء کو بھی بطور تبرک بلا لیا جاتا ہے، عموماً ایسے شعراء اسٹیج پر ایک کونے میں ڈرے سہمے اور دبکے ہوئے بیٹھے عبرت لیتے ہیں اور دل ہی دل میں کہتے ہیں ''یا اللہ قیامت کب آئے گی'' لیکن ندا صاحب ان شاعر نما تماشہ گروں کا خوب خوب مقابلہ کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ ذرا سا اسٹیج کا شعور خالص ادبی شاعری پر بھی عوام سے داد وصول کر لیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بھی اسٹیج پر تھوڑی سی اداکاری سے باز نہیں آتے۔ اب مشاعروں میں ان کا بڑا ڈیمانڈ ہے، ادھر سننے میں آیا ہے کہ وہ بیرونِ ممبئی مشاعروں میں جانے کے لئے صرف ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں۔ ٹرین سے نہیں یعنی اس علاقے میں مشاعرہ نہیں پڑھتے جہاں ایرپورٹ نہ ہو۔ مشاعرے میں کلام سنانے سے قبل تھوڑی سی تقریر بھی کرتے ہیں جس میں میر، نظیر، کبیر ضرور ہوتے ہیں۔

ان کے ساتھ کئی مشاعروں میں مجھے بھی کلام سنانے کا موقع نصیب آیا۔ اسٹیج پر بیٹھ کر وہ مسلسل بولتے رہتے ہیں اور ہر شاعر کے تعلق سے دلچسپ کمینٹس بھی کرتے ہیں، بکواس شاعری کو ہوٹ بھی کرتے ہیں اور نوجوان شعراء کے اچھے اشعار پر داد دے کر حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔

میں اور عبدالاحد ساز ان کے ساتھ احمد آباد کے مشاعرے میں جا رہے تھے، ٹرین میں بھیڑ کم تھی، ندا صاحب پیتے اور بولتے رہے، پاس پڑوس کے لوگ بھی ان کی باتوں میں دلچسپی لے رہے تھے لیکن کب

تک؟ ہمیں بھی نیند آنے لگی تھی لیکن وہ تو جیسے رتجگے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے، ہم دونوں تو شغل نہیں کرتے لیکن اگر کوئی ان کا ہم مشرب ہوتا تو شاید رات آنکھوں ہی میں کٹتی، البتہ میں نے ایک بات ضرور سیکھ لی ہے، کہ آپ انہیں چھیڑ جایئے اور اس جانب سے علم کے چشمے پھوٹتے رہیں گے، جی کھول کر سیراب ہو لیجئے۔ بلا کا مطالعہ اور مشاہدہ ہے اس شخص کا۔ آپ یقین کیجئے کہ ہم جیسے چھوٹے اور نئے شعراء کے کاموں پر بھی وہ نظر رکھتے ہیں بتاتے ہیں کہ آپ کی فلاں غزل فلاں رسالے میں پڑھی تھی اس کے ایک شعر میں یوں ہے اور یہ عیب ہے اسے یوں کر لیجئے، یا بے تکلفی سے کہتے ہیں کہ یار وہ غزل اچھی نہیں تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے قلم کار کو وہ اہمیت دیتے ہیں اور توجہ سے پڑھتے ہیں یہاں تو وطیرہ یہ ہے کہ یار لوگ وہ رسالہ ہی نہیں پڑھتے جس میں ان کی تخلیق نہ ہو۔

احمد آباد کے اس سفر کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ صبح ساڑھے چھ بجے جب ہم احمد آباد کے پلیٹ فارم پر اترے تو ندا صاحب پورے موڈ میں تھے، ایک صاحب پلیٹ فارم پر کھڑے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے، شاید کسی کو تلاش کر رہے ہوں۔ ندا صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بارعب آواز میں پوچھا ''کیوں کھڑے ہو؟'' وہ صاحب گڑبڑا گئے، پہلے پہچاننے کی کوشش کی کہ اتنی بے تکلفی سے یہ کون مخاطب ہے، آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے، ایسا لگا کہ قمر احسن کی ''آگ الاؤ صحرا'' کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں، لیکن وہاں شمس الرحمٰن فاروقی تو تھے نہیں کہ کچھ سمجھا پاتے۔ وہ صاحب جھلا گئے، ندا صاحب پھر بولے ''یار یہاں کیوں کھڑے ہو؟'' اب ان صاحب سے رہا نہیں گیا جھلا کر بولے ''ابے تجھے کیا کرنا ہے میں کھڑا رہوں یا لیٹ جاؤں'' ندا صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اس وقت واجپائی سرکار تحلیل ہوئی تھی، باہر چائے کے اسٹال پر چائے والے سے بولے ''یار تمہیں شرم آنی چاہئے، آج اس ملک کا کوئی وزیرِ اعظم نہیں ہے اور تم چائے بیچ رہے ہو'' چائے والا اتنی سنجیدگی سے ان کی جانب متوجہ تھا گویا ندا صاحب اسے وزارتِ عظمٰی کی پیش کش کر رہے ہوں، ویسے یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کے بیشتر سیاسی رہنما چائے بیچنے کے اہل بھی نہیں ہوتے۔ سیاسی ہی کیوں اب تو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو پڑھانے والوں کی ایک بڑی تعداد پر بھی یہی گمان گزرتا ہے۔

بہت سی باتیں ہیں۔ بہت سے واقعات ہیں، ندا فاضلی کی شخصیت کی اتنی پرتیں ہیں کہ سب کا الٹنا محال ہے، ایک مضمون میں آپ کیا کیا لکھیں گے اور پھر خدا بھلا کرے اس وقار قادری کا جو سر پر مسلط ہے کہ جلدی لکھ اس لئے جنابِ عالی آپ تھوڑے کو بہت سمجھیں۔ باقی آئندہ!

●●

.....جو تھے وہی رہے

• پورن پنکج

دائیں ہاتھ کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی، کلائی میں سونے کا بریسلیٹ اور گلے میں سونے کی زنجیر۔ گہرے رنگ کا کرتا پہنے کبھی وہ بریسلیٹ والی کلائی کو گھماتے ہیں تو کبھی گلے کی زنجیر پر اپنی انگلی گھماتے ہیں۔ کبھی باتوں باتوں میں سنجیدہ ہو جاتے ہیں تو کبھی اپنے جملوں سے محفل کو ہنساتے ہیں۔ مشہور شاعر اور فلمی گیت کار ندا فاضلی کی یہ ادا کسی بھی وقت دیکھی جا سکتی ہے۔ بے فکری، مستی، پھکڑ پن ان کے مزاج میں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر شعر انسانی تہذیب اور زندگی کو بیان کرتا ہے۔

ندا فاضلی ان گنے چنے شاعروں میں ہیں جنہوں نے اپنی بہترین شاعری کے ذریعے دیس بدیس میں خاصی عوامی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان کی شاعری میں کہیں صوفیانہ رنگ چڑھتا ہے تو کہیں سماج کے ناہمواری پر کبیر کی مانند غصہ دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں ''کھویا ہوا سا کچھ'' پر درجنوں ادبی انعامات ملے ہیں۔ ان کے فلمی گیت ''کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا''؛ ''تو اس طرح سے میری زندگی میں شامل ہے'' حال ہی میں ان کی لکھی فلم ''سُر'' کے گیتوں کو عوام نے کافی سراہا ہے۔ ''آ بھی جا..... نامی گیت کے لئے انہیں اسکرین ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

ادب یا فلمی دنیا سے جڑے جو لوگ ندا صاحب کو جانتے ہیں یا ان سے اکثر ملتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ندا صاحب کی چھیڑ چھاڑ، چہل بازی اور پھر دلیش، سماج کو لے کر ہوئی سنجیدہ بحثیں یادگار بنتی ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ پھکڑ پن اور مستی تمام سنگھرشوں کا سامنا کرنے کے بعد کیسے آئی؟ وہ فرماتے ہیں ''یہ آدمی کے اختیار میں ہے کہ زندگی کو کیسے جیا جائے۔ اکثر حالات ایسے ہوتے ہیں ہم زندگی کو جس طرح سے جینا چاہتے ہیں جی نہیں پاتے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا۔ یہ طے کیا تھا کہ زندگی کو اپنے تئیں جیوں گا۔ میں جب تنگی میں تھا، سنگھرشوں میں تھا تب بھی اپنی وہی طبیعت تھی اور آج سب کچھ ہے تب بھی وہی ہوں۔

میرا ایک شعر ہے۔

بدلا نہ اپنے آپ کو جو تھے وہی رہے
ملتے رہے سبھی سے مگر اجنبی رہے

نداصاحب کا دن پڑھنے لکھنے اور محفلوں میں گزرتا ہے۔ وہ صبح اٹھتے ہیں اور اپنے گھر سے تھوڑی دور یاری روڈ کے پارک میں آٹھ چکر لگاتے ہیں۔ اور پھر اپنے سات بنگلہ والے مکان پر آ جاتے ہیں۔ اپنی پانچ سالہ بیٹی تحریر کے ساتھ کھیل کر چائے نوشی کے دوران ہندی اردو اور انگریزی کے اخبار پڑھتے ہیں۔ ندافاضلی کہتے ہیں "صبح نہادھو کر ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کام کاج میں جٹ جاتا ہوں۔ کچھ کام فلموں کا ہوتا ہے تو کچھ ادب سے جڑا ہوا۔ دوپہر میں لنچ کے بعد کوئی اچھی سی کتاب یا ساہتیہ پتریکائیں پڑھتا ہوں۔ آدھا گھنٹہ آرام کرتا ہوں اور پھر پڑھائی لکھائی میں کھو جاتا ہوں۔

نداصاحب جتنے سنجیدہ ادیب ہیں اتنے ہی محفل باز بھی۔ رات میں اکثر ان کے گھر میں محفل جمتی ہے۔ جس میں کبھی فلمی تو کبھی ادبی لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ان محفلوں میں سنجیدہ بحثیں ہوتی ہیں۔ اور ہنسی مذاق بھی۔ وہ کسی فلمی پارٹی میں جانا پسند نہیں کرتے۔ اپنے گھر میں ہی کھانا پینا پسند کرتے ہیں۔ انہیں نان ویج (Non Veg.) پسند ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ زور نہیں دیتے۔ ان کا کہنا ہے کھانے کے لئے میری کوئی خاص ضد نہیں ہوتی۔ میری پتنی مالتی جوشی گجراتی ہیں۔ زیادہ تر میں ان کی پسند کا کھانا کھاتا ہوں۔ جب .Non Veg کا من کرتا ہے تو خود ہی بنالیتا ہوں۔ شامی کباب، سیخ کباب اور پراٹھا وہ (نداصاحب) چاؤ سے کھاتے، کھلاتے ہیں۔ لوگوں سے مسلسل ملتے رہنا نداصاحب کی عادت کا اہم حصہ ہے۔ وہ اپنی عمر کے ادیبوں کے علاوہ نئی عمر کے ادیبوں شاعروں سے بھی خود ملتے جلتے ہیں اور انہیں پڑھتے بھی ہیں۔ ان کے ساتھ ادب پر بحثیں کرتے ہیں۔ اپنے سے چھوٹی عمر کے ادیبوں سے وہ دوستانہ رشتہ رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہم پیالہ بھی ہوتے ہیں اور پھر انہیں اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی لذیذ کھچڑی بھی کھلاتے ہیں۔ نداصاحب کا کہنا ہے میرے آس پاس کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کا ادب سے تعلق ہے۔ لیکن وہ ملنے جلنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہ عادت اگر ادبی لوگوں میں آتی ہے تو میں اسے غلط بات مانتا ہوں۔ آپ لوگوں سے ملیں گے ان کی باتوں کو شیئر کریں گے تو اس سے آپ کے ذہن کی سوچ کا دائرہ بڑھتا ہے نئے خیالات کی کھڑکیاں کھلتی ہیں۔

ندافاضلی اکثر رستہ چلتے اجنبیوں سے باتیں کرنے لگتے ہیں اور ان پر جملے تراشتے ہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ ہے اپنے یا دوسروں کے کم عمر کے بچوں کے ساتھ باتیں کرنا یا ان کی مرضی کے مطابق انہیں

ٹافیاں یا چاکلیٹ دلانا ہے۔ وہ چلتے چلتے راستے میں کسی بھی چیز کو بحث کا موضوع بنا لیتے ہیں۔ وہ ڈال پر بیٹھی چڑیا ہو، یا سڑک پر چہل قدمی کرتی ہوئی گائے یا کوئی ٹیڑھی میڑھی سبزی۔ وہ پہلے اسے خود دیکھتے ہیں پھر دوسروں کو دکھا کر ہنساتے ہیں۔ بچے ان کی زندگی میں خوشبو کی طرح شامل ہیں۔ پہناوے میں کرتے پائجامے کو اولیت دیتے ہیں۔ ندا صاحب لگ بھگ ساری دنیا گھوم کر اپنے شعر سنا چکے ہیں مگر انہیں سب سے زیادہ پسند اگر کوئی جگہ ہے تو وہ ممبئی ہے کیونکہ اس ممبئی کی گلی کوچوں میں جدوجہد کرتے ہوئے آج وہ اس بڑے مقام تک پہنچے ہیں۔ [ہندی سے]

••

ندا کی باتیں...

(اپنے عزیز دوست کلاؤڈ ڈسلوا کی نذر)

● وقار قادری

ابھی اسکول کے دن ختم ہونے کو تھے، یعنی سن ۷۴-۷۵ کی آمد تھی، ایک دن مکتبہ جامعہ کے ماہنامہ ''کتاب نما'' میں ندا فاضلی کے مجموعۂ کلام ''لفظوں کا پل'' کا اشتہار دیکھا، اس اشتہار کے ساتھ 'صرف بالغوں کے لئے' بھی تحریر تھا۔ اشتہار کے ساتھ اس تحریر کو جڑا دیکھ کر، پڑھنے کا اشتیاق بڑھا، بالکل ایسا ہی جیسا اس عمر میں ''صرف بالغوں والی'' فلمیں دیکھنے کا ہوتا ہے۔ مکتبہ جامعہ ممبئی کو خط لکھا تو کتاب ''آؤٹ آف اسٹاک'' ہونے کا جواب آیا۔ داپولی میں یہ کتاب سوائے استاد محترم جناب بدیع الزماں خاور کے اور کہاں ملتی؟ ان سے دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوئی، اتفاق سے کچھ ماہ بعد جب میں خاور صاحب کے مکان پر گیا، یہ کتاب ان کی میز پر دکھائی دی، کتاب کے مطالعے کی دبی ہوئی خواہش نے زور مارا اور جھجکتے ہوئے استاد مرحوم کی آنکھ بچا کر وہ کتاب میرے ہاتھ میں تھی، سائیکل کا پائیدان اب تیز چلنے لگا تھا۔ گھر پہنچ کر کمرہ بند کر کے 'لفظوں کا پل' یوں دیکھنے لگا جیسے بالغوں کیلئے مخصوص باتصویر میگزین دیکھا جا رہا ہو۔ مگر یہ کیا اس میں تو ایسی کوئی بات نہ تھی جس کی میں توقع لئے ہوئے تھا، بہت شور سنتے تھے..... مگر یہاں تو سمجھ میں نہ آنے والی شاعری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ مجموعے کی ورق گردانی کر ڈالی، پر کچھ ہاتھ نہ آیا، نہ کوئی ایسا لفظ نہ ہی کوئی 'بالغوں' والی بات۔ کتاب جہاں سے اٹھائی تھی وہیں لے جا کر رکھ دی، استاد مرحوم کو کتاب کی ہیر پھیر کا علم ہی نہ ہو پایا۔ ندا صاحب کے کلام بلاغت نظام نے پہلی صحبت میں بڑا مایوس کیا تھا۔

کالج کے دنوں میں ان کا فن اپنی پرتیں کھولتا گیا،'' .....اس کا نہ کوئی گھر تھا، نہ شہر تھا اور نہ ہی رشتے دار، کاغذ پر نہ جانے لکیریں کب بدلی تھیں، لیکن بٹی ہوئی سرحدیں، اس پوری رات بجلی کے ایک کھمبے تک شہر کے ہر گھر کو آگ لگاتی پھر رہی تھی.....''تقسیم ملک کا کرب، جس نے بھوگا ہے، اس درد کو وہی جانتا ہے، دو قومی نظریئے کے نتائج اور اس کے مسائل کو تو ہم نصف صدی سے بھگت رہے ہیں، تقسیم کے مسائل سے ہمارا اردو ادب نہ صرف بھرا پڑا ہے بلکہ اس میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، یہ آگ بلا

تفریق مذہب، کئی گھروں کو اپنی چپیٹ میں لے گئی اور یہ ستم ظریفی ہے کہ آج بھی وقتاً فوقتاً لے جاتی رہتی ہے۔ کاش ہمیں یہ تقسیم کا عذاب نہ جھیلنا پڑتا۔ ندا صاحب کے ساتھ بھی وہی ہوا تھا، جسے انہوں نے فنکارانہ خوبصورتی کے ساتھ اپنے سوانحی ناول ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' میں پیش کیا ہے۔ یہاں بات ''لفظوں کا پل'' کی ہے وہ یوں رقم طراز ہیں:

''میں نے گلی میں گھستے ہوئے تو اپنے آپ کو دیکھا تھا، دروازہ کھٹکھٹانے تک بھی میں نے اپنے آپ کو دیکھا تھا، لیکن اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا، اٹیچی ہاتھ لئے جو سر جھکائے واپس آیا تھا، وہ میں نہیں تھا، کوئی اور تھا، مجھ جیسا ہی.... وہ بالکل اکیلا تھا۔''

ندا صاحب نے زندگی گزاری نہیں بلکہ جی ہے، انسانی قدروں کو پامال ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ جمیل فاطمہ کے اس لعل نے تقسیم کی لکیروں سے تقسیم نہ ہوکر یہیں زندگی گزارنے کی ٹھان لی تھی، اسی زندگی کے جینے کا حاصل ان کی تحریروں کا نکھار ہے۔ یوں تو میں نے ندا صاحب کو آسودگی کے دنوں میں دیکھا ہے۔ مگر یار دوست بتاتے ہیں کہ جھگی جھونپڑی میں قیام کے دنوں میں بھی انہیں وقت کو کاٹنے کے لئے مطالعے ہی میں مصروف پایا تھا۔ یعنی اپنے برے دنوں میں بھی انہوں مایوسی کو قریب پھٹکنے نہ دیا تھا، Struggle کی زندگی جی مگر دنیا کو کبھی برا نہ کہا۔

جتنی بری کہی جاتی ہے   اتنی بری نہیں ہے دنیا

اب وہ لطیفہ یاد آتا ہے کہ ندا صاحب کو سمجھنے کے لئے پختہ ذہن، مطالعے کا وسیع ہونا یا بالغ نظر ہونا کتنا ضروری تھا نہ کہ سن بلوغت کو پہنچنا۔ یہاں جسمانی نہیں ذہنی بلوغت درکار تھی۔ ندا زندگی جینے، دریا اور پہاڑ سے ٹکرانے، سانس ٹوٹنے تک جیئے جانے کی ہدایت دیتے ہیں۔

دریا ہو یا پہاڑ ہو ٹکرانا چاہئے   جب تک نہ سانس ٹوٹے جئے جانا چاہئے

''سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا'' کو فیشن پرستی، ابہام جمود یا نری جدیدیت کا نام دیا گیا۔ مگر وہ اپنا کام کرتے رہے اور یہ سفر اب بھی جاری ہے۔

اب جہاں بھی ہیں وہیں تک لکھو روداد سفر   ہم تو نکلے تھے کہیں اور ہی جانے کے لئے

''ملاقاتیں'' کے بعد ''چہرے'' لکھ کر انہوں نے ادبی البم میں مشاعرے کے شاعروں کی مانند بڑتی تصویروں کو محفوظ کر دیا ہے۔ نثری خدمات میں یہ بھی ان کا نا قابل فراموش کارنامہ ہے۔

ندا صاحب ہمارے عہد کے ان ممتاز شاعروں میں سے ہیں، جن کی تخلیقات نے بعد کی نسل کو

بے حد متاثر و متوجہ کیا ہے۔ ان کی شاعری سے اردو میں ایک نیا شعری محاورہ وجود میں آیا ہے۔ انہوں نے اس بھولی بسری لسانی وراثت (خسرو، میرا، کبیر، رحیم، سورداس، نظیر وغیرہ) سے رشتہ جوڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جسے لوگ بھول چکے تھے۔

ندا صاحب نے نہ صرف اس وراثت کی بازیافت کی ہے، اس وراثت میں موجودہ عہد کی لسانی ذہانت جوڑ کے اردو کے نثری ادب میں نئے امکانات کی نشاندہی کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں، مگر ان کے نثری اسلوب نے بھی اپنی ایک الگ راہ بنائی ہے۔ بقول وارث علوی ''تم (ندا) ان چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہو، جن کی شاعری اور نثر دونوں لوگوں کو رجھا گئے ہیں۔'' آج بے شک ندا اردو شعر و ادب کا اہم اور نمایاں نام بن کر ادبی دنیا پر چھا گئے ہیں۔

ندا صاحب کو ممبئی آ کر کچھ مشاعروں میں سنا تھا۔ اپنے اس پسندیدہ شاعر سے میری پہلی ملاقات، مکتبہ جامعہ، ممبئی میں ہوئی تھی، میں نے ان سے ہاتھ ملانا چاہا تھا، بجائے اس کے موصوف نے ریاست کے ایک باریش شیروانی پوش بزرگ شاعر سے مجھے متعارف کروایا تھا اور ان کی شعری عظمت کے گن گائے تھے، ممبئی کا بچہ بچہ ''ٹیر'' لینے یعنی کسی کا مذاق اڑانے کے انداز کو سمجھتا ہے، نہ جانے وہ کس کا مذاق اڑا رہے تھے، میرا یا اس بزرگ شاعر کا۔ بہر کیف مجھے ان سے یہ امید نہ تھی، میں اپنے پسندیدہ فنکار ندا سے ملنا چاہتا تھا، اپنے پسندیدہ شاعر سے مل کر پہلی ملاقات میں، مجھے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔

اردو اکادمی میں برسرِ روزگار ہونے پر سن ۸۷ یا ۸۸ء میں ظ صاحب (انصاری) نے رشین کلچر ہاؤس میں کسی روسی ادیب کی 'غالب پر تقریر' رکھی تھی، تب روس کے اچھے دن تھے، تقریب کے اختتام پر انہوں نے مخصوص احباب کی روسی ووڈکا سے ضیافت کروائی، کھانا بھی تھا۔ نا و نوش کے انتظام میں 'بلانوشوں' پر جب 'ناپ تول' کا کوٹا سسٹم عائد ہوا، تو حسب معمول وہ دوسرے ٹھکانوں کا رخ کر گئے، کہ تشنگی باقی نہ رہے۔ ندا صاحب ماہم موری روڈ کے لیما چائنیز میں آئے تھے، میرے دوست کلاؤڈ ڈسلوا، کو ندا صاحب کی مختلف فنکاروں نے گائی ہوئی غزلیں اور ان کے سارے فلمی گیت یاد ہیں۔ اسے ان کی باتیں اچھی لگتی ہیں، چھت پر آنکھیں ٹکائے، مسکراتے ہوئے، ان کا اندازِ تخاطب اسے بھاتا ہے، شاید یہی اردو زبان کی شیرینی ہے، جو غیر اردو دانوں کو باندھے رکھتی ہے۔ یہیں سے ندا صاحب سے کچھ قربت کا سلسلہ بنا تھا۔

ندا صاحب جب بولتے ہیں تو 'وہ کہیں اور سنا کرے کوئی' ساتھ اگر کوئی ایسا بندہ بھی ہو جس کی وہ

''چسکیوں'' کے ساتھ ''چٹکیاں'' بھی لے سکیں، تو پھر سونے پر سہاگہ۔ موڈ میں ہوں تو اپنے ہاتھ کی بنی کھچڑی یا گوشت کا سالن، بھرپیٹ۔ ممبئی کے Dry-Day میں ''سوکھا'' اور ''بندھ'' میں ''بھوکا'' ان کے حلقۂ اختیار میں کوئی نہیں سوسکتا، دراصل یہ عقدہ مجھ پر بعد میں کھلا کہ ندا صاحب جیسے کھلنڈرے اور ''تیر باز'' دکھائی دیتے ہیں ویسے ہیں نہیں۔ وہ ایک محنتی اور زمانہ شناس شاعر ہیں کہ بہت کم شاعر زمانہ شناس ہوتے ہیں، بقیہ اپنی تباہی کو فن کی معراج سمجھتے ہیں۔ یہ کیسی دانشمندی ہے؟ ندا کے ہاتھ کے کڑے کا، سونے کے بریسلیٹ میں بدل جانا محنت اور اسی زمانہ شناسی کا نتیجہ ہے، ''ٹین کی کھولی میں جو چاند سوتا تھا'' وہ محنت اور اپنے ٹیلنٹ کی بنیاد پر آج کھار اور اندھیری کے ہوادار فلیٹوں میں ہے، بزرگوں نے اسی لئے کہا ہے کہ محنت کرے انسان تو جو چاہے بن سکتا ہے۔ ندا صاحب آج جو ہیں شاید وہی بننا چاہتے ہوں۔

ان سے جب کچھ قربت ہوئی، انہیں ایک معصوم اور بے انتہا محنتی انسان پایا۔ یہ ان کے لئے ضروری بھی تھا، اور اب تو اس لئے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ بوہیمنی دن لد چکے، ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ اور ان کی ذمہ داریوں نے Bread & Butter کے انتظام کو ضروری بنایا ہے۔ آج وہ ممبئی کی ادبی دنیا کی ایک اہم شخصیت بن گئے ہیں، جس جلسے میں جائیں، اپنی تقریر سے سکہ جمادیں، سیکولرزم کا پیغام دے کر سیکولر و چار دھاراوالوں کا بوالاالا کروادیں۔ آج کے اس دور میں وہ سیکولرزم کی پتی علامت ہیں۔ سچ کہوں، کلاسیکی اور عالمی ادب کے گہرے مطالعے کی شخصیتوں کا اب اس شہر میں قحط ہی جانو، ایسے میں ان کی درازئ عمر کی دعا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ندا صاحب کے جب اچھے دن آئے تو انہوں نے اپنی ادبی برادری کے لوگوں کو الگ نہیں کیا، بلکہ ان کی ضرورتوں کو حتی المقدور پورا کرنے کی کوشش بھی کی ہے، بعض معاملات کا میں خود گواہ ہوں کہ انہوں نے کسی کو کبھی مایوس نہیں کیا۔ ہمارے ایک ادبی دوست کی یہ بات بھی شاید درست ہو کہ اس بات کی تشہیر کے جملہ حقوق بھی وہ اپنے پاس ہی محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر اس شہر میں...

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند　　کس کی حاجت روا کرے کوئی

ندا صاحب سفر کے آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کو سفر کے کٹنے کا احساس نہیں ہوتا۔ میں نے ان کے ساتھ کچھ سفر کئے ہیں، مشاعرے سے قبل یہ کوشش کرنی ہوتی ہے کہ شعراء کرام کہیں مشاعرے سے قبل ''بہک'' نہ جائیں، مگر آخر کہاں تک؟ وہ خود تو اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر کاربند رہتے ہیں مگر چاہتے ہوئے بھی دوسروں کے ساتھ ایسا نہیں ہو پاتا۔ وہی ہوتا ہے جو آپ نہیں چاہتے، یعنی خود ''ہٹ''

اور دوسرے ''پٹ'' جاتے ہیں۔

مشاعرے کے متعلق یہ بہت کمرشل واقع ہوئے ہیں۔ مگر سب کے ساتھ صرف کاروباری ہو کر بات نہیں کرتے، مجھے انہیں ایک مشاعرے میں اپنے علاقے داپولی (ضلع رتنا گیری) لے جانا تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا، پوسٹروں اور اشتہارات میں ان کے نام کی تشہیر ہوئی تھی، مجھے دھڑکا سا لگا ہوا تھا، آیا موصوف آئیں گے بھی یا نہیں، شکر ہے وہ آئے، اور بہت کم معاوضے پر آئے تھے۔

ایک واقعہ یوں ہے کہ شہر کی ایک سندھی تنظیم نے، موصوف کا ایک Talk تقسیم کے موقع پر این سی پی اے (نریمن پوائنٹ، ممبئی) میں رکھا تھا۔ اس تنظیم کی آرگنائزر خاتون سے میں نے ہی ندا صاحب کی ملاقات کروائی تھی۔ پروگرام کے وقت جب میں وہاں پہنچا موصوف ابھی آئے نہ تھے، ''سندھی'' برادری کے خواتین و مرد ندا صاحب کو سننے کے لئے جمع تھے، میں نے سوچا ٹریفک میں '' جام'' ہو گئے ہونگے۔ ان دنوں موبائل فون رائج نہ تھا۔ گھر فون کیا، موصوف کھار میں اپنے گھر پر ہی تھے، مزید ستم یہ کہ انہیں تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ اس پروگرام میں شریک ہونا ہے۔ آخر کار میں نے جا کر منتظمین سے ''سفید لفظوں میں'' ندا صاحب کے اچانک بیمار ہونے اور ان کے نہ آپانے کی بات کہی، اس کے بعد وہاں سے ایسا بھاگ کھڑا ہوا کہ....... وہ خاتون آج بھی جب کہیں دکھائی دیتی ہیں، میں مارے 'ندا-مت' کے اپنے آپ کو ان سے دور بھاگتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اس واقعے نے یہ سبق سکھایا کہ پھر کبھی ایسی ذمہ داری اپنے سر لینے کی جرأت نہ ہوئی۔

ندا صاحب نے اپنا ایک مکان کھار، اندھیری کے علاوہ میرا روڈ پر بھی بنوایا ہے۔ جو ان دنوں بے سہارا شاعروں اور کویوں کی دھرم شالہ کہلاتا ہے۔ ندا صاحب کبھی ادھر کا رخ بھی کر لیتے ہیں، پہلے یہ خود گاڑی چلاتے تھے، مگر سنا ہے کسی حادثے کے بعد انہوں نے اسے خیر باد کہہ دیا اب گاڑی چلانے کے لئے انہیں مالتی جی کو راضی کرنا پڑتا ہے۔ یا پھر یہ سفر بس میں طے کرنا پڑتا ہے۔

مسلسل میڈیا میں چھائے رہنے کی وجہ سے اب لوگ باگ ان کی صورت شکل کے شناسا ہو گئے ہیں۔ میرا روڈ پر ان کے آنے کی خبر تیزی سے پھیل جاتی ہے یا پھیلا دی جاتی ہے، پیاسوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے، 'شام کی دعوت' طویل ہوتی ہے۔ کچھ مخصوص مہمانوں کو انہوں نے مخصوص نام دے رکھے ہیں، ان میں کوئی 'فل بوٹ' تو کوئی 'روزنِ زنداں' ہے۔ ان مخصوص مہمانوں کی موجودگی میں نشست کا اختتام عموماً حسبِ معمول ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ مخصوص مہمان آئندہ نشست میں بھی سب سے پہلے

پہنچنے والوں میں ہوتے ہیں۔ ان مخصوص مہمانوں کی موجودگی میں سلام بن رزاق اور یعقوب راہی صاحبان دعوت میں شریک ہونے سے گریز کرتے ہیں۔ مگر ندا صاحب کا اصرار سلام اور راہی کے انکار یا کسی ''بہانے'' کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔

ندا صاحب کا حافظہ بلا کا ہے، کئی کلاسیکی اشعار انہیں ازبر ہیں، شعر سنا کر اس کی تشریح کرنا وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ جسے سن کر کچھ پانے کا احساس ہوتا ہے۔ اپنی بات لوگوں کے دل میں اتارنا وہ خوب جانتے ہیں۔ ندا صاحب کی مہمان نوازی بھی خوب ہوتی ہے، اپنے ہاتھوں سے بنی کھچڑی اور کبھی گوشت کھلا کر وہ بہت خوش ہوتے ہیں، بقول کسے اتنا خوش انہیں نظم یا شعر کی تعریف پر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ ان کے بنائے سالن میں عموماً مرچیں تیز ہوتی ہیں۔ جو سلام بھائی کی آنکھوں میں پانی لے آتی ہیں، سلام بھائی تیز مرچوں کے عادی نہیں ہیں، وہ اپنی صحت کا بڑا خیال رکھتے ہیں اسی کا حصہ ہے کہ وہ اپنا منرل واٹر بھی سب سے الگ رکھتے ہیں۔ ندا صاحب مغلوں سے مراٹھوں تک کے کھانوں میں مرچوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں، ایسے میں ایک شاعر حزب مخالف میں کھڑے ہو کر کوئی نکتہ ڈھونڈ لاتے ہیں، جس پر ندا صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ انہیں 'یوگا' کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ شب قریباً بارہ بجنے کو ہوتے ہیں دھیرے دھیرے اب سب جدا ہونے کو ہوتے ہیں۔

(یہ زندگی تو میرے کام میں نہیں آئی)
شراب پھیل گئی جام میں نہیں آئی

(ناتمام مضمون)

●●

ندؔا فاضلی ''کھویا ہوا سا کچھ'' کے پردے میں

● یوسف ناظم

شاعری کی خوبیاں، جنھیں اساتذہ کی زبان میں شعر کہا جاتا ہے ندؔا فاضلی کے یہاں نیا لباس پہن کر بہ افراط موجود ہیں۔ ان محاسن کی جڑیں تو اُن ہی خوبیوں سے جا کر ملتی ہیں جو کہ صنائع بدائع اور لفظ و نشتر وغیرہ کے اَدِق ناموں سے شاعری میں رائج تھیں۔ لیکن ندؔا نے کہ جو اپنی شناخت کے بارے میں بہت چوکنا رہتے ہیں' اُنہیں اپنے انداز سے برتا ہے۔

سادگی بجائے خود حسن ہے۔ معراجِ حُسن' جس میں دیہات کی سوندھی مٹی کی بوباس ہو ندؔا کے اشعار کی سجاوٹ ہے۔ یہی اس چھوٹی سج دھج کے شاعر کے حسنِ بیان کا نمایاں پہلو ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ وہ اچھے شاعر ہیں ندؔا کو اپنا چوتھا مجموعہ چھاپنے کی ضرورت نہیں تھی' لیکن اُن کے اسلوبی ارتقاء کی داستان اُن کے اسی مجموعہ ''کھویا ہوا سا کچھ'' میں ملتی ہے اور دل کو چھو لینے کی بات یہ ہے کہ اِس داستان میں زیبِ داستان قسم کی کوئی چیز نہیں ہے اور ندؔا نے جو کچھ بھی کھویا' اسی میں پایا ہے۔ شاعر کی متلاشی آنکھیں جستجو خیز، تگ و دو اور بولتی ہوئی فطری بے چینیاں ڈھونڈتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اگر سب کی سب نہیں تو ۸۰ رفی صد اب ان کی دسترس میں ہے۔ دیکھیے۔

کہیں چھت تھی، درو دیوار تھے کہیں، ملا مجھ کو گھر کا پتہ دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے 'مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

یہ نہ تھکاوٹ ہے نہ قناعت۔ لیکن طمانیت کی ایک ایسی پُرسکون اور خاموش کیفیت ہے جس کی خواہش ہر آدمی کو اور خاص طور پر ایسے آدمی کو جو فطرتاً اور مزاجاً شاعر ہو' ضرور ہوتی ہے۔ ندؔا فاضلی صوت و سکوت کو ہم آہنگ کرنا جانتے ہیں وہ حصار میں گھرے ہوئے غیر محرک اسباب کو پھیلانا اور متحرک بنانے کا گرُ ہی نہیں' پھیلے ہوئے سامان کو سمیٹنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ خواہ وہ سامان آسمان ہی کیوں نہ ہو۔

زمین دی ہے تو تھوڑا سا آسمان بھی دے
میرے خدا! میرے ہونے کا کچھ گمان بھی دے

یہ کائنات کا پھیلاؤ تو بہت کم ہے
جہاں سما سکے تنہائی وہ مکان بھی دے

دوسرا شعر پڑھ کر قاری ایک لمحے کے لئے چونک جائے کہ شاعر نے مانگا کیا ہے اور اسی مکان میں شاعر ایک ایسا گوشہ بھی چاہتا ہے جس میں ایک چھوٹی سی دیوارِ گریہ بھی ہو۔

گھر کی تعمیر چاہے جیسی ہو
اس میں رونے کی کچھ جگہ رکھنا

اس دھرتی پر کون ہے جو روتا اور کچھ کھوتا نہیں، لیکن ندؔا جانتے ہیں کہ اچھی غزل کچھ کھونے اور کچھ رونے ہی کی دین ہوتی ہے۔

اس دھرتی پر آکر سب کا اپنا کچھ کھو جاتا ہے
کچھ روتے ہیں کچھ اس غم سے اپنی غزل سجاتے ہیں

کھونے کی یہ بات ندؔا کے یہاں چاہت کی حدوں کو چھوتی ہے ہر بار اُن سے کچھ نہ کچھ کہلواتی ہے۔ مثلاً:

صدیوں صدیوں وہی تماشہ ، رستہ رستہ لمبی کھوج
لیکن جب ہم مل جاتے ہیں کھوجاتا ہے جانے کون

وہ میری پرچھائیں ہے اور میں اُس کا آئینہ ہوں
میرے ہی گھر میں رہتا ہے مجھ جیسا ہی جانے کون

ندؔا اگر یہ سمجھتے ہیں کہ شعر کو شاعر کی شناخت بننے میں دیر ہوتی ہے تو یہ صرف اُن کا شبہ ہے۔ شاعری کے سفر میں تو کئی موڑ آتے ہیں کہیں کچھ دیر اور کچھ دُور چل کر لوٹنا یا راستہ بدلنا پڑتا ہے۔ ندؔا نے صرف خوش رنگ پھلوں اور مہکتے پھولوں سے واسطہ نہیں رکھا' یہ بھی جانا ہے کہ یہ شاداب پھل اور آنکھوں کو تراوٹ بخشنے والے پھول یوں ہی نہیں پیدا ہو گئے ہیں۔ اُن کی تخم ریزی کب اور کیسے ہوئی اور اُن کی آبیاری کے لئے کتنے جتن کرنے پڑے ہوں گے یہ سب جاننے اور دیکھنے کے لئے اُن کی بینائی صرف بصری نہیں دل کی دھڑکن بھی بن گئی۔

صرف آنکھوں ہی سے دُنیا نہیں دیکھی جاتی
دل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

وہ کتابوں کی بے حرمتی تو نہیں کرتے لیکن کہتے ہیں۔

زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

(کتابی علم کے بوجھ تلے کتنے لوگ ملبہ بن جاتے ہیں)

ندا نے شاعری کو بھی اسی طرح دیکھا، برتا اور روایت سے رشتہ جوڑے رکھا۔ اقدار کی بدلتی رُتوں میں نہاتے، دھوتے روایت اور بغاوت کے درمیان ''لفظوں کا پل'' تیار کی۔ طاؤسی رنگوں میں لپٹے ہوئے لفظ چنے (اسے شاید لفظیات کہتے ہیں) جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھے۔ کچھ کھویا لیکن اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کبھی کوفت کا ذائقہ بھی چکھا اور کہا جو بیت گیا ہے وہ گذر کیوں نہیں جاتا۔ اونچی اُڑان بھی اُڑے لیکن زمین کی مضبوط ڈور اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی ورنہ وہ یہ نہیں کہتے۔

چمکتے چاند ستاروں کا کیا بھروسہ

زمین کی دھول بھی اپنی اُڑان میں رکھنا

اس احساس کے باوجود کہ

آنکھوں دیکھی کہنے والے پہلے بھی کم کم ہی تھے

اب تو سب ہی لکھی لکھائی باتوں کو دہراتے ہیں

نیا اور بالکل نیا کہنے کی مستقل اور مسلسل روش بھی اُن کے یہاں کلاسیکی رچاؤ لئے ہوئے ہے۔ ترقی پسندی سے الگ اور بہت الگ رہ کر بھی وہ اس اندازِ شاعری کے قریب سے ہو کر گذرے ہیں جس سے فیض پہچانے جاتے ہیں۔ اِس اندازِ شاعری کے گہرے رنگ تو اُن کے یہاں نہیں ہیں لیکن اُس کی چھینٹ تو کہیں کہیں پڑتی ہی ہے۔ فیض نے بالراست کہا تھا۔

تازہ ہے ابھی یاد میں اے ساقیِ گلِ خام

وہ عکسِ رُخِ یار سے مہکے ہوئے ایام

ندا نے ذراہٹ کے کہا ہے۔

اب بھی یوں ملتے ہیں ہم سے پھول چنبیلی کے

جیسے اُن سے اپنا کوئی رشتہ لگتا ہے

ندا کسی بھی تجربے سے گھبراتے نہیں ہیں۔ اُنھیں چونکہ شعری زبان کا سہارا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دیہی البیلے پن کا اُنھیں اچھا سلیقہ ہے اس لئے وہ گاؤں کا کچا راستہ ہو یا شہر کی شاہ راہ ہر رہ گذر سے

کسی اجنبی کی طرح ٹھنک ٹھنک کر نہیں بلکہ یوں بے تکلف اور بلا تامل گذر جاتے ہیں جیسے یہ سارے راستے اُن کے آزمائے ہوئے ہیں۔ یہ بات میں اِس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ ندا نے اپنے دوہوں میں بھی اس نہج اور سج دھج کو برقرار رکھا ہے جو اُن کی غزلوں اور نظموں میں رچ بس گئی ہے۔

ندا اصل میں اپنے سامع یا قاری کو للکارتے یا جھنجھوڑتے نہیں پچکارتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دو بات کر رہے ہوں۔ اُن کی یہی اپنائیت، شاعرانہ ملن ساری اور ذہنی قربت اُن کی کامیابی بھی ہے اور وجہ مسرت بھی۔ چند دوہے دیکھئے۔

سودا لینے ہاٹ میں کیسی جائے نار
چاقو لے کے ہاتھ میں بیٹھا ہے بازار

اور اب تو یہ گھر گرہستی والی لڑکی اپنے میکے والوں کو خیریت کی چٹھی بھی نہیں بھیج سکتی۔ ڈاک کے خرچ میں شاعرانہ اضافے کے بعد تو اُس کا شوہر خط لکھنے کی شاید ہی اجازت دے۔

سنا ہے اپنے گاؤں میں رہا نہ اب وہ نیم
جس کے آگے ماند تھے سارے وید حکیم

ہم سمجھتے ہیں ندا فاضلی صرف چنبیلی کے پھولوں کو یاد کرتے ہیں ایسا نہیں ہے۔ نیم کے درخت کی پتیاں اور نمولیاں بھی اُن کے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ہیں۔ فلورائڈ میں بسے ٹوتھ پیسٹ کی عادت تو شہروں کی بدعت ہے ورنہ مسواک کے لوگ کہاں خوشبودار عرق کے غرارے کرتے ہیں۔ ایک اور دوہا دیکھئے۔

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دُکھ نے دُکھ سے بات کی بن چٹھی بن تار

یہاں فیض کا ایک شعر یاد آ گیا۔

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ، ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

ندا کے دوہے اور فیض کے شعر میں کیفیت ایک ہی ہے ماحول الگ ہے۔ ایک یاد میں گاؤں بول رہا ہے اور ایک یاد میں صحبتِ یاراں اور انجمنِ گل۔ ندا نے گاؤں کو استعارہ بنا لیا ہے۔ وہ شہر بمبئی کے باشندے نہ بنتے تو وہ کیسے کہہ سکتے تھے۔

گھر کو کھوجیں رات دن گھر سے نکلے پاؤں
وہ رستہ ہی کھو گیا جس رستے تھا گاؤں

اور ندا کو گاؤں کا بوڑھا پیپل بھی یاد آتا ہے تو اُس کی چھاؤں سمیٹ لیتے ہیں۔

بوڑھا پیپل گھاٹ کا ' بتیائے دن رات
جو بھی گذرے پاس سے سر پر رکھ دے ہات

یہی نہیں ندا کو گاؤں کی الھڑ لڑکی کی موتیا اور بیلے کے پھولوں سے مہکی یاد یہ کہنے پر اُکساتی ہے

چڑیوں کو چہکار دے ، گیتوں کو دے بول
سورج بن آکاش ہے ، گوری گھونگھٹ کھول

گھونگھٹ کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی چمکیلی غزلیں، کچھ لچکیلے گیت، سوچ میں ڈوبی ہوئی نظمیں اور کانوں میں رس گھولنے والے دوہے۔ اگر یہ سب کچھ اِس مجموعے میں موجود ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے ''کھویا ہوا سا کچھ'' کسے کہا ہے۔ اِس سوال کا جواب ندا شاید اپنے پانچویں مجموعے میں دیں گے۔ اُن کے پاس کہنے کے لئے اب بھی بہت کچھ ہے۔ کتاب بہت خوب صورت چھپی ہے۔ سر ورق پر رنگ بکھرے نہیں، برسے ہیں۔ معیار پبلی کیشنز، دہلی نے یہ مجموعہ واقعی دل لگا کر چھاپا ہے۔ قیمت ۱۰۰ روپے ہے اور میں تو سمجھتا ہوں' یہ صرف سرورق کی قیمت ہوئی۔ شعر کی قدر و قیمت سے اِس کا تعلق نہیں۔ ندا تو نقصان ہی میں رہے۔

●●

دو کتابیں..........ایک کہانی

• قیصر تمکین

ندا فاضلی اُردو کے ایک خوشگوار شاعر ہیں۔ لگ بھگ نصف صدی سے مشق سخن میں مصروف ہیں اور اعتبار اُن کا جدید اور روایتی دونوں شعر دبستانوں میں مدت سے قائم ہے۔ فلمی دُنیا سے متعلق ہونے کی وجہ سے ندا صاحب آج کل عوام میں بہت اچھی طرح جانے پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے بھی مجروح کی طرح نہ تو اپنی فلمی شاعری کو ذریعۂ عزت خیال کیا اور نہ اس مقبولیت سے بے جا فائدہ اُٹھا کر تنقیدی حلقوں میں اپنی اہمیت اور عظمت کو جتانے کی کوشش کی۔ ''دیواروں کے بیچ'' اور دیواروں کے باہر'' کے نام سے اُنھوں نے اصل میں دو جلدوں میں ناول نما خودنوشت مرتب کی ہے اور اس طرح خودکو ادبی حلقوں میں ایک اہم نثر نگار کی حیثیت سے بھی منوایا ہے۔

مذکورہ خودنوشت کی دونوں جلدوں میں ندا نے واحد متکلم کا استعمال نہیں کیا ہے۔ ناواقف قاری یہ فرض کرسکتا ہے کہ ندا فاضلی نامی ایک شخص کی جیون کہانی کوئی غیر متعلق ادیب لکھ رہا ہے۔ یہ بات ان معنوں میں بہت اہم ہے کہ پورے بیانیے میں کہیں بھی میں کی جلوہ فرمائی نہیں ہے اور سوانح نگار بھی بہت خوش اسلوبی کے ساتھ ایک نازک مرحلے سے گذر گیا ہے۔ اُردو ہی نہیں دوسری زبانوں میں بھی عام طور پر خودنوشت رقم کرنے والوں نے اپنی کہانی کے بہانے ''شاہنامہ'' قسم کے دفاتر مرتب فرمائے ہیں۔ انگریزی کے ایک مرحوم صحافی نے (Indian from Curzon to Nehru and After) نامی آتم کتھا میں ذاتی عظمت، اہمیت کے وہ ڈھول تاشے بجائے ہیں کہ پڑھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں کوئی بھی اہم موڑ یا واقعہ مصنف کی خلاف مرضی ظہور پذیر نہ ہوسکا اور تمام تاریخ ساز واقعات کی داستان صحافی مذکور کی بیدار مغزی اور ژرف نگاہی سے ہی عبارت رہی ہے اور مزید یہ کہ گاندھی اور نہرو تو طفلِ مکتب تھے ورنہ اگر مصنف نہ ہوتا تو ہندوستان آج تک آزاد نہ ہو پاتا۔

لگ بھگ اِسی طرح کی خودنوشت حضرت شان الحق حقی نے بھی مرتب فرمائی ہے جو کئی صدیوں اور قرنوں تک ''افکار''، کراچی میں شائع ہوتی رہی۔ (معلوم نہیں ''افکار'' کو کس جبر یا مروّت کی بناء پر یہ ہنومان چالیسہ برداشت کرنا پڑا)۔ اِس داستانِ ناتمام کے بیشتر قاری اگر یہ سمجھ بیٹھے کہ عرفی وفائی کے

اُستاد یا میر و مرزا کو اُردو ابجد سے متعارف کرانے والے یا ارسطو کو ....کی ترتیب کے وقت اور افلاطون کو مکالمات رقم کرنے کی منزل میں اصل رہنما حضرت تقی ہی تھے تو انھیں موردِ الزام قرار دینا مشکل ہوگا۔ اسی طرح جوش، قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، ادا جعفری یا کشور ناہید کے شاہنامے بھی ہیں۔ ذاتی نوبت نگاڑے اور ہچو من دیگرے نیست کی دھوم دھام کے اس نقار خانے میں ندا فاضلی کا بلا کم و کاست اپنے ماحول کے بارے میں حقیقت پسندانہ رویہ انتہائی خوش آئند طرز نگارش کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔

ندا فاضلی کی زندگی برصغیر کے عام متوسط طبقے کے ادیبوں اور شاعروں کی زندگیوں سے کچھ بہت مختلف نہیں رہی ہے۔ گوالیار، بھوپال اور ممبئی وغیرہ میں زندگی کا ابتدائی دور گذارتے ہوئے وہ جن مشکلوں اور تکلیفوں سے دو چار ہوئے وہ بھی غیر معمولی نہیں ہیں۔ انیس بیس کے فرق سے برصغیر کے تقریباً تمام ادب دوستوں کی زندگی اسی طرح گذری ہے۔ بقول فیض کے۔ ''اِس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے وہ گذری''، کم و بیش سبھی اہلِ جنوں نے قلم سے رشتہ جوڑ کر وہی دُکھ سُکھ جھیلے جو اُردو ہی نہیں بلکہ تقریباً ہر زبان، ہر ملک اور ہر دور کے لکھنے والوں کا مقدر رہے ہیں۔

ندا فاضلی کی اہمیت اور انفرادیت یہ ہے کہ اُنھوں نے کہیں بھی خود کو بے مثال عبقری صلاحیتوں کا حامل قرار نہیں دیا ہے۔ کہیں بھی سچ مصلوب کا روپ دھارنے کی کوشش نہیں کی ہے اور نہ ہی اُنھوں نے کہیں سقراطِ وقت یا شہدائے مظلوم کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اُنھوں نے بعض بہت ہی تکلیف دہ حوادث بھی سہے۔ والدہ سے آخر وقت نہ مل سکنے کا ذِکر اُنھوں نے ایک خاص رواداری میں کیا ہے اور گو کہ وہ اِس المیے پر ماتم کناں نہیں ہیں مگر حساس قاری اُن کے ذاتی درد تک بہ آسانی رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

کمال ندا کا یہ ہے کہ احباب و اغیار کے تذکرے کرتے ہوئے اُنھوں نے نہ تو بے جا خوشامد پسندی، مصلحت بینی اور عاقبت اندیشی سے کام لیا ہے اور نہ کہیں اپنی تحریر میں کسی عصبیت یا تلخی کو جگہ دی ہے۔ چنانچہ جن اصحاب کے ہاتھوں اُنھیں مشکلیں جھیلنی پڑی ہیں' اُن کا بھی ذِکر معروضی انداز میں کرنے کے بجائے یہ کام اُنھوں نے حقیقت پسندی سے لیا ہے۔ چونکہ اِس حقیقت پسندی کی راہ میں اُنھیں کوئی خوف، آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا نہ تھا' اِس لئے ساحر، بیدی، جاں نثار اختر اور کرشن چندر وغیرہ کے بارے میں شگفتہ لہجے میں مگر بہت ہی بلیغ جملوں میں تلخ و ترش بھی بیان کر گئے ہیں۔ یہ تو ہمیں پوری بات پڑھنے کے

بعد ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک منفرد و غیر جانبداری کا حامل یہ ادیب کس طرح سادہ انداز میں بہت گہری باتیں کہہ گیا ہے۔ مثلاً: کرشن چندر کے بارے میں یہ جملہ کہ "وہ پڑھتے بہت ہیں اور اس کے نتیجے میں دوسروں کی بے خبری سے فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں۔" بہت ہی معنی خیز ہے۔ کرشن چندر کے بارے میں یہ جملہ پڑھتے وقت راشد کے مجموعہ "ماوراء" پر اُن کا پیش لفظ بھی ذہن میں رکھئے۔ کرشن چندر نے یہ پیش لفظ ایک انگریزی مضمون سے ترجمہ کر دیا تھا۔ حقیقتِ حال کا علم جب راشد کو ہوا تو اُنھوں نے بعد کے ایڈیشنوں سے کرشن چندر کا ترجمائیہ (اسے بھی مزاحیہ اور انشائیہ کی طرح ایک صنفِ نگارش ہی خیال فرمائیے) نکال دیا۔

کمال امروہی کے دربارِ گہربار کا ذکر بھی ندا نے خاصے بصارت آموز الفاظ میں کیا ہے اور اس میں انتہائی عبرتناک سریندر پرکاش کا حال ہے جو کمال امروہی کے حضور "ٹی بوائے" (چھوکرا چائے لانا) کا کردار کرتے نظر آتے ہیں۔ (یا اولی الابصار) اپنی جانبداری اور شگفتگیٔ تحریر کی لاج رکھتے ہوئے ندا نے باقر مہدی کے ذکر میں راجہ مہدی علی خاں کے ایک مشہور شعر کا حوالہ اُنھیں دیا ہے۔ حالانکہ مرحوم مہدی علی خاں نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں وہ شعر کہا تھا کہ باقر مہدی کی پوری شخصیت کا عطر نکال کر رکھ دیا تھا۔

اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی اہمیت اور اُس کے احسان کو نہ ماننا اب تو شاید رجعت پسند ادیبوں اور مذہبی تشدد پسندوں کے لئے بھی ممکن نہ ہو لیکن بعض نمایاں ترقی پسندوں کی ریاکاریوں اور سماجی و تہذیبی اعتبار سے اُن کے قابلِ گرفت ان کار و کردار ہر تا حال تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اِس ضمن میں جعلی ترقی پسندی کی ایک ترکیب استعمال کی تھی۔ ندا نے اپنے سادہ اور پُر اثر لفظوں میں جعلی ترقی پسندوں کی طرف چونکا دینے والے خفیف اشارے ضرور کیے ہیں۔ (مثال کے لئے ملاحظہ ہو' ساحر کے دربار اور اُن کے مجبور مصاحبوں کا تذکرہ) "چونکہ ترقی پسند تحریک اور تنظیم کے گمراہ کن رجحانات کا تفصیلی تذکرہ یا تنقید ندا کے دائرۂ تحریر سے باہر ہے اور یہ موضوع بجائے خود ایک اہم کتاب کا متقاضی ہے۔ اِس لئے خواہش ہوتی ہے کہ کاش کوئی اور ندا ہی کی طرح کا "محرمِ رازِ درونِ میخانہ" اِس طرف مخلصانہ توجہ کر سکتا ہے۔ بات جو اس ضمن میں کھٹکتی ہے وہ یہ کہ ندا کو شاید مجنوں گورکھپوری اور مجاز سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا' ورنہ وہ ترقی پسند تحریک کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کے ذرا اور دلچسپ واقفیت کا اظہار کرتے۔

''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' میں جگہ جگہ ندا نے اپنی نظمیں بھی ٹانک دی ہیں۔ یہ طریقۂ کار (Modus Operandi) شان الحق حقی قسم کے جارحانہ نرگسیت کے مارے ہوؤں کے لئے تو مناسب ہے مگر ندا جیسے متین وخوددار ادیب کی تحریر میں اس طرح کی پیوند کاری بہت سے صاحبان نظر کے خیال میں عیب کی حدود کی طرف بڑھتی سمجھی جاسکتی ہے۔ دوسری وجہ ''دیواروں کے باہر'' کا اختتام ''جاری'' کے لفظ پر ہوا ہے گویا ندا اپنے قارئین کو مطلع کررہے ہیں کہ اُن کی زندگی کے بہت سے نشیب وفراز اور بھی ہیں جن کا ذکر کسی نئی جلد میں ہوگا۔ اس تاثر کے تحت حتمی طور پر زیر نظر کتابوں پر کوئی قلم لگانا مشکل ہے۔ لیکن یہ کہنا پھر بھی آسان ہے کہ ندا نے ذاتی نشیب وفراز کے تذکرے کرنے کی آڑ میں ایک اہم دور کی سماجی وادبی تاریخ کا منظرنامہ مرتب کردیا ہے۔ جن حضرات کو ہندوستان کی آزادی کے بعد کے ہندی اور اُردو ادیبوں کی تالیف طلب یا ارتداد سے دلچسپی ہو وہ اِن کتابوں کے ذریعہ گذشتہ نصف صدی کے اُن حدوث واستمرار سے بہت اچھی واقفیت حاصل کرسکتے ہیں۔ جنھوں نے ادب کو رابطۂ عامہ اور ادیبوں کو مصالح وقت کا پابند بنا کر رکھ دیا۔

●●

چہرے ——— ایک قدِ آدم آئینہ

● زبیر رضوی

انسانی آبادیوں میں باہمی ربط و تعلق کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ انسان کی شخصیت سکّے کے دو پہلوؤں کی طرح ظاہر و باطن کے دو الگ الگ منطقوں میں بٹی رہتی ہے۔ سماجی زندگی میں انسان زیادہ تر اپنے حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اُس کے ظاہر میں اُس کا چہرہ، اُس کے خدوخال اور اُس کے سراپے کی تمہید بھی بنتے ہیں اور تفصیل بھی۔

اور اسی تمہید اور تفصیل کی بناء پر ہم کہتے ہیں ''ہاں میں اسے جانتا ہوں'' یہ ہاں اسی طرح کا ہے جب کسی کے حال پوچھنے پر ہم برجستہ کہہ دیتے ہیں۔ ''جی، میں بہت اچھا ہوں'' واقعہ یہ ہے کہ کسی کی شخصیت یا اس کی ساری ذات کو جاننے کا دعویٰ کرنا محض اپنے سرسری مشاہدے کو اعتبار بخشنے کی ایک کوشش ہے جسے خوش فہمی ہی کہا جاسکتا ہے۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے آدھے ادھورے ملتے ہیں کیونکہ ہر شخص اپنے ظاہر کے ساتھ اپنے باطن میں بھی جیتا رہتا ہے۔ وہ فطرتاً اپنا سارا کچھا اپنے ظاہر کے سپرد نہیں کرتا وہ اپنی ذات کے باطن تک لے جانے والے خفیہ راستوں کا پتا ہر کسی کو نہیں بتاتا' اپنے باطن میں جھانکنے کی اجازت تو وہ خود کو بھی نہیں دیتا۔ شاید اسی لئے بہت سے سراپا نگار شخصیت کے بھیتر دبی چنگاری کو کُریدنے میں اُنگلیاں جلالیتے ہیں۔ نہ سراپا ٹھیک سے بن پاتا ہے اور نہ ہی شخص کے باطن کی کھوج ہی ہو پاتی ہے۔ تو پھر سراپا نگار کیا کرے۔ وہی کرے جو شاعر ندا فاضلی نے اپنی نئی کتاب ''چہرے'' میں کیا ہے۔ ندا فاضلی نے پورے ہوم ورک کے ساتھ یہ چہرے بنائے ہیں' سنوارے ہیں اور پھر اُن کے سامنے اپنی شفاف اور تابندہ نثر کا قدِ آدم آئینہ رکھ دیا ہے۔ آپ دیکھیں تو پورا سراپا سر سے پیر تک کھل اُٹھتا ہے، بولنے لگتا ہے۔ منٹو نے اپنی کہانیوں کے لئے بدنام بستیوں کو چنا تھا اور انہی بدنام بستیوں کے کرداروں نے اس کی کہانیوں کو لازوال کردیا۔ ندا فاضلی بھی ''چہرے'' کے لئے ایک ایسے ثقافتی گلیارے میں اپنے قاری کو لے جاتے ہیں' جسے ''مشاعرہ'' کہتے ہیں۔ ہماری تہذیبی زندگی کا ایک ایسا تجوبہ جسے ادب کی سنجیدگی نے کبھی درِ خورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ادب کے سنجیدہ طالب علم کے لئے ''چہرے'' کے سارے تیئس سراپے غیر اہم

ہوسکتے ہیں لیکن غیر دلچسپ نہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ مشاعرے کی داد و تحسین میں پل کر جوان وشاداب ہونے والے بالآخر اسی خاک کا پیوند ہو جاتے ہیں ۔اُن کے چہرے، اُن کی شاعری اور اُن سے وابستہ شہرتیں اور داد و تحسین کے غُل غپاڑے سب فراموشی کی گرد میں حافظوں سے محو ہو جاتے ہیں ۔تو کیا ہماری کتاب یا ہمارا رسالہ مشاعروں میں کامیابیوں اور سربلندیوں کے تاج پہننے والے اِس تئیں کرداروں کے ذکر سے گریزاں رہے؟

اس کا جواب ''نہیں'' ہوگا کہ جس زمانے میں ندا فاضلی کے یہ کردار مشاعرہ پڑھ رہے تھے، داد سمیٹ رہے تھے' اُس وقت اُسی مشاعرے میں جگر، جوش، فراق، سردار جعفری، مجاز، ساحر، کیفی، نشور واحدی، روش صدیقی، ساغر نظامی بھی کلام سنا رہے تھے۔ادبی پہچان رکھنے والے ان شاعروں کے سراپے تو مشاعرے اور مشاعرے سے آگے یعنی ادب میں بھی خدوخال' جناب، صاحب'، 'گنجے فرشتے' کے عنوانوں سے گفتگو اور تحریر کا موضوع بنتے رہتے تھے' لیکن وہ جو خالص مشاعرے کے اسٹیج پر اپنی پھڑک دار شاعری سے اپنا بَت بناتے رہے تھے ان کی یادوں کو محفوظ رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی گئی کہ وہ بھی ہماری مشاعرے والی ثقافتی زندگی کا اسی طرح ایک ناقابلِ فراموش حصہ تھے' جس طرح کل کے گاؤں گاؤں نوٹنکی کرنے والے ہمارے آج کے ترقی یافتہ تھیٹر کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ندا فاضلی نے ان سارے سراپوں میں التزام یہ رکھا ہے کہ ان ''مشاعرے کے شاعروں'' کے حوالے سے وہ حاشیے پر اُس عہد کی سخن شناسی، سخن فہمی اور عوامی زندگی میں شاعرانہ زبان کے ذریعہ برپا ہونے والی رونقوں اور قیامتوں کی رُوداد بھی لکھتے جاتے ہیں۔

ندا فاضلی نے ''مشاعرہ'' اور اُس کے ''مقبول شاعروں'' کی سراپا نگاری کو اس لئے بھی اپنی اس تازہ نثری پروجیکٹ کا حصہ بنایا کہ وہ خود بھی شروع میں یعنی آزادی کے بعد کے برسوں میں اپنے والد دُعا ڈبائیوی کی معیت میں مشاعرے کی چہل پہل اور اس کی دھنک رنگ رونقوں کے شاہد رہے اور پھر کچھ برسوں بعد خود بھی مشاعرے کے اسٹیج کا حصہ بن گئے۔ندا کے شعری مزاج کا پسند، ناپسند کا اپنا ہی معیار اور پیمانہ ہے۔وہ خود ایک اہم شاعر ہیں اور ادب سے وابستگی اُن کے خون میں شامل ہے۔ان کا ذوق صاف ستھرا ہے وہ ادب کے بے تکلف اور بے محابا قاری ہیں۔اس لئے اُن کے ان سراپوں کو بے توجہی سے نہیں پڑھا جاسکتا۔''جی خوش ہوا ہے راہ پُر خار کو دیکھ کر'' والے جذبے کے تحت ہی ان سراپوں نے ندا کے طرزِ تحریر کو اپنی طرف للچایا کہ ندا مزاجاً ایسے سراپوں کے دلدادہ ہیں اور کوئی ہمارے درمیان ایسا بھی تو ہو جو یہ

کہہ کے ذرّوں کو آفتاب بنادے۔

آنکھیں ہوں تو وہ کون سا ذرّہ ہے جو اے دوست!
خود اپنی جگہ انجمنِ ناز نہیں ہے

نداؔ نے ''چہرے'' میں ان کرداروں کے ''انجمنِ ناز'' ہونے کی ایسی کامیاب اور شگفتہ مُرقّع سازی کی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ''مشاعروں کے شاعروں'' کے تئیں نداؔ کے دِل میں ایک ایسی انسانی ہمدردی ہے جو کہیں بھی کسی کردار کے کپڑے نہیں اُتارتی، اُسے بدنام نہیں کرتی، کچوکے نہیں لگاتی اور اس کا پُر زور قہقہوں سے مذاق نہیں اُڑاتی۔ اُن کرداروں کی سراپا سازی کرتے ہوئے اُن کا رویّہ اس کارٹونسٹ کا سا ہے جو اپنی محبوب اور پسندیدہ شخصیت کو کارٹون میں ڈھالتے ہوئے ایک عجیب سی سرخوشی میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ پہلے خود ہر سراپے سے کھیلتے ہیں، اُس کے ساتھ ہنستے بولتے ہیں اور پھر اُسے قاری کے حوالے کر کے دُور کھڑے ہو کے پوچھتے ہیں۔ ''کہیے جناب! انور صابری اچھے لگے؟، دِلؔ لکھنوی پسند آئے؟، صابر دت نے اپنے پائپ کا دھواں آپ پر پھینکا؟ خمارا اپنے کھلے بٹن کی شیروانی اور چوڑے پانچوں والے پاجامے میں کیسے لگے؟

شاعر اچھا ہے یا برا، گھٹیا ہے یا بڑھیا' اس کے لئے نداؔ فضا ضرور بناتے ہیں لیکن فیصلہ سراپا پڑھنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں! ہر سراپے کو مختلف انداز سے شروع کرتے ہیں۔ مثلاً خمار، شفا اور انور صابری کے سراپوں کا آغاز بے حد دلچسپ واقعوں کے ساتھ بیان ہوتا ہے۔ نداؔ سراپے کو قاری کے لئے زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے ہر طرح کا مسالہ حسبِ ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ چہرے میں مشاعرے کے اسٹیج کو ایک مستقل Location کی حیثیت حاصل ہے۔ سب سے پہلے سب شاعر یہیں آتے ہیں؟ کیسے آتے ہیں' اسٹیج پر کس طرح بیٹھتے ہیں، شعر کس طرح سناتے ہیں اور کس طرح مشاعرے کو زیر و زبر کرتے ہیں۔ معاصرین کے ساتھ ان کی چھیڑ چھاڑ' اپنے ماحول میں یعنی شہر، بستی میں بطور شاعر ان کا Image، لباس، پہناوا، اُن کی شاعری، اِکہری یا دوہری، اُن کے شعری محاسن، ان کے سماجی مشغلے اور اُن کے بہترین اشعار، ان سب جزئیات کے بیان سے ہر شاعر کا سراپا مرتب ہوتا ہے۔ اسٹیج پر شاعر کی آمد سے اُس کے واپس اپنی نشست پر جا کر بیٹھنے تک نداؔ کی کیمرہ جینک Camera Genic آنکھ اِس قدر ''ہو بہو'' سراپا نگاری کرتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ نداؔ ہر سراپے کو بڑے انوکھے پن سے سجاتے اور سنوارتے ہیں' کہیں یکسانیت یا مشاہدے کے کمزور پڑ جانے کا احساس نہیں ہوتا۔ سراپے کے بیان میں

ندا شگفتگی اور برجستگی کے رنگوں کو بڑی بے ساختگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ان کا حافظہ انہیں ہر بات چمکا کے دیتا ہے اور حافظے کی اسی چمک دمک کو وہ جب اپنی خلّاق اور شگفتہ اور شریر نثر میں ڈھالتے ہیں تو اُن کی سراپا نگاری ادبی بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ وہ ہر شاعر کے پڑھنے کے انداز کو کیمرے کی آنکھوں سے ایسی جزئیات اور منفرد لفظیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ شاعر کی ہر ادا، ہر انداز مجسم ہو جاتا ہے۔ کچھ نمونے دیکھئے:

☆ نوح صاحب بیٹھ کر پڑھتے تھے' آواز زیادہ بھاری نہ تھی لیکن ہاتھوں کے اشاروں، آنکھوں کے گھماؤ کے ساتھ مصرعوں کو مناسب جگہوں پر ٹھہرا کر آگے بڑھاتے تھے۔ ردیف قافیہ بولتے ہوئے ہوتے تھے۔ دوسرا مصرعہ آدھا پورا ہی ہوتا تھا کہ سامعین باقی کا حصہ بے ساختہ بول پڑتے تھے۔

☆ شعری بھوپالی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے جادو جگاتے تھے' ان کا ترنم دوسروں سے مختلف ہی نہیں ہوتا تھا اس میں گائیکی سے زیادہ لحن کا حسن تھا۔

☆ انور صابری آواز اور الفاظ کا فرق پہچاننے کے باوجود تا عمر الفاظ پر آواز کا ملمع چڑھا کر ہی مشاعروں کا کاروبار چلاتے رہے۔

☆ نریش کمار شاد تحت میں پڑھتے تھے۔ تیکھی، کراری آواز اور ہاتھ پاؤں کے چلانے کے انداز کے ساتھ جملے بازی اور چٹکلے بھی ان کی شعر خوانی کا حصہ تھی۔ خود تماشا بن کر سامعین کو تماشا بناتے تھے۔ وہ کلام سناتے ہی نہیں تھے اسے دِکھاتے بھی تھے۔

☆ دِل لکھنوی دوزانو ہو کر بیٹھ کر پڑھتے تھے وہ ہر شعر کے پہلے مصرعے کو بار بار دہراتے تھے۔ پہلے سروں میں اسے کھنکھناتے تھے اس کے بعد پہلے سے اونچے سروں میں اسے سجاتے تھے پھر کان پر ہاتھ رکھ کر جب اسے تیسری بار اُٹھاتے تھے تو ہارمونیم کے سارے پردوں کو پھلانگ جاتے تھے۔ اتنے اونچے سروں تک پہنچنے کے بعد ان کی آواز کی رعنائی اور گولائی میں فرق نہ آتا۔ جب وہ سدھی ہوئی آواز کو ذرا دھیما کر کے دوسرا مصرع ادا کرتے تھے تو سامعین اپنی نشستوں سے غبارے کی طرح ایک ایک فٹ اونچے اوپر اُٹھ جاتے تھے۔

ندا کو فقرے بازی سے زیادہ جملہ سازی کا ہنر زیادہ عزیز ہے۔ ان کے جملے کی ضرب کردار کے بدن پہ نیل نہیں ڈالتی' اضطرار پیدا کر کے اونچی اُٹھ کر ہموار ہو جانے والی موج کی طرح کسی نئے تموّج کی تلاش میں تہہ نشیں ہو جاتی ہے۔ گذرے وقتوں میں مُقفّیٰ اور مُسجّع نثر پڑھنے میں بڑی بھلی لگتی تھی۔ ندا نے "

چہرے' میں اس کو کہیں کہیں اپنے نثری اسلوب کی آرائش کے لئے سلیقے سے برتا ہے۔

☆ نوح کی شاعری کا مجموعی مزاج زبان کی صناعی ہے۔ محاوروں کی رعنائی ہے اور قافیہ ردیف کی چوکسائی ہے

☆ وہ پیچھے سے میرے جیسے کم سن اور سامنے سے میرے والد کے ہم سن لگتے تھے۔

☆ پہلی شادی کے وقت ساتھ میں جوانی تھی۔ دوسری بار عمر کی بے سروسامانی تھی لیکن نہ جوانی نے ان کا ساتھ نبھایا' نہ بے سروسامانی نے ترس کھایا۔

''چہرے'' کے سارے کردار اس کی مجموعی فضا میرے لئے تو بڑی مانوس ہے کہ میں بھی نصف صدی سے مشاعرے کے اسٹیج کا ایک اٹوٹ حصہ بن کر جیتا رہا ہوں۔ اس لئے'' چہرے'' پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں مشاعرے کے'' بیتے ہوئے میں'' اسٹیج پر بیٹھا کبھی انور صابری، کبھی شعری، کبھی کیفی اور کبھی شکیل کو سن رہا ہوں' دیکھ رہا ہوں۔ لیکن کیا وہ قاری جس نے اپنی عمر کے کسی حصے میں نہ ان شاعروں کو دیکھا اور نہ سنا وہ کیا ان سراپوں سے میری طرح لطف اُٹھا سکے گا؟ پھر مشاعرہ ہر دہائی کے بعد نئی آوازوں اور نئے چہروں کے ساتھ چمکتا، دمکتا رہتا ہے۔ مشاعرے کے نئے سامع کو کل کے دل لکھنوی کے مقابلے آج کا نواز دیوبندی زیادہ مانوس اور پسندیدہ لگتا ہے۔ مشاعرے کے سامعین کے کمزور حافظوں میں عالم فتحپوری، شمسی مینائی اور ناظر خیامی اب گمنام ہو گئے ہیں۔ لیکن'' چہرے'' مشاعرے کے ''کل'' کے اُن مقبول شاعروں کا جواب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ایک ایسا البم تو ہے جو اُنھیں ہماری آنکھوں میں مجسم کر دیتا ہے۔

''چہرے'' کے صفحات پر داغ اسکول کا ذکر اور اس'' سلسلے'' کی جس محبت کے ساتھ ندا نے مدح سرائی کی ہے اس سے'' دبستانِ داغ '' سے ندا کی گہری تخلیقی وابستگی کا احساس ہی نہیں ہوتا وہ ان کا Obsession بھی ہے اور کیوں نہ ہو کہ اُنھیں اِس دبستان کی شعری روایت ورثے میں ملی اور اس شعری روایت کے کامیاب نمونے اُنھوں نے اوائل عمری کی ادبی محفلوں میں بھی دیکھے۔

●●

یہ کیسی کشمکش ہے زندگی میں
کسی کو ڈھونڈتے ہیں ہم کسی میں

دیواروں کے بیچ کھڑا ندا فاضلی

● رتن سنگھ

وہ تو کہیئے کہ اللہ میاں کا ایک گن یہ بھی ہے کہ اُسے غصہ نہیں آتا' لیکن اگر غصہ آتا ہوتا تو یہ شخص جس کا نام ندا فاضلی ہے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

ندا فاضلی کی پیدائش کا اس کہانی سے تعلق کچھ اس طرح ہے کہ اللہ میاں نے اپنی ساری کائنات اور مخلوق پیدا کرنے کے بعد جس ایک آدمی کو پہلے پہل اس کے دیدار کرائے تھے' اس نے سب دیکھنے کے بعد کہا ''بس'' اور یہ بس کچھ اس طرح کہا تھا کہ کوئی بڑے سے بڑا طنز نگار بھی کیا کہے گا' ندا فاضلی اسی شخص کی آل اولاد میں سے ہے۔ پتہ نہیں کتنے لاکھوں سال بیت گئے اس شخص کو ندا فاضلی کے وجود میں داخل ہونے میں' ہمارے عہد کے ہر موڑ پر کھڑا وہ مسکرا رہا ہے اور کہہ رہا ہے' ''بس' بس اتنا ہی' بس یہی کچھ؟''

کسی چیز سے مطمئن نہ ہونے کی ضد نے ہی ندا فاضلی کو آج تک زندہ رکھا ہے ورنہ حضور یہ تو کب کا مر کھپ چکا ہوتا۔ یہ تو پیدا ہونے سے پہلے ہی اس وقت مر جاتا جب پورے دنوں پر اس کی ماں اسے اپنی کوکھ میں چھپائے' دھنستی ہوئی چھت کے ایک لوہے کے سریے کو پکڑے زمین و آسمان کے درمیان معلق تھی۔ یہ اُس وقت بھی نہ مرا جب دہلی کے بے سروسامانی کے دنوں میں اس کی وہی کیفیت تھی' جس کا اظہار مجاز نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ

اے غمِ دل کیا کروں' اے وحشتِ دل کیا کروں

ندا تو ایسا سخت جان نکلا کہ ممبئی کی تنگ کھولیوں میں بھی اس کا دم نہ گھٹا اور اس کا جینے کا حوصلہ نہ صرف برقرار رہا بلکہ اُن کھولیوں کے اندھیروں میں یہ اپنے چہرے پر مسکراہٹوں کے چراغ لئے رہا تا کہ کچھ تو روشن ہو راہ' راہرو کے لئے۔ اور یہ اندھیری راہیں آسانی سے روشن نہیں ہوئیں۔ پاکستان جانے سے پہلے جب سارے گھر والوں کے سمجھانے، بجھانے کے باوجود ندا اپنی ضد پر اڑ گیا کہ وہ ہندوستان میں ہی رہے گا تو سارے خاندان کے چلے جانے کے بعد ندا کی آنکھوں کے سامنے ایک بار تو چار سُو اندھیرا چھا گیا تھا۔ یوں اس کے پہلے کی زندگی بھی کوئی ایسی روشن نہیں تھی۔ والد، خوبصورت بیوی اور بچوں

کے باپ ہوتے ہوئے بھی سندھیا دربار کی کسی مُغنّیہ کی زلف کے اسیر ہیں تو وہ حسینہ بھی اپنے عاشق کے بچوں کو ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ انہیں جیب خرچ کے لئے پیسے دیتی ہے' لیکن بچوں کو وہ پسند نہیں۔ ایسے ماحول میں بچوں کی ذہنی کیفیت پر جو اثر پڑنا تھا' پڑا۔ شاید اسی لئے ندا تمیں سال پہلے مرچکی دادی کی قبر سے گُم صُم چمٹا ہے اور کسی بھی قیمت پر قبر چھوڑنے پر راضی نہیں۔ شاید وہ خاموش زبان میں اس سے اپنے والد کی شکایت کرنا چاہتا ہو' کون جانے؟

پھر ملک کی تقسیم کے وقت پاکستان جائے بنا ہی ندا کو اپنے خاندان کے ساتھ شرنارتھی بننا پڑتا ہے۔ پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں کے ساتھ ہی جب گوالیار کی فضاؤں میں فسادات کا زہر گھلتا ہے تو ان کا پریوار بھوپال کے قریب ببرا گڑھ منتقل ہو جاتا ہے لیکن تنہا ندا گوالیار کو نہیں تو وہاں کے کچھ حصے کو ساتھ ضرور اٹھا لاتا ہے۔ ببرا گڑھ میں اُن کے کوارٹر کے سامنے ایک درخت ہے جو ندا کو گوالیار کے مکان کے پیچھے والے پیڑ جیسا لگتا ہے۔ وہ سوچتا ہے' جیسے یہ درخت بھی اس کی طرح اپنی جگہ سے اکھڑ کے یہاں آ گیا ہے' بڑی بہن کہتی ہے۔ "پاگل وہ پیڑ یہاں کیوں آنے لگا۔ پیڑوں میں ہندو مسلمان تھوڑے ہی ہوتے ہیں جو ایک شہر چھوڑ کر دوسرے میں پناہ گزین ہوں۔" یہ منطق ندا کی سمجھ میں نہیں آتی اور اس ناسمجھی نے اُسے اُس پیڑ کے قریب کر دیا۔

اپنے ماحول کے ساتھ یہی وابستگی ندا کا اصلی سرمایہ ہے' اس کی اصلی طاقت اسی لئے جب وہ ببرا گڑھ سے منتقل ہو کر بھوپال میں مقابلتاً بہتر مکان میں آتے ہیں تو بھی وہ خود کو مطمئن نہیں پاتا' وہاں کی مٹی میں نہ مانوس خوشبو ہے اور نہ پتھروں اور ارد گرد کے درختوں سے شناسائیاں ہیں۔ ستارے، ہوائیں، پرندے، دیواریں، چھتیں سب کی سب اسے کاغذ پر چھپی تصویروں سے لگتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بھی ایسا نہیں جو گوالیار کے کشادہ کمروں والے گھر اور اس کے سامنے لگے املی کے پیڑ اور مکان کے پیچھے والی تنگ سی گلی اور اس پرانے کنویں کی جگہ لے سکیں۔ جو محلے کی ساری لڑکیوں کا ہمراز ہے۔ ندا تو بمبئی کی مرطوب آب و ہوا میں نیم اور املی کی چھاؤں تلاش کرتا رہتا ہے اس لئے اُسے نت نئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ندا کا اُداس رہنا لازمی ہے لیکن ندا کی ذات کا ایک گُن یہ بھی ہے کہ وہ پانی کی طرح ہر برتن کے مطابق خود کو ڈھال لیتا ہے۔ اور اگر اداس بھی رہتا ہے تو ندی میں بہتے ہوئے پانی کے بہاؤ کی طرح' جس میں میلا میلا نیچے تہہ پر جا کر جم جاتا ہے اور اوپر سے پانی صاف شفاف ہو کر بہتا رہتا ہے۔

ندا کی اُداسی بھی اسی طرح اُس کے دل کی گہرائیوں میں چھپی رہتی ہے اور اُوپر سے اس کا چہرہ ایسے گلاب کی طرح کھلا رہتا ہے جیسے ساری خوشبوئیں صرف خوشبوئیں ہی اس کی زندگی کا حصہ ہوں' لیکن اس طرح جینا ایک مشکل کام ہے۔ من کے دکھوں پر انسان دوسروں کو دکھانے کے لئے مسکراہٹ کا لبادہ اوڑھ تو لیتا ہے لیکن انسان کے درد میں بھی ایسی روانی ہوتی ہے کہ کبھی تو وہ عام انسان کی آنکھوں سے آنسو بن کر چھلک پڑتا ہے اور کبھی دل کے پھپھولوں میں ٹیس اٹھتی ہے تو اس کی روح تک کانپ جاتی ہے۔ ندا کے ہاں بھی یہ سب کچھ ہوتا ہوگا' لیکن یہ سارے کام ندا نے بڑی چالاکی سے مقتدا حسن کو سونپ رکھے ہیں جو ندا کا اصلی ہمراز ہے۔ وہ اکیلے میں روتا بھی ہے اور غم کی شدت کی تاب نہ لا کر آہیں بھی بھرتا ہے۔ رہی ندا کی بات تو یہ مسکراتا رہتا ہے اور اگر کبھی رونا بھی پڑ جائے تو یہ خود نہیں روتا' اس کا قلم روتا ہے۔ یہ تو رہا ندا بحیثیت ایک شخص کے۔ اب قلم کا ذکر آیا ہے تو اس کے قلم کے جوہر دیکھنے کے لئے ''دیواروں کے بیچ'' کے کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

''مذہب کو جمعہ کی نماز تک محدود کر کے اپنے دوسرے ہم پیشہ لوگوں کے مقابلے میں انہوں نے اپنے آپ کو زیادہ آزادی دے رکھی ہے۔''

''راجستھان، مدھیہ پردیش، یوپی، کے اضلاع کی غریبی جس حساب سے بمبئی میں امیری کی کھوج میں آرہی ہے' اسی اعتبار سے بمبئی کی شکل و شباہت بدلتی جارہی ہے۔ چلنے والی فٹ پاتھوں پر رہنے سہنے والی جھونپڑیاں بنتی جارہی ہیں۔ بمبئی چاروں طرف پھیلی بھی' بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے چھوٹی ہورہی ہے۔ چوریاں، قتل اور لوٹ مار کی وارداتوں میں بھی ترقی کی رفتار نے عدالتوں اور پولس تھانوں کو پہلے سے زیادہ مصروف کر دیا ہے۔''

''کتوں میں بھی سیاسی جماعت جیسا اتحاد ہوتا ہے۔ آپس میں یہ سدا ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں' لیکن جب کوئی ان کی سرحد کو پار کرتا ہے تو یہ سب متحد ہو کر مورچے سنبھال لیتے ہیں۔''

''ویشنو ماتا، اجمیر کے خواجہ، شرڈی کے سائیں بابا کی مارکیٹ دوسرے دیوی دیوتاؤں سے زیادہ ہے۔''

''گھر میں گھر کے رقبے کی تقسیم کی طرح مرتضیٰ حسن بھی تین ٹکڑوں میں منقسم ہیں۔ ایک جگہ سے صبح کا ناشتہ آتا ہے' دوسری طرف سے دوپہر کا کھانا آتا ہے' رات کی ذمہ داری تیسرے گھر کی ہے۔''

ان اقتباسات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ندا اپنے ہاتھ میں قلم کی تلوار لئے اپنے دَور کے

اندھیروں سے سینہ سپر ہیں۔ کہیں وہ مذہب کے سلسلے میں کسی کے دِکھاوے کے پرخچے اڑا رہا ہے تو کہیں عدالتوں اور پولس کی موجودگی میں بڑھتی ہوئی غنڈا گردی پر طنز کر رہا ہے۔ اُس کے قلم کی زد سے وہ سیاسی پارٹیاں بھی نہیں بچیں جن کو آپس کی لڑائیوں سے طاقت کی بھوک سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ عوام کی بہبود کی بات سوچ سکیں۔ اسی لئے آج کے دور کی ادبی زندگی ہو یا سماجی، سیاسی ہو یا مذہبی، ندؔا عوام کے ساتھ خود کو ایسی دیواروں کے بیچ گھرا پاتا ہے، جن کے حصار سے انسان باہر نکل آئے تو اسے آزادی کی سچی فضاؤں میں سانس لینے کا موقع میسّر ہو۔ رہی ندؔا فاضلی کی بات تو جب بھی اسے شدت سے ان دیواروں کے بیچ گھرے ہونے کا خیال آتا ہے تو اس سے نجات پانے کے لئے وہ لکھتا ہے، تاکہ غم دل، غم دوراں بن کر کاغذ پر اس طرح منتقل ہو جائے کہ ان کی تحریر اندھیروں سے لڑتی سی دکھائی دے۔ والد کی موت پر جب یہ کراچی میں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتے ہیں تو کہتے ہیں۔

"میری بیماریوں میں تم
میری لاچاریوں میں تم
تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں میں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا"

اپنے والد کے لئے جس جذباتی رشتے کا اظہار ندؔا کی ان سطروں میں ہوتا ہے وہ نثر نگار کے ساتھ ساتھ اس کے اچھے شاعر ہی نہیں اچھے انسان ہونے کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ (بشکریہ 'بیسویں صدی' نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۴ء)

●●

گھیروں سے معانی کے نکلنے تو لگے ہیں
الفاظ گلی کوچوں میں چلنے تو لگے ہیں

خودنوشت اندر ناول.... ایک بے تکلف تجربہ

● پروفیسر عتیق اللہ

"کوئی سچ مکمل سچ نہیں ہوتا۔ سارے سچ آدھے ادھورے سچ ہیں۔ انہیں مکمل سچ منوانے کی کوشش کے معنی شیطان کے چنگل میں پھنسنے کے ہیں۔"

(الفریڈ نارتھ وہائٹ ہیڈ)

"گذرے ہوئے کل میں کوئی ترمیم ممکن نہیں۔ آنے والا کل غیر یقینی ہے۔ صرف آج ہی یقینی ہے اسی کو یہ جب تک تمہارے ساتھ ہے جیسا چاہو جی لو۔"

(زرتشت)

اُردو میں سوانح نگاریوں اور خودنوشت سوانح عمریوں کی تعداد سوانحی ناولوں سے یقیناً کئی گنا زیادہ ہے۔ ان خودنوشتوں میں بھی پردہ داری اور اعتراف کی جرأت کا مظاہرہ کم اور پردہ پوشی اور خودآرائی کا پہلو زیادہ حاوی ہے۔ اکثر خودنوشتیں محض یادداشتوں تک محدود ہوکر رہ گئی ہیں۔ جنہیں یادنگاری کے ذیل ہی میں شمار کرنا چاہیئے۔ سوانحی ناول سوانح بھی ہوتا ہے اور جس میں اپنے یا کسی دوسرے کے سوانح کو کسی ایک کسے بندھے یا ڈھیلے ڈھالے پلاٹ میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوانح نگار یا خودنوشت نگار چونکہ ناول کے آرٹ سے کم واقف ہوتے ہیں اس لئے ان سے پلاٹ کے نظم وضبط اور واقعات کے تانے بانے جوڑنے کے اس افسانوی فن کی توقع بے سود ہوگی جسے ایک فکشن نگار بڑی مہارت کے ساتھ کوئی خاص ذیلی تنظیم دے دیتا ہے۔ ذیلی اِس لئے کہ اسباب وعلل کے منطقی سلسلے کے مطابق ناول کی ظاہر ساخت کو تشکیل دینا اب ناول کے ترقی یافتہ سیال فارم کے عین منافی ہے۔ عزیز احمد، عبداللہ حسین اور قرۃ العین حیدر سے لے کر عبدالصمد اور مستنصر حسین تارڑ تک ناول کی ظاہراً تنظیمی ساخت کو بار بار چیلنج کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ اب ناول انسانی فطرت اور انسان کے بے ہنگم سفر حیات کی اس رَو کا زیادہ مظہر ہے جس کی منطق خارج کی تعین کردہ زمان کی رَو کے برخلاف ترتیب اور نظم کے اپنے متنوع قواعد سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی بہ ظاہر بدنظمی نے ناول کو ایک وسیع تر داخلی میدان کارزار بھی فراہم کیا ہے۔ جواز میں جو توضیح اور

استدلال کا پہلو چھپا ہوا ہے اس سے یقیناً ہمارے قارئین کو بڑی تشفی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن جواز کی جستجو اور قاری کو قائل کرنے کی عجلت میں ہم ایسے بہت سے قاریوں سے محروم بھی ہو جاتے ہیں جو واردات اور واقعات کے اسباب و جواز کی کسی ایک منطق ہی کو آخری دلیل نہیں مانتے۔ ہر قاری اور عہد کے ساتھ استدلال کی منطق بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جدید ناول کا فن پہلے کی بہ نسبت زیادہ پہلو دار، زیادہ سیال اور زیادہ وسیع ہوا ہے۔

امراؤ جان ادا، علی پور کا ایلی، الکھ نگری اور غالبؔ جیسے ناولوں میں سوانح اور ناول کا فارم ایک دوسرے میں حل ہو گئے ہیں۔ ناول نگار اگر نفسیاتی بصیرت بھی رکھتا ہے تو وہ زیادہ بہتر طریقہ سے اس کردار کی روح اور فطرت کے ان متنوع اطراف کی تفصیلات بہم پہنچا سکتا ہے جو بہتوں کے لئے نامعلوم کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس معنی میں ممتاز مفتی کو ہم بغیر کسی لاگ لپیٹ کے Naturalist of Souls کا نام دے سکتے ہیں' اس ذھب کا فن کار اظہار کی غیر معمولی جرأت سے بھی کام لیتا ہے' اعتراف کے حوصلے بھی جہاں تہاں آزماتا ہے اور خود کشائی کی اس توفیق کے مظاہرے کی ہمت بھی رکھتا ہے جسے ایک خاص تہذیبی تناظر میں پرورش یافتہ اَنا اپنی تاکید میں رکھنے کے درپے رہتی ہے۔

خود گذشت یا خود سوانحی ناولوں کا معاملہ تو سوانحی ناولوں سے زیادہ خطرناک ہے اکثر خود گذشت نگار اپنی ذات اور کسی حد تک اپنے تعصبات سے پرے ہو کر چیزوں کو دیکھنے کے باوجود خود احتسابی کی ایک حد قائم کر لیتے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ چیزوں کی بہتر فہم کے لئے معروضیت ہی سب سے بہتر اور واحد راستہ ہے۔ بعض اوقات وہ دھند اور وہ اسرار بھی زیادہ معنی گیر ثابت ہوتے ہیں جن پر دلیل کا بھاری بوجھ ڈالنے سے معنی کی متوقع قدر کے کوتاہ ہو جانے کا ڈر لاحق ہوتا ہے' نیز یہ کہ چیزوں سے روحانی ربط پیدا کرنے کی راہیں بھی سمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں قرۃ العین نے جہاں خود کشائی کی ایک حد قائم کی ہے وہاں ان بہت سے کرداروں کو بھی اپنے اپنے طاقوں سے اترنے کا موقعہ کم ہی دیا ہے' جن سے ان کی یا ان کے قرابت داروں کی زندگی کے کسی دورانیے میں ایک خاص نسبت رہی ہے۔

سوانحی ناولوں میں بھی تاریخی ناولوں کی طرح Facts جب فکشن کا روپ دھارن کرتے ہیں تو ان کی اصل بڑی حد تک ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی سب سے بڑی وجہ ناول کا وہ فن ہے جس کے اپنے کچھ تکنیکی مطالبے ہوتے ہیں۔ ہر ناول کے ساتھ ان مطالبات کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ قرۃ العین کا ناول خود گذشت ہونے کے باوجود ایک ضخیم تذکرے کا حکم بھی رکھتا ہے۔ تاریخ، تہذیب اور

انسانی رشتوں کی رنگارنگی سے اس کی بافت تیار ہوئی ہے۔اس بلند کوش ناسٹلجیائی تصویر کی بالائی معنویت کی تہہ میں بغور دیکھا جائے تو کارِ جہاں کی درازی کے باوجود ناکارگی اور بالآخر لاحاصلی اور ناآسودگی کی ایک زیریں لہریں لہر کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔جسے قرۃالعین کے معروف تصور کی روشنی میں وقت کے جبر کا نام دیا جاتا ہے۔اس جبر نے گیان سنگھ شاطر کے یہاں سماجی جبر کی شکل اختیار کرلی ہے، جو کہیں کہیں نفسیاتی جبر میں بھی بدل جاتا ہے۔شاطر کے یہاں ناسٹلجیا کی وہ کیفیت نہیں ہے جس میں کسی بیش قیمت ساعت کے کھو جانے کا تاسف پنہاں ہوتا ہے۔یا یہ ملال کہ یہ جواتنا برا نہ ہوا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ساطر نے Glorify کرنے کے بجائے چیزوں کو ان کی "جو ہے اسی صورت میں" بیان کرنے پر ترجیح دی ہے۔نفسیاتی ادراک نے ساطر کے تجزیوں کو زیادہ دلچسپ، گرہ گیر اور معنی افزا بنا دیا ہے۔

ندا فاضلی نے اپنی سوانح کے لئے اس ضمیر متکلم کا سہارا نہیں لیا ہے جو بالعموم خودسوانحی ناول نگاروں کا سب سے مرغوب صیغہ کہلاتا ہے۔اس ترجیح کی پشت پر ان کا یہ منشا بھی ہوسکتا ہے کہ کہیں "میں" کی پرداخت انا، اظہار، احتساب اور اعتراف کی راہ میں حائل نہ ہوجائے اور وہ معروضیت بھی پیدا نہ ہوسکے جو جراُتوں کو بحال رکھنے کا ایک بڑا سبب بھی ہوتی ہے۔ندا اپنی شاعری میں مختصر لمحوں کا شاعر ہے۔یعنی وقت کو وسیع بساط پر پھیلانے سے اسے کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔جب کہ "دیواروں کے بیچ" اور "دیواروں کے باہر" کا زمان کم وبیش ۶۰/برسوں پر محیط ہے۔ندا کے یہ ۶۰/برس کسی ایسے شخص کے ۶۰/برسوں کا عرصہ رُواں نہیں ہیں جسے اپنے ماضی پر گھمنڈ ہو، حال پر فخر اور مستقبل پر اعتماد۔جو اخلاقیات کی نام نہاد فرہنگ کی ہر اس برائی سے اپنے پاک ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہو جس سے اس کے حال کی عظمت پر کوئی حرف آسکتا ہے۔

ندا کہیں برائی کرنے کو برائی سرزد ہونے کا نام نہیں دیتا اور نہ ہی برائی کے تصور کو اتنا برا خیال کرتا ہے جتنا براہم نے اسے اپنے اخلاقی دعاوی میں نام دے رکھا ہے۔وہ شخص جس نے اپنی تقریباً تمام عمر تن بہ تنہا گذاری ہو۔اُس کے لئے انسانی اور جذباتی رشتوں کی بڑی قیمت ہوجاتی ہے یا وہ اس قسم کے جذبوں سے عاری ہوکر انتہائی خودغرض، بےحس اور سخت دل بھی واقع ہوسکتا ہے۔لیکن ندا ایک ایسا کردار ہے جس نے اپنے اکیلے پن کو ٹوٹے پھوٹے اور وقت کے ہارے ہوئے یا حالات سے جوجھتے ہوئے انسانوں کے دُکھ دردوں سے آباد کرلیا ہے۔ماضی کی بازیافت اس کا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی ماضی اس کے لئے کسی تفاخر کا سامان مہیا کرتا ہے۔ماضی جیسا ہے اور جو کچھ ہے اسی حالت میں اس کے ذہن نشین بھی

ہے وہ نہ تو اپنی اس بداعمالی پر پشیمان ہوتا ہے جسے سیدھے سادے لفظوں میں ہم گناہ سے تعبیر کرتے ہیں اور نہ اپنے والد کی اس بے راہ روی پر کوئی لعن طعن کرتا ہے جو اس کی رفیق و شفیق ماں کی حق تلفی، تنہا بسری اور لافانی الاولاد کا باعث بنتی ہے۔ ندا کے اس شعار پر حافظ کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے۔

فاش می گویم و از گفتہ ٔ خود لشادم بندہ ٔ و از ہر دو جہاں آزادم

ندا نے ایک غیر از خود ہستی کے طور پر اپنا کردار خلق کر کے خود گذشت کو ناول کے فارم میں دیا ہے۔ غیر از خود ہستی کے طور پر ندا کا کردار زیادہ جاندار، زیادہ دلچسپ اور زیادہ حرکی ہے۔ اس کا میں اس کی ذہن و ضمیر کی آزایوں اور زندگی کو اس کی تلچھٹ تک پی جانے کی راہ میں نہ تو کہیں مانع آتا ہے اور نہ کہیں قدغن لگاتا ہے۔ ایک بوہیمین اسپرٹ ہے جو بچپن سے لے کر پکی ہوئی عمر تک اس کی رگ و پے میں رواں رہتی ہے۔ 'میں کے بجائے 'ماں' اس کے لاشعور کے نہاں خانوں میں جاگزیں ہے جسے وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی جھٹک نہیں پاتا۔ کیونکہ یہ احساس ہمیشہ ایک خون میں تر بہ تر زخم کی طرح اُس کے وجود میں جھپکتا رہتا ہے کہ وہ جمیل فاطمہ کے (ماں کا نام) خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکا۔ اس قلق اور اس تاسف کے علاوہ ایک احساس زیاں اور تھا جو فطرت سے دُوری کے باعث اُس کی رُوح کی تھاہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ پیڑ، پھول اور پودے اکثر اُس کے لئے انسانی ذلالتوں، کمینگیوں، مکاریوں، غرض مندیوں، نفرتوں اور ریاکاریوں سے بھری ہوئی دُنیا سے تھوڑی دیر کے لئے فراغت کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ ویسے ندا کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان سے کبھی مایوس نہیں ہوتا اور نہ انسانوں سے وہ بہت زیادہ توقع باندھتا ہے کہ نفرت یا کمینگی سچویشنل ہوتی ہے' سچویشن بدلنے کے ساتھ اس کے رُخ اور اُس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔

''دیواروں کے بیچ'' کا ندا اتنا ''دیواروں کے بیچ'' نہیں ہے۔ وہ ایک آزاد رَو اور آوارہ پنچھی ہے اقرار کے بجائے انکار اس کی شخصیت کا وہ رُخ متیعن کرتا ہے جسے ہر چیز بے وقعت نظر آتی ہے اور وہ ہر چیز میں تحلیل ہونے کے درپے بھی دکھائی دیتا ہے۔ حیات و کائنات کی ابسرڈٹی کا عرفان اسے اپنے لڑکپن میں ہو جاتا ہے اس لئے رشتوں کے معنی بھی اس کے یہاں کچھ اور مفہوم اختیار کرتے جاتے ہیں وہ پانے کے لئے کھوتا نہیں ہے بلکہ کھونے اور پانے کے احساس ہی سے اپنی ذات کو پرے رکھ کر دُنیا کا ایک ایسے تماشہ بین کے طور پر مشاہدہ کرتا ہے جو وجودی اور جسمانی سطح پر اس میں پوری طرح شامل بھی ہے اور روحانی اور ذہنی سطح پر اس سے علیحدہ بھی جسمانی سطح پر جو اس کے تئیں ایک مستقل سپردگی، زندگی کے ایسے

بہت سے نئے معنی اس پر وا کر دیتی ہے جنہیں انکشاف کا نام دیا جا سکتا ہے اور یہی معنی ندا کے حق میں روحانی اور ذہنی سطح پر ذات، حیات، کائنات، فطرت، مذہب، نیکی، بدی، جرم، گناہ اور انسانی رشتوں کی ایک نئی فرہنگ کے موجب بن جاتے ہیں۔

''انسانوں کے علاوہ کسی کے الگ الگ نام نہیں ہوتے' وہ سب اپنی قسم کے اعتبار سے ایک ہی نام سے جانے جاتے ہیں جیسے چیونٹا کہیں کا ہو صرف چیونٹا ہوتا ہے۔ کبوتر صرف کبوتر ہوتا ہے۔ گائے دودھ دے یا قصائی کا گوشت بنے' ایک نام سے پکاری جاتی ہے۔ شاید اسی لئے ان میں موت کا ماتم اور پیدائش کا جشن نہیں ہوتا۔''

''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں سے باہر'' کے بعض کردار بہت کم عرصہ کے لئے نمودار ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ایک ایسا پہلو ضرور ہوتا ہے جو ان کے غیاب میں چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ذہن میں گشت کرتا رہتا ہے۔ اس کی کوئی لغزش، اس کا کوئی عیب، اس کا کوئی فریب ہمیں یاد نہیں رہتا' یاد رہتی ہے اس کی وہ شخصیت جو خوابوں سے لدی پھندی مگر شکستوں سے چور ہے' ہر آدھے ادھورے، ٹوٹے پھوٹے، غریب الوطن میں ندا کو اپنی خانہ خرابی کی کوئی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے اور کچھ وقتوں کے لئے وہ اس کی رفاقتوں میں اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے۔

انسانی دردمندی کا یہ وہ درس ہے جو اس کی آوارگیوں کے سب سے پہلے شریک بیر سنگھ سے اسے ملا ہے جو خود مصیبت کا شکار ہے لیکن اپنی بیوی شیلا کے ہاتھ ندا کو فیس کی رقم مہیا کرنا نہیں بھولتا۔ یہ سبق اسے اس پنجابی شرنارتھی سے بھی ملا ہے جو لٹا پٹا ہندو ہونے کے باوجود جمیل کی تجہیز و تکفین کے لئے امداد کے طور پر سب سے زیادہ چندہ دیتا ہے۔ وہ مندر کا پجاری اسے اُنس اور دلجوئی کے معنی سکھاتا ہے جو ندا کو اس کے بچپن میں روز آواز دے کر بلاتا ہے اور ایک تازہ گلاب کا پھول مورتی سے اُٹھا کر ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔ اسکول کے ساتھی الطاف کی صحبتوں سے اسے جسم و جنس کی رغبتوں اور تقاضوں کا علم ہوتا ہے۔ مس ٹنڈن کی حادثاتی موت اس کے اندر ایک خالی درز سی چھوڑ دیتی ہے۔ کچھ دنوں کے لئے عشرت اس خالی درز کو پر ضرور کر دیتی ہے لیکن زندگی بڑی ظالم چیز ہے جس کے مطالبے جنس و جسم کے مطالبوں کو پیچھے کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ عشرت اس کی پہلی اور آخری محبت ہے۔ باقی تمام جنسی اور جسمانی رشتے عشرت کے انتظار کے دورانیے کی خالی جگہ کو بھرتے رہتے ہیں۔ وہ ٹھرّا پیئے یا انگریزی شراب، جھوٹ بولے یا امانت میں خیانت کرے، چوری کرے یا جنگی جھونپڑی کے آلودہ ماحول میں بسر کرے' بیدی اس پر ترس

کھا کر پاگل کا رول آفر کریں یا جنس وجسم کی ترغیبات اسے اُلجھائے رکھیں۔ وہ کہیں کچھ چھپاتا نہیں ہے۔ ندا کے کردار کا یہی پہلو بے حد جیونت اور متاثر کن ہے۔

''انہی دنوں میں اس (ندا) کی ملاقات بیر کمار کی طوائف شیلا سے ہوتی ہے۔ بیر کمار کا کچھ دن سوگ منانے کے بعد اب وہ مستقل کوٹھے پر بیٹھنے لگی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کے گہنے اور چہرے پر خوشحالی کی چمک ہے۔ شیلا اپنے مرحوم عاشق کو اتنا عرصہ گذرنے کے بعد بھی بھول نہیں پائی ہے۔ وہ جب بھی ندا کے ساتھ ہوتی ہے تو پرانی یادوں سے آنکھیں ضرور بھگوتی ہے۔ ان یادوں کے سہارے وہ اکثر جسمانی دوریوں کو عبور کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ پیشہ ور ہونے کے باوجود ان مشترک یادوں کے احترام میں ندا سے فیس نہیں لیتی۔ وہ جب پیسے دینے پر اصرار کرتا ہے تو شیلا سنجیدگی سے صرف اتنا کہتی ہے۔ ''تم میرے دوست ہو۔ وہ (بیر کمار) تمہیں بہت چاہتا تھا۔ میرے تمہارے بیچ گاہکی کیسے ہوگی، گھر کے لوگوں سے بھی کوئی لین دین کرتا ہے..؟''

ندا کی صبحیں مذہبی، شامیں شرابی اور دن ناستک ہیں۔ دن بھر نئی نئی دلیلوں سے خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے، لیکن ہر صبح سورج نکلنے سے پہلے کلمہ پڑھ کر اس کے وجود کا اثبات بھی کرتا ہے اور شام کو خدا کی بنائی ہوئی نامکمل کائنات میں تکمیلی رنگ بھرنے کی کوشش کرتا۔ شخصیت کے ان تضادات نے اس کے ذہن میں تشکیک کے دھندلکے پیدا کر دیے ہیں۔''

وطن کی تقسیم ہو جاتی ہے، آبادی ادھر سے اُدھر اُلٹ پلٹ جاتی ہے، کوئی کہیں رہ جاتا ہے کوئی کہیں، گھر کا آرام غارت ہو جاتا ہے، مستقبل کے سارے خواب ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں، برسوں کی جمی جمائی گرہستی آنا فانا تہس نہس ہو جاتی ہے، محل چھپر کھٹ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ضرورتیں اخلاق کے معنی بدل دیتی ہیں، کنواریوں کی گودیں بھر جاتی ہیں اور بوڑھے قبروں کی راہ لیتے ہیں۔ اس اثنا میں ندا کے خاندان کو بھی بے گھری کا شکار ہونا پڑتا ہے، بھوپال ایک عارضی قیام گاہ کے طور پر درمیان میں آتا ہے، بھوپال کے بعد ندا عین وقت پر گھر سے بھاگ جاتا ہے اور باقی تمام گھر کے افراد پاکستان کی راہ لیتے ہیں۔ ندا کے لئے دہلی، بھوپال اور گوالیار کا دشتِ امکاں ایک نقشِ پا ثابت ہوتا ہے اور وہ تمنا کے دوسرے قدم کے طور پر عروس البلاد بمبئی کی راہ لیتا ہے۔

''بمبئی بڑی گھمنڈی بستی ہے۔ یہ آسانی سے ہرایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتی، پہلے اپنے طور پر آزماتی ہے، راستوں پر کئی چپلیں گھسواتی ہے، بار بار دیواروں سے چھتیں ہٹاتی ہے، بنا مذہب کے کئی

روضے رکھواتی ہے، جھوٹے وعدے کرتی ہے اور طول طویل فاصلے کراتی ہے، تھکن جب توڑ پھوڑ دیتی ہے تو تازہ دم کرنے کے لئے نیا وعدہ تھما دیتی ہے۔ ایک وعدے سے دُوسرے وعدے تک ضرورتیں مسلسل مصروف رہتی ہیں۔ نہ وعدے ختم ہوتے ہیں نہ خواب مایوس ہوتے ہیں۔ یہاں کے خواب بھی پیپل کے درخت کی خاصیت رکھتے ہیں، اچھے برے ہر موسم میں کہیں بھی اُگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی کوئی اَن دیکھا ہاتھ ڈھلان پر سورج کی گیند لڑھکا دیتا ہے اور پوری بمبئی اس کے پیچھے بچوں کی طرح بھاگتی ہے۔ بھاگتے بھاگتے لوگ تھک جاتے ہیں اور سورج روز کی طرح سمندر میں اُتر جاتا ہے۔''

بمبئی میں عزیز جاوید، تاباں جھانسوی، گوالیار کا پپو (قصائی کا بیٹا)، حسن نعیم، پانڈو، مانس مکھرجی، پیٹر، مارگریٹ اور نورا ایسے کردار ہیں جنھیں خود بھی یہ احساس نہیں ہے کہ ان کے اقدام یا اقدامات کی پشت پر کون سا جبر کام کر رہا ہے۔ ارادے جہاں باندھے جاتے ہیں اس کا ایک سیاق ہوتا ہے، ارادے جہاں ٹوٹتے ہیں اس کا ایک دوسرا سیاق ہوتا ہے، ایک خواب ہوتا ہے دوسرا تعبیر، خواب میں بسر کرنا سہل ہوتا ہے لیکن تعبیر کی سرزمین بہت سخت ہوتی ہے اور بڑی بے رحم بھی۔ سردار جعفری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی یا مجروح سلطان پوری کی بے گھری ان کا کچھ بگاڑ نہیں پائی۔ ان کے پیروں تلے زمین کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی زمین ملتی رہی۔ اسی لئے یہ کردار محض ٹائپ کے طور پر ہی اُبھرتے ہیں، جیسا اُن کے بارے میں ہم جانتے ہیں وہ ویسے ہی ہیں۔ عصمت میں ایک انفرادیت ہے جو مکر یا تصنع سے خالی ہے لیکن انھیں بھی شورِ شکم سے واسطہ پڑتا ہے نہ پیروں تلے کی دھول چاٹنی پڑتی ہے۔

ندا کا کردار عمر کے ہر باب میں تبدیلیوں سے گذرتا ہے جس سیاست نے اسے گھر والوں سے دور کر دیا تھا وہ اس سیاست سے بھی نالاں ہے اور اپنے آپ سے بھی وہ اکثر خفا رہتا ہے کیونکہ وہ خود یہ سمجھ نہیں پاتا کہ آخر وہ کیا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ کبھی خود کو دُنیادار سمجھتا ہے، کبھی خود پر جھلاتا ہے، کبھی محفلوں میں تنہا ہو جاتا ہے اور کبھی تنہائی کو انجمن سے آراستہ کر دیتا ہے۔ اس انجمن سازی میں کبھی نیم اور پیپل کے پیڑ، کبھی املی اور مولسری کے درخت اس کے دم ساز بن جاتے ہیں، کبھی کسی چیونٹے کے کچھ لمحے وہ چرا لیتا ہے، کوؤں کی رِفاقت اُس کے سپاٹ دِنوں میں ایک نیا رنگ بھر دیتی ہے، وہ اپنے ساتھ رہتا ضرور ہے لیکن اپنے آپ کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔ اِسی لئے اپنی تنہائی کو وہ ہر وقت بقول اس کے غیر ضروری آوازوں سے آباد کر رکھتا ہے۔ ''پائی ہوئی چیز کو کھونا اور کھو کر اسے پھر تلاش کرنا اُس کی عادت ہے۔'' کبھی وہ ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، نہ اُس کا کوئی دوست ہے نہ دشمن، جو بھی ہے وہ وقتی ضرورت ہے۔'' دیواروں

کے باہر'' میں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ '' ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی''۔ اس کے باوجود وہ (ندا) خارج و باطن کے تضاد میں اپنے آپ کو تلاش کرتا ہے، اُسے یاد آتا ہے کہ وہ جیسا پہلے تھا' ویسا اب نہیں ہے۔''

جمیل فاطمہ ندا کے انتظار کو ادھورا چھوڑ کر آسمان کا تارہ بن جاتی ہیں۔ والد اپنی جوانی کی آزاد روی کو تیاگ کر کے درود و صلوٰۃ میں باقی عمر گذار دیتے ہیں۔ ان کی محبوبہ زیبُن پھر انھیں کبھی یاد نہیں آتی لیکن زیبُن آخر دم تک اُن کی یاد کو جی جان سے چمٹائی رہتی ہے۔ عشرت سے نکاح کے بعد بھی ندا عشرت سے محروم رہتا ہے۔ مالتی جوشی اُس کے ویرانے کو آباد ضرور کر دیتی ہے لیکن عشرت اُس کے ضمیر کی تھاہ سے کبھی نکل نہیں پاتی۔ لیکن ایک ظالمانہ بے حسی کو اپنے اوپر عائد کرنے کے باوجود جمیل فاطمہ ندا کی روح میں رچی بسی رہتی ہیں۔ جمیل فاطمہ کی تاکیدیں، اُن کے خواب، اُن کی نمازیں، اُن کی خاموشی پھر اُن کی مسور کی دال میں لہسن کا بگھار، ارہر میں سوکھی کیری کی کھٹائی اور سرسوں کے تیل میں نئی فصل کے چھوٹے آلو اور ہری میتھی کا ذائقہ' ندا کے نہاں کدۂ ذہن میں ہمیشہ تازہ دم رہتا ہے۔ اُسے سب عورتیں ایک سی لگتی ہیں لیکن جمیل فاطمہ کے بارے میں اُس سے سوال کیا جائے تو وہ یہی کہے گا کہ '' میری صاحبہ ساری دُنیا کی ماؤں سے الگ تھیں۔''

ندا کی ان دونوں جلدوں کو ناول کا نام دینا چاہیئے یا نہیں؟ یہ سوال اُن لوگوں کے لئے ہی تذبذب کا باعث ہے جو ناول کی کسی ایک تکنیک یا کسی ایک مسلسل دہرائے جانے والے فارم ہی کو ناول کے اصل فن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ندا کا ناول (دونوں جلدیں ملا کر) ٹھیٹھ بیانیہ کی اس تکنیک میں لکھا گیا ہے جسے جیرالڈ پرنس نے The recounting of one or more real or fictious events سے موسوم کیا ہے۔ ندا کے واقعات، وارداتوں اور سانحات میں ایک واقعی اور فطری ترتیب کام کر رہی ہے۔ اگرچہ ناول کے تخیلاتی ڈھانچے میں فطری نظم و ترتیب کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن ندا کا مسئلہ یہ تھا کہ ناول کہیں محض یادداشت بن کر نہ رہ جائے' اسی لئے وہ بار بار فلیش بیک، فلیش فارورڈ، فلمی ٹائپ کٹس اور اسکرین پلے کی تکنیکوں کو اس کمال ہوشیاری سے برتتا ہے کہ قاری کی ذہنی رَو کم ہی صدمے سے دوچار ہوتی ہے۔ اسی لئے ندا کے فن میں ڈرامہ، فلم اور ناول کے فارم نے ایک جمالیاتی واحدے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ درمیان میں کرشن چندر، سردار جعفری، بیدی، عصمت، نیاز حیدر اور راہی معصوم رضا وغیرہ کی شخصیتوں کے بعض چھپے ہوئے اور بہتوں کے لئے حیرت خیز پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ لیکن ندا

کی اپنی زندگی اس قدر دلچسپ اور توجہ خیز ہے کہ ادیبوں سے متعلق یادداشتوں کا یہ سلسلہ کچھ زائد سا معلوم ہوتا ہے بلکہ ناول کے تدریجی مرتب ہونے والے اثر کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ البتہ ان ادیبوں کے فکر وفن پر ندا نے جو رائے قائم کی ہیں وہ ندا کی تنقیدی اہلیت ہی کی مظہر نہیں ہیں۔ ان کے حوالے سے ہم ندا کے تخلیقی شعور اور ان رویوں کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں جو ندا کی شاعری کے پسِ پشت کارفرما ہیں۔

''ناسٹیلجیا تخلیقی ذہن کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ شخصی ہوتا ہے تو اکہرا ہو جاتا ہے۔ اچھے ادب میں نجی یادیں تہذیب وثقافت اور ان کے طویل اتہاس سے رشتہ جوڑ کر لسانی و زمانی دائروں سے آزاد ہوتی ہیں۔ ہمارے ادب کا ایک بڑا حصہ اس آگہی سے محروم ہے' حال سے بے اطمینانی اور ماضی کی پاسبانی کے محدود رویے نے الفاظ کی قوتِ گویائی کو بھی محدود کر دیا ہے۔''

''میری شاعری نہ صرف ادب اور اس کے پڑھنے والوں کے ادبی رشتے کو ضروری مانتی ہے' اس کے تہذیبی وسماجی حوالے کو اپنا معیار بھی جانتی ہے۔ یہ ایک طرح ادب کی اس روایت کی حمایت ہے جو ادب کو اشرافیہ کی پرانی حکمرانی سے آزاد کر کے اسے عوامی وقار عطا کرتی ہے۔ یہ شاعری بند کمرے سے باہر نکل کر چلتی پھرتی زندگی کا ساتھ نباہتی ہے اور اُن علاقوں میں بھی جانے سے نہیں ہچکچاتی' جہاں روشنی بھی مشکل سے پہنچ پاتی ہے۔''

''اس شاعری کی زبان بھی اس کے موضوعات کی طرح نہ چہرہ پر داڑھی سجاتی ہے نہ ماتھے پر تلک لگاتی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو صوفی سنتوں کی زبان تھی جو گھر آنگن اور گلی کوچوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور انسانی رشتوں سے جگمگاتی ہے۔ یہ درباروں کی نہیں بازاروں کی زبان ہے اس شاعری کا مزاج عوامی، احتجاجی اور مسائلی ہے۔''

ندا کا اسلوب اپنی کارکردگی میں بے حد تخلیقی ہے۔ اس کی شعری حسیت نے نثر میں بھی اپنا جادو جگایا ہے۔ اسلوب جہاں بیانیہ واقع ہے وہاں بھی اور جہاں محض تجزیاتی اور توضیحی ہے وہاں بھی وہ تخیل اور وجدان کے عمل سے تغافل نہیں برتتا۔ جو ہمیشہ اس کی شاعری میں ہمارے احساس میں شمولیت کے درپے رہتا ہے۔ ندا کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی شاعری میں جگہ جگہ وقفے چھوڑ جاتا ہے، اس کی زبان میں بھی نیا پن کچھ نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر مانوس لفظیات ہی پر وہ اکتفا کر لیتا ہے۔ زبان کی تخلیقی قوتوں سے بھی اُس نے کم ہی کام لیا ہے کیونکہ تخلیقی زبان کی پیچیدگیوں اور گرہ داریوں کو آزمائے بغیر بھی وہ مصرعوں کی ترتیب کچھ اس طور پر قائم کرتا ہے کہ مانوس' نامانوس میں بدل جاتا ہے اس طرح ان نظموں میں

انسانی خباثتوں میں گم ہوتی ہوئی معصومیتوں کا شدید احساس ہمارے وقتوں کے قاری کے احساس سے ایک ذیلی رابطہ قائم کرلیتا ہے۔ یہ چیز ندا کے اسلوب نثر سے بھی آشکار ہے' تھوڑا طنز، تھوڑا چلبلا پن، تھوڑی سنجیدگی، تھوڑا پھکڑ پن، کہیں باتیں بنانے کا انداز، کہیں استعجاب، کہیں درگذری، لَے میں کہیں نرمی، کہیں تلخی اور کہیں اخلاق آموزی یہی تمام صورتیں یک جا ہوکر اس کی نثر کو بھی انتہائی وقیع، عام ڈھرے سے الگ' برجستہ اور توانا بنا دیتی ہیں۔ ندا کی نثر میں اسی بنیاد پر تاثیر کی قوت، اس کی شاعری سے کم نہیں ہے۔ درج ذیل یونانی اسطوری روایت کو ادا کرنے میں شاعری کے کئی جہان سمٹ آئے ہیں۔

''عورت نے اپنے جسم سے پچیس ندیاں نکال کر دھرتی پر چاروں طرف پھیلا دیں اور مرد کو آواز دی' پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی سے ٹکراتی اس آواز کو سن کر مرد نے سمندر کی طرح چاروں دشاؤں میں پھیل کر ان ندیوں کو اپنی بھجاؤں میں سمیٹ سمیٹ لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مل کر مکمل ہو گئے تھے۔ عبادت گاہوں میں گہری نیند میں سوئی ہوئی ندائی مورتیوں نے اس تماشہ کو دیکھا اور خوف زدہ ہو گئیں۔ وہ اپنے پتھروں کے خول سے باہر آئے' عورت اور مرد کے ملے جلے اس وجود کو اٹھا کر پہاڑ کی اس چوٹی پر لے گئے جہاں عورت کی آواز ٹکرائی تھی اور مرد نے اسے سنا تھا۔ ڈرے ہوئے دیوتاؤں نے آسمان کے تیز دھار سورج سے اس مکمل وجود کو تقسیم کر کے عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے الگ کیا اور ایک تکمیل کے دو ادھورے حصوں کو مختلف سمتوں کے حوالے کر دیا۔ اس دن سے آج تک ایک ادھورا حصہ پورا ہونے کے لئے دوسرے ادھورے حصے کی تلاش میں ہے۔''

''چھٹی کا گھنٹا بجتے ہی بچہ ماں کی طرف بھاگتا ہوا آتا ہے۔ زمین پر اس کے چھوٹے چھوٹے پیروں کی آہٹیں، روشنی کے ننھے ننھے بلبوں کی مانند پہلے ماں کی آنکھوں میں چمکتی ہیں اور پھر پورے جسم میں جھلملانے لگتی ہیں اور وہ پل بھر کو دُنیا کی حسین ترین عورت بن جاتی ہے۔''

ندا اپنی شاعری میں چیزوں کے احساس کو مسخ نہیں ہونے دیتا۔ جیسا کہ اکثر جدید شاعری میں لفظ پر تعبیرات کا ایک ایسا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے کہ شعر کی پہلی اور دوسری اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ قرأتیں ضائع چلی جاتی ہیں۔ ندا کے شعری تجربے میں حقیقت یا جذبے کے مہین مہین ذرات کو پکڑنے میں اس کی زبان اور اس کی غیر متوقع اور بے تکلف تکنیکوں کا ایک خاص کردار ہوتا ہے۔ جو اس کی نظم کو کبھی ایک وحدانی تاثیر اور کبھی مونتاژ جیسی تصویر میں بدل دیتا ہے۔ فلم اور میڈیا سے گہرا تعلق ہونے کی بنا پر وہ چیزوں اور وارداتوں کو بصارت کے تجربے سے زیادہ گذارتا ہے اور قاری کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لئے

استعمالاتِ زبان میں اس کی اوّلین ترجیح تاثیر کی دوگانہ اور سہ گانہ نیز فوری قدر پر ہوتی ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو ندا کی نثر کی تخلیقی کارکردگی کی سمت بھی متعین کرتا ہے۔ اُردو ناول کی تاریخ میں عبداللہ حسین کے ''باگھ'' کے بعد ندا فاضلی کے اس ناول کو نثر کے تخلیقی جوہر کا بہترین نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ عبداللہ حسین کا زور تجرید پر ہوتا ہے اور ندا کی ترجیح تجسیم کے عمل پر ہوتی ہے اور جو اپنے مقصد میں چھپانے سے زیادہ دکھانے اور کھولنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔

●●

دیواروں سے باہر...خودنوشت سوانح

● نامی انصاری

ندا فاضلی اِس دَور کے ممتاز شاعر ہیں اور یہ بات چنداں تعجب خیز نہیں ہونی چاہیئے کہ شاعری کی طرح ان کی نثر نگاری بھی بڑی دِل کش، توانا اور موثر ہے۔ اپنی خودنوشت سوانح ''دیواروں کے بیچ'' لکھ کر انھوں نے جو وقار و اعتبار حاصل کیا تھا' اس کا اثبات کرتی ہُوئی اُن کی نئی کتاب ''دیواروں کے باہر'' کچھ اور زیادہ پُر خیال اور معنی خیز ہے۔ اور اُن کے مشاہدے اور مطالعے کی ہمہ گیریت کا موثر اظہار ہے۔

''دیواروں کے باہر'' صرف ندا کی سوانح ہی نہیں ہے بلکہ ممبئی کی بیچ در بیچ سماجی زندگی کا ایک دِل چسپ مُرقع ہے اور انکشافِ ذات کا ایک معنی خیز اشاریہ بھی۔ اس سوانحی کتاب میں افسانوں کی دِل چسپی، ناول کی وُسعت، افکار و خیالات کی معنویت' مصنف کی تنقیدی بصیرت اور جاندار خاکہ نگاری کے اوصاف اس طرح سموئے ہُوئے ہیں کہ ایک ہمہ جہت آئینہ خانہ سج گیا ہے۔ اس آئینہ خانے میں کیسے کیسے نادر کردار ہیں جو اپنی آن بان کے نت نئے زاویوں سے قاری کو متحیر کر دیتے ہیں۔ اس میں ترقی پسند شاعر نیاز حیدر ہیں جو اُردو کے کلچر کے آخری بوہیمین شاعر تھے۔ اس میں راجندر سنگھ بیدی، ساحر لدھیانوی، مجروح سُلطان پوری، باقر مہدی، جون ایلیا، اختر الایمان، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سردار جعفری، ظ۔ انصاری، راہی معصوم رضا، فلم ساز کمال امروہوی اور کئی دِیگر معروف و غیر معروف ہستیوں کے دِل چسپ اور خیال انگیز مرقعے ہیں' جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ یہ مرقعے اگرچہ ندا کے اپنے زاویۂ نظر کے ترجمان ہیں تاہم ان میں ایک معروضی صداقت کے ساتھ ساتھ ہمدردی اور انسانیت کی ایک زیریں لہر بھی موجود ہے جو برابر رواں دواں رہتی ہے۔ ندا کے اُسلوب کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ ایک فقرے یا چند لفظوں میں ایسی ہُنرمندی سے شخص اور شاعر دونوں پر اس طرح کے تبصرے کر جاتے ہیں' جن کی کاٹ مشکل ہے۔ مثلاً

''اختر الایمان دُوسروں سے مختلف ہیں لیکن وہ جب بھی اپنی نظموں کی تعریف سے فرصت پا کر کبھی اپنے عہد کے شاعروں کی فہرست بناتے ہیں تو نہایت ایمانداری سے اپنے علاوہ اپنے سارے

معصرین کے نام بھول جاتے ہیں۔"

"باقر مہدی کے باغیانہ مزاج نے کبھی کوئی ذریعہ معاش پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اُن کے ملنے جلنے والوں میں جب بھی کوئی اُن کی اِس رَوایت سے انکار کرتا ہے تو اُن کی زبانی تنقید کے عذابوں کا شکار بن جاتا ہے۔"

ندا فاضلی نے جس شخص کو جس طرح پایا' بغیر لاگ لپیٹ کے اُس کو اُسی طرح پیش کیا ہے۔ خود اپنی شخصیت کے بارے میں بھی اُنھوں نے کوئی رُو رعایت نہیں کی ہے اور اپنے بعض پہلوؤں کو بھی نہیں چھپایا ہے۔ ممبئ کی سماجی زندگی میں بے روزگاری، شراب نوشی اور مکرو فریب سے زندگی کی لذّت چشیدگی، خود پرستی، عیاری اور جھوٹ کے ساتھ ساتھ انسانی قدروں کے اثبات کی جھلکیاں بھی اِس کتاب کے ناقابلِ فراموش عناصر ہیں' جن سے اِس کی قدرو قیمت میں اضافہ ہُوا ہے۔

اِس کتاب میں ندا فاضلی کا تنقیدی شعور بھی بڑا نکھرا، ستھرا اور کاٹ دار نظر آتا ہے۔ ایک ایک دو، دو فقروں میں اُنھوں نے کسی شاعر یا افسانہ نگار کے بارے میں جو جچی تُلی اور متوازن رائے ظاہر کر دی ہے وہ بعض اوقات طویل مقالوں پر بھی بھاری نظر آتی ہے۔ مثلاً:

"اختر الایمان نے سماج اور فرد کے جبریہ سمجھوتے کو جس طرح ایک سماجی اقدار کے طور پر بار بار دُہرایا ہے' اِس سے اُن کا شعری کردار فارمولائی اور معاشرے کے ایک بہت چھوٹے حصے میں محصُور محسوس ہونے لگتا ہے۔ اُن کے یہاں زندگی کا مقصد صرف زندگی کرنا ہے' اِس کا رشتہ تاریخ، تہذیب اور وَقت کے تسلسل سے کٹ کر یک رُخا اور سمٹا ہوا لگتا ہے۔"

"عصمت میں کہانی کار کی قوت' اُن کا ماضی ہے۔ اُنھوں نے جب بھی دُور ہوتے اس ماضی کے بجھتے ہُوئے انگاروں کو روشن کیا۔ اُردو ادب کو دوزخی، چوتھی کا جوڑا اور ننھی کی نانی جیسی کہانیوں سے امیر بنایا۔ اپنے ماضی سے جہاں وہ دُور ہوتی ہیں' اس دَردمندی کو پیدا کرنے سے معذور ہو جاتی ہیں' جو اُن کے اَفسانوں کے وَقار کا معیار ہے۔"

ایسے ایسے درجنوں بصیرت افروز فقرے اِس کتاب میں بکھرے پڑے ہیں۔ ندا کے جاندار اور توانا اُسلوب نے اِس کتاب کو اور زیادہ لائقِ مطالعہ بنا دیا ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں ہر سال چھپنے والی اُردو کتابوں میں خال خال ایسی کتابیں ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر ذہن و دِل کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں' اور میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہُوں کہ اِنہیں خال خال کتابوں میں سے ایک کتاب "دیواروں کے باہر" بھی ہے۔

عرصۂ دراز سے ممبئی میں بُود و باش رکھنے کی وجہ سے تذکیر و تانیث میں گڑبڑ کر جاتے ہیں اور کہیں جملوں کی نحوی ساخت سے سرسری گذر جاتے ہیں۔ مگر ایسے مقاماتِ آہ و فغاں اس کتاب میں کم ہی ہیں۔

ضخامت: ۲۳۸ صفحات، قیمت ۱۵۰/روپے، سنِ اشاعت ۲۰۰۰ء، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ اُردو بازار جامع مسجد، دہلی، علی گڑھ، ممبئی۔

••

پھوٹی کرن، اذان کی، جاگے پنچھی ڈھور
چڑیوں کی چہکار میں، کرے تلاوت بھور

ندیا سے بادل بنے، بادل سے برسات
تو چاہے جو روپ لے، میں ہوں تیرے سات

دیواروں کے بیچ.....ایک جائزہ

● سلام بن رزّاق

اردو میں ناول کی ابتدا سو' سوا برس پہلے ہوئی تھی۔ مگر آج بھی اردو کے ناقدین اور قارئین کو یہ شکایت ہے کہ اردو میں ناول کی کوئی ٹھوس روایت نہیں ہے۔ یا بقول قرۃ العین حیدر '' چھکے چھڑا دینے والے ناول اردو میں آج تک نہیں لکھے گئے۔ '' اگر چہ کہ ادھر چند برسوں میں پاکستان اور ہندوستان میں چند اچھے ناول لکھے گئے ہیں مگر ان کی تعداد بس انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

دیگر زبانوں میں ناولوں کے علاوہ سوانحی ناولوں کی بھی ایک خاص روایت ہے۔ اردو میں اس کا کوئی چلن نہیں ہے۔ البتہ اردو میں خودنوشتیں ضرور لکھی گئیں مگر '' یادوں کی برات '' ، '' شہاب نامہ '' اور اختر رائے پوری کی '' گردِ راہ '' کے علاوہ بہت کم کتابوں کو مقبولیت نصیب ہو سکی۔ قرۃ العین حیدر کی '' کارِ جہاں دراز ہے '' کو سوانحی ناولوں کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ مگر بعض نقادوں کو اسے ناول کی حیثیت سے قبول کرنے میں اس لئے تامل ہے کہ اس میں مصنفہ نے خود کو وقائع نویس سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ادھر ممتاز شاعر اختر الایمان بھی اپنی خودنوشت لکھ رہے ہیں جو سوغات میں قسط وار چھپ رہی ہے۔ جو خاص دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ ندا فاضلی کی تصنیف '' دیواروں کے بیچ '' کو اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھا جا سکتا ہے۔ '' دیواروں کے بیچ '' کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے ماہنامہ شاعر میں قسط وار چھپ کر اہل نظر سے داد پا چکی ہے۔

ندا فاضلی کا شمار ہمارے عہد کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے۔ مگر اپنے ہم عصر شاعروں میں ان کا نام اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ وہ نہ صرف ایک خوش فکر شاعر ہیں بلکہ ایک صاحبِ طرز نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی کتاب '' ملاقاتیں '' اپنے منفرد اسلوب اور بے باک لب و لہجے کے سبب اردو نثر کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

ندا فاضلی کی تازہ تصنیف '' دیواروں کے بیچ '' نثر میں ان کی دوسری کتاب ہے۔ ناقدین اور قارئین میں اس بات پر اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ یہ خودنوشت ہے' سوانحی ناول ہے' آیا ناول ہے۔ مگر

اس بات پر سب متفق ہوں گے کہ یہ ایک فکر انگیز اور دلچسپ تصنیف ہے جس میں مصنف نے اپنے بے باک قلم سے نہ صرف اپنی زندگی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ سماج کے بعض نازک گوشوں سے بھی پردے اٹھائے ہیں۔ ہر چند کہ اردو میں لکھی گئی سابقہ خودنوشتوں کے مقابلے میں '' دیواروں کے بیچ'' کا قلم زیادہ بے باک اور دھار دار ہے۔ مگر جب ہم دوسری زبانوں بالخصوص مراٹھی زبان میں لکھی گئی دلتوں کی خودنوشتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو ادیب میں صداقتوں کو برہنہ کرنے کی جرأت ابھی پوری طرح پیدا نہیں ہوئی ہے۔ یا بالفاظ دیگر ہماری نثر غزل کے اثر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئی ہے اور آج بھی ہم عریاں حقیقتوں کو رمز و کنایے کے پردے میں بیان کرنے کے عادی ہیں۔ یعنی

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

'' دیواروں کے بیچ'' کا مصنف بھی ہزار چاک پیرہنی کے باوجود بعض مقامات سے دامن بچا کر گذرتا نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ندا اور عشرت کے رشتے میں کچھ ایسی گرہیں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں جنہیں قاری کوشش کے باوجود کھول نہیں پاتا۔ ندا کے تئیں عشرت کا رویہ عجیب معماتی سا ہے۔ دونوں ذہنی طور پر قریب ہیں جسمانی طور پر بھی قریب آجاتے ہیں۔ مگر ان دونوں کے درمیان وہ کون سی گرہ تھی جو آخر تک کھل نہیں پائی۔ مصنف اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا اس لئے عشرت کا کردار ایک جیتا جاگتا کردار بننے کی بجائے صرف پرچھائیں بن کر رہ گیا ہے۔ خود ندا کا رویہ بھی عشرت کے تئیں واضح نہیں ہے۔ عشرت اور ندا گھر سے فرار ہونے کا منصوبہ بناتے ہیں مگر عین وقت پر ندا مقررہ جگہ پر نہیں پہنچتا' کیوں نہیں پہنچتا اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ اس کے باوجود کتاب میں کچھ کردار ایسے ہیں جو قاری کو یاد رہ جاتے ہیں۔ ان میں ندا کی والدہ جمیل فاطمہ کا کردار پوری کتاب میں برگد کی چھاؤں کی طرح چھایا ہوا ہے۔ جس کے ٹھنڈے سایے میں دوسرے کردار کچھ دیر ستاتے اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

جمیل فاطمہ کے کردار میں ممتا کا تقدس، نسوانی پاکیزگی اور ایک خاتون خانہ کی ذمہ داریوں کا کچھ ایسا امتزاج ہے کہ وہ ایک مکمل اور آئیڈیل مشرقی خاتون کے روپ میں ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس مرتضیٰ حسن اپنی شخصیت کی بوقلمونی کے باوجود کوئی یادگار کردار نہیں بن پائے۔ جبکہ مصنف یا ندا کی ذہنی وابستگی جمیل فاطمہ سے زیادہ مرتضیٰ حسن ہی سے ہے۔ اسی لئے تو ندا ان کی موت پر ایک تاثر انگیز نظم کہتا ہے۔ کراچی سے ماں کی موت کی خبر ملنے پر ہندوستان میں اپنے باپ کی داشتہ زینن

کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا اس بات کا اشارہ ہے کہ ندا کو زیبُن میں اپنی ماں کی ممتا کی جھلک نظر آتی تھی۔ یہ واقعہ رشتوں کے..... پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

مرتضٰی حسن شاعر ہیں' عورتوں سے آشنائیاں کرنے میں طاق ہیں اس لئے شادی کی اخلاقی پابندیوں کے باوجود زندگی کو پوری آزادی سے جینے کے قائل ہیں۔لہٰذا شادی کے بعد بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آتا۔جمیل فاطمہ ایک سگھڑ گھریلو خاتون ہیں اور صبر و رضا کی پتلی ہیں۔وہ ازدواجی رشتے کو آسمان پر طے ہونے والا رشتہ سمجھتی ہیں' اس لئے اپنے شوہر کی ساری بے اعتدالیوں کو ایک شریف اور صابر بیوی کی طرح برداشت کر لیتی ہیں۔

ندا کا آئیڈیل چونکہ مرتضٰی حسن ہیں اس لئے وہ بھی ایک بوہیمین (Bohemian) زندگی کی ڈگر پر چل پڑتا ہے اور اس راہ میں پیش آنے والے سارے تلخ و ترش واقعات کو ایک محتاط سچائی کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔جمیل فاطمہ، مرتضٰی حسن اور ندا اس کتاب کے اہم کردار ہیں۔ان کے علاوہ کتاب میں زیبُن اور شیلا کے کردار ہیں۔ان میں زیبُن' مرتضٰی حسن کی داشتہ اور شیلا بیر کمار کی محبوبہ ہے۔زیبُن کو ندا سے خاص لگاؤ ہے۔غالباً اس لئے اسے ندا کے لاابالی پن میں مرتضٰی حسن کی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔مرتضٰی حسن پاکستان جانے کے بعد وہاں کے معاشرے میں ڈھل کر اسلامی ہو جاتے ہیں۔مگر یہاں زیبُن 'اک شمع رہ گئی ہے' وہ بھی خموش ہے' کی منہ بولتی تصویر بن جاتی ہے۔زیبُن کا انجام قاری کو تھوڑی دیر کے لئے مضطرب کر دیتا ہے اور اس جاگیردارانہ سماج کی یاد دلاتا ہے جس میں مرد کا اپنی منکوحہ عورت کے علاوہ دوسری عورتوں بالخصوص طوائفوں کو اپنی داشتہ بنانا ایک عام رواج تھا۔

عام طور پر ایسی عورت یا طوائف تریا چلتر سے بخوبی واقف ہوتی اور مرد کو اپنے حسن کے دام میں اس طرح پھانس لیتی کہ وہ اس پر جان و مال دونوں نچھاور کر دیتا۔بصورتِ دیگر عورت میں ذرا بھی وفا کی خو آ جاتی تو وہ خود اپنی ہی آگ میں جل کر بھسم ہو جاتی۔زیبُن بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جو مرتضٰی حسن سے وفاداری اس طرح نبھاتی ہے جیسے وہ ان کی داشتہ نہ ہو کر محبوبہ ہو۔یہی نہیں بلکہ وہ مصیبت کے وقت ان کی دستگیری بھی کرتی ہے مگر مرتضٰی حسن کے پاکستان چلے جانے کے بعد اس کے حصے میں ایک جاں سوز تنہائی کے سوا کچھ نہیں آتا' اور وہ آخری لمحے تک مرتضٰی حسن کی یادوں کو سینے سے لگائے وقت کے تھپیڑے کھاتی، رُلتی گھلتی ایک دن ماضی و حال کی کش مکش سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتی ہے۔

اس کتاب میں بیر کمار اور شیلا کے کردار کو بھی قاری آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔بیر کمار کا جیل

جاتے جاتے ندا کے لئے کالج کی فیس کا انتظام کر جانا منٹو کے کرداروں کی یاد دلاتا ہے جو گردن' گردن گناہ آلود دلدل میں دھنسے ہونے کے باوجود اپنی کسی نہ کسی 'ادا' سے اپنے 'انسان' ہونے کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں۔ شیلا جو بیر کمار کی محبوبہ ہے اس کے مرنے کے بعد طوائف بن جاتی ہے اور ایک دن خود ندا جب اس سے ٹکراتا ہے تو دونوں بیر کمار کی یاد میں جسمانی دوریوں کو عبور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ یہاں نفسانی خواہش سے زیادہ انسانی رشتوں کی کشاکش یا جذبات کے تصادم کو پوری شدت سے بیان کرنے کا موقع تھا مگر مصنف اس واقعہ سے سرسری سا گذر جاتا ہے' جس سے قاری کی تشفی نہیں ہوتی۔ ندا جب شیلا کو فیس دینا چاہتا ہے تو وہ سنجیدگی سے کہتی ہے۔

''تم میرے مرد کے دوست ہو' وہ تمہیں بہت چاہتا تھا۔ میرے تمہارے بیچ گاہکی کیسے ہوگی' گھر کے لوگوں سے بھی کوئی لین دین کرتا ہے؟'' شیلا کے یہ الفاظ دراصل ایک طوائف کے الفاظ ہیں مگر ان الفاظ کے پیچھے جو اخلاقی قدر یا جو جذباتی نکتہ ہے وہ شیلا کے کردار کو کوٹھے سے اٹھا کر مندر کی ویدی پر بٹھا دیتا ہے۔

مصنف نے اپنے اطراف کے ماحول اور کرداروں کے اندر بساط بھر جھانکنے اور انہیں پرت پرت کھولنے کی کوشش کی ہے مگر اوّل تو ''دیواروں کے بیچ'' میں ایسا کوئی بڑا کردار نہیں ہے جو اردو فکشن میں ایک یادگار کردار کی حیثیت سے زندہ رہ جائے۔ دوسرے نہ کسی کردار میں ایسی پیچیدگی ہے جس کی گرہ کشائی میں مصنف کو اپنے قلم کا انتہائی جوہر صَرف کرنا پڑا ہو۔ ندا' جمیل فاطمہ اور مرتضٰی حسن کو چھوڑ کر تمام کردار ریل کے مسافروں کی طرح مختلف اسٹیشنوں پر چڑھتے اترتے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ مگر مجموعی اعتبار سے یہی چھوٹے چھوٹے کردار کتاب کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں اور قصے کے تسلسل کو قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ جیسے اجنبی عورت کی بپھری جوانی کو سر نہ کر پانے کی صورت میں آنسو بہاتا خیرالدین عرف خیرو بھائی کا بڑھاپا' کالج میں ندا کی کلاس فیلو مس ٹنڈن' جس کا مہکتا، چھکتا بدن اور سنجیدہ رکھ رکھاؤ ندا کے ذہن میں نئی شعری زبان کا تجسس جگا دیتا ہے۔ سونالی جو مروجہ نظام کے جبر اور ناانصافی کے خلاف لڑنے اور احتجاج کرنے والے گروہ کی ایک فرد ہے۔

مصنف نے سونالی اور اس کے ساتھیوں کا ذکر اس قدر سرسری سا کیا ہے کہ ان کی کوئی بھی تصویر واضح نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ سونالی اور ندا کا رشتہ بھی اس قدر مبہم ہے کہ قاری آخر تک اس رشتے کو کوئی نام نہیں دے پاتا۔ آخر میں ٹرین چھوٹنے سے پہلے سونالی کا ندا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا آرٹ فلم کے

ایک دہرائے ہوئے منظر کی طرح یاد رہ جاتا ہے۔ چند سطروں میں رضی صاحب کا خاکہ ہجڑوں کے گرو حاجی صاحب کا کردار اور کسی نیپالی کو ہجڑہ برادری میں شامل کی جانے والی رسم کا تذکرہ اور اسے مسلمان بنانے کی رسم دلچسپ ہے۔ اس بات پر ہندو مسلم فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فرقہ ورانہ فسادات کے پیچھے کیسی کیسی بوالعجبیاں کارفرما ہوتی ہیں۔ سلیم کا کردار بھی ایک خلش چھوڑ جاتا ہے۔ سلیم مرتضیٰ حسن کے کسی بازاری عشق کا ثمرہ ہے۔ مگر اسے اپنی ماں سے نفرت ہے اس لئے وہ ندا اور اس کے گھر والوں کے ساتھ رہنے پر اصرار کرتا ہے' ان کی خدمت کرتا ہے اور بیمار ہو کر انہیں کے درمیان اپنی زندگی کی آخری سانس لیتا ہے۔ سلیم کا کردار قاری کے ذہن میں کسی جگنو کی طرح چمک کر بجھ جاتا ہے۔ سلیم کی موت نہ صرف ندا کی ماں کے دل کا داغ بن جاتی ہے بلکہ قاری کے دل پر بھی چوٹ کر جاتی ہے۔

کتاب میں سلام مچھلی شہری کا کیری کیچر خوب ہے۔ پورا خاکہ کفایت لفظی کا عمدہ نمونہ ہے۔ ندا اس ناول نما سوانح یا سوانح نما ناول کا مرکزی کردار ہے جو ایک خاموش تماشائی کی طرح دنیا اور معاملاتِ دنیا کو دیکھ یا بھوگ رہا ہے۔ مگر اس کی شخصیت خود اپنی داخلیت کے بوجھ سے اس قدر گراں بار ہے کہ قاری کے اندر کوئی حوصلہ، کوئی امنگ یا کوئی جذبہ پیدا نہیں کر پاتی۔ ندا کے کردار کو کچھ اس احتیاط سے تراشا گیا ہے کہ کتاب کے دوسرے کردار اس کے گرد حرکت کرنے یا اس سے متصادم ہونے کی بجائے اس کا طواف کرتے نظر آتے ہیں۔

کتاب میں پجاری کا مورتی سے پھول اٹھا کر ندا کے ہاتھ میں رکھنا اور ندا کے بیمار پڑنے پر عیادت کے لئے اس کے گھر جانا دھرم اور مذہب سے ہٹ کر انسانی رشتے کی عظمت کا اشاریہ ہے۔ تقسیمِ ملک کے ہنگاموں کے بعد نئے پجاری کا ندا کو پہچاننے سے انکار کر دینا ظاہر کرتا ہے کہ تقسیمِ ملک سے پہلے ہندو اور مسلمان کے درمیان انسانیت ایک قدرِ مشترک تھی مگر تقسیم کے بعد سیاست کی ایک موہوم لکیر نے زمین کے ساتھ انسانی قدروں کو بھی تقسیم کر دیا۔ انسانی رشتے کی پاکیزگی اور تاریخ کی اس جبریت کو مصنف نے گلاب اور زخم کے استعارے سے ظاہر کیا ہے۔ تقسیم کے بعد بھوپال میں پناہ گزینوں کے کیمپ کا جو نقشہ کھنچا گیا ہے وہ اس زمانے میں برصغیر کے مختلف پناہ گزین کیمپوں کا ایک عبرت خیز نمونہ ہے۔

''دیواروں کے بیچ'' اسکرین پلے کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ اس میں ہمیں کوئی پلاٹ نہیں ملتا مگر

مصنف نے ندا کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے بکھرے واقعات کو جمالیاتی رنگ آمیزی کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے پیرایۂ بیان میں قصہ گوئی کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ شان بھی پیدا ہوگئی ہے۔ زبان و بیان پر مصنف کی گرفت مضبوط ہے۔ وہ معمولی سی بات کو بھی غیر معمولی طور پر پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ ایک معمولی سے چیونٹے کی تگ و دو کی جزیات کو ایسی فنکارانہ چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے کہ مصنف کی قوتِ مشاہدہ کی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ تین صفحات پر مشتمل ایک غیر اہم واقعہ کو مصنف نے اپنے بیان کے جادو سے غیر معمولی بنا دیا ہے۔ اس واقعہ کو پڑھتے ہوئے ہیمنگ دے کا مشہور ناول (Old man and the sea) یاد آجاتا ہے۔ مصنف نے چیونٹے کے پردے میں انسانی جد و جہد اور قدرتی آفات سے اس کی مبارزت اور تصادم کو تمثیلی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہاں زندگی اور موت کے ازلی رشتے کے ساتھ ساتھ جبر و اختیار کی نکتہ آفرینی کا کمال بھی موجود ہے۔ اس واقعہ کی حد تک اسکرین پلے کی تکنیک بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مگر پوری کتاب اس کی متحمل نظر نہیں آتی۔

زمانۂ حال کے صیغے میں ایک آدھ افسانہ تو لکھا جا سکتا ہے مگر اس صیغے میں پوری کتاب کا مطالعہ قاری کو تھکا دیتا ہے۔ اس سے واقعات کی روانی بھی متاثر ہوتی ہے۔ بعض جگہ خود کلامی کا سا گمان ہوتا ہے۔ دراصل تکنیک کے اعتبار سے مصنف تذبذب کا شکار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا انبار ہے مگر انہیں ناول کے فارم میں ڈھالنے کے لئے جو معروضی نقطۂ نگاہ کی ضرورت ہے وہ مفقود ہے۔

کتاب میں کرداروں کا ہجوم ہے مگر چونکہ یہ سارے کردار حقیقی ہیں اس لئے مصنف انہیں حقیقت کی آنکھ سے دیکھ اور پرکھ رہا ہے۔ حقیقت کے رنگ میں جب تک خیال کا عنصر شامل نہیں ہوتا 'فکشن' وجود میں نہیں آسکتا۔ کتاب کے آخری پچاس صفحات میں بمبئی کا تذکرہ ملتا ہے۔ مصنف نے بمبئی میں اپنی عمر کا تقریباً نصف حصہ گذارا ہے۔ حالات کے سرد و گرم بھی سہے ہیں اور تلخ و ترش تجربات سے بھی گذرا ہے۔ مگر بمبئی کی ادبی سرگرمیوں، ادبی شخصیتوں اور بمبئی میں اپنے شب و روز کا ذکر کچھ اس قدر پھیکا پھیکا سا ہے کہ کتاب کا یہ حصہ محض ڈائری معلوم ہوتا ہے۔

پچھلے پچاس برس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں سے لے کر مشاعروں تک جو ادبی معرکے ہوئے ہیں وہ خود ایک ضخیم کتاب کا تقاضہ کرتے ہیں۔ پچھلے تیس برسوں سے مصنف بھی ان ادبی

جلسوں کا صرف چشم دید گواہ ہی نہیں بلکہ ان کا ایک حصہ بھی رہا ہے۔ مگر کتاب میں ان کا تذکرہ اس قدر غیر دلچسپ طریقے سے کیا گیا ہے کہ قاری کسی حیرت خیز تجربے سے دوچار نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے جیسے یہ ساری شخصیتیں بمبئی میں ندا کی پذیرائی اور دل بستگی پر معمور کی گئی ہوں۔ مصنف یہاں اپنے اطراف کے ماحول کی گہرائی میں غوطہ لگانے کی بجائے صرف سطح پر تیرتا نظر آتا ہے۔ اس لئے کتاب کا یہ حصہ قاری کو متاثر نہیں کرتا' اس کے باوجود اگر ایک طرف زبان کی دلکشی کتاب کو دلچسپ بناتی ہے تو دوسری طرف مصنف کی نکتہ سنجی اور فقروں کی بلاغت قاری کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے۔ مثلاً:۔

''دوسرے کے غم کو بہانہ بنا کر ہم اکثر اپنے ہی کسی غم کو روتے ہیں۔'' ، ''خدا آسمان سے اتر کر موت کی خوشبو کی طرح مسجد کے آنگن میں پھیل جاتا ہے۔''، ''چہروں اور ناموں کے امتیازات زندگی کے واہمے ہیں۔ حقیقت صرف مٹی ہے جس کا ہر جگہ ایک نام، ایک چہرہ اور ایک رنگ ہے۔''

ایسے بلیغ فقرے کتاب میں ورق ورق بکھرے ہوئے ہیں۔ تمثیلی اظہار کی ایک مثال دیکھئے۔

''ندا کا ان دنوں کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے' کمرے کا کرایہ چڑھ چکا ہے۔ کالج کی پڑھائی کام کاج کی تلاش کی نذر ہو چکی ہے' روٹیاں چاند کی مانند حسین ہو کر دور سے لبھانے لگی ہیں' دن بھر اِدھر اُدھر بھٹکنے کے باوجود کبھی صبح کا ناشتہ دوپہر کے کھانے سے ناراض رہتا ہے' کبھی رات کا کھانا ان دونوں سے اپنی خفگی کا اظہار کرتا ہے۔ نچلے متوسط طبقے کے معاشرے کی پرورش نے ضرورتوں کو گونگا کر دیا ہے۔ نہ ہونٹ پریشانی کے لفظ ادا کر پاتے ہیں نہ ہاتھ مجبوری بن کر پھیلتے ہیں۔''

یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ ''ملاقاتیں'' کے بعد ''دیواروں کے بیچ'' لکھ کر مصنف نے ایک بار پھر اپنی نثر کا لوہا منوالیا ہے۔ ''دیواروں کے بیچ'' ممکن ہے مقبولیت میں ''ملاقاتیں'' کی ہمسری نہ کر سکے۔ تاہم اس میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ اردو کی خودنوشتوں یا سوانحی ناولوں میں ''دیواروں کے بیچ'' اپنے اسلوب کی انفرادیت اور بیباکی اظہار کے سبب عرصے تک یاد رکھی جائے گی۔

●●

کوشش بھی کر، امید بھی رکھ، راستہ بھی چُن
پھر اس کے بعد تھوڑا مقدر تلاش کر

دیواروں کے بیچ......ایک تجربہ

● پروفیسر علی احمد فاطمی

ندؔا فاضلی اُردو کے ممتاز ومقبول شاعر ہیں' بحیثیت شاعر اُن کی ایک الگ شناخت ہے' اِس شناخت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ روایتی طور پر اُردو کے بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک دانشور بھی ہیں' گہری سماجی وتہذیبی فکر ونظر بھی رکھتے ہیں' اور اُنھیں جستہ جستہ نہایت سلیقہ سے شعری ونثری پیکر میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ بہت پہلے اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''لفظوں کا پل'' شائع ہوا تھا تو اُسی کے آس پاس اُنھوں نے ''ملاقاتیں'' نام کی بھی ایک کتاب شائع کی تھی جس میں مشاہیر ادب سے ملاقاتیں اور اُن سے ادبی مسائل پر گفتگو تھی' جسے عرفِ عام میں ہم انٹرویو کہتے ہیں۔ یہ انٹرویوز بہت دِلچسپ اہم اور معلوماتی انداز میں پیش کئے گئے تھے' جس سے یہ کتاب ہٹ ہوئی اور ندؔا فاضلی بھی اور اُن کی فکری کج ادائی بھی' جو اِس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ وہ اپنے علاوہ دوسروں کو بھی پڑھتے ہیں' باخبر رہتے ہیں اور اُن پر اپنی نیم تخلیقی اور نیم تنقیدی رائے بھی رکھتے ہیں۔

اِس درمیان اُنھوں نے اپنا شعری سفر ''مورناچ'' اور ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' کے ذریعہ طے کرتے ہوئے اپنی شاعرانہ پہچان کو مزید معتبر اور مستحکم کیا اور یقیناً ندؔا کی شاعری میں ندا ایک منفرد، مدھر، رنگارنگ معنویت ومقصدیت کا طوق پہنے اِنسان دوستی وتہذیبی وُسعت کو اپنے آپ میں جذب کئے گوالیار سے ممبئی، گاؤں سے شہر کے تمام اُتار چڑھاؤ اور رموز ونکات کو سمیٹے اپنے آپ میں ایک مخصوص دعوتِ فکر اور دعوتِ مطالعہ دیتی رہی' اور یہ حقیقت ہے کہ ندؔا کی شاعری بظاہر جتنی آسان لگتی ہے اِس کے سِروں اور اُس روایت کی تلاش اور اُس کے پس منظر کی تلاش اُتنی ہی مشکل ہے۔ اِس کے لئے دیہی و قصباتی تہذیب کی خاک تو چھاننی ہی پڑے گی' شہر کے عام انسانوں کے پیچھے بھی بھٹکنا پڑے گا۔ ساتھ ہی اِن مٹھوں، خانقاہوں، درگاہوں کے چکر بھی لگانے پڑیں گے جن کے درمیان رہ کر ندؔا کی فکر جوان ہوئی اور جن کی صوفیانہ تہذیب نہ صرف ندؔا کی شخصیت بلکہ اُن کی شاعری میں فطری اور لاشعوری انداز میں حلول کر گئی۔ بالکل ایسے ہی جیسے کبیر، میرا، خسرو، نظیؔر وغیرہ میں آپ کو نظر آئے گی۔

ندا کی شاعری کا کینویس اتنا وسیع اور معنوی آہنگ اس قدر کھنک دار ہے کہ بادی النظر میں اُن کی شاعری کی اصل پہچان نہ صرف ناممکن ہے بلکہ انصاف کے منافی بھی۔ اِس لئے ضرورت اِس بات کی ہے کہ ندا کی شاعری کا مکمل و مفصل جائزہ لیا جائے اور شاعری کی اِس دوسری روایت کی تلاش کی جائے جو ہماری اصل تہذیب کی آئینہ دار ہے لیکن جور و مانیت اور معیار پرستی کے غیر ضروری اثرات کے تلے کہیں گم ہوگئی ہے یا گم کردی گئی ہے۔ پیشِ نظر اُن کی نثری کاوِش ''دیواروں کے بیچ'' اُن کی نثر سے زیادہ اُن کے شعری افہام میں معاونت کرتی ہے۔

۱۷۷ صفحات پر مشتمل ندا کی اِس نثری تخلیق کو پہلی نظر میں خود نوِشت ہی کہا جائے گا اور یہ ہے بھی خود نوِشت ہی۔ لیکن ندا نے اپنے دِلکش اسلوب' قوتِ مشاہدہ اور اپنی تہذیب، معاشرت و سیاست پر جذباتی گرفت نے اِس کتاب کو اِس قدر دِلچسپ، بامعنی اور خلاّقیت کی اُن حدوں تک پہنچا دیا ہے جہاں سے اِس پر ناوِل ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ اِس کی ابتدا ناول کی طرح ہوتی ہے۔ ایک خود نوِشت سوانحی ناوِل سے دور بھی ہوتا جاتا ہے۔ کتاب کے خاتمہ تک قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس صِنف کی کتاب پڑھ رہا ہے' بس پڑھ رہا ہے اور ایک دوسری دُنیا میں پہنچتا چلا جارہا ہے۔ لیکن کتاب کے خاتمہ کے بعد ایک خاص مقام پر قاری کو یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ یہ کتاب جو اُس نے ابھی ختم کی وہ اصلاً ہے کیا اور اُسے کس خانے میں رکھا جائے کہ خانہ بندی اور گروپ بندی کے ہم ابتدا سے ہی قائل رہے ہیں۔ حالانکہ اسی طرح اُردو کی نہ جانے کتنی بے مثال کتابیں جن کے بارے میں کل بھی بحث تھی اور آج بھی ہے کہ یہ کس نوعیت کی کتابیں اور کس ادبی صنف سے اس کا رشتہ استوار کیا جائے۔ مثلاً: آبِ حیات، روشنائی وغیرہ لیکن ان کے بڑے ہونے میں ذرا بھی شبہہ نہیں۔ اُردو میں خود نوِشت قسم کے ناوِل کتنے کامیاب ہوئے۔ خود نوِشت ناوِل ہوتے بھی ہیں یا نہیں' یہ بھی ایک بحث ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کتاب ''کارِ جہاں دراز ہے'' جتنی معلوماتی اور تاریخی کتاب ہے اتنی ہی ''آگ کا دریا'' اور ''آخر شب کے ہم سفر'' سے دُور۔ یہ بحث لازمی ہے اور لا حاصل بھی۔ آیئے براہِ راست اِس کتاب کی ندرت اور حیثیت پر باتیں کریں۔ ندا کی یہ کتاب شروع ہوتی ہے ان جملوں سے۔

''سورج غروب ہو رہا ہے ایک بے ہوش عورت کے گرد تین چار بچے سہمے ڈرے بیٹھے ہیں۔ بڑی بہن اُٹھ کر لالٹین کی چمنی صاف کر کے اُسے روشن کرتی ہے۔ چاروں طرف چت کبری روشنی پھیل جاتی ہے۔ سامنے اِملی کے درخت پر ایک ڈراؤنا بھوت روز کی طرح آج بھی آکر بیٹھ گیا ہے۔ لمبے لمبے

دانت، ٹیڑھے میڑھے ہاتھ پاؤں، ہوا سے شاخیں ہلتی ہیں تو اُس کی گرم سانسیں بہت قریب محسوس ہوتی ہے۔ دالان سے آنگن میں آتے بھی ڈر لگتا ہے۔ بڑی بہن بھوت کو دفع کرنے کے لئے اندر سے قرآن شریف لاکر باہر اسٹول پر رکھ دیتی ہے۔ بچوں اور بھوت کے درمیان اللہ کے کلام کی حد بن جاتی ہے۔ بھوت میں اس حد کو پھلانگنے کی ہمت نہیں ہے۔ لیکن جب بھی نظر اُٹھتی ہے وہ املی کی شاخوں سے جھانکتا نظر آتا ہے۔''

صاف ایسا لگتا ہے کہ کسی ناول کا آغاز ہو رہا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا اس لئے ہوا کہ ندا نے ماضی کو حال کے صیغہ میں اور کہیں علامتی انداز میں۔ ان کا یہ ماضی ان کے حال کی طرح زندہ و تابندہ ہے۔ اُن کی زندگی میں ماضی کا جو رول ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے جو لوگ تہذیبی اقدار اور اثرات پر یقین رکھتے ہیں۔ اُن کی نفسیاتی گرہوں اور نزاکتوں کا اکثر یہی عالم ہوتا ہے۔ یہ اشاریت تو ندا کی شاعری میں جھلکی پڑتی ہے یا پھر یہ کہ وہ ماضی میں پہنچ کر اسے حال کا پیکر عطا کر کے اپنے قاری کے سامنے ایک جگمگاتا اور دمکتا ہوا دور پیش کرنا چاہتے ہوں' یہ ایک ترقی پسندانہ عمل ہے۔ بہر حال وہ دونوں اعتبار سے کامیاب ہیں اور اس لئے بھی کامیاب ہیں کہ شاید پہلی بار یا عرصۂ طویل کے بعد دبستان داغؔ کی شعری روایتوں اور حضرت دُعا و نوحؔ کی شاعرانہ کاوشوں اور لسانی موشگافیوں کی محفلیں سامنے آتی ہیں اور شاید اس لئے بھی کہ اُردو کے مراکز دہلی، لکھنؤ، لاہور اور حیدرآباد وغیرہ کا ذکر تو ہم نے بہت سنا لیکن شاید گوالیار پہلی بار ہمارے سامنے آیا اور ندا نے گوالیار کو بڑے سلیقہ و ظرف سے پیش بھی کیا اور وہاں کی صرف محفلوں کا ہی ذکر نہیں بلکہ تہذیب و معاشرت اور حد یہ کہ فرقہ داریت کو بڑے قریب سے دیکھا اور پیش کیا ہے۔ جس سے نہ صرف گوالیار کی بلکہ اس عہد کے ہندوستان کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے' اس تصویر میں صرف اُردو والے نہیں ہیں' صرف مسلمان بھی نہیں ہیں۔ بلکہ پنڈت جی ہیں، بیر کمار ہیں، رام نرائن ہیں، خلیل احمد اور ہجڑے بھی ہیں غرض یہ کہ کرداروں کی بھیڑ ہے اور ہر کردار کو ندا نے اپنا کردار سمجھ کر پیش کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے وہ کردار جن کی زیادہ حیثیت بھی نہیں اُن کی پیش کش بھی لاجواب ہے کہ زندگی میں کرداروں کے چھوٹے بڑے کی حیثیت کم گہرے اور پُر اثر ہونے کی حیثیت زیادہ ہوا کرتی ہے خواہ وہ ماسٹر ہو، دکاندار، صوفی شاہ، دودھ والا اور نہ جانے کتنے جیسے '' فسانہ ' آزاد'' میں کرداروں کی ریل پیل ہے۔ اِن سب کی بھیڑ میں ندا کا اپنا کردار بھی ہے۔ سب سے وابستہ، سب کے دُکھ درد میں شریک، سب سے کچھ نہ کچھ لیتا ہوا بھنورے کی طرح تمام کلیوں سے رس لیتا ہوا، زندگی کے تمام تلخ و شیریں تجربات میں

ڈھلتا ہوا ندؔا کا کردار کس طرح پروان چڑھتا ہے' اُس کی دِلآ ویز تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کرداروں کی تشکیل و تعمیر میں ایسے سجے ہوئے جملے بار بار آتے ہیں۔

''چھٹو مرتضیٰ حسن کی شادی سے پہلے کی کسی بازاری عشق کی گواہی ہے۔''

''چڑھتی ہوئی عمر کئی جوان اور نوجوان عورتوں سے جوانی مستعار لے کر جب بھی اِس فقدان کی تلافی کرنے میں ناکام رہتی ہے تو تشویش بڑھتی ہے۔ کئی وید، حکیم سونے، چاندی اور جواہرات کو ادویات میں تبدیل کر کے دولت اور وقت کی لڑائی میں جاگیرداروں سے وفاداری نباہتے ہیں' لیکن میدان وقت کے ہاتھ ہی رہتا ہے۔''

'' اِن ساری ڈگریوں کو لے کر ایک دِن وہ کالج کے پرانے پھاٹک سے باہر آتے ہیں تو بے چارہ ہندوستان اُن کے شایانِ شان استقبال کے لئے ہار پھول لانا بھول جاتا ہے۔ وہ بھی کیا کرے' اُس کے سر پر ایک ساتھ کئی کام آ پڑے ہیں۔''

اور اب یہ منظر دیکھئے۔

''عربی الفاظ قرأت کے لحن میں ایک عجیب پُراسرار آہنگ کی تعمیر کرتے ہیں' یوں لگتا ہے آسمان کی نیلاہٹیں مہربان ہوتی جارہی ہیں' اور ساری زمینیں صوفیوں کی خانقاہیں بنتی جارہی ہیں۔ ہر طرف فِضا میں سرمئی سنجیدگی طاری ہے۔ جیسے مفتوح علاقے میں ہارے ہوئے فوجیوں کے گھروں کے سناٹے۔''

ایسے ترشے تراشے تخلیقی جملے جس میں مشاہدے کی دمق اور تخلیق کی چمک گھل مل کر چاندی کی طرح بکھر گئی ہے۔ تاثیر کا ایک لطیف احساس دِل میں گھر کرتا چلا جاتا ہے۔ ایسے جملے، ایسی زبان تقریباً پوری کتاب میں خوشبو کی طرح بسی ہوئی ہے' جس سے اِس کتاب کا حسنِ مذاق و معیار اور قرأت کی کیفیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ گوالیار کا حصہ اِس کتاب کا جاندار حصہ ہے' بے حد خوبصورت، دِلچسپ، اثر انگیز، مرتب و مزین۔

گوالیار کی اِن دِلآ ویز تصویروں اور گلیوں سے نکل کر تلاشِ معاش کے سلسلے میں ندؔا جب دہلی پہنچتے ہیں تو اندازہ تو یہی ہوتا ہے کہ وہ دلی کی بھی اتنی ہی اچھی ہی تصویر پیش کریں گے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ دلی کی گلیوں سے سرسری گذر گئے اور شاید وہ گذرے بھی ہیں' اگرچہ اپنے اِس مختصر بیان میں وہ شہر اور ادیبوں کے ہلکے پھلکے نقوش چھوڑنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ خاص طور پر جناب سلاؔم مچھلی شہری کا کردار اچھی طرح سے اُبھرتا ہے' دو ایک کانٹے کے جملے محمود ہاشمی کے بارے میں بھی نکل جاتے ہیں۔ اُس

کے بعد بس یونہی.....! اگر چہ دِل والا دلی کا ذکر اور چاہتا ہے۔

دلی سے نکل کر وہ ممبئی پہنچتے ہیں اور کئی صفحات ممبئی شہر کے کردار پر خرچ ہوتے ہیں۔ ندا کو دلی راس نہیں آتی اور ممبئی بڑی مشکلوں کے بعد راس آتی ہے۔ وہ اُس کی آزمائشوں پر کھرے اُترتے ہیں۔ کڑی محنت، تجربات و مشاہدات کام آتے ہیں اور کچھ دِنوں دھکا کھانے کے بعد وہ ایک نئی زندگی سے قریب آتے ہیں' جہاں سے اُن کی زندگی اور شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے' گوالیار جیسا چھوٹا شہر مہاراجوں کی بستی اور دوسری طرف ممبئی جیسا بڑا شہر' جہاں بڑے بڑے راجہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں' کتنا بڑا تضاد زندگی کا۔ حقیقتوں کا نہ جانے کتنے شاعر اور ادیب دم توڑ دیتے ہیں' عام آدمی کا ذِکر کیا۔ ندا نے نہ صرف ممبئی پر فتح حاصل کی بلکہ اِس تضاد کو اپنی فکر و تخلیق کا حصہ بنایا' لیکن اپنی تہذیب اور اُس کے اُجلے پن کو ممبئی کی دھواں دھواں زندگی میں ختم نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اُسے بھی زندگی کا ایک روپ ایک نمونہ بنا کر پیش کیا۔ بہت مشکل ہوتا ہے ایسے تضاد پر قابو پانا۔ اپنے آپ میں اُتارنا۔ ندا نے یہ مشکل کام انجام دیا۔ نتیجہ کامیابی۔ زندگی اور شاعری دونوں سطح پر اس حصے میں جہاں ممبئی کی کاروباری زندگی پر روشنی پڑتی ہے' وہیں دوسری طرف وہاں کے ادب اور ادیبوں پر بھی خاص طور پر باقر مہدی۔ لیکن اس میں تشنگی ہے ایک احساس عدم تکمیلیت جو بہت فطری ہے۔ ایک جھلک ملاحظہ کیجئے۔

''ندا کے ہاتھ سے باقر مہدی کا پھٹا ہوا کُرتا، سُریندر پرکاش کے غصہ سے چکنا چور ہوتی بوتل۔ بلراج مین را کے گال پر مہندر ناتھ کا طمانچہ۔ اس سرکس کے کچھ سین ہیں۔ ادب و زندگی کا یہ قریبی رشتہ نئے ادیبوں کی مادّی محرومیوں کا ردِّ عمل ہے۔''

اور پھر کتاب کے آخر میں وہی جذباتی مسائل جو عام طور پر اُردو والوں کے ہوا کرتے ہیں۔ رشتہ داروں کی جدائی پاکستان، پاسپورٹ، اکیلاپن، کمزور جذباتیت اور پھر حالات کا جبر۔

سکوں سے چار گھڑی بھی بسر نہ کر پائے
یہ زندگی ہے تو اِس زندگی سے بھر پائے

زندگی سے بھر پانا' ندا کا لہجہ نہیں ہوسکتا یہ اُن کے والد کا شعر ہے۔ جن کے انتقال پر ندا نے معرکہ کی نظم کہی جس میں ندا کا اپنا حقیقی لہجہ ہے۔

تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے

تمہاری قبر میں مَیں دفن ہوں

تم مجھ میں زندہ ہو

کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

ندا کی یہ نثری کاوِش جس کا نام عجیب وغریب ہے جسے کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے یا نہ بھی دیا جائے پھر بھی اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ کتاب ایک بے حد دِلچسپ معلوماتی فکر انگیز اور قابل مطالعہ کتاب ہے اور خاص طور پر ایسے دور میں جب کہ تخلیقی نثر میں ڈھلی کتابوں کا قحط پڑا ہو۔ ندا کی اس کاوِش سے ندا کا قد، منصب بلند ہوا ہے اور نثر کے حوالے سے اُن کا شاعرانہ مرتبہ اور بھی عظیم سے عظیم تر۔

●●

''لفظوں کا پُل'' ، ''مورناچ'' ، ''آنکھ اور خواب کے درمیان''

.......ایک نا تمام جائزہ

● مشتاق مومن

''زبان شاعر کے لئے بند ڈبے کا گوشت نہیں بلکہ خون میں نہایا ہوا شکار ہے' جسے دیکھ کر، چھوکر، چکھ کر، سونگھ کر شاعر کے پانچوں حواس جاگ اٹھتے ہیں۔ زبان ایک نٹ کھٹ اور ضدی میڈیم ہے' اسے رام کرنے میں شاعر کا سحر' اس کی وحشت کھونے میں اس کا اعجاز رہا ہے۔ اسی لئے زبان کے رُخسارِ سیمیں پر شاعر کے بوسوں کے نشانات ہی نہیں بلکہ ناخنوں کی خراشیں بھی ہوتی ہیں۔''

جب بھی ندا فاضلی سے رسالوں کے صفحات پر ملاقات ہو' وارث علوی کے محولا بالا جملے ضرور یاد آتے ہیں اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ ناقد نے شاعر کا سحر اعجازِ زبان کے رخسارِ سیمیں پر شاعر کے بوسوں کے نشانات ناخونوں کی خراشیں جیسی تراکیب ندا فاضلی کی شاعری کے لئے کہی ہیں۔

ندا فاضلی کا پہلا شعری مجموعہ ''لفظوں کا پُل'' 'نیو رائٹرس پبلی کیشنز' نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔ کتاب کے اولین صفحات پر ندا فاضلی نے کہا تھا۔

''۶۵ء کی بات ہے' میں بھوپال سے گوالیار واپس آیا تھا۔ رات کا وقت تھا اور میں حسب معمول اٹیچی ہاتھ میں لئے اُس برسوں کی جانی پہچانی گلی میں مڑ گیا جہاں اِملی کی گھنی چھاؤں تلے میرا گھر تھا۔ میں نے گلی میں گھستے ہوئے تو اپنے آپ کو دیکھا تھا' دروازہ کھٹکھٹانے تک بھی میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ اٹیچی ہاتھ میں لئے جو سر جھکائے واپس آیا تھا وہ میں نہیں تھا کوئی اور تھا مجھ جیسا ہی وہ بالکل اکیلا تھا۔ اُس کا نہ کوئی گھر تھا نہ شہر تھا اور نہ رشتے دار تھے۔ کاغذ پر نہ جانے لکیریں کب بدلی تھیں۔ لیکن بنی ہوئیں سرحدیں اس پوری رات بجلی کے ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک شہر کے ہر گھر کو آگ لگاتی پھر رہی تھیں۔ وہ اکیلا آدمی آج بھی اُسی طرح اکیلا بھٹک رہا ہے۔ رات کے بھیانک اندھیروں میں جس گھر کو اُس سے چھین لیا گیا تھا' اُسے وہ آج تک ڈھونڈ رہا ہے۔ یہ بے منزل کی تلاش ہی اس کی منزل ہے۔''

میر تقی میر کا یہ شعر ندا فاضلی کو بہت پسند ہے اور اکثر موقعوں پر وہ اسے دہراتے رہتے ہیں۔ ۔

سرسری تم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

مگر ہمیں یہ تو ماننا پڑے گا کہ ندافاضلی میں اُس انسان کا دل دھڑکتا ہے جو اپنے ماحول، تہذیب، گھر، رشتہ دار اور قصبہ کی باتیں کر رہا ہے اور بیتے دنوں کو یاد کر رہا ہے۔ بقول اختر الایمان ؎

جو دن بیت گئے' کتنے اچھے تھے

۱۹۶۹ء ''لفظوں کا پُل'' سے ۱۹۸۶ء ''مور ناچ'' اور اس کے بعد'' آنکھ اور خواب کے درمیان''۔ شاعر کی زندگی جدو جہد، ٹوٹنا اور ٹوٹ کر پھر جڑنا، لمحہ لمحہ زندگی، پل دو پل کی موت، ماہ و سال کی بھٹی میں سلگتا ہوا بے چین دل، چمبور سے کلانگر باندرہ' نور محمدی ہوٹل کے تیز لال مرچ کا مزیدار سالن اور فلمی مصروفیات۔

مدینے کی گلیوں سے آواز آئی
محمدؐ کے جلوؤں سے روشن خدائی

اُمرا اَپارٹمنٹ، ڈان پاڑہ، کھار میں بجی سجائی دکان اور فلیٹ میں ؎

مری غربت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تیری رائے بدل جائے گی

ندافاضلی نے اب تک کی زندگی میں کیا کھویا' کیا پایا اس کا عکس اُن کے تینوں شعری مجموعوں میں جھلمل کرتا دکھائی دیتا ہے اور ہماری تشفی بھی ہو جاتی ہے کہ اپنے تاثرات و تعصبات اور جذبات و خیالات کے اظہار کے لئے اس نے شاعری کو میڈیم کیوں بنایا، شاعروں کی اس بھیڑ میں اُس نے اپنی الگ قصارع کیوں بنائی، اُس کی کوئی شناخت ہے بھی یا نہیں، کیا ندافاضلی کو چھنا ہوا گھر، چھینی ہوئی تاریخ اور تہذیب، دوست احباب اور رشتہ دار، ماں، باپ، بھائی، بہن مل گئے؟

ان کی نئی غزل ملاحظہ کیجئے' جو ان کی شعری مجموعے میں نہیں ہے۔ ؎

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے چوکا، باسن، چمٹا، پھکنی جیسی ماں

بان کی کھرّی کھاٹ کے اوپر ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوئی، آدھی جاگی' تھکی دوپہری جیسی ماں

چڑیوں کی چہکار میں گونجے رادھا، موہن، علی
مُرغے کی آواز سے کھلتی گھر کی کُنڈی جیسی ماں

بیوی، بیٹی، بہن، پڑوسن تھوڑی سی سب میں
دن بھر اِک رسّی کے اُوپر چلتی نٹنی جیسی ماں

بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں جانے کہاں گئی
پھٹے، پُرانے اِک اَلبم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

اِس کا پورا جواب ہمیں اُن کی شاعری میں شاید ہی مل سکے' کیونکہ اُن کی شاعری تاثرات و تغضیات کا زیرا کس ہیں' اوریجنل نہیں۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں' جس سُکھ، دُکھ میں ہمیں شامل کرنا چاہتے ہیں' اُس کے اظہار کے لئے کیا اُنہیں الفاظ مل گئے؟

شاید ہاں!
شاید نہیں!

بہت پہلے میر انیس نے اپنی قادرالکلامی کا دعویٰ یوں کیا تھا۔

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو دوں جواب تو گوہر سے ملا دوں

ذرّے کی چمک مہرِ مُنوّر سے ملادوں
خاروں کو نزاکت میں گُل تر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اِک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ندا فاضلی نے کوئی دعویٰ تو نہیں کیا مگر ہاں بنجارہ زندگی جینے کا مدعی ضرور رہا ہے۔

جیون جینا سہل نہ جانو بہت بڑی فنکاری ہے

تو چلئے ندا فاضلی سے ملاقات کرنے سب سے پہلے ان کے گھر جاتے ہیں۔

جب بھی گھر سے باہر جاؤ
تو کوشش کرو جلدی لوٹ آؤ

جو کئی دن گھر سے غائب رہ کر
واپس آتا ہے
وہ زندگی بھر پچھتاتا ہے
گھر اپنی جگہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے

(مور ناچ)

تم جہاں بھی رہو
اسے گھر کی طرح سجاتے رہو
گلدان میں پھول لگاتے رہو
دیواروں پر رنگ چڑھاتے رہو
سجے بنے گھر میں ہاتھ پاؤں اُگ آتے ہیں
پھر تم کہیں بھی جاؤ
بھلے ہی اپنے آپ کو بھول آؤ
تمہارا گھر
تمہیں ڈھونڈ کر واپس لے آئے گا

(لگاؤ)

دیکھتے دیکھتے
ٹی وی، فرِج
صوفہ بن کے
آدمی کھو گیا عزت کا تماشہ بن کے
ہر گھڑی بھاگتے رہنا
مقدر اس کا
گھر کی دیواروں نے ہی چھین لیا گھر اس کا
نہ جانے کون سے لمحے کی بددعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

گھر سے چلے تھے پوچھنے موسم کا حال چال
جھونکے ہوا کے بالوں میں چاندی پرو گئے
چاند میں کیسے قید ہوئی کسی گھر کی خوشی
یہ کہانی کسی مسجد کی اذاں سے سُلجھے

(دور کا ستارہ)

میں برسوں بعد
اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا
اپنے گھر پہنچا
لیکن میرے گھر میں
اب میرا گھر نہیں تھا
مجھے کافی دیر ہو گئی تھی

دیر جانے پر
ہر کھویا ہوا گھر
آسمان کا ستارہ بن جاتا ہے
جو دور سے بلاتا ہے
لیکن پاس نہیں آتا

ڈی ونچی نے یہ بات کس قدر پتے کی کہی ہے کہ ہمارے تجربات نہیں ہمارے فیصلے جھوٹے ہوا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ فیصلہ اُسی وقت جھوٹا ہوگا جب کہ ہم محسوسات کو شریکِ عقل نہ کریں۔ ڈی ونچی یہ بھی کہتا ہے کہ آرٹ کی بنیاد تجربات و محسوسات پر ہے نہ کہ منقولات اور معقولات پر۔

ندا فاضلی کے یہاں خیال اور سوچ کی کوئی ایک لہر نہیں ہے، جس پر انگلی رکھ کر کہہ سکیں کہ ہاں یہی خالص اور من پسند رنگ ہے اُن کا۔ کسی خیال اور احساس کو وہ بیان کرتے ہیں اور پھر اس کو رد کرنے میں کوئی رعایت بھی نہیں کرتے اور پھر اپنا تجزیہ کرتے ہیں۔

میں نہیں سمجھ پایا اس الجھن کو
جسم کی حرارت تھی یا تیری محبت تھی

قیس ہو کہ لیلیٰ ہو، ہیر ہو کہ رانجھا ہو
بات صرف اتنی ہے کہ آدمی کو فرصت تھی

(لفظوں کا پُل)

کچھ دن خطوں میں آنسو بہے شور و غل ہوا
تم زہر پی کے سوئیں
میں انجمن سے کٹ گیا
پھر یوں ہوا کہ دھوپ کھلی ابر چھٹ گیا
میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسا لیا
تم نے پڑوس میں نیا بھائی بنا لیا

(لفظوں کا پُل)

ایک خط

تمہارے نام کی خوشبو سے جب موسم سنورتے ہیں
فرشتے جب تمہارے رات دن لے کر اترتے ہیں
تمہیں پانے کی حسرت تھی
مجھے تم سے محبت تھی
تمہارے خواب آکاش کے تاروں میں روشن تھے
گلابی انگڑیوں میں دھوپ تھی آنچل میں ساون تھے
بہت سوں سے رقابت تھی
مجھے تم سے محبت تھی
تمہارا خط ملا
میں یاد ہوں تم کو عنایت ہے
بدلتے وقت کی لیکن ہر دل پہ حکومت ہے
وہ پہلے کی محبت تھی
مجھے تم سے محبت تھی

شکایت

کبھی دور تک
گرد ہی گرد ہوگی
فقط ایک تم ہی نہیں ہو
یہاں جو بھی اپنی طرح سوچتا ہے
زمانے کی نیرنگیوں سے خفا ہے
ہر ایک زندگی اک نیا تجربہ ہے
مگر جب تلک یہ شکایت ہے زندہ
یہ مجھوز میں پہ محبت ہے زندہ

نظم ''ایک لڑکی'' ان مصرعوں پر ختم ہوتی ہے۔

یہ ساری چیزیں کہ جیسے مجھی میں شامل ہیں
مرے غموں میں مری ہر خوشی میں شامل ہیں
میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی یوں ہی گذرتی رہے
ادا و ناز سے لڑکے کو پیار کرتی رہے

مذہبی اور نسلی نفرت کا لاوا ریلوے انجن کے بوائلر کی طرح اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہے' جو موقع پاتے ہی پھٹ پڑتا ہے اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔ علاقائی تعصب اور فرقہ ورانہ فسادات آج طرزِ زندگی بن گئے ہیں۔ آج فسادات اور جنگ پر جو نظمیں کہی جارہی ہیں' ان میں ندا فاضلی کی نظمیں ایک الگ انداز رکھتی ہیں۔ ایک تازہ ترین نظم دیکھئے۔

چڑیوں کی گنتی ہوتی ہے
ساری چڑیاں ایک جیسی ہوتی ہے
بھیڑوں کی گنتی ہوتی ہے
ساری بھیڑیں ایک جیسی ہوتی ہیں
مسلمانوں کی گنتی نہیں ہوتی
سارے مسلمان ایک جیسے ہوتے ہیں

کئی لحاظ سے وہ ان نظموں سے الگ ہیں جو تقسیم وطن کے بعد لکھی گئیں۔ ندا فاضلی کا موضوع چاہے فساد ہو یا جنگ یا ہند و پاک کے لیل و نہار۔ ان کا ایک الگ انداز، ایک الگ سوچ اور الگ Treatment ہے۔ جیسے اپنے پیش روکی طرح انہوں نے سرحد کو مان کر قبول کر کے شاعری نہیں کی بلکہ انہوں نے سرے سے سرحد کو ہی نہیں مانا۔

پاسپورٹ آفیسر کے نام

کراچی ایک ماں ہے
بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا
یہ رشتہ پیار کا پاکیزہ رشتہ ہے جسے اب تک
نہ کوئی توڑ سکتا ہے نہ کوئی توڑ پایا ہے
غلط ہے ریڈیو جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں
نہ میری ماں کبھی تلوار تانے ان میں آئی ہے
نہ میں نے اپنی ماں کے سامنے بندوق اٹھائی ہے
یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے
یہ کیسی لڑائی ہے

جنگ پر لکھی گئی نظموں میں انہوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ دو ملکوں میں جب جنگ ہوتی ہے تو سپاہی لڑتا ہے اور مرتا ہے اور شہید کہلاتا ہے۔ دونوں ملکوں کے سپاہی یہ سوچتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کون حق پر ہے؟

تم فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو
ضرور ہو
لیکن یاد رہے
جنگ کے دوران تمہارا ملک جو کہے گا وہ سچ ہوگا
اور اس سچ کے لئے تمہیں اپنا جان سے کھیلنا ہوگا
تمہارے دوستوں اور دشمنوں کی فہرست

سیاست کی طرح بدلتی رہے گی
جنگ ختم ہونے کے بعد
تم امر، شہید بھی ہو سکتے ہو
اور بے وقوف بھی

لفظ 'سفر' ندا فاضلی کی شاعری کا ایک کلیدی لفظ ہے۔ ''مور ناچ'' دسمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ندا نے لکھا تھا۔ ''لفظوں کا پُل'' کی بیشتر نظمیں اور گیت اپنے لسانی دائرے سے نکل کر ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں مقبول ہو چکی ہیں۔'' ''لفظوں کا پُل'' سے ''مور ناچ'' تک ندا کا شعری سفر قصباتی زمیوں کے ساتھ ساتھ شہری صلابت سے ٹکراتا ہوا گذرتا ہے۔ اس میں سانحی انداز میں موجود دور کے عہد کے اتار چڑھاؤ کو منعکس کیا گیا ہے' لیکن لب ولہجہ کی دردمندی نے اس کی شاعری کو شخصی مسائل کا اظہار ہوتے ہوئے بھی ہم سب کے دُکھ سُکھ کی کہانی بنا دیا ہے۔

میری ماں ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے
اِدھر اُدھر سے مٹی لا کر
گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکے سے
بے چاری کتنا ڈرتی ہے
میری ماں کتنی بھولی ہے

اس نظم سے وہ شخص زیادہ باتیں کر سکتا ہے جس نے اپنی ماں کو جُھری دار چہرے اور ہاتھ پر اُبھری لکیروں کے ساتھ گوبر اور مٹی سے کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتے دیکھا ہو۔ میں ندا فاضلی کی یہ نظم جب بھی ذہن میں دُہراتا ہوں تو میری ماں بے ساختہ مجھے یاد آ جاتی ہے اور وہ منظر میری آنکھوں میں زندہ ہو جاتا ہے' جب کرفیو کے سناٹے میں ماں گھر کی کچی دیواروں میں مٹی بھرا کرتی تھی تاکہ کرفیو گھر کے اندر نہ گھس جائے۔ ندا فاضلی کا ایک مخصوص انداز اور اسٹائل دوشیزۂ فطرت کی نقاب کشائی ہے۔ گاؤں میں اور شہر میں بھی بھور، سردی، پہلا پانی، سحر، دوپہر، شام اور صبح، 'ایک دن' اُن کی ایسی نظمیں اور گیت ہیں جن میں گاؤں اور شہر کی چہل پہل ہے۔

سورج

اِک نٹ کھٹ بالک

دن بھر شور مچائے

اِدھر اُدھر چڑیوں کو بکھیرے

کرنوں کو چھترائے

قلم، دَرانتی، برش، ہتھوڑا

جگہ جگہ پھیلائے

شام تھکی ہاری ماں جیسی

ایک دیا ملکائے

دھیمے دھیمے

ساری بکھری چیزیں چنتی جائے

یہ نظمیں نہیں Paintings ہیں جن میں شاعر نے فطرت کو فریز کر دیا ہے۔ بڑے شہروں کا جو احوال ہے اور مشینی زندگی کی بے حسی، بے چہرگی نے فطرت، موسم اور انسان کا جو حلیہ بنا رکھا ہے اس کا بڑی شدت سے بیان ہوا ہے۔ شہری مزاج کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں پہلے سورج نہیں نکلتا بسیں اور ٹرینیں پہلے نکلتی ہیں۔

یہ کیسی بستی ہے

میں کس طرف چلا آیا

فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں

جدھر بھی دیکھو

●●

ہم بھی کسی کمان سے نکلے تھے تیر سے

یہ اور بات ہے، کہ نشانے خطا ہوئے

دیواروں کے باہر کی اندرونی کہانی

● اقبال رضوی

''دیواروں کے باہر'' ندا فاضلی کے سوانحی ناول کا دوسرا حصہ ہے۔ پہلا حصہ ''دیواروں کے بیچ'' پانچ سال قبل شائع ہو چکا ہے۔ جو دلچسپ اور بیباک تحریر کے طور پر بحث میں رہ چکا ہے۔ حالانکہ ندا کی شناخت ایک شاعر کے طور پر ہی ہوتی ہے۔ اکثر ادیب کسی ایک صنف میں اظہار خیال کر کے محدود ہو کر رہنا نہیں چاہتے۔ دوسری اصناف میں بھی اظہار کے وسیلے کی متقاضی ہوتی ہیں۔ ندا کے ساتھ بھی یقیناً یہی ہوا ہے۔ انہوں نے جیسی ٹھکری اور فاقہ مست زندگی جی ہے اس کے اظہار کے لئے یقیناً شاعری کا دائرہ محدود ہوتا۔

پہلے حصے میں مصنف نے اپنا لڑکپن بھارت کی تقسیم کا خاندان پر پڑا ہوا اثر اور اپنے کھوئے ہوئے گھر کے بارے میں اپنی ابتدائی تگ ودو کے متعلق لکھا ہے۔ آخر میں مصنف ممبئی میں آباد ہونے کی کوشش یا جدوجہد کا بیان کرتا ہے۔ دوسرا حصہ ندا کے ممبئی میں آباد ہونے کے بعد کی داستان ہے۔'' بھومیکا'' میں ندا لکھتے ہیں'' میں نے اس میں شامل مختلف کرداروں کے چترن کے مادھیم سے خود کو ہی پیش کیا ہے۔ کیوں کہ میں نے انہیں اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اپنے شبدوں سے محسوس کیا ہے۔ حالات کو جانچنے پرکھنے کے زاویے میرے اپنے ہیں۔ تصویر بھلے ہی دوسری ہو۔ لیکن ان کے فریم میرے اپنے ہیں۔ ان میں میری ذہنی الجھنوں............''

سوانح حیات لکھتے وقت عام طور پر ایسے واقعات کو تحریر کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ مگر ناول کا یہ فائدہ ہوتا ہے اور یہ حصہ بڑی بے باکی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ دراصل اس ناول کی بنیاد زندگی کو دیکھنا ہے۔ اور ندا کی نظر عام لوگوں اور عام واقعات کو بھی خاص طرح سے دیکھنے کا ہنر رکھتی ہے۔ زیادہ تر لوگ نہیں جانتے کہ جیون جینے کے لئے زندگی جینا سیکھنا پڑتا ہے۔ اور وقت سے بڑا کوئی عالم استاد نہیں جو زندگی جینا سکھا سکے۔ وقت نے جب جب ندا کو کچھ سکھایا ہے انہوں نے سیکھنے سے پرہیز نہیں کیا۔ ندا کا ایک شعر ہے:

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

ندا نے لوگوں کو رشتوں اور خود کو بار بار دیکھا ہے۔ تب ان کی قلم بیباکی سے سمے کی پڑتال کرتی چلتی ہے۔ ان کے ناول میں بھکاری، چائے والے، مزدور، عورتیں، سپنوں کی گٹھری باندھے ممبئی پہنچے اور بدحالی کی موت مر گئے۔

مصنف اور فنکاروں کے ساتھ ساتھ مشہور ہستیاں بھی اس کا حصہ ہیں۔ مصنف نے سب پر ایک سمان قلم چلایا ہے۔ ممبئی جیسے شہروں میں دیس کے کونے کونے سے آنے والوں کے رچنے اور بسنے کے عمل کو جاننا اور ان کے ذہنی سفر سے گزرنا ہو تو ''دیواروں کے باہر'' میں اس پر گہری نظر ملتی ہے۔ گھر سے دور جدوجہد کے دور میں ٹوٹتا بکھرتا انسان اپنی ضرورتوں کے لئے زندگی کی قدروں اور اصولوں کو درکنار کر دیتا ہے۔ جنہیں دوسرے ابن الوقتی اور گھٹیا پن قرار دیتے ہیں۔ مگر جدوجہد کرنے والے کے لئے زندہ رہنے کی جدوجہد ہی سب سے اہم ہوتی ہے۔ ندا اپنے کرداروں کی جدوجہد کو گھٹیا تسلیم نہیں کرتے۔ وہ خود بھی تو ناول کے ایک کردار ہیں۔ اس لئے وہ کسی کے کاموں پر کوئی رائے نہیں دیتے یا فیصلہ نہیں کرتے۔

ندا نے جدوجہد کے دوران ممبئی میں کئی ٹھکانے تبدیل کئے ہیں۔ ان میں پالی ناکے کا ایک ہاسٹل بھی تھا جہاں رہنے والے سبھی لوگ فلمی دنیا میں ہاتھ آزمانے کے لئے ممبئی پہنچے تھے۔ یہاں رہنے والوں کی جدوجہد کوئی عظیم یا تاریخی جدوجہد نہیں ہے۔ مگر ندا کی تحریر نے اسے بے حد دلچسپ بنا دیا ہے۔ ندا کے یہاں جو مزاح ہے وہ کٹھن حالات سے پیدا ہونے والے ہر کردار کے حالات پر طنز کرنے سے نہیں چوکتا۔ مثلاً یہ حصہ

''پالی ناکے کے اس ہاسٹل میں سبھی فلم اسٹرگلر (Strugler) ہیں۔ سب کے اپنے خواب ہیں۔ کوئی گیت کار بننا چاہتا ہے۔ کوئی سنگیت کی دنیا میں تہلکہ مچانا چاہتا ہے۔ کوئی ہیرو، کوئی ویلن ہے۔ لیکن سب مہینوں سے بیکار ہیں۔ گزارا کرنے کے لئے ان میں سے زیادہ تر لوگوں نے اپنے مزاج سے ہٹ کر پیشے کو اپنا لیا ہے۔ جسے ہیرو بننا ہے وہ لنکنگ روڈ کے ایک بڑے سے ہوٹل میں ویٹر کا کام کرتا ہے۔ ویلن باندرہ سے گوشت لاکر گھروں میں سپلائی کرتا ہے۔ صابر دت گیت کار بننے کا شوق چھوڑ کر کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ کی مدد سے انہیں پر فن و شخصیت کا پہلا نمبر شائع کر رہے ہیں۔ کرشن چندر اپنے ہوتے ہوئے اپنے بھائی پر کسی نمبر کے نکالے جانے کے خلاف ہیں۔ لیکن مہندر ناتھ کو جیتے جی یہ نمبر دیکھنا

نصیب نہیں ہوتا۔ دوسرا نمبر جاں نثار اختر پر ہوتا ہے۔ وہ بھی اسے دیکھتے ہی اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔
ان دو واقعات کے بعد صابر دت جس کسی کے فن اور شخصیت پر نمبر نکالنے کا پلان بناتا ہے وہ ڈر کے مارے
اپنا نام واپس لے لیتا ہے۔ سب کو اپنی زندگی سے پیار ہو گیا ہے۔ مگر صابر دت بے کار ہو گیا ہے۔"

واقعات اور لوگوں کے بارے میں اس طرح کا بیان کتاب میں جگہ جگہ پر ملتا ہے۔ پالی ناکہ کے
ہاسٹل کے علاوہ ندا نے مکتبہ جامعہ کا بھی خاکہ کھینچا ہے۔ اس دور میں مکتبہ نئے لکھنے والوں کا ملن کیندر رہا
کرتا تھا۔ یہاں آنے والے ادیبوں شاعروں کا ندا نے باریکی سے مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً ساحر لدھیانوی
اور مجروح کا خود کو فیض سے بڑا شاعر ماننا، ساحر اور مجروح کی رسہ کشی، سردار جعفری، جاں نثار اختر ان سب
کا ذکر ہے دراصل یہ کتاب اپنے دور کے اردو ادیبوں کا آئینہ بھی ہے ساتھ ہی فلمی دنیا میں اپنی اہمیت منوا
چکے گیت کاروں اور ادیبوں کے نجی زندگی کے کئی پہلوؤں کی دستاویز بھی۔

شاید جدوجہد کے دوران آدمی کافی کڑوی سچائیوں سے روبرو ہوتا ہے۔ اس لئے ندا۔ نے اس دور
کے شاعروں پر قلم کچھ تیکھی چلائی ہے۔ ندا لکھتے ہیں۔" یہ دور جدیدیت کے ابھار اور ترقی پسندی کے اتار کا
ہے۔ شاعروں میں جاں نثار اختر کے علاوہ کوئی تخلیقی طور پر سرگرم نہیں ہے۔ مخدوم اللہ کو پیارے ہو گئے
ہیں۔ سردار جعفری لمبی تیراکی کے بعد کنارے ہو گئے۔ ساحر فلمی آسمان کے ستارے ہو گئے۔ مجروح تھوڑا
لکھ کر بہت سارے ہو گئے۔ ظ انصاری کئی شادیاں کر کے پھر سے کنوارے ہو گئے۔ کیفی اسٹیج کے دلارے
ہو گئے۔"

لیکن جب ندا عام لوگوں اور بدحال ساہتیہ کاروں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی تحریر میں ہمدردی
چھلک پڑتی ہے۔ ندا کی تحریر کی ایمانداری اور بے باکی سے کتاب کا شاید ہی کوئی کردار ہو جس سے قاری
اپنا رشتہ نہ جوڑ لے۔ ندا کی لڑکپن کی منگیتر عشرت، پہلی نظر میں بھا جانے والی محمودہ اور بنا کسی سماجی بندھن
کے ندا کے ساتھ رہنے والی مالتی جوشی۔ ہر کردار ندا کے لفظوں اور لہجے کے سہارے یادگار بن جاتا ہے۔
کاروبار میں تبدیل ہوتا مذہب، اندھی تقلید، انڈرورلڈ، فرقہ پرستی، سیاست اور فلمی دنیا، ان ساری چیزوں کا
ذکر اس کتاب میں ہے اور درمیان میں ندا کی بڑی بہن جو پاکستان میں رہتی تھیں انکی بھی آمد ہوتی رہتی
ہے۔ ندا نے کچھ کرداروں کو چھوڑ کر بقیہ کے متعلق افسانوی انداز میں لکھا ہے۔ مکمل کتاب میں ندا نے
احساس دلایا ہے کہ انہیں دنیا سے سب کچھ ملا ہے لیکن دیر سے .... پیار، پیسہ، گھر، عزت اور شہرت سبھی
کچھ ملا۔ اس پر ندا نے ایک غزل بھی کہی ہے۔

کہیں رک گیا راہ میں بے سبب، کہیں وقت سے پہلے گھر آئی شب
ہوئے بند دروازے کھل کھل کے سب، جہاں بھی گیا میں گیا دیر سے

سوانحی ناول بہت کم لکھے گئے ہیں۔ خاص کر اردو میں۔ ندا نے اصل میں یہ ناول اردو میں لکھا ہے۔ اس سے قبل کئی ادیبوں سے کی ہوئی ''ملاقاتیں'' بھی اردو میں شائع ہوئی ہیں۔ اس کتاب سے پہلی بار قاری ندا کی نثر سے روبرو ہوا تھا۔ مگر اس کتاب میں ان کی نثر بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ پورے ناول کو پڑھتے ہوئے قاری ایک گہرے شہری احساس سے دوچار رہتا ہے۔ زبان پر ندا کی مکمل گرفت ہے۔ وہ لفظوں کا استعمال بہت احتیاط سے کرتے ہیں۔ بقول ندا

وہ صوفی کا قول ہو یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر اتنا ہی سچ مان

''دیواروں کے باہر'' سے ندا کی زندگی کو جان کر یہی لگتا ہے کہ جوان پر بیتی جو انہوں نے محسوس کیا، دیکھا اور بھوگا ان کے لئے صرف وہی سچ ہے۔ [ہندی سے]

ندا فاضلی کا شعری سفر.... روبرو

● عبدالاحد ساز

ندا فاضلی میرے بے حد پسندیدہ شاعر ہیں اور اتنی ہی پسندیدہ مجھے اُن کی شخصیت بھی لگتی ہے۔ اِس پسندیدگی کو میں ظاہری اور اِخلاقی معنوں میں نہیں کہہ رہا ہوں' جس کی ایک جینوین فن کار کے تعلق سے ضرورت بھی نہیں ہوتی' بلکہ اِس ارتباطی کے تحت ظاہر کر رہا ہوں جو اُن کے شعری رویئے اور شخصی مزاج کے مابین بڑے فطری انداز میں قائم ہے۔ بادی النظر میں تضاد کے شایبے بھی دِکھائی دیتے ہیں۔ مگر ہمہ وقت خود سے اُلجھتے ہوئے ذہنوں کے یہاں یہ تضاد توازن ہی کا حصہ ہوتا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر اِس تضاد میں بھی ہم آہنگی کو بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ میں نے کئی بار اپنے ذہن کو سوالیہ زاویوں سے ٹٹولا ہے کہ ندا کی شاعری میرے اپنے شعری مزاج سے یکسر مختلف Temperament رکھنے کے باوجود مجھے اِس قدر جاذبیت کیوں فراہم کرتی ہے۔ اس کا کوئی منطقی جواب مجھے آج تک نہیں مل سکا ہے' مگر واقعہ بدستور یہی ہے اور اس کی ایک تصدیق یہ بھی کہ "لفظوں کا پل" سے "مور ناچ"، "آنکھ اور خواب کے درمیان" اور "کھویا ہوا سا کچھ" تک ندا فاضلی کا تعاقب کرتے ہوئے' اُن کی بیسیوں نظمیں، گیت، دوہے اور غزلوں کے دسیوں درجہ اشعار مجھے ازبر ہو گئے ہیں' جو زندگی کے بعض لمحوں میں مجھ سے بڑی اپنائیت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ ندا جتنے منفرد اور جداگانہ ہیں' اُتنے ہی مانوس اور قریب بھی ہیں۔

ندا صاحب سے پہلی ملاقات کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ خصوصاً اِس لئے بھی کہ یہ میرے اپنے غریب خانے پر ہوئی۔ ۶۹ء ۔ ۶۸ء کا ذِکر ہے۔ والد محترم عبدالرزّاق سعید صاحب کے ایک دوست اِفتخار اعظمی (مرحوم) جو مکین تو لکھنؤ میں تھے مگر ہر سال تین چار مہینے بمبئی میں گذارتے تھے۔ اور والد صاحب سے خاصے کم عمر ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ میرے دوست زیادہ ہو گئے۔ ایک روز ندا صاحب کو ہمراہ لئے والد صاحب سے ملنے گھر تشریف لائے۔ اُن دِنوں ندا کو بمبئی آئے ہوئے تین چار برس ہی ہوئے ہوں گے۔ میں نے اُنھیں بمبئی کے چند مشاعروں میں دیکھا اور سنا تھا، رِسائل میں اُن کا تھوڑا بہت کلام پڑھ چکا تھا۔ مگر جاذبیت کا احساس اُس وقت ہی شروع ہو چکا تھا' جب میں کالج کا طالب علم تھا۔

اپنے اِس پسندیدہ شاعر کو اپنے ہی گھر میں دیکھ کر مجھے بڑی بے محابہ حیرت اور خوشی ہوئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے۔ اُس شام اُنھوں نے یہ دو شعر سنائے تھے۔

میں موسموں کے جال میں جکڑا ہوا درخت
اُگنے کے ساتھ ساتھ بکھرتا رہا ہوں میں

اوپر کے چہرے مہرے سے دھوکا نہ کھائیے
مجھ کو تلاش کیجئے ' گم ہوگیا ہوں میں

اور اپنا ایک گیت بھی۔ جس کا مکھڑا ہے۔

جھکے ہوئے کندھوں پہ سانسوں کی گٹھری ، رستوں میں نوکیلی گھاس

چند مہینوں بعد اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''لفظوں کا پُل'' شائع ہوگیا تھا۔ پھر کافی عرصے تک اپنی معاشی اُلجھنوں میں گھرا رہنے کے سبب میں اُن سے ملاقات نہیں کر سکا تھا۔ مگر بعد میں ادبی نشستوں کے بعد ''کارنر میٹنگس'' میں چائے کی میز، پھر مشاعروں اور خصوصاً مشاعروں کے لئے سفر کے دوران تفصیلی ملاقاتیں ہونے لگیں' جو اِدھر پانچ سات برسوں میں خود اُن کے گھر پر ملاقاتوں اور طویل مکالموں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ قدر و احترام کے علاوہ کچھ بے تکلفی اور اُن سے لبرٹی لے کر بات کرنے کی سہولتیں بھی میسّر آئیں' جو از راہِ دوست نوازی و کشادہ ذہنی خود اُنھوں نے مُہیا کیں۔ اُن مکالموں میں گو کہ میرے حصے میں زیادہ تر سماعت ہی رہتی ہے' مگر میرے تجسس اور استفہام کا وہ بڑے تحمّل، دیانت داری، تفکر اور لُطف کے ساتھ جواب دیتے۔ ہاں اپنے مزاج کے تیکھے پن کے ساتھ بھی' جس میں کبھی کبھی ذہانت بھری شرارت لئے میری کھنچائی کرنے کے پہلو بھی ضرور شامل ہوتے ہیں۔

اُن سے انٹرویو کرنے کا خیال کافی عرصے سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ جب برادرم وقار قادری نے ''اعتراف'' کے لئے یہ ذمہ داری مجھے سونپی تو میرے لئے ایک اچھی سبیل نکل آئی اور میں نے اُن کے گھر پہنچ کر جو سوالات وقتاً فوقتاً میرے ذہن میں اُبھرتے رہتے تھے' اُن کے سامنے بکھرا دئے۔ ان میں سوانحی قسم کے سوالوں سے میں نے گریز ہی کیا ہے کہ ان کوائف سے ندؔا کے قارئین بخوبی واقف ہیں۔ سوالات کا ارتکاز اُن کی شاعری، شعری سفر اور متعلقہ اُمور ہی پر ہے۔ ایک آدھ ضمنی سوال کے علاوہ میں نے اُن کی نثر کو بھی چھیڑا نہیں ہے کہ ندؔا فاضلی کی نثر پر الگ سے ایک سیر حاصل گفتگو کی جا سکتی ہے۔ جس کا حق ہمارے نثر نگار معاصرین ہی بہتر ادا کر سکتے ہیں۔

رُوبــــــرو

● عبدالاحد ساز

ساز : ندا صاحب! پہلے تو یہ بتایئے کہ آپ کی شاعری کے آغاز کے کیا کوائف تھے؟ فوری محرکات کیا تھے؟ آپ کا اُسلوبِ شعر جو آپ کے پہلے مجموعے "لفظوں کا پل" ہی سے منفرد نظر آتا ہے، اُس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

ندا : شاعری کا ماحول تو گھر میں تھا۔ میرے والد دعا ڈبائیوی داغ اسکول کے نمائندہ شاعروں میں تھے۔ لیکن میری شاعری کی شروعات اور گوالیار میں ۲۰ ء میں اچانک بے گھر ہو جانے کی تاریخ ایک ہی ہے۔ اکیلا پن، اقتصادی بدحالی اور ملکی سیاست کے اُتار چڑھاؤ ان محرکات میں شامل ہیں، جن کا لفظی اظہار میری شاعری اور نثر ہے۔ میرے پہلے مجموعے "لفظوں کا پل" میں شامل غزلیں، نظمیں، گیت اور قطعات اس معاشرے کی دین ہیں جو فاصلوں اور دُوریوں میں ایک دُوسرے سے لاتعلق نہیں ہوا تھا۔ ایک گھر کا دُکھ پورے محلے کا غم ہوتا تھا، ایک حادثے میں پورا شہر روتا تھا۔ اُس ماتم میں انسانوں کے ساتھ درخت، تالاب، راستوں میں گھومتے پھرتے جانور، اُڑتے ہوئے پرندے، مکانوں کے چھجے سب شریک ہوتے تھے۔ میرے ابتدائی اُسلوب کی تراش خراش میں میر، غالب اور داغ کی روایات کے ساتھ مختلف ہندوستانی بولیوں کے سنتوں کے شعری معجزات بھی کارفرما ہے۔ غزل کی زبان کی درباری شائستگی میں عوامی نغمگی کی شمولیت اس اُسلوب کا بنیادی مزاج ہے۔

ساز : شاعری معاشرتی و مسائلی ہو، رُومانی ہو، فلسفیانہ ہو، موضوعاتی ہو یا کیفیاتی ہو؟ "شاعری خیال سے نہیں الفاظ سے کی جاتی ہے" اس کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہے؟

ندا : میری رائے آپ کے سوال میں شامل جملہ" شاعری خیال سے نہیں الفاظ سے کی جاتی ہے" میں ہے۔ ادب کی موضوعی شناخت بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیتی ہے۔ جن سے پیشہ ور نقاد نئی نئی گمراہیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ترقی پسند دور میں بھی یہی ہوا۔ مشترک خیالات کی کھونٹیوں پر فیض، جذبی، مخدوم، جاں نثار، نیاز حیدر، سردار اور کیفی کو ایک ساتھ لٹکایا گیا ہے۔ جدیدیت کے دور میں بھی سب کو ذات کے کرب، اقدار کی شکست اور لاتعلقی کے

آئینوں میں دیکھا اور دِکھایا گیا۔ ادب ہر عہد میں شعری لسان کے تخلیقی اِمکانات کی تلاش و جستجو کا معیار رہا ہے۔ انیس و دبیر ہم موضوع ہوتے ہوئے بھی ایک دُوسرے سے مختلف ہیں ۔غزل کے ہم موضوع اشعار کی پہچان میں بھی یہی رویّہ معیار بندی کرتا ہے۔ مثلاً دو شعر یاد آرہے ہیں۔۔

ذرا وِصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست!
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی ہے
اِک بار جلادے جو تجھے وصل کی آگ
کندن سا بدن اور سنہرا ہوجائے

شعری لسان صرف لغوی الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اس میں شخصیت کی تہہ داری، الفاظ میں شامل حرفوں کی پہچان، وزن و بحر کے برتاؤ کی ہنرمندی اور لفظوں کے دائیں بائیں کی اصوات سے بھی معنوی ابعاد نمایاں کئے جاتے ہیں۔ لفظ اپنے تئیں اچھا یا برا یا چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ شاعر کے الفاظ ایک ہی لُغت کے حصے دار ہوتے ہوئے بھی شخصی رنگ و آہنگ کے اعتبار سے جدا جدا معیار کے حامل ہوتے ہیں۔ چھوٹے موضوع پر بڑی شاعری اور بڑے موضوعات پر چھوٹی شاعری کی مثالیں ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔

ساز : جدیدیت کی واضح شناخت روایت سے انحراف قرار دی گئی تھی۔ آپ جدید شاعری کے نمائندہ اور بہت ہی اہم شاعر گردانے جاتے ہیں۔ لیکن آپ کے کلام میں روایت سے یکسر انحراف نظر نہیں آتا۔ اِس کے علاوہ اب جو جدیدیت کے زوال کے بعد مابعد جدیدیت کی بات ہو رہی ہے اور معاشرتی سروکاروں کی ادب میں واپسی کا ذِکر ہو رہا ہے تو آپ کی شاعری جدیدیت کے عروج کے زمانے میں بھی سماجی سروکار سے خالی نہیں رہی۔ تو آپ اپنے زمانی شعری سفر کے حوالے سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تضاد یا توازن کو کس طرح اُجاگر کریں گے؟

ندا : اختر الایمان نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ نسلیں جانوروں کی ہوتی ہیں۔ شاعر صرف اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ اچھی شاعری اپنے عہد کی ہوتے ہوئے بھی زمانی حصار سے آزاد ہوتی ہے۔ فیشن اور لیبل کمزور شاعری کی بیساکھیاں ہیں۔ اچھے شاعر ہر عہد میں ایک دُوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر ادبی دَور بیک وقت کئی چہروں کا نگار خانہ ہوتا ہے۔ جدیدیت ہو یا ترقی

پسندی یا اس سے پہلے کا ادبی زمانہ' زندہ ادب روایت کی توسیع سے ہی عبارت ہوتا ہے۔ فارمولا سازی تخلیق کا نہیں تنقید کا عمل ہے۔ انتہا پسندیاں بس کچھ دیر تک ہی ساتھ دیتی ہیں۔ بعد کا عمل متوازن قدموں کا سفر ہوتا ہے۔ ادب اور سماج کی رشتگی سے انکار تنقیدی پینترے بازی کا حصہ تھا۔ اس کا تعلق تخلیق سے کبھی تھا نہ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ادب میں سماج کی شمولیت کا پیرایہ مقرّر کی تقریر یا صحافی کی تحریر سے مختلف ہوتا ہے۔ ادب میں اِس کے اظہار کی جمالیاتی احتیاطیں لازمی ہیں۔ جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے میں نے وہی کہا جو مجھ سے چھ سو برس پہلے کبیر داس کہہ گئے تھے۔ ''انوبھو گائے سوراگی ہے'' اسی انوبھو نے اُن کے لفظوں کو آج تک روشن رکھا ہے۔ غالب نے انوبھو کو' دِلِ گداختہ'' سے تعبیر کیا اور اس نے اُن کی شاعری کو ابھی تک پرانا نہیں ہونے دیا۔ امریکن ناولسٹ گورے وڈال نے جین آسٹن کے بارے میں لکھا ہے۔ ''جین آسٹن کی دُنیا محدود تھی' لیکن وہ بڑی ادیبہ تھی' کیوں کہ وہ اِس چھوٹی سی دُنیا کو ہر زاویے سے جانتی تھی۔

ساز : ''لفظوں کا پل'' سے ''کھویا ہوا کچھ تک'' تجربے احساس اور فہم کی سطح پر تو مسلسل تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں مگر Idiom اور Treatment میں زیادہ تنوع نہیں ہے۔ تو اسے تنوع کی کمی کہا جائے یا ارتکاز کی شدت یا اپنے اسٹائل پر اصرار؟

ندا : ''لفظوں کا پل''، ''مورناچ''، ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' اور ''کھویا ہوا سا کچھ'' اِن چار شعری مجموعوں کے بعد بھی ظاہر ہے تخلیقی عمل جاری ہے۔ ان مجموعوں میں مَیں نے مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، نظم، گیت، دوہا، نثری نظم اور ماہیہ وغیرہ۔ جہاں تک لفظیات کا تعلق ہے' اُن کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ میری شعری زبان اُردو کی رائج شعری زبان ہے سے کسی حد تک الگ ہے۔ اس میں زمین و آسمان کو سوچا نہیں' دیکھا گیا ہے۔ میں نے لاشکل (Obstract) زبان کی جگہ تصویروں کے ذریعہ اپنی بات کہی ہے۔ میں نے اِس شعری رویے کے ذریعہ اِس لوک وراثت سے رشتہ جوڑنے کی سعی کی ہے جس میں اُردو کی حصہ داری نہ ہونے کے برابر تھی اور جہاں تک آپ نے Idiom اور Treatment کا سوال کیا ہے تو اس تعلق سے میں کتابوں سے کچھ اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا۔

کسی کو ٹوٹ کر چاہا' کسی سے کھنچ کر رہے

دُکھوں کی راحتیں جھیلیں، خوشی کے درد سہے
کبھی بگولہ سے بھٹکے، کبھی ندی سے بہے
کہیں اندھیرا، کہیں روشنی، کہیں سایہ
طرح طرح کے فریبوں کا جال پھیلا
پہاڑ سخت تھا، برسوں میں ریت ہو پایا

(لفظوں کا پل)

کتنے دِن بعد ملے ہو
چلو اِس شہر سے دُور
کسی جنگل کے کنارے، کسی جھرنے کے قریب
ٹوٹتے پانی کو پی کر دیکھیں
بھاگتے، دوڑتے لمحوں سے چرا کر کچھ وقت
صرف اپنے لئے جی کر دیکھیں
تم بھی جو چاہو کہو، میں بھی بلا خوف وخطر
ان سبھی لوگوں کی تنقید کروں
جن سے مل کر مجھے ہر روز خوشی ہوتی ہے

(مور ناچ)

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

دُنیا جسے کہتے ہیں، جادُو کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے، کھو جائے تو سونا ہے
غم ہو کہ خوشی دونوں، کچھ دیر کے ساتھی ہیں
پھر رستہ ہی رستہ ہے، ہنسنا ہے نہ رونا ہے

(آنکھ اور خواب کے درمیان)

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے چوکا، باسن، چمٹا، پھُکنی جیسی ماں

بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اِک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

آج ذرا فرصت پائی تو آج اُسے پھر یاد کیا
بند گلی کے آخری گھر کو کھول کے پھر آزاد کیا

پڑھے لکھوں کی بات نہ مانی' کام آئی نادانی ہی
سنا ہوا کو، پڑھا ندی کو، موسم کو اُستاد کیا

بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا
جو بیت گیا ہے وہ گذر کیوں نہیں جاتا

سب کی پوجا ایک سی' الگ الگ ہر ریت
مسجد جائے مولوی' کوئل گائے گیت

سیدھا سادا ڈاکیہ' جادو کرے مہان
ایک ہی تھیلے میں بھرے' آنسو اور مسکان

(کھویا ہوا سا کچھ)

ساز: آپ کے پیرائیہ اظہار میں مناظرِ کیفیات اور واقعات کو مشخص کرنے کا یعنی Personify کرنے کا فن خصوصاً متوجہ کرتا ہے۔ ''کھلی کہنیوں تک منور ہوتی صبحیں''، ''پڑوس کے آنگنوں میں ٹہلتی فراغتیں''، ''گلی کے کونے سے ہاتھ ملاتا ہوا پیپل اور ایسی بیسیوں مثالیں ہیں۔ یہ تلازمے فنی سطح پر آپ کے یہاں کن لطیف محرکات کی دین ہوتے ہیں۔

ندا: میں نے عرض کیا کہ میرے ہاں لاشکل الفاظ کی جگہ تصویروں کے ذریعہ اپنی بات کہنے کی ترجیح ہے۔ اس سوال کا جواب تو اِس سے پہلے کے سوالوں کے ذیل میں آ ہی چکا ہے۔

ساز: آپ کا تیسرا مجموعۂ کلام ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' آپ کے دُوسرے مجموعہ ''مورناچ'' کی بہ نسبت' پہلے مجموعہ ''لفظوں کا پل'' سے زیادہ Relate کرتا ہے۔

ندا : ''لفظوں کا پل'' میں جو معصومیت اور تحیّر کی ایک فطری فضا ہے' وہ ایک بالغ زاویے اور ایک کشادگیِ فکر کے ساتھ ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' میں لوٹ آئی ہے۔ جب کہ ''مورناچ'' میں تیز ابیت اور راست طنز زیادہ ہے۔ مثلاً : ''آدمی چند ملاقاتوں میں مر جاتا ہے''، ''جو چل سکو تو چلو ورنہ راستہ چھوڑ دو''، ''شائستہ محفلوں کی فضاؤں میں زہر تھا''، اُجلی پوشاک، سماجی عزت اور کیا چاہئے جینے کے لئے''، ''دِل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیئے'' وغیرہ وغیرہ۔

ندا : میں جب گوالیار سے بمبئی آیا تھا' اُس وقت تک ''لفظوں کا پل'' نامکمل رُوپ میں تھا۔ اس میں وہ قربتیں جو قصباتی زندگی کی دین ہوتی ہیں۔ لفظوں کی آہستہ روی اور تصویر گری میں نمایاں ہیں۔ ''مورناچ'' کی غزلیں، نظمیں، گیت، فاصلوں کی بستی، بمبئی کی عطا ہیں' جہاں میں نے ایک طویل عرصہ بے روزگاری، بے گھری اور بزرگ شاعروں کی ناراضگیوں کے عذاب میں گذارا تھا۔ ان حالات نے نہ صرف شعری موضوعات میں تبدیلی کا تقاضہ کیا بلکہ اِظہار کے پیرایوں میں ردو بدل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ''آنکھ اور خواب'' کے دوران بے گھری نے گھر، بے روزگاری نے روزگار، زندگی نے میرے وجود کے لئے تھوڑی بہت سہولتیں پیدا کرنی شروع کر دی تھیں۔ ''ملاقاتیں'' سے پیدا شدہ ناراضگیوں میں بھی بڑی حد تک توازن پیدا ہوتا گیا تھا۔ ان دو مجموعوں کے اُسلوب و موضوع کا فرق میرے شب و روز کی تبدیلی کا فرق ہے۔ میرے خیال سے حالات' یکساں واقعات کو نئی نئی شکل میں دِکھاتے رہتے ہیں۔ ہم اور معاشرہ وہی رہتا ہے۔ لیکن دیکھنے والی نظریں اور محسوس کرنے والے زاویے بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی مثال کے طور پر اپنی ایک غزل کے دو اشعار پیش کروں؟۔

جتنی بری کہی جاتی ہے' اُتنی بری نہیں ہے دُنیا
بچوں کے اسکول میں شاید تم سے نہیں ہے دُنیا

چار گھروں کے ایک محلے کے باہر بھی ہے آبادی
جیسی تمھیں دِکھائی دی ہے سب کی سب وہی نہیں ہے دُنیا

ساز : ''کھویا ہوا سا کچھ'' میں زندگی کی مثبت قدروں اور آفاقی سچائیوں پر اعتماد و اصرار اور زیادہ نکھر کے آیا ہے۔ انسانی دردمندی کا مشترک احساس، نیچر سے آدمی کی ہم آہنگی، انسان کے اندر سے زندہ رہنے کا یقین۔ کئی نظمیں اس کی مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ''شناخت کی دُعا''،

''کوئی اکیلا کہاں ہے''، ''روشنی کے فرشتے''، ''چھوٹی سی ہنسی''، ''سپنا زندہ ہے'' اور کئی نظمیں اور غزلوں کے بہتیرے اشعار بھی ۔ آپ کی گذشتہ دس بارہ برسوں کی شاعری میں نفی اور نشریت کی جگہ۔ اثبات اور Mellowness آ گئے ہیں ۔اس پردیس پر کچھ روشنی ڈالیں ۔

ندا : زندگی بدلتی ہے تو زندگی کو جاننے پہچاننے کے انداز بھی بدلتے ہیں ۔ ڈاکٹر اقبال کا مصرعہ ہے۔ ـ ''ثبات ایک تغیر ہے زمانے میں''۔ ان سے بہت پہلے مہاتما بدھ کہہ چکے تھے۔'' تبدیلی ایک حقیقت ہے اور ہر تبدیلی بھی تبدیلی ہوتی ہے۔'' یہ اُس سے بڑی حقیقت ہے ۔ فلسفہ طراز شاعر اکثر ایک ہی فکری دائرے کے امیر ہوتے رہتے ہیں ۔ میں نے اپنی شاعری کا موضوع خود اپنی زندگی اور اس کی بدلتی ہوئی سمت و رفتار کو بنایا ہے ۔اس کا مزاج سوانحی ہے ۔ میرے کلام میں یہ اثرات لفظوں کے آگے پیچھے محسوس کیے جا سکتے ہیں ۔

ساز : اس سے ایک سوال تصوف کی سمت بھی پھوٹتا ہے ۔تصوف کے شیڈس ادھر آپ کی شاعری میں نمایاں سے ہیں' حالانکہ آپ کی ابتدائی شاعری میں بھی جمال و تحیر کی رو سے اس کے امکانات مضمر تھے۔صوفیوں ، سنتوں کی صنفِ سخن 'دوہے' کی طرف آپ کا میلان بھی شاید اسی کا غماز ہے۔اس تعلق سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ندا : رائج اصطلاح میں تو تصوف سے میرا کوئی علاقہ نہیں ہے ۔لیکن میں طبیعتاً میر کے مصرعے ''ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا'' کے تجسس کا ضرور قائل ہوں ۔ میں انسان اور کائنات کے رشتوں کو الگ الگ اکائیوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتا۔ آسمان، زمین، درخت، پرندے، دریا، پربت اور انسان ایک ہی خاندان کے مختلف افراد ہیں' جو ارتقاء کے راستے میں ایک دُوسرے سے بچھڑ گئے ہیں ۔ میرا جس معاشرے سے تعلق ہے'اس میں کبوتر سیّد ہوتے تھے ،درخت بچوں کے بزرگ ہوتے تھے ، برسات کے بادل جھولوں میں جھولنے والوں کے ساتھ گاتے تھے ، کوے خوش خبریوں کے قاصد تھے ، کتوں کا رات کو رونا سانحات کی اِطلاع دیتا تھا ، مرغے کی بانگ سے دروازے کھلتے تھے ۔ فجر کی اذانوں سے رات کی نیندیں رُخصت ہوتی تھیں ۔ خدا ، انسان ، جانور ، پہاڑ ، سمندر سب کا ہوتا تھا ۔ وہ بچوں کے ساتھ اسکول جاتا ، ماں کے ہونٹوں سے مسکراتا تھا ، بہن کی چوڑیوں میں کھنکھناتا تھا ، سورج میں جگمگاتا تھا ، ہواؤں میں سرسراتا تھا ، کبیر داس کی شاعری کی طرح وہ سیکولر تھا ۔

اس کے کئی نام تھے۔ وہ اللہ بھی تھا، رام بھی تھا، غریب نواز بھی تھا، مورے لال بھی تھا، آتم گیان بھی تھا۔ صرف دوہے ہی نہیں، میری بیشتر نظموں اور غزلوں میں بھی اس معاشرے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ دوہوں کی طرف میرا میلان دراصل اس یکسانیت کو توڑنے کا عمل ہے جو کسی ایک صنفِ سخن میں بار بار طبع آزائی سے پیدا ہوتی ہے۔

ساز : ایک سوال......... حالانکہ گفتگو کا سلسلہ اب جہاں پہونچا ہے۔ یہ اس سے پہلے کا سوال ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اب ذہن میں اُبھرا ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے کسی گفتگو میں یا کسی مضمون میں اپنے اپروچ کو Anti Romantic بنایا ہے۔ ٹھیک ہے، اس کے جواز میں کچھ نظمیں اور اشعار ہیں بھی۔ مثلاً : "تم نے بے کار میں موسم کو ستایا ورنہ....."، "خون میں حرارت تھی یا تیری محبت تھی" وغیرہ۔ لیکن مجموعی طور پر آپ کی شاعری میں اچھا خاصہ رُومانی عنصر ہے۔ بلکہ حقیقت پسندی اور رُومان کا اِمتزاج مجھے تو آپ کی شاعری ہی میں نہیں، شخصیت میں بھی نظر آتا ہے۔ تو پھر Anti Romantic ہونے پر اصرار کیوں؟

ندا : میں اپنے سوانحی ناولوں "دیواروں کے بیچ" اور "دیواروں کے باہر" میں تفصیل سے اس موضوع پر بحث کر چکا ہوں۔ میں وقت اور حیات کے رشتے کو کسی فلسفے کا اِحاطہ نہیں مانتا۔ بتدریج بدلتے موسم ان کے اثرات فکری و جذباتی ردِ عمل کے آئینے بنتے ہیں۔ جس طرح سانسوں کا شمار کسی خاص معیار سے ممکن نہیں، اُسی طرح حسیاتی و جذباتی ترجیحات بھی اپنی سمتیں متعین کرتی رہتی ہیں۔ میں صداقتوں کو اِضافی مانتا ہوں، جس لمحے جو جیسا نظر آتا ہے، اُسی کو اِس لمحے کا سچ جانتا ہوں۔ آپ نے صحیح کہا ہے، میں بیک وقت رُومانی اور غیر رُومانی دونوں ہوں۔ جتنی زندگی میرے دائرے میں آسکی ہے، میں وہ سب کچھ ہوں۔

ساز : آپ شاعری میں غنائیت کے کس حد تک قائل ہیں؟ آپ نے نثری نظمیں بھی کہی ہیں؟

ندا : عمیق حنفی نے مجھے ایک خط لکھا تھا کہ ضروری نہیں ہر شعری آواز غنائی ہو لیکن میں پہلے کی طرح آج بھی غیر غنائی اور کھردرے لہجے کو شاعری ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ کیوں کہ شاعری صرف فکر نہیں، اِظہار کا پیرایہ بھی ہوتی ہے۔ پچھلے دِنوں کی بات ہے، میں تاج محل کے پاس جمنا کے کنارے اکیلا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ بار بار میں دو مصرعے دُہرا رہا ہوں۔ مصرعے ہندی کے شاعر نرالا کے تھے۔

باندھو نہ ناؤ اس ٹھاؤں بندھو!

پوچھے گا سارا گاؤں بندھو!

ان مصرعوں کے ساتھ اچانک میر کا ایک شعر بھی ذہن میں جاگ گیا ہے۔

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

ان دونوں شعروں میں کوئی بڑا خیال نظم نہیں کیا گیا۔ شعر صرف خیال ہوتا بھی نہیں۔ خیال کے ساتھ بحر کی چاہت، لفظوں کی کیفیت، قافیوں کی کھنک، ردیف کی چمک، لہجے کی نوعیت، مصرعے کی دروبست پورا آرکسٹرا ہوتا ہے۔ تب شعر شعر کا روپ دھارتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے نثری نظمیں بھی کہی ہیں۔ مگر میں نے پابندیوں کے راستے سے آزادیوں کا سفر طے کیا ہے۔ یوں تو میری شاعری کی مجموعی زبان کی نثر میں شعریت کی جستجو ہے۔ میرا خیال ہے نثر میں شعر کی آہنگ کی بازیافت قدرے مشکل کام ہے۔ اسی طرح نثر میں شعر کہنا بحر و وزن میں شعر کہنے سے زیادہ وقت طلب ہے۔

س: آپ کے دو حصوں پر مشتمل سوانحی ناول "دیواروں کے بیچ" اور "دیواروں کے باہر" میں آپ کے سیال اور دلکش اسلوب نثر، واقعات و معاملات کی فنکارانہ منظر کشی اور صیغۂ واحد متکلم کے امتزاج ڈرامائی برتاؤ کی تمام تر تحسین کے ساتھ بعض معاصرین کا خیال ہے کہ اس میں نرگسیت زیادہ ہے۔ وہ ایک طرح کا Self Projection کہتے ہیں۔ اس سوانحی ناول میں آپ سوانح اور ناول کی مطابقت اور افتراق کی کیا وضاحت کریں گے؟

ج: کسی بھی تخلیق سے تخلیق کار کا رشتہ تخلیق کے عمل تک ہی رہتا ہے۔ جب تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو تخلیق اور قاری کے درمیان سے تخلیق کار کو رخصت ہو جانا چاہیے۔ قاری کو کسی بھی تخلیق پر اپنی رائے کے اظہار کی آزادی ہونی چاہیے۔ نرگسیت یا Self Projection کے جو معنی میرے ذہن میں ہیں ان کا میری تخلیق ان کتابوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجتبیٰ حسین، ظ۔ انصاری، شمیم حنفی اور دیگر ناقدین نقادوں نے ان کتابوں پر لکھا ہے۔ انہوں نے بھی ان اعتراضات کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ یہودی شاعر یہودا امیخائی نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "دنیا میں کچھ لوگ محبت کرتے ہیں، کچھ نفرت کرتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان میری جگہ رہی ہے۔" ادب کی رائج تعریفوں سے جب کوئی گریز کرتا ہے تو بحث کا موضوع بن جاتا ہے۔

یوں تو ہر ناول کسی نہ کسی کردار یا کرداروں کی سوانح سے ہی بیانیہ کی تعمیر کرتا ہے۔ مذکورہ کتابوں میں کیونکہ مرکزی کردار کا نام ندا فاضلی ہے۔ اس لئے جو مجھے جانتے ہیں وہ اسے میرے حالات سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ ویسے ندا فاضلی ان کتابوں میں دُوسرے بہت سے متعلقہ کرداروں میں سے ایک ہے۔ ان میں سے کسی ایک کردار کی کہانی نہیں ہے۔ اس ایک کردار کے ذریعہ بہت سے کرداروں کی کہانیاں دُہرائی گئی ہیں۔

ساز : پوری دُنیا میں اس وقت نثر کا دَور ہے۔ کیا آپ اِس سے متفق ہیں؟ کیا فی زمانہ نثر میں فنی و تخلیقی اِظہار کی گنجائشیں زیادہ ہیں؟

ندا : نثر کے لکھتے ہوئے اکثر مجھے اس کی اہمیت اور طاقت کا اندازہ ہوا ہے۔ ہمارے عہد کی پیچیدگیاں جتنے پھیلاؤ اور تہہ داری کے ساتھ نثر میں بیان کی جا سکتی ہیں' شاعری کے ضابطوں اور قاعدوں میں ممکن نہیں۔ جو شعراء شاعری میں زیادہ آزادی سے کام لیتے ہیں وہ اپنے سرنا شاعر ہونے کا الزام لیتے ہیں۔ ترقی پسند عہد میں جیسی شاعری ہوئی' اُس سے کہیں فی صد بہتر کہانیاں لکھی گئیں۔ اس کی طرف ایک بار سجاد ظہیر نے واضح اِشارہ بھی کیا تھا۔ آج عالمی سطح پر نثر ہی حاوی ذریعہ اِظہار ہے۔ بیدی کی 'جوگیا'، منٹو کا 'ٹھنڈا گوشت'، کرشن چندر کا 'آدھے گھنٹے کا خدا' یا قرۃ العین حیدر کا 'آگ کا دریا' جیسی تہہ داری اور فکری وسعت لئے ہوئے تخلیقات ان کے ہم عصر شعراء کے یہاں نظر نہیں آتیں۔

ساز : آپ کی تازہ تصنیف ''چہرے'' خاصی مقبول ہو رہی ہے۔ جس میں آپ نے اُن شعراء کے کوائف اور شخصیت کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے' جو ادب و تنقید کے نہیں بلکہ شاعروں کے حوالے سے مشہور ہوئے۔ روز نامہ انقلاب میں اس کے قسط وار سلسلے بھی بڑی دِل چسپی سے پڑھے گئے تھے۔ کیا آپ اِس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کا اِرادہ رکھتے ہیں؟

ندا : اسے آگے بڑھانا اب شاید ممکن نہیں۔ میرے ساتھ ایک مشکل یہ ہے کہ میں کسی موڈ کی گرفت میں دیر تک نہیں رہتا۔ دُوسری مشکل یہ ہے کہ جن شاعروں پر میں نے لکھا ہے یا لکھنا چاہا' اُن میں سے بیش تر کا تعلق مشاعروں سے تھا۔ ادب کا رشتہ مشاعروں کی راتوں تک محدود تھا جو بعد میں دِن کی روشنی میں ختم ہو جاتا تھا۔ نہ اُن کی کتابیں کسی لائبریری میں بھیجی جاتی تھیں نہ رسائل میں اُن پر تبصرے شائع ہوتے تھے۔ لِھٰذا لکھنے کے لئے شعراء کے بارے میں جن

معلومات کی ضرورت ہے، وہ آسانی سے حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کے لئے میں قارئین کا شکر گذار ہوں۔

ساز: آپ غالب، میر اور اقبال میں کس کو ترجیح دیتے ہیں؟

ندا: تینوں اپنے مزاج اور عہد کے شاعر ہیں۔ میں بیک وقت بہت سے شاعروں کو پسند کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ ان بہت سوں میں اُردو کے علاوہ ہندوستانی زبانوں اور انگریزی اور انگریزی کے واسطے سے دُوسرے ممالک کے شعراء بھی شامل ہیں۔

ساز: اپنے پیش رو رہم عصر شعراء میں کچھ نام جو آپ کو زیادہ پسند ہوں۔

ندا: فہرست سازی بے جا اختلافات کو اُبھارتی ہے، جس کا نام بھول جایئے اُس کی گالی کھایئے...!

ساز: آپ کے بعد کے کچھ شعراء جن کے یہاں آپ سمجھتے ہیں، امکانات ہیں۔

ندا: نئی نسل کے یعنی میرے بعد کے کچھ شعراء مجھے پسند ہیں۔ مگر یہاں بھی فہرست سازی سے دُور رہنا پسند کروں گا۔

ساز: آپ کی شاعری پر میر کا شعر

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

بڑی حد تک صادق آتا ہے۔ آپ خود اِس ضمن میں کیا محسوس کرتے ہیں؟

ندا: آپ نے میر کے شعر کا حوالہ دیا لیکن میں نے عوام و خواص کے درمیان جو لفظوں کا پل بنایا ہے، اس میں میرا، کبیر، رحیم، سوز وغیرہ نے میرا زیادہ ساتھ نبھایا ہے۔ جب کہنے کو اپنا کچھ ہوتا ہے تو زیادہ آرائش یا اُلجھاؤ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

●●

جانے کیا ان کی نگاہوں نے کہا ہے ہم سے
آج کل شہر میں ہر کوئی خفا ہے ہم سے

کاش وہ ایک نہیں ہوتے بہت سے ہوتے
جن کو وہ مل نہ سکے، ان کو گلہ ہے ہم سے

مُلاقات

● فرحان حنیف

" نداؔ فاضلی کی شاعری نداؔ فاضلی کی طرح بچوں کو ھنساتی ھے ، بڑوں کو رُلاتی ھے ، چڑیوں کو چھکاتی ھے ، رنگوں کو سجاتی ھے ، پھولوں کو کھلاتی ھے اور سب سے بڑھ کر کائنات کو الفاظ میں پروکر کبھی غزل بناتی ھے تو کبھی نظم ، کبھی گیتوں کا رُوپ دیتی ھے تو کبھی دوھے کی شکل عطا کرتی ھے ۔ نداؔفاضلی آج کے عہد کے ایک کامیاب نثر نگار ، گیت کار اور شاعر ھیں ۔ اب تک ' لفظوں کا پل ' ، ' مور ناچ ' ، ' آنکھ اور خواب کے درمیان ' ، 'کھویا ھُوا سا کچھ ' ، ' ملاقاتیں ' ، 'دیواروں کے بیچ ' ، ' دیواروں کے باھر ' اور ' چہرے ' نامی کتابیں منظر عام پر آچکی ھیں ، داد بھی پاچکی ھیں ۔ "کھویا ھُوا سا کچھ " کے لئے نداؔ فاضلی کو ساھتیہ اکادیمی ایوارڈ بھی مل چکا ھے ۔ ' تعمیر کے قارئین کی خدمت میں نداؔ فاضلی کا ایک تازہ انٹرویو پیش کیا جارھا ھے ۔ "

ف : اپنی پیدائش اور تعلیم و تربیت کے علاوہ بچپن کے کسی دِلچسپ واقعے پر روشنی ڈالیں ۔

نداؔ : پیدائش اور تعلیم و تربیت کے بارے میں تفصیل سے " دیواروں کے بیچ " اور " دیواروں کے باہر " میں لکھ چکا ہوں ۔ ویسے میری پیدائش دہلی کی ہے ۔ والدہ بھی دہلی کی تھیں ، والد علی گڑھ کے پاس ایک قصبہ ہے دیبائی ' وہاں کے رہنے والے تھے ۔ میری تعلیم و تربیت گوالیار میں ہوئی ۔ دِلچسپ واقعہ یہ ہے کہ میری والدہ مجھ سے پہلے دو بچوں کو جنم دے چکی تھیں ۔ ایک بڑی بہن اور ایک بڑے بھائی ۔ اُس زمانے میں بھی اور آج بھی ہر گھر میں کمانے والی کی آمدنی کے حساب سے بچوں کی پیدائش کی تعداد مقرر ہوتی ہے ، میری والدہ دو کے بعد تیسرا جوان کے پیٹ میں تھا ' اُسے پیدا کرنا نہیں چاہتی تھیں اور وہ تیسرا میں تھا ۔ مجھے اِس دُنیا میں نہ لانے

کے لیے اُس زمانے کی تمام دیسی دواؤں کا استعمال اُنھوں نے کیا، اِس درمیان وہ ایک حادثے کا شکار ہوئیں لیکن اِس کے باوجود انہونی کو ہونی ہونا تھا' میں دُنیا میں آ گیا۔ دیسی ادُویات کا جو استعمال ہُوا تھا اُس نے لگتا ہے کہ کسی نہ کسی سطح پر میرے ذہن پر کچھ عجیب سے اثرات چھوڑے ہیں اور اِنہی اثرات کی گرفت میں بچپن سے میں اب تک ہُوں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ انسانی وجود اور اس کے وجود کے عناصر جس پر آئندہ زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اُس کی بُنیاد ماں کی کوکھ میں پڑ چکی ہوتی ہے اس کی اصطلاح میں اسے جنس کہا جاتا ہے۔ اس کو اور آسان طریقہ سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ نیم کا پیڑ مسجد جائے، گرودوارے جائے یا مندر جائے' اس میں کسی کی دُعا سے بھی سیب نہیں پیدا ہو سکتا، اس طرح سیب کا درخت لاکھ کوشش کرے اس کے اندر انگور نہیں اُگ سکتا۔

ف : ندا صاحب! پہلے تو یہ بتایئے کہ آپ کی شاعری کے آغاز کے کیا کوائف تھے؟

ندا : شاعری کا ماحول گھر میں ہی تھا۔ میرے والد دُعا دبیائیوی داغ اسکول کے نمائندہ شاعروں میں تھے۔ ویسے میری شاعری کی شروعات اور گوالیار میں ۱۹۶۰ء میں اچانک بے گھر ہونے کی تاریخ ایک ہی ہے۔ اکیلا پن اقتصادی بدحالی اور ملکی سیاست کے اُتار چڑھاؤ ان محرکات میں شامل ہیں' جن کا لفظی اِظہار میری شاعری اور نثر ہے۔

ف : آپ نے پہلا شعر کب اور کون سا کہا تھا؟

ندا : جس طرح مجھے آخری شعر کی اطلاع نہیں ہے کہ وہ کیسا اور کس طرح کا ہوگا' اسی طرح پہلے شعر کی بھی اطلاع نہیں ہے۔ شاید میرا پہلا شعر بغیر لفظوں کا تھا جو زیادہ بامعنی تھا اور وہ اُس چیخ کے رُوپ میں تھا جو میری والدہ کی لاکھ کوششوں کے باوجود میرے وجود میں ظاہر ہُوا تھا۔ وہ میرا پہلا احتجاج تھا' جس کے معنی میں آج تک سمجھنے کی کوشش کر رہا ہُوں۔

ف : 'لفظوں کا پل' سے 'کھویا ہُوا سا کچھ' پر تو مسلسل تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں مگر Treatment میں زیادہ تنوع نہیں ہے۔ اِسے کیا قرار دیا جائے، تنوع کی کمی، ارتکاز کی شدت یا اسٹائل پر اصرار؟

ندا : 'لفظوں کا پل'، 'مورناچ'، 'آنکھ اور خواب کے درمیان' اور 'کھویا ہُوا سا کچھ' ان چار شعری مجموعوں کے بعد بھی ظاہر ہے' تخلیقی عمل جاری ہے۔ ان مجموعوں کا میں نے مختلف شعری

اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔غزل، نظم، گیت، دوہے، نثری نظم اور ماہیہ وغیرہ۔ جہاں تک لفظیات کا تعلق ہے' ان کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ میری شعری زبان اُردو کی رائج شعری زبان سے کسی حد تک الگ ہے۔ اِس میں زمین و آسمان کو سوچا نہیں گیا ہے، دِکھایا گیا ہے۔ میں نے لاشکل Abstract زبان کی بند تصویروں کے ذریعہ اپنی بات کہی ہے۔ میں نے اِس شعری رویئے کے ذریعہ اس لوک وراثت سے رِشتہ جوڑنے کی سعی کی ہے' جس میں اُردو کی حصے داری اگرتھی بھی تو نہ ہونے کے برابر تھی اور جہاں تک Treatment کا سوال ہے تو اِس تعلق سے 'لفظوں کا پل'، 'مورناچ'، 'آنکھ اور خواب کے درمیان' اور 'کھویا ہُوا سا کچھ' میں مثالیں بھری پڑی ہیں:

دُنیا جسے کہتے ہیں' جادُو کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹّی ہے' کھو جائے تو سونا ہے

غم ہو کہ خوشی دونوں' کچھ دیر کے ساتھی ہیں
پھر رستہ ہی رستہ ہے' ہنسنا ہے نہ رونا ہے

ف : ندؔا صاحب! آپ کی گذشتہ دس بارہ برسوں کی شاعری میں نفی اور نثریت کی جگہ اثبات اور Mellowness آ گئے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

ندؔا : زندگی بدلتی ہے تو زندگی کو جاننے پہچاننے کے انداز بھی بدلتے ہیں۔ڈاکٹر اقبالؔ کا مصرع ہے۔ ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں۔ان سے بہت پہلے مہاتما بدھ کہہ چکے تھے۔تبدیلی ایک حقیقت ہے اور ہر تبدیلی بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ یہ اِس سے بڑی حقیقت ہے۔" فلسفہ طراز شاعر اکثر ایک ہی فکری دائرے کے امیر ہوتے ہیں' مگر جو زندگی کو فلسفہ بناتے ہیں' اُن کے شعری سفر کے مناظر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنی شاعری کا موضوع خود اپنی زندگی اور اس کی بدلتی ہُوئی سمت و رفتار کو بنایا ہے۔ اِس کا مزاج سوانحی ہے مرے کلام میں یہ اثرات لفظوں کے آگے پیچھے محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

ف : پوری دُنیا میں اس وقت نثر کا دور ہے' کیا آپ اِس سے متفق ہیں؟

ندؔا : نثر لکھتے ہُوئے اکثر مجھے اس کی اہمیت اور طاقت کا اندازہ ہُوا ہے۔ ہمارے عہد کی پیچیدگیاں جتنے پھیلاؤ اور تہہ داری کے ساتھ نثر میں بیان کی جاسکتی ہیں' شاعری کے ضابطوں اور قاعدہ

میں ممکن نہیں۔

ف : آپ غالب، میر اور اقبال میں کس کو ترجیح دیتے ہیں؟

ندا : تینوں اپنے مزاج اور عہد کے شاعر ہیں۔ میں بیک وقت بہت سے شاعروں کو پسند کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ ان بہت سوں میں اُردو کے علاوہ ہندوستانی زبانوں اور انگریزی کے واسطے سے دُوسرے ممالک کے شعراء بھی شامل ہیں۔

ف : آج اُردو کا جو مقام ہے اُس پر آپ کے تاثرات جاننا چاہوں گا۔

ندا : آج اُردو زبان اپنے رسم الخط کے ساتھ سیاسی کھیل تماشے کا ایک کھلونا بن گئی ہے۔ اس کی وجہ سے اُردو تعلیم آہستہ آہستہ گھٹتی جا رہی ہے۔ اُردو کے ساتھ تعصب کی بنیاد محمد علی جناح کے اس رویے سے شروع ہوتی ہے، جس میں اُنھوں نے دو قومی نظریے میں اُردو کو بھی شامل کیا تھا۔ ایک بڑا پیراڈاکس یہ ہے اور یہ سوچنے والا پہلو بھی ہے کہ ہندوستان میں آپ کے جتنے بھی مسائل پیدا ہوئے ہیں، ان کی پیدائش، ان کی کشمکش اور ان کا تصادم صرف دو آبہ تک محدود رہا ہے، جس کا نام اُردو ہے۔ جناح صاحب جس وقت اُردو کے مسلمان ہونے کا اعلان کر رہے تھے، قاضی نذر الاسلام مسلمان تھے اور بنگالی زبان کے بڑے شاعر تھے۔ بشیر وائیکم مسلمان تھے اور تامل زبان کے مشہور شاعر تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُردو کا تعلق کسی مذہب سے ہے نہ رہے گا۔ اُردو کا موجودہ رُوپ جو ہے اس کے پس پردہ انگریزوں کی ''ڈوائیڈ اینڈ رول'' کی پالیسی ہے۔ اس پالیسی نے رسم الخط کی سطح پر مجموعی طاقت کو توڑنے کی سعی کی کہ دیوناگری ہندوؤں کی زبان ہے اور پرشین اسکرپٹ جو ہے وہ مسلمانوں کی زبان ہے اور پھر بٹوارے کے بعد زبان بھی دو حصوں میں بٹ گئی۔

ف : آج بھی اِدھر اُدھر سے آزاد نظم کی مخالفت جاری ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ندا : اُردو کا معاشرہ احساس کمتری کا شکار ہے۔ دُنیا میں جو ہو رہا ہے یا اِرد گرد جو تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں، اُس کا اثر وہ نہیں لیتا ہے۔ وہ انٹرایکشن کی ضرورت کو بھی محسوس نہیں کرتا ہے۔ اُردو کے علاوہ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانیں اور باہری ممالک کی بڑی زبانوں میں آج جو شاعری ہو رہی ہے، وہ وزن، قافیہ، ردیف اور بحر سے آزاد ہے۔ سو سال قبل جب وِٹمین نے شاعری کا آغاز کیا تھا، اس وقت بھی اِسی طرح مخالفت جاری تھی۔ وٹمین نے نثری نظموں کا مجموعہ "I sing myself" (میں اپنے آپ کو جانتا ہوں) جب سامنے لایا تھا تب

انگریزی ادب میں اس سے اختلاف کا اظہار کیا گیا۔ ایمرسن نے اس وقت وٹمین کی حوصلہ افزائی کی تھی اور لکھا تھا۔

"نوجوان تمھیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے' میری پیشن گوئی ہے کہ تم نے انگریزی شاعری میں نئی جمالیات کو متعارف کرایا ہے۔"

آج آپ دیکھ رہے ہیں' انگریزی شاعری کی تاریخ وٹمین کے تذکرہ کے بغیر ناممکن ہے۔ دیکھئے آج زندگی کی پیچیدگیاں اتنی بڑھ گئی ہیں اور حالات اِتنے زیادہ تہہ در تہہ ہو چکے ہیں کہ اب یہ فارسی کے جو اثرات ہیں' قافیہ، ردیف، بحر اور آہنگ وغیرہ۔ زیادہ دُور ساتھ نہیں چل سکتے۔ آپ کو دُوسری زبانیں جن راستوں پر جارہی ہیں' انہی راستوں اور آزاد فضاؤں میں سانس لینی پڑیں گی۔ آج جو یہ رجعت پسندی ہو رہی ہے یہ اُس وقت بھی ہُوئی تھی' جب علی سردار جعفری اور ن۔ م۔ راشد نے آزاد نظمیں لکھی تھیں۔ اس زمانے میں اثر لکھنوی آزاد نظم کو قبول نہیں کرتے تھے اور آج بھی ہمارے یہاں حاوی صنفِ سخن غزل ہی ہے۔

ف : ندا صاحب! آخری سوال' آپ کی تازہ تصنیف 'چہرے' خاص مقبول ہو رہی ہے۔ کیا آپ آئندہ اس میں مزید اضافہ کرنے کے خواہش مند ہیں؟

ندا : اسے آگے بڑھانا اب شاید ممکن نہیں۔ میرے ساتھ مشکل یہ ہے کہ میں کسی موڈ کی گرفت میں دیر تک نہیں رہتا۔ دُوسری مشکل یہ ہے' جن شاعروں پر میں نے لکھا ہے یا لکھنا چاہتا تھا ان میں سے بیشتر کا تعلق مشاعروں سے تھا۔ ادب سے ان کا رشتہ مشاعروں کی راتوں تک محدود تھا' جو بعد میں دِن کی روشنی میں ختم ہو جاتا تھا۔ لہٰذا لکھنے کے لئے شعراء کے بارے میں جن معلومات کی ضرورت ہے' وہ ملنا مشکل ہے میں قارئین کا شکر گذار ہُوں کہ اُنھوں نے 'چہرے' کو پسند کیا۔

●●

سندر پھول گلاب کا ، یوں بگیا سے جائے
مرجھانے کے بعد بھی، کلیوں میں مُسکائے

برملا

● وقار قادری

و : شاعری کی ابتداء کب کی اور اس کے محرکات کیا تھے؟

ن : ''دیواروں کے بیچ'' میں لکھا ہے۔

و : پہلی نظم یا شعر کون سا کہا تھا؟

ن : ''دیواروں کے بیچ'' میں لکھا ہے۔

و : شاعری میں کس سے اصلاح لی؟

ن : بچوں کے کھیلوں سے۔

و : سب سے پہلے کلام کب اور کس جریدے میں شائع ہوا؟

ن : ''سریتا'' (اُردو)۔

و : پہلا مشاعرہ کب اور کہاں پڑھا؟

ن : اپنے گھر میں۔

و : قدیم شعراء میں آپ کن سے متاثر ہیں؟

ن : کسی ایک سے نہیں، بہت سوں سے اور کسی ایک زبان کے نہیں، بلکہ کئی بھاشاؤں کے۔

و : ہم عصر اور نئی نسل کے کن شعراء سے متاثر ہیں؟

ن : میرا عصر کسی ایک بھاشا یا ایک دیس تک محدود نہیں ہے۔

و : پسندیدہ اُردو ادیب؟

ن : کوئی ایک نام میں لے نہیں سکتا۔ مجھے طلسم ہوش رُبا بھی پسند ہے، خواجہ حسن نظامی بھی۔

و : پسندیدہ اُردو شاعر؟

ن : نظیر اور غالب۔

و : پسندیدہ عالمی شاعر یا ادیب؟

ن : بہت سے۔

و : ہندوستان کی علاقائی زبانوں سے متاثر کرنے والے شاعر، ادیب؟

ن : تکارام، وائکم بشیر، ٹیگور، ونداکرندیکر اور بہت سارے۔

و : سائنس اور تکنالوجی کے اِس دَور میں شاعری کی افادیت پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

ن : آج کی سوچ کے دائرے آج سے نہیں بلکہ First world War سے تبدیل ہونے شروع ہوئے۔ اِس میں مارکس، آئن اسٹائن اور فرائڈ کا بہت بڑا رول رہا ہے۔

و : مشاعرے شاعری کے فروغ میں کوئی کردار ادا کر رہے ہیں؟

ن : مشاعرے کی ساعتیں، لب و لہجے کی ہکلاہٹوں کو دُور کر دیتی ہیں۔

و : ایک شاعر یا ادیب کے لئے ذاتی مشاہدے کے ساتھ مطالعے کی کیا اہمیت ہے؟

ن : یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ فراقؔ صاحب کے مطابق لفظ لکھنے والے کی شخصیت کے حساب سے بڑا یا چھوٹا ہوتا ہے۔

و : شعر و ادب کے فروغ کے لئے حکومتِ وقت کیا اقدامات کر سکتی ہے؟

ن : دو دشمن کبھی ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکتے۔

و : اُردو غزل کے فروغ میں گلوکاروں کا حصّہ؟

ن : ظاہر ہے اُردو کے تعلق سے جو تعصب ہے وہ گلوکاروں کی آوازیں لپیوں کے فرق کو ختم کر دیتی ہیں۔

و : آپ کے پسندیدہ غزل گائیک؟

ن : کئی ہیں مہدی حسن، برکت علی خان، مدھورانی، جگجیت سنگھ اور بہت سے وہ جن کو میں نے ابھی تک نہیں سنا۔

و : پسندیدہ فلمی گلوکار؟

ن : سہگل صاحب، طلعت محمود صاحب، رفیع صاحب اور نئے لوگوں میں بہت سارے۔ بات یہ ہے کہ خدا کا دوسرا نام حُسن ہے اور حُسن کی جلوہ کاری ہر جگہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک دوسرے میں فرق کرنے میں کوئی Logic نہیں ہے۔

و : آپ کے پسندیدہ فلمی شاعر؟

ن : شیلیندر اور ساحر۔

و : آپ کے لئے سب سے بڑی خوشی کیا ہے؟

ن : دیش کی ایسی پارلیمنٹ جس کے چنے ہوئے نمائندوں کی جگہ بچے، بہنیں اور بھائی ہوں۔

و : آپ کو متاثر کرنے والی شخصیتیں؟

ن : اپنے چھوڑے ہوئے گھر کے سامنے والا نیم کا پیڑ، املی کا درخت اور وہاں کی گلیوں میں گھومتے ہوئے آوارہ کتے، سڑکوں پر راستہ روکتے ہوئے نندی بیل اور کالج کے گیٹ کے سامنے کا مندر۔

و : سب سے عزیز شخصیت؟

ن : ماں۔

و : کس بات سے ڈر لگتا ہے؟

ن : جب سامپر دائک (بنیاد پرست) طاقتیں زور پکڑتی ہیں۔

و : کن موقعوں پر جھوٹ بولتے ہیں؟

ن : جب اس سے کسی کا بھلا ہوتا نظر آئے۔

و : زندگی میں کس بات پر افسوس کیا ہے؟

ن : پیدا ہونے پر، غالب نے کہا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

سب سے بڑا افسوس یہ ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے یہ نہیں پوچھا گیا کہ کہاں پیدا ہونا چاہتے ہو؟ اگر پوچھا جاتا تو اچھا باپ، بہتر ماں اور ایسے دیس کا انتخاب کرتا جو ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کو ٹکڑوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتا، انسان کو اس کی انسانیت سے پہچانتا۔

و : کیا آپ کبھی روتے ہیں؟

ن : بہت رویا پر اب بھی کبھی کبھی رونے کا ریاض کرتا رہتا ہوں۔

و : فرصت کے لمحات میں آپ کیا کرنا پسند کرتے ہیں؟

ن : اپنے آپ سے ملتا ہوں اور جب اپنے آپ سے مل کر اُوب جاتا ہوں تو کتابوں کو پاس لے آتا ہوں، جب ان سے جی بھر جاتا ہے تو خالی آسمان میں اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ پورا برہمانڈ ایک پریوار کے سمان ہے۔ یہ مانو، پکشی، ورکش، آکاش اس کے

سد سیہ ہیں۔

و : کن باتوں پر ہنسی آتی ہے؟

ن : لیڈروں کی تقریروں پر۔

و : دوسروں کے کردار میں آپ کیا پسند کرتے ہیں؟

ن : اپنے سے مختلف باتیں۔

و : دوسروں کی کس بات سے آپ کو تکلیف پہنچتی ہے؟

ن : جب دھرم تجارت بنایا جاتا ہے اور عوام کو بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔

و : ہندوستان کی کس تاریخی شخصیت سے آپ متاثر ہیں؟

ن : کسی ایک شخصیت سے نہیں۔

و : آپ کی پسندیدہ تفریح گاہیں؟

ن : ایکانت کا آکاش، رستوں کے درخت، بچوں کو ٹافیاں بانٹنا، اجنبی چہروں کی Study کرنا۔

و : پسندیدہ کھانا' مغلائی، چائنیز، Continental یا گھریلو؟

ن : بھوک میں ہر کھانا اچھا لگتا ہے۔

و : زندگی میں کس سے ڈانٹ کھائی ہے؟

ن : وقت سے۔

و : کس بات پر غصہ آتا ہے؟

ن : اپنے آپ پر۔

و : اُردو کے کون سے ناول بہت پسند ہیں؟

ن : جو ابھی لکھے جانے باقی ہیں۔

و : اُردو کی پسندیدہ کہانیاں؟

ن : ٹوبا ٹیک سنگھ (منٹو)، امرتسر آ گیا (بھیشم ساہنی)، جوگیا (بیدی)، ہاؤسنگ سوسائٹی (قرۃ العین حیدر)، بجوکا (سُریندر پرکاش) اور کتنے نام اوں' میں نے ان کے نام لئے ہیں جو میرے ماضی یا قریب کے رائٹر ہیں۔ میرے ساتھ کے اور بعد کی بے شمار کہانیاں ہیں...!

و : پسندیدہ پانچ ہندی فلمیں؟

ن : مغل اعظم، مدرانڈیا، دیوداس (دلیپ کمار)، تیسری قسم اور سُر۔
و : پسندیدہ فلمی ہدایت کار؟
ن : محبوب خاں، کے آصف، مہیش بھٹ، لیش چوپڑہ۔
و : کیسی موت چاہیں گے؟
ن : پیدائش کی طرح موت کے بارے میں بھی مجھ سے پوچھا نہیں جائے گا۔
و : پسندیدہ فلمی موسیقار؟
ن : خیام، آر۔ڈی۔ برمن، اے۔آر۔ رحمٰن، آدیش شری واستو اور جگجیت سنگھ۔
و : وہ موسیقار جن کے ساتھ کام کرنے میں آپ کو مزہ آتا ہو؟
ن : پیشے میں مزہ نہیں دیکھا جاتا۔
و : ان دِنوں آپ کس کی کتاب پڑھ رہے ہیں؟
ن : میں بہ یک وقت کئی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ ان دِنوں مجھ پر امبیڈکر سوار ہیں۔
و : اُردو کا وہ کون سا شاعر یا ادیب ہے جسے نقادوں نے Over rate کیا ہے؟
ن : غالب۔
و : اُردو کا وہ کون سا شاعر یا ادیب ہے جسے نقادوں نے Under rate کیا ہے؟
ن : نظیر۔
و : آپ کے مطالعہ کی پسندیدہ جگہ؟
ن : میری لائبریری۔
و : ایک نہایت نجی سوال' معذرت کے ساتھ' شادی کیوں نہیں کی؟
ن : I am oppose to marrage institution, I am leaving with a women who is mother of my daughter.
و : فلمی نغمہ نگاری اور ادبی شاعری میں کس طرح تعاون برقرار رکھا؟
ن : ایک تجارت ہے اور دوسری ذہانت۔
و : فلمی گیت ایک ہی Sitting میں مکمل ہوتا ہے یا بعد میں دے دیتے ہیں؟
ن : ایک ہی Sitting میں مکمل ہو جاتا ہے۔

و : آپ کی غزل کے اسلوب پر زیادہ تر ہندی کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

ن : ہندی، اُردو دو زبانیں تھیں' ہیں' نہ رہیں گی۔ جسے آپ ہندی اثرات کہہ رہے ہیں وہ مشترکہ لسانی تحریک کے اثرات ہیں۔

و : کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ فلمی شاعری کے سبب آپ کی ادبی شاعری اثر انداز ہو رہی ہے؟

ن : اِس کا جواب مجھ سے بہتر میرے پڑھنے والے دے سکتے ہیں۔

و : گلوبلائزیشن پر کچھ؟

ن : گلوبلائزیشن ارتقاء کی تقدیر ہے۔ دُنیا کے جو فاصلے ہیں وہ بتدریج کم ہوتے جائیں گے۔ مگر ان کے کم ہونے کی رفتار کیا ہو' اس کا حساب کتاب ہر اس دیس کے معاشرے، اقتصادیات اور آبادی ہی کو طے کرنا چاہیئے۔ جو Advance Countreis Third World کو اپنی منڈی بنانے پر تُلے ہوئے ہیں وہ غلط ہے۔

و : ترقی پسند تحریک کے بعد ادب میں کیا اضافہ ہوا؟

ن : ہر تبدیلی کے ساتھ زندگی کی طرح ادب میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں' انہیں تحریکوں کا نام دیں یا نہ دیں' تھکے ہوئے آدمی کی طرح کسی پیڑ کے سائے میں بیٹھتا نہیں ہے' یہ مسلسل سفر کرتا رہتا ہے۔ نئے نئے آسمان اور زمین تلاش کرتا رہتا ہے۔

و : اُردو کا مستقبل؟

ن : ہمارے دیس کے دستور کے سیکولر کیریکٹر سے جڑا ہوا ہے۔ جس طرح ماضی کی سیاست نے اُردو کو مسلمان بنایا' اِسی طرح Constitution کا سیکولر کردار اسے دوبارہ مسلمان سے انسان بنا دے گا۔

●●

سکھا دیتی ہے چلنا ٹھوکریں بھی راہ گیروں کو
کوئی رستہ سدا دشوار ہو ایسا نہیں ہوتا

انتخاب
لفظوں کا پُل ۔ نظمیں

ایک بات

اس نے
اپنا پیر کھجلایا
انگوٹھی کے نگ کو دیکھا
اُٹھ کر
خالی جگ کو دیکھا
چٹکی سے اک تنکا توڑا
چرپائی کا بان مروڑا
بھرے پرے گھر کے آنگن میں
کبھی کبھی وہ بات
جو لب تک
آتے آتے کھو جاتی ہے
کتنی سُندر ہو جاتی ہے

☆☆

دو سہیلیاں

بیٹھے بیٹھے اُوب رہے ہیں
آؤ سہیلی
سرپٹ بھاگیں
سر کے بال تلک کھل جائیں
دھم دھم
یوں دہلیزیں لانگیں
گھٹنوں گھٹنوں تال میں چل کر
منہ منہ تک
گاگر بھر لائیں
اور نشانے تاک تاک کر
پتھر سے پتھر ٹکرائیں
برگد کی ننگی شاخوں پر
بن جھولے کے
ایسا جھولیں
لوکٹ چٹلے میں پھنس جائے
انگوٹھے پیشانی چھولیں
ہنسی ہنسی میں اِک دُوجے پر بدلی بن بن کریوں ٹوٹیں
آٹے جیسا کس کر گوندھیں
کئی جگہ سے ٹوٹیں، پھوٹیں

☆☆

نیا دِن

سورج!
اِک نٹ کھٹ بالک سا
دِن بھر شور مچائے
اِدھر اُدھر چڑیوں کو بکھیرے
کرنوں کو چھترائے
قلم، درانتی، برش، ہتھوڑا
جگہ جگہ پھیلائے

شام!
تھکی ہاری ماں جیسی
ایک دِیا ملکائے
دھیمے دھیمے
ساری بکھری چیزیں چنتی جائے

☆☆

پھر یوں ہوا

ممکن ہے چند روز
پریشاں رہی ہو تم
یہ بھی ہوا ہو، وقت پہ سورج اُگا نہ ہو
اِملی میں کوئی اچھا کتارا پکا نہ ہو
چھت کی کھلی ہواؤں میں آنچل اُڑا نہ ہو

دو تین دن رضائی میں سردی رُکی نہ ہو
کمرے کی رات پنکھ پسارے اُڑی نہ ہو

ہنسنے کی بات پر بھی بہ مشکل ہنسی ہو تم
ممکن ہے چند روز پریشاں رہی ہو تم

کچھ دِن خطوں میں آنسو بہے شور وغُل ہوا
تم زہر پی کے سوئیں!
میں انجن سے کٹ گیا!
پھر یوں ہوا کہ دُھوپ کھلی، ابر چھٹ گیا
میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسا لیا
تم نے پڑوس میں 'نیا بھائی' بنا لیا

☆☆

بھوت

دُور تک سنسان رستہ
اونگھتی بے سُدھ ہوائیں
اِک بھیانک خامشی سی

نیم سے دو ہاتھ پیچھے
اِک ہلتا جلتا سایہ

لمبے لمبے ہاتھ جس کے
شیر جیسے دانت جس کے
بڑ کی شاخوں سی جٹائیں
تیز شعلوں سی نگاہیں

رات کالی ہے تو کیا ہے
دو قدم کا فاصلہ ہے

چھو کے اپنی انگلیوں سے
بھوت کو پتھر بنا دو
آج گر گھبرا گئے تم
تو یہی خاموش پتھر

بدنما ، بے جان سا ڈر
عمر بھر شیطاں بن کر

یا کوئی بھگوان بن کر
راستہ روکا کرے گا
بے سبب ٹوکا کرے گا
آج اک پتھ میں ہے کل سے

ہر جگہ گھوما کرے گا
بے سبب ٹوکا کرے گا
راستہ روکا کرے گا

☆☆☆

قاتل

وہ!

جو ہوٹل میں چائے کے ٹوٹے کپ پر
نئی نئی پھلجھڑیاں سی چھوڑا کرتا ہے
بیٹھے بیٹھے ماچس کو توڑا کرتا ہے

وہ!

جو ٹیڑھے سے منہ سے اِک بیل کو لے کر
رستے بھر تیکھے جملے بولا کرتا ہے
رنگ برنگی اُپمائیں سوچا کرتا ہے

وہ!

جو چلتے رستے انجانے بچوں کے
بنے بنائے بالوں کو بکھرا دیتا ہے
رو دیتا ہے کوئی بہلا دیتا ہے

جانے کیوں جب سے میں نے اُس کو دیکھا ہے
میرے دِل میں ایک عجیب سا شک بیٹھا ہے

اپنے کمرے کے سناٹوں میں چھپ چھپ کر
روز کسی کو قتل کیا کرتا ہوگا وہ
رات گئے تک خون پیا کرتا ہوگا وہ

☆☆☆

بمبئی

یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا

فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سُلگ رہی ہیں فضاؤں میں اَن گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو
کھوے، کولھے، پنڈلیاں، آنکھیں
مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا

یہاں تو سب ہی بڑے چھوٹے
اپنے چہروں کو
چمکتی آنکھوں کو، گالوں کو، ہنستے ہونٹوں کو
سروں کو خول سے باہر نکال لیتے ہیں
سویرے اُٹھتے ہی جیبوں میں ڈال لیتے ہیں

عجیب بستی ہے

اس میں نہ دِن، نہ رات، نہ شام
بسوں کی سیٹ سے سورج طلوع ہوتا ہے
جھلستی ٹین کی کھولی میں چاند سوتا ہے

یہاں تو کچھ بھی نہیں ریل اور بسوں کے سوا
زمیں پہ رینگتے بے حس سمندروں کے سوا
عمارتوں کو نگلتی عمارتوں کے سوا
یہ قبر قبر جزیرہ کسے جگاؤ گے
خود اپنے آپ سے اُلجھو گے، ٹوٹ جاؤ گے!

☆☆☆

نوحہ

کسی کو ٹوٹ کر چاہا کسی سے کھنچ کے رہے
دُکھوں کی راحتیں جھیلیں، خوشی کے درد سہے
کبھی بگولا سے بھٹکے
کبھی ندی سے بہے
کہیں اندھیرا، کہیں روشنی، کہیں سایہ
طرح طرح کے فریبوں کا جال پھیلایا
پہاڑ سخت تھا، برسوں میں ریت ہو پایا

☆☆☆

اِظہار

شام ہونے کو ہے
پیلی دُھوپ
چھجے سے اُتر کر
اُون کے گولے سی بستر پر پڑی ہے
رنگ میں ڈوبی دِشائیں
پتیوں میں سرسراتی اپسرائیں
تم نہیں ہو
چاہتا ہوں اس گھڑی جو ذہن میں ہے نظم کر دوں
لفظ سارے لفظ
کتنے اجنبی
کتنے اجانے
کانچ کی پیالی کو چکنا چور کر دوں
سب کتابوں پر نئے کاغذ چڑھا دوں
نیم کی ڈالی سے چڑیا کو اُڑا دوں
دوڑتے بچے کو گودی میں اُٹھا کر
راستے سے اِک نئی گڑیا دِلا دوں
ریشمی تلووں کو منہ سے گدگدا دوں

لفظ سارے لفظ
کتنے اجنبی
کتنے اجانے

☆☆☆

پاسپورٹ آفیسر کے نام!

کراچی ایک ماں ہے
بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا
یہ رشتہ پیار کا پاکیزہ رشتہ ہے جسے
یہ اب تک
نہ کوئی توڑ پایا ہے
نہ کوئی توڑ سکتا ہے
غلط ہے ریڈیو، جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں

نہ میری ماں کبھی تلوار تانے رَن میں آئی ہے
نہ میں نے اپنی ماں کے سامنے بندوق اُٹھائی ہے

یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے
یہ کیسی لڑائی ہے

☆☆☆

خدا خاموش ہے

بہت سے کام ہیں
لپٹی ہوئی دھرتی کو پھیلا دیں
درختوں کو اُگائیں
ڈالیوں پہ پھول مہکا دیں
پہاڑوں کو قرینے سے لگائیں
چاند لٹکائیں
خلاؤں کے سروں پہ
نیلگوں آکاش پھیلائیں
ستاروں کو کریں روشن
ہواؤں کو گتی دے دیں
پھُدکتے پتھروں کو پنکھ دے کر نغمگی دے دیں
لبوں کو مسکراہٹ
انکھڑیوں کو روشنی دے دیں
سڑک پہ ڈولتی پرچھائیوں کو
زندگی دے دیں

خدا خاموش ہے!
تم آؤ تو تخلیق ہو دُنیا
میں اِتنے سارے کاموں کو اکیلا کر نہیں سکتا

☆☆☆

کئی دِنوں سے چاند اُگا
نہ سُورج نکلا
جب سے تم پردیس گئے ہو
بہت اندھیرا ہے

رات رات بھر پانی برسے
دُھول اُڑے دِن دِن بھر
لوہارن لوہے کو پیٹے
لگے ہتھوڑا من پر
بڑھئی بے چارہ لکڑی چیرے
میں دیکھوں اُٹھ اُٹھ کر

نئی صراحی میں بھی پانی
ندیا جیسا ہے
جب سے تم.......

ابھی ابھی ٹوٹے گا پیالہ
پھر خود جڑ جائے گا
مڑ کر دیکھا تو
کھڑکی کا سریا مڑ جائے گا
کبھی لگے
پنجرے میں بیٹھا پنچھی اُڑ جائے گا

کیسے کیسے نئے وِچاروں نے
آگھیرا ہے
جب سے تم پردیس گئے ہو
بہت اندھیرا ہے

☆☆☆

ہری ہری گھاس
چلی سَن سَن ہوا
بھرا منہ کٹورے سا تال
شیشے کی پیالی سا چھن سے گرا کچھ
بچوں کے تلوؤں سا من میں ہوا کچھ
مٹکے کے پانی سا ٹھنڈا لگا کچھ
تھمی تھمی سانس
کبھی زینہ چڑھوں
کبھی سہلاؤں بلّی کے بال

ہری ہری گھاس....
گھوڑے کی ٹانگوں میں نگن کا پھندا
لکڑی کی تختی پہ لوہے کا رندا
اُڑنے کی کوشش میں زخمی پرندا
نئی نئی باس
کھلے شبدوں کے دُوار
اُڑے زنجیر پہنے خیال
ہری ہری گھاس
چلی سَن سَن ہوا

☆☆☆

❁

نہا گئیں ڈالیں کھجوروں کی
بھاگ گئے پتھر پہاڑوں کے
بالوں کو بکھرائیں، کپڑے بگاڑیں
مٹی میں دبے، دھنسے پتھر اُکھاڑیں
جی چاہا
دوڑ پڑیں
چیخیں، دہاڑیں
سنور گئے چھجے جھروکوں میں
موسم گندری، سنگھاڑوں کے
نہا گئیں ڈالیں.........
چاندی کی لڑیوں سی، بگلوں کی ڈاریں
ہاتھوں میں تیر کسے اُڑتی پھواریں
کس سے لڑائی کریں
کس کو پکاریں
بھرے بھرے مٹ میلے بادل کے دَل
جیسے گھٹیلے اکھاڑوں کے
نہا گئیں ڈالیں.....

☆☆☆

غزلیں

جھکے ہوئے کندھوں پہ سانسوں کی گٹھری
رستوں میں نوکیلی گھاس
چائے کے پیالوں میں ماتھوں کی شکنیں
سمٹی ہوئی کرسیاں
سرحد، سپاہی، گیہوں، کبوتر
اخبار کی سرخیاں
سگرٹ کی ڈبیوں میں بندی سویرا
لوکل کے ڈبوں میں شام
لڑتا جھگڑتا کوئی کسی سے
بے بات کوئی ہنسے
ساگر کنارے لہروں پہ کوئی
کنکر سے حملہ کرے
لمبی رسّی پہ کپڑے ہی کپڑے
کپڑوں کے کونوں میں نام
جھکے ہوئے کندھوں پہ سانسوں کی گٹھری
رستوں میں نوکیلی گھام

☆☆☆

خط ہے کہ بدلتی رُت یا گیتوں بھرا ساون
اِٹھلاتی ہوئی گلیاں، شرماتے ہوئے آنگن

شیشے سا دُھلا چوکا، موتی سے دُھلے برتن
کھلتا ہوا اک چہرہ، ہنستے ہوئے سو درپن

سمٹی ہوئی چوکھٹ پر کچھ دُھوپ گلہری سی
نیبو کی کیاری میں چاندی کے کئی کنگن

بچوں سی ہُمکتی شب، گیندوں سے اُچھلتے دِن
چہروں سی دُھلی خوشیاں، بالوں سی کھلی اُلجھن

ہر پیڑ کوئی قصہ، ہر گھر کوئی افسانہ
ہر راستہ پہچانا، ہر چہرے پہ اپنا پن

●●

چنچل ہوئی ہوائیں تو پانی مچل گیا
پربت کو چیرتا ہوا دریا نکل گیا

رستے میں کوئی کار، نہ عورت، نہ بلڈنگیں
دو گھونٹ تھی شراب مگر جی بہل گیا

رنگوں کے اِمتزاج میں پوشیدہ آگ تھی
دیکھا تھا میں نے چھو کے مرا ہاتھ جل گیا

اکثر پہاڑ سر پہ گرے اور چپ رہے
یوں بھی ہوا کہ پتہ ہلا، دِل دہل گیا

پہچانتے تو ہوں گے ندا فاضلی کو تم
سورج کو کھیل سمجھا تھا چھوتے ہی جل گیا

●●

کبھی کبھی یوں بھی ہم نے اپنے جی کو بہلایا ہے
جن باتوں کو خود نہیں سمجھے اوروں کو سمجھایا ہے

اُس کو بھولے مدت گذری، لیکن آج نہ جانے کیوں
آنگن میں ہنستے بچوں کو بے کارن دھمکایا ہے

اس بستی سے چھٹ کر یوں تو ہر چہرے کو یاد کیا
جس سے تھوڑی سی اَن بن تھی وہ اکثر یاد آیا ہے

کوئی ملا تو ہاتھ ملایا، کہیں گئے تو باتیں کیں
گھر سے باہر جب بھی نکلے دِن بھر بوجھ اُٹھایا ہے

●●

کچھ بھی بچا نہ کہنے کو ہر بات ہوگئی
آؤ کہیں شراب پئیں رات ہوگئی

پھر یوں ہوا کہ وقت کا پانسا پلٹ گیا
اُمید جیت کی تھی مگر مات ہوگئی

سورج کو چونچ میں لیے مُرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

وہ آدمی تھا کتنا بھلا ، کتنا پُرخلوص
اس سے بھی آج لیجیے ملاقات ہوگئی

رستے میں وہ ملا تھا' میں بچ کر گذر گیا
اُس کی پھٹی قمیص مرے ساتھ ہوگئی

نقشہ اُٹھا کے کوئی نیا شہر ڈھونڈیے
اِس شہر میں تو سب سے ملاقات ہوگئی

●●

دریا ہو یا پہاڑ ہو ٹکرانا چاہیے
جب تک نہ سانس ٹوٹے جیے جانا چاہیے

یوں تو قدم قدم پہ ہے دیوار سامنے
کچھ بھی نہ ہو تو خود سے اُلجھ جانا چاہیے

جھکتی ہوئی نظر ہو کہ سمٹا ہوا بدن
ہر رس بھری گھٹا کو برس جانا چاہیے

چوراہے ، باغ ، بلڈنگیں ، سب شہر تو نہیں
کچھ ایسے ویسے لوگوں سے یارانا چاہیے

اپنی تلاش ، اپنی نظر ، اپنا تجربہ
رستہ ہو چاہے صاف بھٹک جانا چاہیے

چپ چپ مکان، راستے گم سم، نڈھال وقت
اس شہر کے لیے کوئی دیوانا چاہیے

بجلی کا قمقمہ نہ ہو ، کالا دھواں تو ہو
یہ بھی اگر نہیں ہو تو بُجھ جانا چاہیے

●●

منہ کی بات سنے ہر کوئی، دِل کے درد کو جانے کون
آوازوں کے بازاروں میں خاموشی پہچانے کون

میں اُس کی پرچھائیں ہوں یا وہ میرا آئینہ ہے
میرے ہی گھر میں رہتا ہے، مجھ جیسا ہی جانے کون

لاکھ پکارے سورج سورج، لاکھ بجائے دُھوپ گھڑی
اندھوں کی اندھی نگری میں، دیوانے کی مانے کون

جانے کیا کیا بول رہا تھا، سرحد، پیار، کتابیں، خون
کل میرے بستر پر تھک کر، ٹوٹ رہا تھا جانے کون

صدیوں صدیوں وہی تماشہ، رستہ رستہ لمبی کھوج
لیکن جب ہم مل جاتے ہیں، کھو جاتا ہے جانے کون

کرن کرن اَلساتا سُورج، پلک پلک کھلتی نیندیں
دھیمے دھیمے بکھر رہا ہے، ذرّہ ذرّہ جانے کون

●●

کتنے دِن بعد

کتنے دِن بعد ملے ہو
چلو اِس شہر سے دُور
کسی جنگل کے کنارے
کسی جھرنے کے قریب
ٹوٹتے پانی کو پی کر دیکھیں
بھاگتے دوڑتے لمحوں سے چُرا کر کچھ وقت
صرف اپنے لیے جی کر دیکھیں
کوئی دیکھے نہ ہمیں
کوئی نہ سننے پائے
دِن دہاڑے
ہر گلی کُوچے میں گھس کر
بند دروازوں کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک
جنگ
گھر گھر بولتی ہے
سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد

☆☆

پہچان

(ہاجرہ بیگم کی نذر*)

نہیں یہ بھی نہیں!
یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں ——— وہ تو
نہ جانے کون تھے
یہ سب کے سب تو میرے جیسے ہیں
سبھی کی دھڑکنوں میں ننھے ننھے چاند روشن ہیں
سبھی میری طرح سے وقت کی بھٹی کے ایندھن ہیں
جنھوں نے میری کُٹیا میں اندھیری رات میں گھُس کر
میری آنکھوں کے آگے
میرے بچوں کو جلایا تھا
وہ کوئی اور تھے
وہ چہرے تو کہاں اب ذہن میں محفوظ جج صاحب!
مگر ہاں!
پاس ہوں تو سونگھ کر پہچان سکتی ہوں
وہ اُس جنگل سے آئے تھے
جہاں کی عورتوں کی گود میں
بچے نہیں ہنستے

☆☆

☆ جلگانو کے فساد میں جن کے چار بچوں کو فسادیوں نے جلا دیا تھا۔

نیا روگ

یہ نیا روگ ہے
آج کے دَور کا
اس نئے روگ کی کوئی پہچان ایسی نہیں
جس کی تشخیص ہو

ہر دوا بے اثر
سرنگوں چارہ گر
آج ہر لہلہاتے ہوئے کھیت میں
گیہوں کے ساتھ اُگتی ہیں خاموشیاں
سرد خاموشیاں
جو گلے سے اُترتے ہی گھُن کی طرح
چاٹ لیتی ہیں آواز کی بجلیاں
بند کانٹوں کا یہ خوش لباس آدمی
دیکھتا ہے
مگر بول سکتا نہیں

سوچتا ہے
مگر چیخ سکتا نہیں

☆☆

سوال پوچھتے رہو

سروں پہ آسمان تھا
قدم قدم زمین تھی
دُھواں دُھواں ہے آسماں
زمین کھوگئی کہاں؟
برس رہی ہے تیرگی
نہ ہاتھ ہیں نہ پانو ہیں
نہ شہر ہیں نہ گانو ہیں
صدائیں ہی صدائیں ہیں
وطن، چراغ، خون، ڈر
عرب، یہود، کینسر
چناب، رُوس، چین، گھر
سیہ، سفید، بے لگام
تَوا، کڑھائی، وِیت نام
سوال ہی حیات ہے
سوال کائنات ہے
سوال ہی جواب ہے
سوال انقلاب ہے
کوئی جواب دے، نہ دے
سوال پوچھتے رہو

☆☆

آخری سہارا

کئی سال پہلے
اِسی شہر میں وہ
نہ جانے کہاں کی زمیں سے اُکھڑ کر
سمندر کی بستی میں اُگنے چلا تھا

بہت سارے الفاظ تھے ساتھ اُس کے
محبت کے الفاظ
نفرت کے جملے
بغاوت کے قصے، بدلتے زمانے
وطن کی زمینوں کے رنگیں ترانے

گذرتے ہوئے وقت کا تیز ریلا
چمکتے ہوئے سارے لفظوں کا دفتر
بہالے گیا ہے

محبت، شرافت، عداوت، بغاوت
ہری گھاس سا، سارا سرمایہ اُس کا
کڑی دُھوپ میں سوکھ کر، لُٹ چکا ہے
فقط ایک ہی لفظ باقی بچا ہے
''نہیں!......''
اِک بڑا سا 'نہیں' اب تلک

اُس کے ہونٹوں پہ چپکا ہوا ہے
جسے وہ لگا تار دُہرا رہا ہے
کسی ڈوبتے آدمی کی طرح سے
وہ کمزور جبڑوں میں تنکا دبائے
سمندر کی لہروں سے ٹکرا رہا ہے
☆☆

مرثیہ

وہ مر گیا چلو اچھا ہوا
کئی دِن سے
گھسٹ رہا تھا، بچارا عذاب ختم ہوا

خود اپنا جسم ہی کندھوں پہ اپنے کیا کم ہے
تمام عمر بھلا کون کس کو ڈھوتا ہے
بہت سے لوگ اِکٹھا ہیں موت کا گھر ہے
سبھی خرید کے لائے ہیں چار چھے آنسو
کبھی کبھی کا یہ مل بیٹھنا غنیمت ہے
نئے پلان، تجارت، معاہدے، وعدے
مکان بیمہ، سفارش، معاشقے، جھگڑے
جلوس میں ہر اِک چہرہ ہے فکر سے مغموم
عوام میں بہت ہر دِل عزیز تھا مرحوم
☆☆

فریب

وہ نہ آیا
نہ آئے گا

یوں ہی صدیوں سے
پانی بے لہر ہے
چپ چاپ کھڑے ہیں پربت
راستے جاگتے رہتے ہیں
ہر اک آہٹ پر
چونک جاتے ہیں
مگر کوئی نہیں
کسی بجتے ہوئے شیشے کی کھنک
دُور اُڑتے ہوئے پنچھی کے پروں کی لرزش
کوئی ناکام اکیلی لغزش
وقت مٹھی میں بندھی ریت سا
ذرّہ ذرّہ
اُنگلیاں چیر کے بہتا ہی چلا جاتا ہے
کہکشاں کھلتی ہے سر پر
نہ سمٹتی ہے زمیں
صرف پرچھائیاں آتی ہیں گذر جاتی ہیں
وہ نہ آیا ہے
نہ آئے گا...... کبھی!
☆☆

خودکشی

کیا خوب آدمی تھا، بلا کا ذہین تھا
کہتا تھا ماں کی گود سے تاریک قبر تک
اِک راستہ ہے
جس پہ چلے جا رہے ہیں ہم
پہیے پہ چڑھ چکے ہیں
گھسے جا رہے ہیں ہم
اُلجھا رہا وہ ذہن کے اندر تمام عمر
ہر نیا پل نیا سوال تھا
جینا وبال تھا
محدود ہو کے سوچنا
اُس کو محال تھا
لیڈر بنا!
نہ چور!
نہ رُوحانی پیشوا!
افسوس جیسے آیا تھا ویسے ہی چل دیا
ہر قدر کو ناپتا تھا یہی اُس کا عیب تھا
کم بخت کو یہ عیب چھپانا نہ آسکا
لوگوں کو بے وقوف بنانا نہ آسکا
کیا خوب آدمی تھا

☆☆

معجزہ

تمھیں اِن زمینوں میں بویا گیا تھا
جنہیں کاغذی معجزوں کی گھٹاؤں نے سینچا ہے برسوں
تمھیں آسمانی فرشتوں کی
برفیلی بانہوں نے بھینچا ہے برسوں
تمھارے لہو میں اَپاہج تقدس کی سیرابیاں ہیں
تقدس کی سیرابیوں کو بڑھاؤ
ہر اِک سال بچے پہ بچہ اُگاؤ
بزرگوں کی قبروں پہ چادر چڑھاؤ
نہ گھبراؤ!
طوفاں کی یورش سے
دُعائیں کرو
ان دُعاؤں کو سُن کر
کوئی نور کا معجزہ
نور کی سیڑھیوں سے اُتر کر
چلا آئے گا
چمکتی ہوئی نور کی کشتیوں میں
گرجتے ہوئے سارے طوفان کو بھر کے لے جائے گا
تمھیں ملنے جلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے
تمھارا ہر اِک کام اللہ اکبر کے جادُو سے ہوتا ہے
ہوتا رہے گا

☆☆

اُتر، دکھن، پورب، پچھم
الگ الگ ہر دھارا
جگہ جگہ بٹوارا

دُکھ کا چہرا ایک ہی چہرہ
دُکھ کے بھیس ہزاروں
میری کٹیا، تیرا آنگن
بنگلہ دیس ہزاروں
روتی آنکھیں مندر مسجد
ٹوٹا دِل گُردُوارا
جگہ جگہ بٹوارا

کمرہ کمرہ پوری دھرتی
ہر مجبوری خواب
ایک آنسو ماٹی کا بھوجن
سو آنسو سیلاب
ٹکڑا ٹکڑا سُورج
ثابت سب اندھیارا
جگہ جگہ بٹوارا

☆☆

بڑا مزہ آیا لڑائی میں
ٹوٹ گئی چُوڑی کلائی میں

شربت سے میٹھے، دَوائی سے کڑوے
سیّاں غضب کے شریر
گیلے اندھیروں میں چوکے نشانہ
برسائیں تیروں پہ تیر
دُھواں دُھواں موسم رضائی میں
بڑا مزہ آیا لڑائی میں
ریشم کے گچھے سا سُلگتا سویرا
اُجلے ہواؤں کے چہرے
نیلے اندھیرے، گلابی اُجالے
بادل سنہرے، سنہرے
نیا نیا پانی ترائی میں
بڑا مزہ آیا لڑائی میں

☆☆☆

من نہیں لاگے
بیری جیون ریشم ریشم
اُلجھے سارے دھاگے
من نہیں لاگے

بینا کے تاروں میں سرگم
سرگم کے گھیرے میں گیت
گیتوں کی سیما پہ سپنے
سپنوں میں اَن دیکھا میت
نیل گگن میں چندا بھٹکے
سُورج دِن بھر جاگے
اُلجھے سارے دھاگے

اُترے دُھندلکوں میں سُورج
لہروں میں لہرائے آگ
چُپ چُپ کناروں کے پتھر
ندیا کے ہونٹوں میں جھاگ
من کا پنچھی گم سم بیٹھے
تن پربت پر بھاگے
اُلجھے سارے دھاگے

☆☆☆

جینا ہو تو جینا سیکھو
اِدھر اُدھر مت بھٹکو

بستی بستی جال بچھے ہیں
خوابوں کے پھندے ہیں
پٹیوں کے بل چلنے والے
صدیوں سے اندھے ہیں
ہر عظمت کے پیروں نیچے
اوروں کے کندھے ہیں
اوروں کے کندھوں پہ چڑھ کر
اپنے کندھے جھٹکو
اِدھر اُدھر مت بھٹکو

قدم قدم پر بت پھیلے ہیں
کب تک سر ٹکراؤ
بہتی بھیڑ جدھر لے جائے
چُپ چُپ بہتے جاؤ
جب تک ٹھوکر مار نہ پاؤ
ہنس کے ٹھوکر کھاؤ

لوہے کی زنجیر کے اندر
لوہا بن کے اٹکو
اِدھر اُدھر مت بھٹکو

☆☆☆

غزلیں

اپنا غم لے کے کہیں اور نہ جایا جائے
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سجایا جائے

خودکشی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی سب میں
اور کچھ دِن ابھی اوروں کو ستایا جائے

کیا ہوا شہر کو، کچھ بھی تو دِکھائی دے کہیں
یوں کیا جائے کبھی خود کو رُلایا جائے

گھر سے مسجد ہے بہت دُور' چلو یوں کرلیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

جن چراغوں کو ہواؤں کا کوئی خوف نہیں
اُن چراغوں کو ہواؤں سے بچایا جائے

باغ میں جانے کے آداب ہوا کرتے ہیں
کسی تتلی کو نہ پھولوں سے اُڑیا جائے

☆☆☆

دُنیا جسے کہتے ہیں' جادُو کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے' کھوجائے تو سونا ہے

اچھا سا کوئی موسم' تنہا سا کوئی عالم
ہر وقت کا رونا تو بے کار کا رونا ہے

برسات کا بادل تو دیوانہ ہے کیا جانے
کس راہ سے بچنا ہے' کس چھت کو بھگونا ہے

یہ وقت جو تیرا ہے' یہ وقت جو میرا ہے
ہر گام پہ پہرہ ہے' پھر بھی اسے کھونا ہے

غم ہو کہ خوشی دونوں' کچھ دیر کے ساتھی ہیں
پھر رستہ ہی رستہ ہے' ہنسنا ہے نہ رونا ہے

آوارہ مزاجی نے پھیلا دیا آنگن کو
آکاش کی چادر ہے' دھرتی کا بچھونا ہے

☆☆☆

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

تمام شہر میں ایسا نہیں، خلوص نہ ہو
جہاں اُمید ہو اِس کی، وہاں نہیں ملتا

کہاں چراغ جلائیں، کہاں گُلاب رکھیں
چھتیں تو ملتی ہیں لیکن، مکاں نہیں ملتا

یہ کیا عذاب ہے، سب اپنے آپ میں گم ہیں
زباں ملی ہے مگر، ہم زباں نہیں ملتا

چراغ جلتے ہی بینائی بجھنے لگتی ہے
خود اپنے گھر میں ہی، گھر کا نشاں نہیں ملتا

☆☆☆

کبھی بادل، کبھی کشتی، کبھی گرداب لگے
وہ بدن جب بھی سجے، کوئی نیا خواب لگے

ایک چُپ چاپ سی لڑکی، نہ کہانی، نہ غزل
یاد آئے جو کبھی، ریشم و کمخواب لگے

گھر کے آنگن میں بھٹکتی ہوئی دِن بھر کی تھکن
رات ڈھلتے ہی پکے کھیت سی شاداب لگے

ابھی بے سایہ ہے دیوار، کہیں لوچ، نہ خم
کوئی کھڑکی کہیں نکلے، کہیں محراب لگے

☆☆☆

بات کم کیجیے ' ذہانت کو چھپاتے رہیے
اجنبی شہر ہے یہ ' دوست بناتے رہیے

دُشمنی لاکھ سہی ،ختم نہ کیجیے رشتہ
دِل ملے یا نہ ملے ' ہاتھ ملاتے رہیے

یہ تو چہرے کا فقط عکس ہے تصویر نہیں
اس پہ کچھ رنگ ابھی اور چڑھاتے رہیے

غم ہے آوارہ اکیلے میں بھٹک جاتا ہے
جس جگہ رہیے ' وہاں ملتے ملاتے رہیے

جانے کب چاند بکھر جائے گھنے جنگل میں
گھر کی چوکھٹ پہ کوئی دیپ جلاتے رہیے

☆☆☆

من بیراگی ،تن انوراگی 'قدم قدم دُشواری ہے
جیون جینا سہل نہ جانو' بہت بڑی فن کاری ہے

اَوروں جیسے ہو کر بھی ہم باعزت ہیں بستی میں
کچھ لوگوں کا سیدھا پن ہے' کچھ اپنی عیاری ہے

جب جب موسم جھوما' ہم نے کپڑے پھاڑے ،شور کیا
ہر موسم شائستہ رہنا ' کوری دُنیا داری ہے

عیب نہیں ہے اس میں کوئی' لال پری ،نہ پھول گئی
یہ مت پوچھو' وہ اچھا ہے یا اچھی ناداری ہے

جو چہرہ دیکھا وہ توڑا ، نگر نگر ویران کیے
پہلے اَوروں سے خوش تھے' اب خود سے بیزاری ہے

☆☆☆

رات کے بعد نئے دِن کی سحر آئے گی
تیرگی چھوڑ بھی دے، روشنی کھا جائے گی

ہنستے ہنستے کبھی تھک جاؤ تو چھپ کے رولو!
یہ ہنسی بھیگ کے، کچھ اور چمک جائے گی

جگمگاتی ہوئی سڑکوں پہ اکیلے نہ پھرو
شام آئے گی کسی موڑ پہ ڈس جائے گی

اور کچھ دیر یوں ہی جنگ، سیاست، مذہب
اور تھک جاؤ، ابھی نیند کہاں آئے گی

میری غُربت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی

وقت ندیوں کو اُچھالے کہ اُڑائے پربت
عمر کا کام گذرنا ہے، گذر جائے گی

☆☆☆

کچے بخیے کی طرح رشتے اُدھڑ جاتے ہیں
لوگ ملتے ہیں مگر مل کے بچھڑ جاتے ہیں

یوں ہوا دوریاں کم کرنے لگے تھے دونوں
روز چلنے سے، تو رستے بھی اُکھڑ جاتے ہیں

چھانو میں رکھ کے ہی پوجا کرو یہ موم کے بت
دھوپ میں اچھے بھلے نقش بگڑ جاتے ہیں

بھیڑ سے کٹ کے نہ بیٹھا کرو تنہائی میں
بے خیالی میں کئی شہر اُجڑ جاتے ہیں

☆☆☆
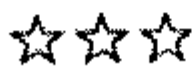
انتخاب
آنکھ اور خواب کے درمیاں
نظمیں

نئے گھر کی پہلی نظم

چار دیواروں چھت باندھ کے
جب وہ اُترا
جسم تھا اُس کا پسینے سے شرابور
مگر
اُس کو آرام کی مہلت نہ ملی
گھر کی دیواروں نے
دیواروں کی زینت کے لیے
نیلے آکاش میں اُڑتے ہوئے
اُس کے سر کو
ایک کمرے میں مُقفّل کر کے
اُس کے بے سر کے بدن کے اوپر
سازوسامان کی
فہرست لگادی ایسے
کوئی ڈھلوان پر پہیے کو گھمادے جیسے
دیکھتے دیکھتے
ٹی وی
فرج
صوفہ بن کے
آدمی کھوگیا عزت کا تماشہ بن کے
ہر گھڑی بھاگتے رہنا ہے
مقدر اُس کا
گھر کی دیواروں نے ہی
چھین لیا گھر اُس کا

☆☆

شکایت

تمھاری شکایت بجا ہے
مگر تم سے پہلے بھی
دُنیا یہی تھی
یہی آج بھی ہے
یہی کل بھی ہوگی
تمھیں بھی اِسی اینٹ پتھر کی دُنیا میں
پل پل بکھرنا ہے
جینا ہے مرنا ہے
بدلتے ہوئے موسموں کی یہ دُنیا
کبھی گرم ہوگی
کبھی سرد ہوگی
کبھی بادلوں میں نہائے گی دھرتی
کبھی دُور تک
گرد ہی گرد ہوگی
فقط ایک تم ہی نہیں ہو
یہاں جو بھی اپنی طرح سوچتا ہے
زمانے کی نیرنگیوں سے خفا ہے
ہر اک زندگی اِک نیا تجربہ ہے
مگر جب تلک یہ شکایت ہے زندہ
یہ سمجھو میں پر محبت ہے زندہ
☆☆

دیوانگی رہے باقی

تُو اِس طرح سے میری زندگی میں شامل ہے
جہاں بھی جاؤں یہ لگتا ہے تیری محفل ہے

ہر ایک رنگ ترے رُوپ کی جھلک لے لے
کوئی ہنسی، کوئی لہجہ، کوئی مہک لے لے

یہ آسمان، یہ تارے، یہ راستے، یہ ہوا
ہر ایک چیز ہے اپنی جگہ ٹھکانے سے
کئی دِنوں سے شکایت نہیں زمانے سے
مری تلاش تری دِل کشی رہے باقی
خدا کرے کہ یہ دیوانگی رہے باقی
☆☆

انتقام

مسجدوں، مندروں کی دُنیا میں
مجھ کو پہچانتے کہاں ہیں لوگ
روز میں چاند بن کے آتا ہوں
دِن میں سورج سا جگمگاتا ہوں
کھنکھناتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں
میں ہی!
مزدور کے پسینے میں
میں ہی!
برسات کے مہینے میں
میری تصویر آنکھ کا آنسو
میری تحریر
جسم کا جادُو
مسجدوں، مندروں کی دُنیا میں
مجھ کو پہچانتے نہیں جب لوگ
میں!
زمینوں کو بے ضیاء کر کے
آسمانوں میں لوٹ جاتا ہوں
میں خدا بن کے
قہر ڈھاتا ہوں

☆☆

فیصلہ

(کرنل قذافی کی بیٹی اور امریکن پائلٹ کی
بے وقت موت کی نذر)

نہیں ایسا نہیں ہوگا
پہاڑوں میں رہو
یا گھر کی دیواریں اُٹھاؤ تم
کسی بھی پیڑ کی چھانو تلے
دھونی رَماؤ تم
کہیں بھی چھپ کے جاؤ تم
ہمارے ساتھ ہو تم
تمھارے ساتھ ہیں ہم
تمہارے جسم میں جب تک لہو ہے
اور لہو میں زندگی کی آگ روشن ہے
ہمارا اور تمھارا
ایک ہی مٹی کا بندھن ہے
یہ ساری زندگی

دھرتی پہ آدم کے اُترنے سے
ابھی تک...اِک لڑائی ہے
مسلسل اِک لڑائی
جس میں اوروں کی طرح تم خود بھی شامل ہو
لڑائی......راکھشش بھی، دیوتا بھی
لڑائی......بولہب بھی، مصطفےٰ بھی
لڑائی......خودکشی بھی کربلا بھی
لڑائی سے مفر ممکن نہیں چاہے کہیں جاؤ
مگر کیسے لڑو
یہ فیصلہ خود تم کو کرنا ہے
کسی آکاش سے
بارود کی صورت بکھر جاؤ
اندھیری رات میں

یا
لیبیا میں جل کے مر جاؤ

☆☆

جنگ

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد
جنگ!
بے گھر بے سہارا
سرد خاموشی کی آندھی میں بکھر کے
ذرّہ ذرّہ
پھیلتی ہے
تیل
گھی
آٹا
کھنکتی چوڑیوں کا رُوپ بھر کے
بستی بستی ڈولتی ہے
دِن دہاڑے
ہر گلی کوچے میں گھس کر
بند دروازوں کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک
جنگ!
گھر گھر بولتی ہے
سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد

☆☆

والد کی وفات پر

تمہاری قبر پر
میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا
تم مر نہیں سکتے
تمھاری موت کی سچی خبر جس نے اُڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
وہ تم کب تھے
کوئی سُوکھا ہوا پتہ ہوا سے ہل کے ٹُوٹا تھا
مری آنکھیں
تمھارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
وہ.... وہی ہے
جو تمھاری نیک نامی اور بدنامی کی دُنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا
تمھارے ہاتھ
میری اُنگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کے لئے
جب بھی قلم، کاغذ اُٹھاتا ہوں
تمھیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کُرسی میں پاتا ہوں
بدن میں میرے جتنا بھی لہو ہے
وہ تمھاری
لغزشوں، ناکامیوں کے ساتھ بہتا ہے
مری آواز میں چھپ کر
تمھارا ذہن رہتا ہے
مری بیماریوں میں تم
مری لاچاریوں میں تم
تمھاری قبر پر جس نے تمھارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے
تمھاری قبر میں مَیں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فُرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

☆☆

اِتّفاق

ہم سب
ایک اِتفاق کے
مختلف نام ہیں

مذہب
مُلک
زبان
اِسی اِتفاق کی اَن گنت کڑیاں ہیں
اگر پیدائش سے پہلے
اِنتخاب کی اِجازت ہوتی
تو کوئی لڑکا
اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہونا پسند نہیں کرتا

☆☆

رُخصت ہوتے وقت

رُخصت ہوتے وقت
اُس نے کچھ نہیں کہا
لیکن ایئر پورٹ پر اَٹیچی کھولتے ہوئے
میں نے دیکھا
میرے کپڑوں کے نیچے
اُس نے
اپنے دونوں بچوں کی تصویر چھپادی ہے
تعجب ہے
چھوٹی بہن ہوکر بھی
اُس نے مجھے ماں کی طرح دُعا دی ہے

☆☆

سونے سے پہلے

ہر لڑکی کے
تکیے کے نیچے
تیز بلیڈ
گوند کی شیشی
اور کچھ تصویریں ہوتی ہیں
سونے سے پہلے
وہ کئی تصویروں کی تراش خراش سے
ایک تصویر بناتی ہے
کسی کی آنکھیں کسی کے چہرے پر لگاتی ہے
کسی کے جسم پر کسی کا چہرہ سجاتی ہے
اور جب اِس کھیل سے اُوب جاتی ہے
تو کسی بھی گوشت پوست کے آدمی کے ساتھ
لپٹ کر سو جاتی ہے

☆☆

پُرانے کھیل

ہم تم گھنٹیاں بجتے ہی پنجروں سے
نکل کر باہر آتے ہیں
نئے نئے کرتب دِکھاتے ہیں
دُشمنوں کی طرح ایک دُوسرے سے ٹکراتے
ہیں
جب لڑ جھگڑ کے تھک جاتے ہیں
تو واپس اپنے پنجروں میں قید ہو جاتے ہیں
ہمیں ہماری لڑائی کی وجہ معلوم نہیں
مُرغوں کی ہاتھا پائی سانپ اور مور کی لڑائی
شیر اور بیل کی مارکٹائی
نئے راجے نوابوں کے پُرانے کھیل ہیں
ہم تو صرف لڑائے جاتے ہیں
ہمارا کام صرف تماشا کرنا ہے
دُوسروں کے لیے جینا ہے
دُوسروں کے لیے مرنا ہے

☆☆

گیت

تیری سانسیں جیا نہیں جو
گھر آنگن کا دِیا نہیں جو
وہ تُلسی کی رامائن ہے تیرا نام نہیں

تیرا ہی تن پوجا گھر ہے
کوئی مورت گڑھ لے
کوئی پُستک ساتھ نہ دے گی
چاہے جتنا پڑھ لے

تیرے سُر میں سجا نہیں جو
اِک تارے پر بجا نہیں جو
وہ میرا کی سَم پتّی ہے تیرا شیام نہیں

☆☆☆

تیرے پیروں چلا نہیں جو
دُھوپ چھانو میں ڈھلا نہیں جو
وہ تیرا سچ کیسے جس پر تیرا نام نہیں

تجھ سے پہلے بیت گیا جو
وہ اِتہاس ہے تیرا
تُجھ کو ہی پورا کرنا ہے
جو بن باس ہے تیرا

غزلیں

سفر میں دُھوپ تو ہوگی ' جو چل سکو تو چلو
سبھی ہیں بھیڑ میں تم بھی ' نکل سکو تو چلو

کسی کے واسطے راہیں کہاں بدلتی ہیں
تم اپنے آپ کو خود ہی ' بدل سکو تو چلو

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم ' سنبھل سکو تو چلو

کہیں نہیں کوئی سُورج ' دُھواں دُھواں ہے فضا
خود اپنے آپ سے باہر ' نکل سکو تو چلو

یہی ہے زندگی ' کچھ خواب ، چند اُمیدیں
انہیں کھلونوں سے تم بھی ' بہل سکو تو چلو

☆☆

ہر چمکتی قُربت میں ایک فاصلہ دیکھوں
کون آنے والا ہے کس کا راستہ دیکھوں

شام کا دُھندلکا ہے یا اُداس ممتا ہے
بھولی بسری یادوں سے پھوٹتی دُعا دیکھوں

مسجدوں میں سجدوں کی مشعلیں ہوئیں روشن
بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں

لہر لہر پانی میں ڈوبتا ہوا سُورج
کون مجھ میں دَر آیا اُٹھ کے آئینہ دیکھوں

لہلہاتے موسم میں تیرا ذِکرِ شادابی
شاخ شاخ پر تیرے نام کو ہرا دیکھوں

☆☆

کچھ طبیعت ہی ملی تھی ایسی' چین سے جینے کی صورت نہ ہوئی
جس کو چاہا اُسے اپنا نہ سکے' جو ملا اُس سے محبت نہ ہوئی

جس سے جب تک ملے دِل ہی سے ملے' دِل جو بدلا تو فسانہ بدلا
رسمِ دُنیا کو نبھانے کے لیے ہم سے رشتوں کی تجارت نہ ہوئی

دُور سے تھا وہ کئی چہروں میں' پاس سے کوئی بھی ویسا نہ لگا
بے وفائی بھی اُسی کا تھا چلن' پھر کسی سے یہ شکایت نہ ہوئی

چھوڑ کر گھر کو کہیں جانے سے' گھر میں رہنے کی عادت تھی بڑی
جھوٹ مشہور ہوا راجا کا' سچ کی سنسار میں شہرت نہ ہوئی

وقت رُوٹھا رہا بچے کی طرح' راہ میں کوئی کھلونا نہ ملا
دوستی تو نبھائی نہ گئی' دُشمنی میں بھی عداوت نہ ہوئی

☆☆

دِن سلیقے سے اُگا' رات ٹھکانے سے رہی
دوستی اپنی بھی کچھ روز زمانے سے رہی

چند لمحوں کو ہی بنتی ہیں مصور آنکھیں
زندگی روز تو تصویر بنانے سے رہی

اس اندھیرے میں تو ٹھوکر ہی اُجالا دے گی
رات جنگل میں کوئی شمع جلانے سے رہی

فاصلہ چاند بنا دیتا ہے ہر پتھر کو
دُور کی روشنی نزدیک تو آنے سے رہی

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

☆☆

دیوار و دَر سے اُتر کے پرچھائیاں بولتی ہیں
کوئی نہیں بولتا جب تنہائیاں بولتی ہیں

پردیس کے راستوں میں رُکتے کہاں ہیں مسافر
ہر پیڑ کہتا ہے قصہ' خاموشیاں بولتی ہیں

موسم کہاں مانتا ہے تہذیب کی بندشوں کو
جسموں سے باہر نکل کے انگڑائیاں بولتی ہیں

اِک بار تو زندگی میں ملتی ہے سب کو حکومت
کچھ دِن تو ہر آئینے میں' شہزادیاں بولتی ہیں

سننے کی مُہلت ملے تو آواز ہے پتھروں میں
اُجڑی ہوئی بستیوں میں آبادیاں بولتی ہیں

☆☆

تنہا تنہا دُکھ جھیلیں گے' محفل محفل گائیں گے
جب تک آنسو پاس رہیں گے' تب تک گیت سُنائیں گے

تم جو سوچو' وہ تم جانو' ہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر جانے میں' ورنہ گھر کھو جائیں گے

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو' چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر وہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

اچھی صورت والے سارے پتھر دِل ہوں ممکن ہے
ہم تو اُس دِن رائے دیں گے' جس دِن دھوکا کھائیں گے

کس رستے سے سفر ہے آساں' کون سا رستہ مشکل ہے
ہم بھی جب تھک کر بیٹھیں گے' اوروں کو سمجھائیں گے

☆☆

انتخاب

کھویا ہوا سا کچھ۔ نظمیں

جو اِس گھڑی نام ہے تمھارا

یہ زندگی!
آج جو تمھارے
بدن کی چھوٹی بڑی نسوں میں
مچل رہی ہے
تمھارے پیروں سے
چل رہی ہے
تمھاری آواز میں
گلے سے نکل رہی ہے
تمھارے لفظوں میں ڈھل رہی ہے
یہ زندگی!
جانے کتنی صدیوں سے
یوں ہی شکلیں بدل رہی ہے
بدلتی شکلوں........!
بدلتے جسموں میں
چلتا پھرتا یہ اِک شرارہ
جو اِس گھڑی نام ہے تمھارا
اسی سے ساری چہل پہل ہے
اِسی سے روشن ہے
ہر نظارہ
ستارے توڑو
کہ گھر بساؤ
علم اُٹھاؤ
کہ سر جھکاؤ
تمھاری آنکھوں کی روشنی تک ہے
کھیل سارا
یہ کھیل
ہوگا نہیں دوبارہ
یہ زندگی!

☆☆

ایک لُٹی ہوئی بستی کی کہانی

بجی گھنٹیاں
اونچے مینار گونجے
سنہری صداؤں نے
اُجلی ہواؤں کی پیشانیوں پر
رحمت کے
برکت کے
پیغام لکھے
وضو کرتی صبحیں
کھلی کہنیوں تک منور ہوئیں
جھلملائے اندھیرے
بھجن گاتے آنچل نے
پوجا کی تھالی سے بانٹے سویرے
کھلے دوار
بچوں نے بستہ اُٹھایا
بزرگوں نے پیڑوں کو پانی پلایا
نئے حادثوں کی خبر لے کے
بستی کی گلیوں میں اخبار آیا
خدا کی حفاظت کی خاطر
پولس نے
پجاری کے مندر میں
مُلّا کی مسجد میں
پہرہ لگایا
خدا!
اُن مکانوں میں لیکن کہاں تھا
سلگتے محلّوں کے دیوار و در میں
وہی چل رہا تھا
جہاں تک دُھواں تھا

☆☆

کوئی اکیلا کہاں ہے

شکریہ!
اے درخت تیرا
تری گھنی چھاؤں
میرے رستہ کی دِلکشی ہے
شکریہ!
اے چمکتے سُورج
تری شعاعوں سے
میرے آنگن میں روشنی ہے
شکریہ!
اے چہکتی چڑیا
ترے سُروں سے
مری خموشی میں نغمگی ہے
پہاڑ!
مرے لئے موسم سجا رہا ہے
ندی کا پانی
ہوا سے بادل بنا رہا ہے
کسی کی سُوئی سے
میرا اگر تا تُرپ رہا ہے
گلاب!
میرے لئے ہی دُھوپوں میں تپ رہا ہے
کوئی اکیلا کہاں ہے

زمین کے ذرّہ سے آسماں تک
ہر اِک وجود ایک کارواں ہے
زمین ماں ہے
ہر ایک سَر پر
ہزار رِشتوں کا آسماں ہے
بٹی ہُوئی سرحدوں میں
سب کچھ جڑا ہُوا ہے
اکیلا پن
آدمی کی فُرصت کا فلسفہ ہے
☆☆

حمد

نیل گگن میں بیٹھے
کب تک چاند ستاروں سے جھانکو گے
پربت کی اونچی چوٹی سے
کب تک دُنیا کو دیکھو گے
آدرشوں کے بند صحیفوں میں
کب تک آرام کرو گے
میرا چھپّر ٹپک رہا ہے
بن کر سُورج اسے سُکھاؤ
خالی ہے آٹے کا کنستر
بن کر گیہوں اس میں آؤ
ٹوٹ گیا ہے ماں کا چشمہ
شیشہ بن کر اِسے بناؤ

چپ چپ ہیں آنگن میں بچّے
بن کر گیند انھیں بہلاؤ
شام ہُوئی ہے
چاند اُگاؤ
پیڑ ہلاؤ
ہوا چلاؤ
کام بہت ہیں
ہاتھ بٹاؤ اللہ میاں
میرے گھر* میں
آ ہی جاؤ اللہ میاں

☆☆

* یو پی کے ایک لوک گیت کا مصرعہ

سپنا زندہ ہے

دھرتی اور آکاش کا رشتہ جُڑا ہوا ہے
اِسی لیے
چڑیا اُڑتی ہے
اِسی لیے
ندیا بہتی ہے
اِسی لیے ہے
چائے کی پیالی میں کڑواہٹ
اِسی لیے تو
چہرہ بنتی ہے ہر آہٹ
دھرتی اور آکاش کا رشتہ جُڑا ہوا ہے
اِسی لیے تو
کہیں سے کچھ اچھا ہے
کچھ کھوٹا ہے
کچھ سچا ہے

سامنے والی کھڑکی
جُوڑا باندھ رہی ہے
دھیمے دھیمے
سُونا رستہ جاگ رہا ہے
اُچھل رہی ہے
تنگ گلی میں گیند ربڑ کی
اُس کے پیچھے پیچھے
بچہ بھاگ رہا ہے
رات اور دِن کے بیچ
کہیں سپنا زندہ ہے
مری نہیں ہے
اب تک
یہ دُنیا زندہ ہے
دھرتی اور آکاش کا رشتہ جڑا ہوا ہے

☆☆

خدا باپ نے
اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کیا ہے
کبھی آسمانی کتابوں نے تم پر
تمھارے عذابوں کو
آساں کیا ہے
خدا کی بنائی ہوئی اس زمیں پر
جو سچ پوچھو
تم سے محبت ہے سب کو
تمھارے دُکھوں کا
مداوا نہ ہوگا
تمھارے دُکھوں کی
ضرورت ہے سب کو

☆☆

چھوٹا آدمی

تمھارے لیے
سب دُعا گو ہیں
تم جو نہ ہوگے
تو کچھ بھی نہ ہوگا
اِسی طرح مرمر کے جیتے رہو تم
تمھیں ہر جگہ ہو
تمھیں مسئلہ ہو
تمھیں حوصلہ ہو
مُصوّر کے رنگوں میں
تصویر بھی تم
مُقرر کے نعروں میں تقریر بھی تم
تمھارے لیے ہی!

تمھیں!

ہندو کی چاہت ہے

نہ مسلم سے عداوت ہے

تمھارا دھرم!

صدیوں سے تجارت تھا

تجارت ہے

مجھے معلوم ہے لیکن

تمھیں!

مجرم کہوں کیسے

عدالت میں

تمھارے جُرم کو ثابت کروں کیسے

تمھاری جیب میں خنجر

نہ ہاتھوں میں

کوئی بم تھا

تمھارے رَتھ پہ تو

مریادا پُرشوتم کا پرچم تھا

☆☆

ایک قومی رہنما کے نام

مجھے معلوم ہے

تمھارے نام سے منسوب ہیں

ٹوٹے ہوئے سُورج

شکستہ چاند

کالا آسماں

کرفیو زدہ راہیں

سُلگتے کھیل کے میدان

روتی، چیختی مائیں

مجھے معلوم ہے

چاروں طرف

جو یہ تباہی ہے

حکومت میں

سیاست کے تماشے کی گواہی ہے

آخری سچ

وہی ہے زندہ.......!
گرجتے بادل
سُلگتے سُورج
چھلکتی ندیوں
کے ساتھ ہے جو
خود اپنے قدموں کی دُھوپ ہے جو
خود اپنی آنکھوں کی
رات ہے جو
وہی ہے زندہ
بزرگ سچائیوں کی راہوں
تجربوں کا عذاب ہے جو
سکوں نہیں
اِضطراب ہے جو
وہی ہے زندہ
جو چل رہا ہے.
وہی ہے زندہ
جو گر رہا ہے
سنبھل رہا ہے

جو لمحہ لمحہ بدل رہا ہے
دُعا کرو
آسماں سے اس پر
کوئی صحیفہ اُتر نہ آئے
کھلی فضاؤں میں
آخری سچ کا زہر
پھر سے بکھر نہ جائے
جو آپ
اپنی تلاش میں ہے
وہ دیوتا بن کے
مر نہ جائے

☆☆

روشنی کے فرشتے

ہُوا سویرا
زمیں پر پھر ادب سے آکاش
اپنے سر کو جھکا رہا ہے
کہ بچے اسکول جا رہے ہیں
ندی میں اشنان کر کے سُورج
سنہری ململ کی پگڑی باندھے
سڑک کنارے
کھڑا ہوا مسکرا رہا ہے
کہ بچے اسکول جا رہے ہیں

ہوائیں!
سرسبز ڈالیوں میں
دُعاؤں کے گیت گا رہی ہیں
مہکتے پھولوں کی لوریاں
سوتے راستوں کو جگا رہی ہیں
گھنیرا پیپل!
گلی کے کونے سے ہاتھ اپنے ہلا رہا ہے
کہ بچے اسکول جا رہے ہیں
فرشتے نکلے ہیں روشنی کے
ہر ایک رستہ ہے
چمک رہا ہے
یہ وقت وہ ہے
زمیں کا ہر ذرّہ
ماں کے دِل سا دھڑک رہا ہے
پُرانی اِک چھت پہ وقت بیٹھا
کبوتروں کو اُڑا رہا ہے
کہ بچے اسکول جا رہے ہیں
کہ بچے اسکول جا رہے ہیں

☆☆

میں کوئی چہرہ.....!
کوئی عمارت.....!
کوئی علاقہ نہیں ہوں
سُورج کی روشنی ہوں
میں زندگی ہوں
تمھارے ہتھیار
بے نظر ہیں
طویل صدیوں کا فاصلہ
وقت بن چکا ہے
تلاش تم کو ہے جس کی
وہ اب.....!
تمھارے اندر سما چکا ہے
تمھاری میری یہ دُشمنی بھی
ہے اِک معمّہ
خود اپنے گھر کو
نہ آگ جب تک لگاؤ گے تم
مجھے!
نہیں مار پاؤ گے تم

☆☆

غلط نشانہ

تمھاری آنکھوں میں
آج کس کے لہو کی لالی چمک رہی ہے
یہ آگ کیسی دہک رہی ہے
پتہ نہیں!
تم نے میرے دھوکے میں
کس پہ خنجر چلا دیا ہے
وہ کون تھا
کس کے راستے کا
چراغ تم نے بجھا دیا ہے
یہ خون میرا نہیں ہے
لیکن تمھیں بھی شاید خبر نہیں تھی
جہاں نشانہ لگائے بیٹھے تھے
وہ مری رہگذر نہیں تھی
میں کل بھی زندہ تھا
آج بھی ہوں

سمجھدار لوگوں سے کہہ دو

سمجھدار لوگوں سے کہہ دو
ہمارے دُکھوں کا مداوا نہ ڈھونڈیں
نئی حاملاؤں کے جسموں کا
سب کاربن مر چکا ہے
وہ اب
اپنے ہی شوہروں کو دوبارہ نہ پیدا کریں گی
بشارت
بصارت سے عاری نگاہوں
پہ روشن نہ ہوگی
شوالوں کے آسن میں خالی
سبھی دیوتا
اپنے اپنے مُکٹ سونپ کر پتھروں کو
گھنے جنگلوں میں سمادھی لگانے گئے ہیں
دِیے آرتی کے بجھا دو
مقدس اذانیں
ہلالی مناروں سے آزاد ہو کر
نئی قرأتوں کے تعاقب میں کھوئی ہوئی ہیں
خدا کے اکیلے مکانوں میں تالے لگا دو
سمجھدار لوگوں سے کہہ دو
مُنڈیروں پر بیٹھی ہوئی فاختاؤں کی آنکھوں میں
اب کوئی منظر نہیں ہے
یہ اب آسماں میں
اُڑنے کے قابل نہیں ہیں
اُنھیں اپنے اپنے عجائب گھروں میں سجا دو
سمجھدار لوگوں سے کہہ دو
ہمیں اب تمھاری سمجھداریوں کی ضرورت نہیں ہے

☆☆

غزلیں

کہیں چھت تھی، دیوار و دَر تھے کہیں، ملا مجھ کو گھر کا پتہ دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے، مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

ہوا نہ کوئی کام معمول سے، گذارے شب و روز کچھ اس طرح
کبھی چاند چمکا غلط وقت پر، کبھی گھر میں سُورج اُگا دیر سے

یہ سب اتفاقات کا کھیل ہے، یہی ہے جُدائی، یہی میل ہے
میں مڑ مڑ کے دیکھا کیا دُور تک، بنی وہ خموشی صدا دیر سے

کہیں رُک گئے راہ میں بے سبب، کہیں وقت سے پہلے گھر آئی شب
ہوئے بند دروازے کُھل کُھل کے سب، جہاں بھی گیا میں گیا دیر سے

سجا دِن بھی روشن ہوئی رات بھی، بھرے جام لہرائی برسات بھی
رہے ساتھ کچھ ایسے حالات بھی، جو ہونا تھا جلدی، ہوا دیر سے

بھٹکتی رہی یوں ہی ہر بندگی، ملی نہ کہیں سے کوئی روشنی
چھپا تھا کہیں بھیڑ میں آدمی، ہوا مجھ میں روشن خدا دیر سے

☆☆

گرج برس پیاسی دھرتی پر، پھر پانی دے مولا
چڑیوں کو دانے، بچوں کو گُڑ دھانی دے مولا

دو اور دو کا جوڑ ہمیشہ چار کہاں ہوتا ہے
سوچ سمجھ والوں کو تھوڑی نادانی دے مولا

پھر روشن کر زہر کا پیالہ، چمکا نئی صلیبیں!
جھوٹوں کی دُنیا میں سچ کو تابانی دے مولا

پھر مورت سے باہر آکر چاروں اور بکھر جا
پھر مندر کو کوئی مِیرا دیوانی دے مولا

تیرے ہوتے کوئی کسی کی جان کا دُشمن کیوں ہو
جینے والوں کو مرنے کی آسانی دے مولا

☆☆

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رُخ ہواؤں کا جدھر کا ہے اُدھر کے ہم ہیں

پہلے ہر چیز تھی اپنی مگر اب لگتا ہے
اپنے ہی گھر میں کسی دُوسرے گھر کے ہم ہیں

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں کدھر کے ہم ہیں

چلتے رہتے ہیں کہ چلنا ہے مسافر کا نصیب
سوچتے رہتے ہیں' کس راہ گذر کے ہم ہیں

ہم وہاں ہیں' جہاں کچھ بھی نہیں رستہ نہ دَیار
اپنے ہی کھوئے ہوئے شام وسحر کے ہم ہیں

گنتیوں میں ہی گنے جاتے ہیں ہر دَور میں ہم
ہر قلم کار کی بے نام خبر کے ہم ہیں

☆☆

دیکھا ہوا سا کچھ ہے تو سوچا ہوا سا کچھ
ہر وقت میرے ساتھ ہے اُلجھا ہوا سا کچھ

ہوتا ہے یوں بھی راستہ کھلتا نہیں کہیں
جنگل سا پھیل جاتا ہے کھویا ہوا سا کچھ

ساحل کی گیلی ریت پر بچوں کے کھیل سا
ہر لمحہ مجھ میں بنتا ، بکھرتا ہوا سا کچھ

فُرصت نے آج گھر کو سجایا کچھ اِس طرح
ہر شے سے مسکراتا ہے رویا ہوا سا کچھ

دُھندلی سی ایک یاد کسی قبر کا دیا
اور میرے آس پاس چمکتا ہوا سا کچھ

☆☆

اُٹھ کے کپڑے بدل، گھر سے باہر نکل، جو ہوا سو ہوا
رات کے بعد دِن، آج کے بعد کل، جو ہوا سو ہوا

جب تلک سانس ہے، بھوک ہے پیاس ہے، یہی اتہاس ہے
رکھ کے کاندھے پہ ہل کھیت کی اور چل، جو ہوا سو ہوا

خون سے تر بتر کر کے ہر رہ گزر، تھک چکے جانور
لکڑیوں کی طرح پھر سے چولہے میں جل، جو ہوا سو ہوا

جو مرا کیوں مرا، جو لُٹا کیوں لُٹا، جو جلا کیوں جلا
مدتوں سے ہیں گم اِن سوالوں کے حل، جو ہوا سو ہوا

مندروں میں بھجن، مسجدوں میں اذاں، آدمی ہے کہاں
آدمی کے لیے ایک تازہ غزل، جو ہوا سو ہوا
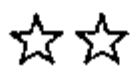
☆☆

بیسن کی سوندھی روٹی پر، کھٹّی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے، چوکا، باسن، چمٹا، پھُکنی جیسی ماں

بانس کی کھرّی کھاٹ کے اوپر، ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوئی، آدھی جاگی، تھکی دوپہری جیسی ماں

چڑیوں کی چہکاریں گونجیں، رادھا موہن، علی علی
مُرغے کی آواز سے کھُلتی، گھر کی کُنڈی جیسی ماں

بیوی، بیٹی، بہن، پڑوسن، تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دِن بھر اِک رسّی کے اُوپر چلتی نٹنی جیسی ماں

بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں، جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اِک البم میں، چنچل لڑکی جیسی ماں

☆☆

مل جُل کے بیٹھنے کی روایت نہیں رہی
راوی کے پاس کوئی حِکایت نہیں رہی

ہر زندگی ہے ہاتھ میں کشکول کی طرح
محرومیوں کے پاس بغاوت نہیں رہی

مسمار ہو رہی ہیں دِلوں کی عمارتیں
اللہ کے گھروں کی حفاظت نہیں رہی

ملکِ خدا میں' ساری زمینیں ہیں ایک سی
اِس دَور کے نصیب میں ہجرت نہیں رہی

سب اپنی اپنی موت سے مرتے ہیں اِن دِنوں
اب دشتِ کربلا میں شہادت نہیں رہی

☆☆

بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا
جو بیت گیا ہے وہ گذر کیوں نہیں جاتا

سب کچھ تو ہے' کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں نگاہیں
کیا بات ہے میں وقت پر گھر کیوں نہیں جاتا

وہ ایک ہی چہرہ تو نہیں سارے جہاں میں
جو دُور ہے وہ دِل سے اُتر کیوں نہیں جاتا

میں اپنی ہی اُلجھی ہوئی راہوں کا تماشہ
جاتے ہیں جدھر سب میں اُدھر کیوں نہیں جاتا

وہ خواب جو برسوں سے نہ چہرہ نہ بدن ہے
وہ خواب ہواؤں میں بکھر کیوں نہیں جاتا

☆☆

اشعار

دو چار گام راہ کو ہموار دیکھنا
پھر ہر قدم پہ اِک نئی دیوار دیکھنا

آنکھوں کی روشنی سے ہے ہر سنگ آئینہ
ہر آئینہ میں خود کو گنہہ گار دیکھنا

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

میداں کی ہار جیت تو قسمت کے ہاتھ ہے
ٹوٹی ہے کس کے ہاتھ میں تلوار دیکھنا

دریا کے اُس کنارے، ستارے بھی پھول بھی
دریا چڑھا ہوا ہو تو اُس پار دیکھنا

اچھی نہیں ہے شہر کے رستوں سے دوستی
آنگن میں پھیل جائے نہ بازار دیکھنا

☆☆

دِل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی

کہیں کہیں سے ہر چہرہ تم جیسا لگتا ہے
تم کو بھول نہ پائیں گے ہم ایسا لگتا ہے

اور تو سب کچھ ٹھیک ہے! لیکن کبھی کبھی یوں ہی
چلتا پھرتا شہر اچانک تنہا لگتا ہے

جو ساتھ ہے وہی گھر کا نصیب ہے لیکن
جو کھو گیا ہے اُسے بھی مکان میں رکھنا

وہ ایک خواب جو چہرہ کبھی نہیں بنتا
بنا کے چاند اسے آسمان میں رکھنا

وہ میری پرچھائیں ہے یا میں اُس کا آئینہ ہُوں
میرے ہی گھر میں رہتا ہے' مجھ جیسا ہی جانے کون

جانے کیا کچھ بول رہا تھا' سرحد، پیار، کتابیں، خون
کل میری نیندوں میں چھپ کر جاگ رہا تھا جانے کون

دُھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے، کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

پتھروں میں بھی زباں ہوتی ہے دِل ہوتے ہیں
اپنے گھر کے در و دیوار سجا کر دیکھو

گھر کی تعمیر چاہے جیسی ہو
اس میں رونے کی کچھ جگہ رکھنا

مسجدیں ہیں نمازیوں کے لئے
اپنے گھر میں کہیں خدا رکھنا

دوہے

چڑیا نے اُڑ کر کہا' میرا ہے آکاش
بولا شکرا ڈال سے' یوں ہی ہوتا کاش

لے کے تن کے ناپ کو' گھومے بستی، گاؤں
ہر چادر کے گھیر سے باہر نکلے پاؤں

چاقو کاٹے بانس کو' بنسی کھولے بھید
اِتنے ہی سُر جانیے' جتنے اِس میں چھید

سودا لینے ہاٹ میں' کیسے جائے نار
چاقو لے کے ہاتھ میں' بیٹھا ہے بازار

سب کی پوجا ایک سی' الگ الگ ہر رِیت
مسجد جائے مولوی' کویل گائے گیت

اچھی سنگت بیٹھ کر سنگی بدلے رُوپ
جیسے مل کر آم سے میٹھی ہوگئی دُھوپ

سیدھا سادہ ڈاکیہ' جادُو کرے مہان
ایک ہی تھیلے میں بھرے' آنسو اور مسکان

ساتوں دِن بھگوان کے، کیا منگل کیا پیر
جس دِن سوئے دیر تک، بھوکا رہے فقیر

وہ صُوفی کا قول ہو یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر، اتنا ہی سچ مان

سیتا، راون، رام کا، کریں وِبھاجن لوگ
ایک ہی تن میں دیکھیے، تینوں کا سنجوگ

بچہ بولا دیکھ کر مسجد عالی شان
اللہ تیرے ایک کو، اتنا بڑا مکان

جادُو، ٹونا روز کا، بچوں کا بیوہار
چھوٹی سی اِک گیند میں بھر دیں سب سنسار

اندر مُورت پر چڑھے، گھی، پوری، لوبان
مندر کے باہر کھڑا، ایشور مانگے دان

پنچھی بالک، پھول جل، الگ الگ آکار
مائی کا گھر ایک ہی، سارے رِشتے دار

سپنا جھرنا نیند کا: جاگی آنکھیں پیاس
پانا، کھونا، کھوجنا، سانسوں کا اِتہاس

بوڑھا پیپل گھاٹ کا، بتیائے دِن رات
جو بھی گذرے پاس سے، سر پر رکھ دے ہاتھ

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دُکھ نے دُکھ سے بات کی، بن چٹھی بن تار

بہنیں چڑیاں دُھوپ کی، دُور گگن سے آئیں
ہر آنگن مہمان سی پکڑو تو اُڑ جائیں

دُور سمندر پار سے کوئی کرے بیوپار
پہلے بھیجے سرحدیں، پھر بھیجے ہتھیار

ندیا سینچے کھیت کو ' توتا کُترے آم
سُورج ٹھیکے دار سا سب کو بانٹے کام

پوجا گھر میں مُورتی ' میرا کے سنگ شیام
جتنی جس کی چاکری ' اتنے اس کے دام

میں کاغذ تُو کلپنا ' تجھ میں مَیں ساکار
اپنی ہی تصویر کو ' پوجے رَچنا کار

چھوٹا کرکے دیکھیے ' جیون کا وِستار
آنکھوں بھر آکاش ہے ' باہوں بھر سنسار

اُوپر سے گڑیا ہنسے ' اندر کاٹ ، کباڑ
گڑیا سے ہے پیار تو ' کیلیں نہیں اُکھاڑ

نئ نئ آنکھیں ہوں تو ہر منظر اچھا لگتا ہے
کچھ دِن شہر میں گھومے' لیکن اب گھر اچھا لگتا ہے

ہم نے بھی سو کر دیکھا ہے' نئے پُرانے شہروں میں
جیسا بھی ہے' اپنے گھر کا بستر اچھا لگتا ہے

یہ شیخ و برہمن ہمیں اچھے نہیں لگتے
ہم جتنے ہیں یہ اتنے بھی سچے نہیں لگتے

☆☆

انتخاب

شہر میرے ساتھ چل تو۔ نظمیں

شہر میرے ساتھ چل تو

شہر میرے ساتھ چل تو
چیختے ،لڑتے جھگڑتے
کرفیو
نعروں
کے اس بازار سے نکل تو
تیری آنکھوں میں
بھری ہے ریت
لگتا ہے کئی برسوں سے
تو سویا نہیں ہے
ہڈیوں میں تیری
تیرے سوچنے محسوس کرنے کا تھا
جتنا فاسفورس مر چکا ہے
کوکوکولا ،پیپسی کا رنگ
ان میں بھر چکا ہے
اب کسی بھی حادثے پر
واقعے پر
مسئلے پر چونکتا ہے تو
نہ روتا ہے کبھی تو
جب بھی دیکھو
مورچے ، جلسے ،تماشے
سچ بتا
تنہا بھی ہوتا ہے کبھی تو ؟
فربہی کا جان لیوا روگ
تیرے تن بدن کو کھا رہا ہے
شہر تو............
چاروں طرف سے
پھیلتا ہی پھیلتا جا رہا ہے
اس سے پہلے
گیس کے غبارے جیسا
تو اچانک پھٹ کے
ٹکڑا ٹکڑا بکھرے
شہر سن ایسا کریں ہم
دور جنگل کے کسی خاموش گوشے میں چھپ کر
پیاز کی گانٹھوں کو
چاقو سے تراشیں _____ اور روئیں
روتے روتے شانت ہو کر
_____ ایک گہری نیند سوئیں
خوب گہری نیند سوئیں

☆☆

زمیں پہ لیکن ابھی ہیں آنسو

یہیں کہیں
وہ چراغ بھی تھا
کھلی ہواؤں میں
جو ستارے سا ڈولتا تھا

یہیں کہیں
وہ درخت بھی تھا
جو آیتوں کی زباں میں
موسم سے بولتا تھا

یہیں کہیں
وہ خیال بھی تھا
جو وقت کی ڈوریوں کی
گانٹھوں کو کھولتا تھا

یہ سچ ہے
اب وہ نہیں ہیں
لیکن مجھے یقیں ہے
جو مدتوں سے ہیں لاپتہ
یہیں کہیں ہیں

وہ سب کتابیں
سراغ روشن تھے جن میں
ان کے............
زمین سے آسماں کو
واپس چلی گئی ہیں
جہاں سے اتری تھیں

اب وہیں پر
وہ چاند سورج بنی ہوئی ہیں
زمیں پہ لیکن
ابھی ہیں بچے
زمیں پہ لیکن
ابھی ہیں مائیں
زمیں پہ لیکن
ابھی ہیں آنسو
انہیں کی چنچل شرارتوں میں
انہیں کی بےلوث چاہتوں میں
انہیں کی مجبور رحمتوں میں
وہ حرف شامل ہیں
جن میں چھپ کر
جو گمشدہ ہے
وہ جھانکتا ہے

☆☆

کتابوں کی دوکان

یہ رستہ ہے وہی
تم کہہ رہے ہو
یہاں تو............
پہلے جیسا کچھ نہیں ہے
درختوں پر
نہ وہ چالاک بندر
شرارت کرتے رہتے تھے جو اکثر
نہ طاقوں میں
چھپے صوفی کبوتر
غٹرغوں کرتے رہتے تھے جو دن بھر
نہ وہ کڑوا نیم
املی کے برابر
جو گھر گھر گھومتا تھا
وید بن کر

کئی دن بعد
تم آئے ہو شاید!!
یہ سورج چاند والا
بوڑھا امبر
بدل دیتا ہے چہرہ ہو
یا منظر
یہ عالی شان ہوٹل ہے جہاں پر
یہاں پہلے
کتابوں کی دکاں تھی!!!

☆☆

میرا شہر

یہ ہی شہر
جواب
سمندر کنارے
بنا چھاؤں کے ناریل کے سہارے
جھکائے ہوئے سر کو بیٹھا ہوا ہے
اکیلا سا
چپ چپ سا
سہما ہوا ہے
کبھی یہ بھی
چاروں طرف بھاگتا تھا
بڑا زندہ دل تھا
یہ راتوں میں
دن کی طرح جاگتا تھا
کبھی جینز پہنے
جوانوں کے جیسا
کبھی چلتی لوکل میں
گانوں کے جیسا
کبھی آرتی اور
اذانوں کے جیسا
کبھی دور کے
آسمانوں کے جیسا
صدا اس کی
ہر خواب میں گونجتی تھی
کھنکتا ہوا ایسا کلدار تھا وہ
شرابی
جواری
بھکاری
پجاری
خود اپنی ہی مستی میں سرشار تھا وہ
نظر لگ گئی اس کو شاید کسی کی
یہ بادل سا گھر گھر
برستا بہت تھا
کبھی اس کی جیبوں میں
ڈھیروں ہنسی تھی
یہ ہنستا بہت تھا

☆☆

جسے لکھتا ہے سورج

وہ آئی!
اور اس نے مسکرا کے
میری بڑھتی عمر کے
سارے پرانے
جانے انجانے برس
پہلے ہواؤں میں اڑائے
اور پھر میری زباں کے
سارے لفظوں کو
غزل کو
گیت کو
دوہوں کو
نظموں کو
کھلی کھڑکی سے باہر پھینک کر
یوں کِھل کھلائی
قلم نے
میز پر لیٹے ہی لیٹے آنکھ مچکائی

میاؤں کر کے کودی
بند شیشی میں پڑی سیاہی
اٹھا کے ہاتھ دونوں
چائے کے کپ نے لی انگڑائی
چھلانگیں مار کے
ہنسنے لگی برسوں کی تنہائی

اچانک میرے ہونٹوں پر
اشاروں اور بے معنی صداؤں کی
وہی بھاشا اُبھر آئی
جسے لکھتا ہے سورج
جسے پڑھتا ہے دریا
جسے سنتا ہے سبزہ
جسے صدیوں سے بادل بولتا ہے
اور ہر دھرتی سمجھتی ہے

☆☆

چھوٹی سی شاپنگ

گوٹے والی
لال اوڑھنی
اس پر
چولی گھاگرا
اسی سے میچنگ کرنے والا
چھوٹا سا اک ناگرا

چھوٹی سی!
یہ شاپنگ تھی
یا!
کوئی جادو ٹونا
لمبا چوڑا شہرا چانک
بن کر
ایک کھلونا
اتہاسوں کا جال توڑ کے
داڑھی
پگڑی
اونٹ چھوڑ کے

الف سے
اماں
بے سے
بابا
بیٹھا ناچ رہا تھا
پانچ سال کی بچی
بن کر جے پور
ناچ رہا تھا

☆☆

جنگل کا سفر

اک جنگل میں
ہاتھی جیسے
اک بادل کے نیچے
بیٹھا تھا
اک بے چہرہ سا
جوگی آنکھیں میچیں
دیکھ کے مجھ کو
اس نے پوچھا
جانا کہاں ہے تجھ کو؟
اپنے سفر کا
نقشہ!

میں نے اسے دکھایا جب سے
سانپ لپیٹے
وہ ہی جوگی
ساتھ ہے میرے تب سے
دن بھر تو وہ
میرے آگے
یا پیچھے ہوتا ہے
رات ہوتے ہی
یوں ہوتا ہے
اپنے باہر جاگتا ہوں میں
وہ!
مجھ میں سوتا ہے

☆☆

مردہ گھر میں بٹوارا

ساری لاشیں
ایک سی تھیں
وہ ہی آنکھیں - میری جیسی
وہ ہی ٹانگیں - تیری جیسی
سارے بچے بچوں جیسے
سارے بوڑھے بوڑھوں جیسے
ساری لاشیں
چپ تھیں لیکن
مردہ گھر کے چاروں جانب
شور و غل تھا
زندگی کے تاجروں کا
موت کے سوداگروں کا
گدیوں کا کرسیوں کا
بندیوں میں
چوٹیوں میں
داڑھیوں میں
ناف سے نیچے کی
ننگی جھاڑیوں میں
زندگی کو جس طرح
ٹکڑوں میں بانٹا جا رہا تھا
موت کو بھی..........
ذات اور دھرموں سے
چھانٹا جا رہا تھا
کون کس کا؟
کس کے کتنے؟
غم تو غم ہے
زعفرانی کیا، ہرا کیا؟
میرے ماتم میں
وہاں جتنے بھی تھے
انسان تھے وہ
ٹوٹا پھوٹا
میرا ہندستان تھے وہ

☆☆

کنفیشن

(مہاراشٹر کی شیلا کنی کے لئے جو اکیلی ظلم سے لڑ کے ہار گئی)

یہ سچ ہے
جب تمہارے جسم کی

چادر
بھری محفل میں کھینچی جا رہی تھی
اس تماشہ کا
تماشائی تھا میں بھی
اور میں چپ تھا

یہ سچ ہے
جب تمہاری بے گناہی کو
سرِ بازار سولی پر چڑھایا جا رہا تھا
اس گھڑی
میں بھی وہاں تھا
اور میں چپ تھا
یہ سچ ہے
جب سلگتی ریت پر تم
سر برہنہ
اپنے بیٹوں
بھائیوں کو
تنہا بیٹھی

رو رہی تھیں
میں تمہاری بے بسی کا
آئینہ تھا
اور میں چپ تھا

یہ سچ ہے
آج بھی جب
شیر، چیتوں سے گھرے جنگل سے ٹکراتی
تمہاری چیختی سانسیں
مجھے آواز دیتی ہیں
میری شہرت
مری عزت
مرے آرام کی عادت
مرے بڑھتے ہوئے قدموں کو
بڑھ کے تھام لیتی ہیں
میں مجرم تھا۔ میں مجرم ہوں
مری خاموشی مرے جرم کی زندہ شہادت ہے
میں ان کے ساتھ تھا جو
ظلم کو ایجاد کرتے ہیں
میں ان کے ساتھ ہوں
جو ہنستی گاتی بستیاں برباد کرتے ہیں

☆☆

ننگا ناچ

کھیت ان کے پاس کب تھے
جن میں وہ غلّہ اُگاتے
روئی چرخوں میں کہاں تھی
جس سے وہ کپڑا بناتے
آگ چولہوں میں کہاں تھی
جس پہ وہ روٹی پکاتے
ہاتھ وہ
بے کام تھے سب
جن کو کاموں سے لگایا جارہا تھا
گودیاں ماؤں کی
قبریں بن رہی تھیں
مکتبوں میں
خوں بہایا جارہا تھا
موت رستوں پر بچھائی جارہی تھی
شہر کو زندہ جلایا جارہا تھا

ہو رہی تھی!
تختِ شاہی کی مرمت!
سبز پیڑوں کو گرایا جارہا تھا
آیتوں کی برکتوں میں
آرتی کے منتروں میں
صدیوں بوڑھی......
بھوک کو
ننگا نچایا جارہا تھا

☆☆

معاہدہ

کئی پھٹی ہیں دھرتیاں
دھواں دھواں فضائیں ہیں
لہولہو
عبادتیں ہیں
بے اثر دعائیں ہیں
وہ جنگلوں کے پہریدار
جانور نہیں رہے
سنبھالتے تھے موسموں کو
جو شجر نہیں رہے
اداس گھونسلے ہیں
ان کے نغمہ گر نہیں رہے
سمندروں کی وسعتوں کو
پی رہی ہیں بستیاں
عمارتوں میں چھن رہی ہیں
پربتوں کی چوٹیاں

ہر ایک ندی کو تیاگ کر
جلا وطن ہیں دیویاں
ہوائیں تیز گام ہیں
خلائیں بے لگام ہیں
معاہدہ!
فلک سے جو زمیں کا تھا
نہیں رہا
دلوں کے آس پاس تھا جو راستہ
نہیں رہا
کسی سے اب کسی کا کوئی رابطہ
نہیں رہا

☆☆

گیت

(مدر ٹریسا کے لئے)

ہر دھوپ میں چھاؤں سی
ہر سر پہ دعاؤں سی
روتی ہوئی آنکھوں کی
تحریر جو پڑھتی تھی
انسان کی خاطر جو
بھگوان سے لڑتی تھی
وہ پیاسی زمینوں پر
اتری تھی گھٹاؤں سے

بیماروں کے بستر پر
سوتا تھا خدا اس کا
لاچاروں کے چہروں سے
روتا تھا خدا اس کا
روشن تھی اندھیروں میں
وہ ماں کی دعاؤں سی
وہ پیاس کے مندر میں
برسات کی مورت تھی
وہ بھوک کی مسجد میں
روٹی کی عبادت میں
وہ درد کے گرجا میں
انسان کی خدمت تھی
نفرت کی جفاؤں میں
رحمت کی وفاؤں سے

ہر سر پہ..........

☆☆

غزلیں

بندرا بن کے کرشن کنہیا اللہ ہُو
بنسی، رادھا، گیتا، گیا، اللہ ہُو

تھوڑے تنکے، تھوڑے دانے، تھوڑا جل
ایک ہی جیسی ہر گوریا اللہ ہُو

جیسا جس کا برتن ویسا ہی اس کا تن
گھٹتی، بڑھتی، گنگا میا اللہ ہُو

ایک ہی دریا نیلا پیلا لال ہرا
اپنی اپنی سب کی نیا اللہ ہُو

مولویوں کا سجدہ، پنڈت کی پوجا
مزدوروں کی ہیا ہیا اللہ ہُو

☆☆
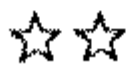
(صدام حسین کے لئے)

اس کو کھودینے کا احساس تو کم باقی ہے
جو ہوا وہ نہ ہوا ہوتا، یہ غم باقی ہے

اب نہ وہ چھت ہے نہ وہ زینہ، نہ انگور کی بیل
صرف اک اس کو بھلانے کی قسم باقی ہے

میں نے پوچھا تھا سبب پیڑ کے گر جانیکا
اٹھ کے مالی نے کہا اس کی قلم باقی ہے

جنگ کے فیصلے میداں میں کہاں ہوتے ہیں
جب تلک حافظے باقی ہیں علَم باقی ہے

تھک کے گرتا ہے ہرن صرف شکاری کے لئے
جسم گھائل ہے مگر آنکھوں میں دم باقی ہے

☆☆

کوئی کسی سے خوش ہو اور وہ بھی بار بار ہو
یہ بات تو غلط ہے
رشتہ لباس بن کر میلا نہیں ہوا ہو
یہ بات تو غلط ہے
وہ چاند رہگزر کا، ساتھی جو تھا سفر کا
یہ بات تو غلط ہے
ہر بار کی نظر سے روشن وہ معجزہ ہو
یہ بات تو غلط ہے

ہے بات اس کی اچھی، لگتی ہے دل کو سچی
پھر بھی ہے تھوڑی کچی
جو اس کا حادثہ ہے میرا بھی تجربہ ہو
یہ بات تو غلط ہے
دریا ہے بہتا پانی، ہر موج ہے روانی
رکتی نہیں کہانی
جتنا لکھا گیا ہے اتنا ہی واقعہ ہو
یہ بات تو غلط ہے
یہ یگ ہے کاروباری، ہر شئے اشتہاری
راجہ ہو یا بھکاری
شہرت ہے جس کی جتنی اتنا ہی مرتبہ ہو
یہ بات تو غلط ہے

☆☆
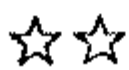
جتنی بُری کہی جاتی ہے اتنی بُری نہیں ہے دنیا
بچوں کے اسکول میں شاید تم سے ملی نہیں ہے دنیا

چار گھروں کے ایک محلے کے باہر بھی ہے آبادی
جیسی تمہیں دکھائی دی ہے سب کی وہی نہیں ہے دنیا

گھر میں ہی مت اسے سجاؤ، اِدھر اُدھر بھی لے کے جاؤ
یوں لگتا ہے جیسے تم سے اب تک کھلی نہیں ہے دنیا

بھاگ رہی ہے گیند کے پیچھے، جاگ رہی ہے چاند کے نیچے
شور بھرے کالے نعروں سے اب تک ڈری نہیں ہے دنیا

☆☆

یہ جو پھیلا ہوا زمانہ ہے
اس کا رقبہ غریب خانہ ہے

کوئی منظر سدا نہیں رہتا
ہر تعلق مسافرانہ ہے

دیس پردیس کیا پرندوں کا
آب و دانہ ہی آشیانہ ہے

کیسی مسجد کہاں کا بت خانہ
ہر جگہ اس کا آستانہ

عشق کی عمر کم ہی ہوتی ہے
باقی جو کچھ ہے دوستانہ ہے

☆☆
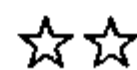
چاہتیں موسمی پرندے ہیں، رت بدلتے ہی لوٹ جاتے ہیں
گھونسلے بن کے ٹوٹ جاتے ہیں داغ شاخوں پہ چھچہاتے ہیں

آنے والے بیاض میں اپنی، جانے والوں کے نام لکھتے ہیں
سب ہی اوروں کے خالی کمروں کو، اپنی اپنی طرح سجاتے ہیں

موت اک واہمہ ہے نظروں کا، ساتھ چھٹتا کہاں ہے اپنوں کا
جو زمیں پر نظر نہیں آتے، چاند تاروں میں جگمگاتے ہیں

یہ مصور عجیب ہوتے ہیں، آپ اپنے حبیب ہوتے ہیں
دوسروں کی شباہتیں لے کر، اپنی تصویر ہی بناتے ہیں

یوں ہی چلتا ہے کاروبارِ جہاں، ہے ضروری ہر ایک چیز یہاں
جن درختوں میں پھل نہیں آتے وہ جلانے کے کام آتے ہیں

☆☆

آج ذرا فرصت پائی تھی آج اسے پھر یاد کیا
بند گلی کے آخری گھر کو کھول کے پھر آباد کیا

کھول کے کھڑکی چاند ہنسا پھر چاند نے دونوں ہاتھوں سے
رنگ اڑائے، پھول کھلائے، چڑیوں کو آزاد کیا

بڑے بڑے غم کھڑے ہوئے تھے رستہ روکے راہوں میں
چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ہی ہم نے دل کو شاد کیا

بات بہت معمولی سی تھی الجھ گئی تکراروں میں
ایک ذرا سی ضد نے آخر دونوں کو برباد کیا

داناؤں کی بات نہ مانی کام آئی نادانی ہی
سنا ہوا کو، پڑھا ندی کو، موسم کو استاد کیا

☆☆

جب بھی کسی نے خود کو صدا دی
سناٹوں میں آگ لگا دی

مٹی اس کی، پانی اس کا
جیسی چاہی شکل بنا دی

چھوٹا لگتا تھا افسانہ
میں نے تیری بات بڑھا دی

جب بھی سوچا اس کا چہرہ
اپنی ہی تصویر بنا دی

تجھ کو، تجھ میں ڈھونڈ کے ہم نے
دنیا تیری شان بڑھا دی

☆☆

دوہے

✿

ندیا اوپر پل بنا، جُڑا نگر سے گاؤں
چڑیاں گونگی ہوگئیں، اندھی ہوگئی چھاؤں

توتا، مینا، فاختہ، لاکھ مچائیں شور
جس کے پر پیسوں بھرے نام اسی کا مور

تالا، چابی، چٹخنی، دروازہ، دیوار
اک دوجے کے خوف سے، بنا ہے یہ سنسار

اب مل میں کس کام کے، بنکر ماتا دین
سو چرخوں کی روئی کو، کاتے ایک مشین

☆☆☆

ماہیے

پاگل ہے مراقی ہے
مردہ ہے نہ زندہ
یہ بچہ عراقی ہے

بے نام سا مرقد ہے
مٹی ہوئی مٹی
اب جنگ نہ سرحد ہے

چھجے پر کبوتر ہے
دھوپ میں ہے قاصد
حجرے میں قلندر ہے

تالے میں لگی چابی
بھیا کی تھالی میں
گڑ رکھنے لگی بھابی

سُر بنسی کا لہرایا
رادھا کی گاگر میں
پھر چاند اتر آیا

فراق گورکھپوری

پچھلے دِنوں امریکن ادیب مارٹن رسؔ نے آسٹریلیا کے ایک فوجی سپاہی کو کسی زخمی ویت نامی عورت کے گلے میں پانی ڈالنے پر مجرم ٹھہرایا ہے۔

رہوڈیشیا میں دو افریقی، وِکٹر اور جیمس کو اپنے حق کے لئے لڑنے کے جرم میں پھانسی کی سزا دے دی گئی...لوکل پلیٹ فارموں پر کچھ پوسٹر لگائے گئے ہیں جن میں مسافروں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ریل میں بھوکے ننگے بھکاریوں کو بھیک نہ دیں...؟ بچے کھیلتے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہیں.....!

میں سوچتا ہوں چڑیا کتنی معصوم اور بھولی ہوتی ہے، فاختہ کتنا خوب صورت پرندہ ہے، بلّی کے بچے کتنے تیز ہوتے ہیں اور سانپ کی کینچلی کتنی خوبصورت ہوتی ہے مگر اُس میں چھپا ہوا زہر.... چڑیا کے پر، بلّی کے دانت، فاختہ کی چونچ، سانپ کی کینچلی اور اُس میں چھپا ہوا زہر...شیکسپیئر نے کسی جگہ کہا ہے۔ Life is a Tale, Told by an Idiot فانؔی بدایونی نے شاید اسی احساس کو زبان دی ہے۔

اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

اور فراقؔ گورکھپوری نے اپنے مخصوص انداز میں یوں رائے ظاہر کی ہے۔

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی
زندگی اُچٹتی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

فراقؔ گورکھپوری، بہتّر سال کا جسم اور ہزاروں سال کی شخصیت۔ بلیکؔ کے مصرعے ہیں۔

''ایک کلی کھلنے میں ایک رات صرف ہوتی ہے، مگر اس کی تخلیق میں ہزاروں سال خرچ ہوتے ہیں۔''

ہندوستان کی وِشال دھرتی میرا شریر
میرے پاؤں راس کماری کی گھاٹی ہیں
میرا سر ہمالہ کی بلند چوٹی ہے
میرے بالوں سے گنگا اُترتی ہے
میرے سر سے برہم پُترا پھوٹتی ہے
میری بانہیں تمام دُنیا کو اپنے اندر سمیٹنے کے لئے پھیلی ہوئی ہیں

میرا پیارا آسیم ہے

میں پورا ہندوستان ہوں

میں چلتا ہوں و میرے اندر پورا ہندوستان چلتا ہے

میں شنکر ہوں.... میں شو ہوں

فراقؔ سے ملنے کے بعد سوامی رام تیرتھ کی نظم کے یہ مصرعے آج پھر میرے ذہن میں اُبھر آئے ہیں۔ نہ جانے یہ کویتائیں میں نے پہلی بار کب پڑھی تھیں' ہاں اتنا ضرور یاد ہے آج سے دو سال پہلے شنکر پورا کی پہاڑی پر پتھر ڈھوتی ہوئی ایک کالی سی راجستھانی لڑکی کو دیکھ کر جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک بیر کی جھاڑی کی طرف آتی تھی اور وہاں میلی سی چادر پر سوئے ہوئے بچّے پر جھک کر اپنے ڈھول بھرے آنچل سے جلدی جلدی ہوا کر کے واپس پتھروں کی طرف لوٹ جاتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا جیسے یہ نظم میں نے کہیں پڑھی ہے۔ مدھیہ پردیش کی کسی گمنام پہاڑی پر پتھر ڈھوتی ہوئی کالی سی راجستھانی لڑکی اور فراقؔ گورکھپوری...دونوں میں بھلا کیا مماثلت ہو سکتی ہے۔ کہاں تپتے پتھروں پر ننگے پاؤں دوڑتی ممتا اور کہاں خوبصورت ٹھنڈے رُوم میں تھکا ہارا بُڑھاپا.......!!

مگر مجھے لگتا ہے وہ لڑکی فراقؔ کے اندر کہیں نہ کہیں بیٹھی ہوئی، بیری کی جھاڑی کے نیچے سوئے ہوئے بچے پر بار بار آنچل ہلا رہی ہے۔ فراقؔ کی آواز کی گہرائی، نرمی اور لہجہ کی معصومیت...اور وہ بچہ تو اکثر جاگ کر فراقؔ کی آنکھوں سے جھانکنے لگتا ہے اور یہی فراقؔ کی شخصیت کی تہیں بھی ہیں۔ فراقؔ اپنے اندر تین وجود ایک ساتھ جیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے شبدوں کی فضا بھی اُردو کے عام شاعروں کے برعکس زیادہ زمینی اور تہذیبی ہے۔ اس میں ہندوستان اپنی قدیم سنسکرتی کے ساتھ چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ فراقؔ نے زبان کو اپنے اظہار کے لئے ایک وسیلے کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ خود زبان نے فراقؔ کی تہہ در تہہ شخصیت کو اپنے اظہار کا تہذیبی مزاج کروٹیں لیتا محسوس ہوتا ہے۔ سوا روپے گز پاجامہ، بکھرے ہوئے چھوٹے بال، قینچی کی سگریٹ....اور دو آنکھیں اُبھری اُبھری' گہری اور دُور تک پھیلی ہوئی.......

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو!

جب یہ دھیان آئے گا اُن کو تم نے فراقؔ کو دیکھا تھا

لیکن آنے والی نسلیں شاید فراقؔ کے دیکھنے والوں سے فراقؔ کے بارے میں کچھ سننے کا مطالبہ کریں اور اگر دیکھنے والوں کی یادداشت میں فلم ایکٹر دلیپ کمار اور مینا کماری کے ہاؤ بھاؤ پر جھومتے ہوئے مجمع میں فراقؔ کی غزل سرائی کی تصویریں ہی محفوظ رہیں تو ممکن ہے وہ فخر کرنے کے بجائے...سردار جعفری کے

جس مشاعرہ میں فراقؔ نے شرکت کی تھی اُس کے صدر دلیپ کمار اور مخصوص مہمان مینا کماری تھیں۔

''ہاں بھئی میں واقف ہوں' ٹکٹ میرے نام سے تھوڑے ہی بکیں گے۔ لوگ تو فلم ایکٹروں کا تماشا کرنے آتے ہیں اور پھر وہاں تو تربوز، خربوز ہو رہا تھا...''

فراقؔ صاحب بات کرتے کرتے خدا جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ بیٹھے تو وہ سامنے بستر پر ہی ہیں لیکن آنکھیں میری طرف سے ہٹ کر کھڑکی کے چوکھٹے سے باہر ہری گھاس میں اُتر گئی ہیں اور ہاتھ بے دھیانی میں سفید چادر پر بکھری ہوئی کالی راکھ کو سمیٹے جا رہا ہے۔ فراقؔ بیٹھے بیٹھے اپنی آنکھوں کو جہاں چاہتے ہیں اُتار دیتے ہیں اور پھر اُن کی حرکات کو اپنی پیشانی کی اُبھری ہوئی شکنوں سے مسکراتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں...!

''شاعری نہ روٹی دیتی ہے نہ کپڑا اور نہ براہِ راست سماج کی خرابیوں کو دُور کرتی ہے۔ اِس میں کوئی مادّی اَفادیت بھی نہیں ہوتی۔ مدراس جانا ہو گا تو آپ ریل ہی سے جائیں گے' غزل کے پہیے پر چڑھ کر نہیں۔ سوشلزم غزل سے نہیں آئے گا' بھلے ہی غزل میں اِس کی تعریف کر دی جائے۔ شاعری کا مقصد سچائی کی پہچان ہے، شخصیت کی گہرائیوں سے سچائی کو جاننا، شاعر اور سچائی کے درمیان صرف ایک پردہ ہوتا ہے جب کہ زندگی اور حقیقت کے بیچ سینکڑوں پردے حائل ہوتے ہیں۔ شاعری ذاتی خوبی نمایاں کرنے کی بھی چیز نہیں ہے۔ یہ دراصل احترام ہے صداقت کا، انسانیت کا.... بڑا ادیب زیادہ سے زیادہ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی کسی مخصوص مدرسۂ خیال یا اِزم کی تبلیغ اپنے شہ پاروں میں نہیں کرتا۔ یہ کام سیاسی مفکروں یا فلسفیوں کا ہے۔ فن کار یا ادیب تاریخ کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا، وہ پیغمبروں کی ہاں میں ہاں بھی نہیں ملاتا۔ ادب بغیر کسی پارٹی کی تابعدار کے تاریخ کے تخلیقی عمل پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتا رہا ہے۔ ادیب و شاعر کا شمار تحریکوں کے نیاز مندوں میں نہیں ہوتا۔ یہ تحریکیں وہیں پنپتی ہیں جہاں بڑے ادیب کم ہوتے ہیں.....''

''مگر فراقؔ صاحب! آپ خود بھی تو ترقی پسند تحریک سے منسلک رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے اب آپ....''

''جی ہاں' میرے گھر میں تو اس کی نشستیں بھی ہوتی تھیں۔ بات یہ ہے میری کئی شخصیتیں ہیں۔ میں کیوں دوست بن گیا اور تحریک سے الحاق کیا....؟ اِس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ ہندوستان کی دُوسری سیاسی جماعتوں کی طرح کمیونسٹ بھی سامراجی طاقتوں کے خلاف تھے۔ اِس کے علاوہ میں مارکس کو بہت

بڑا مفکر مانتا ہوں۔ سیاسی فکریات میں مَیں اس سے سب سے زیادہ متاثر ہوں۔ افلاطون سے بھی زیادہ، حالانکہ میرا محبوب مفکر برک ہے۔ لیکن میں کسی سیاسی مقصد کی تکمیل کے لئے ادب کو پابند نہیں سمجھتا۔

رُوس میں انقلاب کسی ناول کے ذریعہ نہیں آیا۔ اَدب کا منصب ہے نقادِ عمل ہونا یا نقادِ زندگی ہونا۔ میں ایسے ادب برائے عمل کا ہرگز قائل نہیں ہوں۔ جس کا قصیدہ حالی نے مقدمۂ شعروشاعری میں سنایا یا جس کی تبلیغ علامہ اقبال نے کی یا جس کا ڈھنڈورا ترقی پسند ادب کی تحریک نے پیٹا۔ جہاں عمل ختم ہوجاتا ہے وہاں سے فن کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ بطنِ فن سے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنی تخلیقی عمل کا' پارٹی پروگرام پورا کرنے والے عمل کا نہیں۔ ترقی پسندوں کی شخصیتیں ابھری ہیں۔ ترقی پسندی میں وہ اپنی چھوٹائی بھی ساتھ لاتے ہیں۔ ان میں وہ گمشدگی نظر نہیں آتی جو بڑے فن کاروں کی پہچان ہے۔''

''فراق صاحب! پچھلے تیس پینتیس سال میں بہت سے ناموں کی بھیڑ میں کچھ نام الگ سے بھی تو نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی یک رُخی انتہا پسندی کے باوجود فیض، کرشن چندر، اختر الایمان، راجندر سنگھ بیدی اور مخدوم وغیرہ کی کچھ تخلیقات بھی تو اُسی دَور کی ہیں۔''

''ایک زمانے میں فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' وغیرہ کا بڑا شور تھا۔ جگہ جگہ گائی جارہی تھی' آج وہ کہاں ہے؟ فیض کی جو نظمیں اچھی ہیں جیسے ''تنہائی'' اور ''رقیب'' وغیرہ۔ ان میں کوئی اُوپری پروپگینڈہ نہیں ملے گا۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دَور میں علی سردار فوراً ٹاپ پر چلے گئے تھے اور آج وہ نظمیں جن سے اُنھیں شہرت ملی تھی' وہ خود بھی پسند نہیں کرتے۔ ویسے ابتدائی دور کی نظمیں اور وہ جو Topical ہیں چھوڑ کر دیکھا جائے تو علی سردار کافی ڈُوب کر کہتے ہیں۔ کون سا؟ ... ہاں، ہاں ... ''پیراہن شرر''۔ وہ تو خیر ٹھیک نہیں اور دُوسرا ''ایک خواب اور'' اس میں کچھ چیزیں ضرور ہیں' لیکن وہ گمشدگی نہیں جو سن برن کے یہاں ہے۔ تحیّر، استعجاب، معصومیت' یہ سب شخصیت بننے کے بعد آتی ہیں۔ اختر الایمان کے یہاں ادبیت کی کمی ہے، اُن کے ڈِکشن میں ادبیت نہیں ملتی، اُن کی آواز میں گہرائی نہیں ہے۔ میں ادبیت کو وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ ادب میں مزا ملنا ضروری ہے۔ اتنے ٹھس مصرعے اُردو ادب میں کم ملیں گے۔ لیکن اُن کی ادبی دیانت پر شک نہیں کر رہا ہوں۔ اُن کے خیالات' انداز بیان سے الگ کر کے دیکھے جائیں تو قابلِ قدر ہیں۔''

''لیکن فراق صاحب! شاعری میں اندازِ بیان ....'' میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی شاید فراق صاحب میری بات سمجھ گئے۔

''ہاں بھئی بوڑھا ہوگیا ہوں۔ کہیں کوئی یہ نہ سمجھے میں رَن ڈاؤن کررہا ہوں۔ میں انیسؔ کے عقائد سے دُور ہوں مگر اُن کی فن کاری کا قائل ہوں۔ اِسی طرح اقبالؔ کے تصورِ کائنات سے مجھے اختلاف ہے' لیکن اُن کے لہجے کی ادبیت سے انکار نہیں ...وہ بھی دیانت داری سے لکھتے ہیں۔ ساحرؔ خلوص اور دیانت داری سے لکھتے ہیں' اُن کے یہاں مناسب جدّت بھی ہے لیکن اُن کے پنجابی ہونے کی وجہ سے شاعری میں وہ گمشدگی اور خوابناکی نہیں ...وہ بے حد ہوش مند شاعر ہیں۔ دماغوں میں تہہ داری نہیں تو شعر میں بھی نہیں ہوگی۔ مثلاً ؎

اب اَن بَن ہوگئی ہے باغباں سے
مجھے نکلا ہی سمجھو گلستاں سے

اِسے ہم صرف محسوس کرسکتے ہیں۔ دِلکشی کے قوانین نہیں بنائے جاسکتے۔''

''فراقؔ صاحب! جاں نثار اخترؔ کی نظم ''آخری ملاقات'' تو آپ کی نظر سے گذری ہوگی۔''

''ہاں' دیکھی ہوئی ہوگی۔ اِس وقت ذہن میں نہیں ہے۔''

دو پاؤں بنے ہریالی پر
اِک تتلی بیٹھی ڈالی پر

''جی ہاں تتلی ...الفاظ کے صوتی حسن کا عرفان بہت مشکل ہے۔ اچھی اُردو تتلی نہیں تتلیاں ہے مکھی نہیں مکھیاں ہے۔ ہاں آنکھ صیغۂ واحد میں بھی اچھی لگتی ہے۔ بھئی بات یہ ہے کہ بڑی شاعری کی آوازیں ہر وقت میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں۔ میں اسی معیار سے جانچنے کا عادی ہوگیا ہوں۔ راجندر سنگھ بیدیؔ زبان بہت خراب لکھتے ہیں۔ یورپ میں کوئی ایسا ادیب جو اچھی انگریزی نہیں لکھ سکا' کبھی بڑا ادیب نہیں ہوا۔ اچھی زبان سے میری مراد قواعد و حساب کتاب سے نہیں۔ ہاں منٹو بہت شارپ تھا۔ ''کھول دو'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' اچھی کہانیاں ہیں' زبان کے لحاظ سے بھی....''

''فراقؔ صاحب! اُردو کھڑی بولی کی ہی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہی بات جدید ہندی کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے۔ لیکن زبان کے مسائل پر سوچتے وقت لوگ بُنیادی حقیقتوں سے بحث کرنے کے بجائے جذباتی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔''

''بھئی ہم ہندی والوں کے غلط رویّے سے بہت ناآسودہ ہیں۔ ہندی جملوں کی ساخت جیسی سجل اور رچی ہوئی اُردو ادب میں ملتی ہے' ہندی ادب میں نہیں ملتی۔ پچھمی ہندی کبیرؔ کے بعد ڈیڑھ دو سو

برس تک سوتی رہی اور جب اسلامی دربار اور مسلمان شاعروں سے اسے پھر جگایا تو وہ فارسی کی دُنیا میں جا گی۔دوسو برس کھڑی بولی میں وہ کام ہوا جسے اُردوزبان وادب کی تاریخ کہتے ہیں۔ یہ کام بہت شاندار تھا۔اس سے زبان میں قوت ، لچک اور نکھار پیدا ہوگیا۔لیکن جب ہندی تحریک اُردو کے مقابلے میں شروع ہوئی تو سورداس کی ''برج'' اور تُلسی کی ''اودھی'' چھوڑ کر بنی بنائی اور رچی رچائی اسی پچھمی کو ہندی والوں نے اپنایا۔لیکن وہ اس ہندی کی ہندیتا اور اُس کے سُگھڑپن ،اُس کی لچک اور رنگینی اور ہندی الفاظ کی ادبیت سے ناواقف تھے۔اُن کی کھڑی بولی میں کھڑی بولی پن ہی نہیں ہے۔

نئی ہندی میں وہ ادبیت نہیں آسکی جو اس ہندی میں ہے' جسے اُردو والے لکھتے ہیں اور ہندو مسلم کے باہمی کلچر اور تہذیب کی پاسبان ہے۔لیکن ہندو یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اُردو نے ہمارے قدیم طرزِ احساس کو اپنی چرب زبانی سے خراب کردیا۔ جو رس اسے کبیر ، کالیداس ،سورداس ، تلسی داس وغیرہ کے کلام میں ملتا ہے۔وہ غالب اور اقبال یا عام اُردو شاعروں کے یہاں نہیں ملتا ہے۔آج تک اُردو کا کوئی شاعر سنسکرت سے متاثر نہیں ہوا۔اگر کالیداس کے سامنے غالب کے اشعار آئیں' اُن اشعار کو چھوڑ کر جو یونیورسل ہیں' تو اُنھیں پسند آئیں گے۔یا وہٹ مین اور اقبال' کالیداس اِن دونوں میں سے وہٹ مین کو زیادہ پسند کریں گے۔وہٹ مین کی زمینیت کالیداس کے مزاج سے میل کھاتی ہے۔یہ فرق رسم الخط کی وجہ سے نہیں۔غالب کے بہترین اشعار اگر اُسے سنائے جائیں تو شکنتلا لکھنے کے بعد بھی متاثر ہو جائے۔ مگر یہ اعتراض کرنے کا حق' پنت ،نرالا اور مہادیوی وغیرہ کو نہیں' جو خود اس رس سے واقف نہیں ہیں۔ میری شاعری میں یہ طرزِ احساس کئی جگہوں پر ملے گا۔جوش بڑی شاعری کے ۹۹ رفیصدی امکانات پورے کرتے ہیں۔ایک فیصدی کم کیوں رہ گیا؟ یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔''

''فراق صاحب! آپ کی شاعری کی ٹھہری ہوئی فضا، گھریلو پن ،جنس کا ارتقائی حسن اور زراعتی مزاج آپ کی شخصیت کا بھرپور تعارف کراتے ہیں لیکن اس شخصیت کی تکمیل میں وقت اور اس کی رفتار کا بھی کردار رہا ہے۔آج کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں جہاں لمحوں میں بٹی ہوئی سانسوں کا شمار بھی مشکل سے ہو پاتا ہے'ایک بھرپور شخصیت کا تصور کچھ رُومانی سا لگتا ہے۔زندگی کا یہ تصور جاگیردارانہ عہد کی یاد دلاتا ہے۔''

''ادب کوئی تصور جامد نہیں ہوتا۔حقیقت دو چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔ہمارے وجدانی ردِ عمل اور حقیقت کے سنگم سے حقیقت پسندی ظہور میں آتی ہے۔قدیم وجدید کی بحث اچھی شاعری کے لئے نہیں ہوتی' شاعری کوئی بینک نہیں جس میں فوراً رقم جمع کردی جائے۔کبھی کبھی سب سے نئی چیز سے پرانی چیز

زیادہ نئی ہوتی ہے۔ایک ری نیس نے نیچر پر ایک ہزار مصرعوں کی نظم کہی ہے۔ ہمیں اس کے سامنے اپنی غزل قدیم لگتی ہے۔ میں جدت کا قائل نہیں۔ ایلیٹ کے کھوکھلے آدمی کا تصور بنا کسی انسانی عظمت کے تصور سے ممکن نہیں۔ انسانی عظمت کے تصور ہی نے اُسے نئے آدمی کے کھوکھلے پن کا کرب دیا تھا۔ آزادی کے بعد حقیقت پسندی، ناول کے فارم میں آسکتی ہے۔ناول کا کام نظم سے لینے کے لئے ناول نگار سے بھی بڑا ذہن چاہیئے۔شاعری صرف خارجی حالات کی تصویر کشی کا نام نہیں ہے۔ یہ حیات و کائنات کی رُوح تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔میری شاعری کی زبان لُغت یا کتاب کی زبان نہیں بلکہ زندگی کی زبان ہے۔ میں خدا کے واسطے سے حیات و کائنات کی عظمت کا قائل نہیں ہوں' بلکہ حیات و کائنات کو بذاتِ خود پُرعظمت مانتا ہوں اور اُس عظمت کا احساس اپنی اشعری میں کرنا اور اُس شاعری کے ذریعہ دُوسروں کو کرانا میری شاعری کا مقصد رہا ہے۔ میرے نزدیک مادہ کی رُوحانیت کا احساس ہی مذہب ہے۔شاعر کی شخصیت خارجی حالات سے اونچی ہونی چاہیئے۔میری شاعری کا زیادہ حصہ عشقیہ ہے' جس کی بُنیاد جنسیت اور جنسی کشش رہی ہے۔جنسی پاکیزگی کو میں جنسی تلذذ سے جدا نہیں کرتا۔البتہ کچھ لوگ جنسی تلذذ تک ہی جنسی کشش کے قائل رہے ہیں اور اس کی پاکیزگی اور اس کی انسان سازی کے امکانات کا احساس نہیں کرسکتے ہیں۔''

لہروں میں کنول نہائے جیسے — دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ رُوپ، یہ لوچ، یہ ترنم، یہ نکھار — بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

●●

سردار جعفری

بھیڑ کے شور وغُل سے اُکتا کر اُس نے ایک مورتی تلاش کر کے سامنے طاق میں رکھ لی اور وہ ہر روز اُس کے سامنے بیٹھتا رہا۔ اور ہر روز وہ مورتی بڑھتی رہی.... پھیلتی رہی۔ اور پھر یوں ہوا کہ اُس کے دونوں ہاتھ آکاش کے دونوں کناروں کو چھو رہے تھے اور پیر دھرتی کے اَسیم پھیلاؤ کو ناپ رہے تھے... ایک دِن خود اس کے پڑوس کے کھیت میں فصل مرجھانے لگی۔ دُور دُور تک کہیں بادل نظر نہیں آئے۔ اُترے ہوئے چہرے، سوکھی ہوئی مٹی۔ وہ اُس دِن بھی حسبِ معمول مورتی کے سامنے جا بیٹھا لیکن اُس دِن مورتی اور اُس کے رشتہ کی نوعیت عام دِنوں جیسی نہ تھی۔ اب مورتی اور اُس کے درمیان سوکھا ہوا کھیت بھی آ گیا تھا۔ اُسے اِس تبدیلی کا احساس نہیں تھا... مگر جیسے ہی وہ سامنے گیا' اُس کا سر چکرا گیا، ہر چیز گھوم سی رہی تھی، مورتی اپنے آفاقی پھیلاؤ کو سمیٹ کر اپنے اصلی سائز میں ڈھل چکی تھی۔ اُس نے غصّے میں آ کر مورتی کو اُٹھا کر زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ لیکن جب اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو عجیب عالم تھا... مورتی اُسی طرح چوکور طاق میں سمٹی ہوئی ہنس رہی تھی اور خود وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر بکھرا پڑا تھا۔

مورتی نے اُسے دھوکا دیا تھا یا اُس نے اپنے آپ سے مذاق کیا تھا' یہ آج تک معمّہ ہی ہے۔ مگر جب اُس نے فرش پر بکھرے ہوئے اپنے ٹکڑوں کو سمیٹ کر اکٹھا کیا تو چہرہ مہرہ اور حُلیہ تو اُسی کا تھا مگر اب بھی اُسی مورتی کے قریب بیٹھتا ہے۔ لیکن اب وہ اُس میں آکاش اور دھرتی کے پھیلاؤ کے بجائے، نقوش کا تناسب اور پتھر کے کٹاؤ کا حسن تلاش کرتا ہے۔

ہم جب کسی سے ملنے جاتے ہیں تو اُس شخص کو' جس سے ہمیں ملنا ہے اپنے گھر سے ساتھ ہی لے کر چلتے ہیں۔ یہ ملاقات نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ والے آدمی کو دُوسرے کی کُرسی پر بٹھانے کی زبردستی ہوتی ہے اور اتفاق سے اگر کوئی آپ کے ساتھی کے لئے کُرسی نہیں چھوڑتا، جو اکثر ہوتا ہے تو آپ فوراً ناراض ہو جاتے ہیں' ایسا کیوں....؟

سردار جعفری سے میں پچھلے ایک سال سے تقریباً ہر روز مل رہا ہوں۔ وہ جہاں پہلے دِن بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے' وہیں اب بھی لکھتے رہتے ہیں، اُسی کُرسی پر بیٹھ کر جوتے بھی باندھتے ہیں، اُسی کے پاس کھڑے ہو کر کبھی بالوں میں کنگھا بھی کر لیتے ہیں اور جاتے وقت احتیاطاً اپنی بُش شرٹ یا واسکٹ بھی اُسی پر لٹکا جاتے ہیں۔ وہ شخص! دونوں کے نام سردار جعفری.... اور ایک کُرسی اور وہ بھی جب دیکھو بھری

ہوئی۔ دو چار دِن تو عجیب اُلجھن محسوس ہوئی اور پھر ایک دِن جب 'اُردو بلٹز' کی پانچویں منزل کے دُوسرے زینے پر ہی جعفری صاحب نے پھولی ہوئی سانس میں کہا۔

''آپ آگے چلئے' میں رُکتا ہوا آؤں گا۔'' تو مجھے اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ آدمی جو ہر روز میرے ساتھ گھر سے چلتا ہے' وہ تو ایک دَم رُومانی باغی تھا، ایک شرارہ جو خرمن جور جلا دینے کے درپے تھا، جو رعد و برق کی مانند بے چین تھا اور جو خالی پیٹ مجاز اور سبطِ حسن کے ساتھ لکھنؤ کی سڑکوں پر دِن دِن بھر گھوم کر بھی نہیں تھکتا تھا اور اب پانچویں منزل کے دُوسرے زینے پر ہی اُس کی سانس پھول رہی تھی۔ سردار جعفری نے اپنے نئے شعری مجموعہ میں جگر کے ایک شعر۔

اُن کا جو فرض ہو وہ اہلِ سیاست جانیں

میرا پیغامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے

کے حوالے سے اپنی اِس کمزوری کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وقت بھی کتنی جلدی گذر جاتا ہے۔ میری کھولی کے ٹین میں اس برسات میں کتنے سوراخ جھانکنے لگے ہیں۔ دو ایک سال کی تو بات ہے کتنی نئی اور مضبوط تھی یہ... برسات ایسے گذر جاتی تھی جیسے کوئی نئی نئی بیاہی لڑکی پائل چھنکاتی قریب سے گذر جائے .....!! اب میں سردار جعفری کے گھر اکیلا ہی جاتا ہوں، اب میں صرف سامنے بیٹھے ہوئے سردار جعفری سے باتیں کرنے پر اکتفا کرتا ہوں... سردار جعفری... سیتا محل کے فلیٹ کا ایک کمرہ، آٹھ نَومَن کتابیں، دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی نیند، بکھرے ہوئے بہت سارے کالے سفید بال، 555 برانڈ کی سگریٹیں، فرش، کھڑکیاں، دیواریں... فرنیچر، ٹیلی فون، پنڈت نہرو کی تصویر، پدم شری کی دستاویز... سردار جعفری کتنی ساری چیزوں سے گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ اُن تک پہنچنے کے لئے اب بہت کچھ پھلانگنا پڑتا ہے۔ چیمبور سے سیتا محل کا راستہ تو خیر اِتنا طویل نہیں مگر اُن کے کمرے سے اُن تک پہنچنے کا راستہ اکثر بری طرح تھکا دیتا ہے۔ ترپّن، چوّن سال لمبا راستہ... گھاٹیاں، پہاڑ، میدان، جنگیں، فسادات، انتخابات، جیل، انقلاب، محفلیں، سناٹے، بچے، بیوی، سماجی اقتدار... اور نہ جانے کیا کیا....!...! مجھے لگتا ہے خود سردار جعفری بھی اپنے آپ سے کم ہی مل پاتے ہوں گے۔

''یہ پالش والا دِن بھر میں کتنا کما لیتا ہوگا؟''

''یہی سات آٹھ رُوپے۔''

''سادی پالش کے دس پیسے، سات رُوپے میں ستّر جوتے ہوئے، سات سو پیسے۔ ہاں' اِتنے تو

مل ہی جاتے ہوں گے۔''

''اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے جعفری صاحب!''

''نہیں' ایک روپیہ تو بے چارے کا خرچ ہو جاتا ہو گا۔''

''بے چارہ...! مجھے لگا یہ لفظ پالش والے کے لئے بے کار استعمال ہوا ہے۔ اُس کا جائز حق دار تو سامنے کھڑا ہوا وہ سفید پوش نوجوان ہے جس کے گالوں میں عمر سے پہلے وقت نے اُنگلیاں ڈال دی ہیں۔ گرانٹ روڈ اسٹیشن پر چرچ گیٹ کی گاڑی شاید کچھ لیٹ تھی۔ جعفری صاحب نے نئی سگریٹ سُلگا کر ابھی مشکل سے دو کش ہی لئے ہوں گے کہ سامنے بیٹھے ایک پالش والے کی پیٹی میں وہ داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ دو فٹ کی لکڑی کی چھوٹی سی پیٹی اور شاید ساڑھے پانچ فٹ کے سردار جعفری، آٹھ نَو مَن کتابیں، فرش، کھڑکیاں، دیواریں۔ مجھے ڈر لگا' کہیں بے چارے کی لکڑی کی پیٹی، پالش کی ڈبیہ اور برش وغیرہ اِس بوجھ تلے ٹوٹ پھوٹ نہ جائے..... شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی اِس ٹوٹ پھوٹ کے لئے اپنی مثال آپ ہیں۔ (ملاحظہ ہو'' پتھر کُوٹنے والی کا حُسن)

عہدِ قدیم سے مغربی فکر کی یہ روایت رہی ہے کہ عالمِ اشیاء اور اس کے دیکھنے والوں کے درمیان فاصلہ رہے۔ لیکن اب خارجی نقطۂ نظر سے دُنیا آہستہ آہستہ کنارہ کش ہو رہی ہے۔ موجودہ فلسفہ شعور کو تجربہ سے الگ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ چاہتا ہے علم اور اشیاء ایک جاندار اور ہم آہنگ وجود بن جائے۔ ترقی پسندوں کا اپنے اِردگرد کے ماحول سے جو تعلق رہا ہے' اُس کی نوعیت بھی معروض اور موضوع جیسی ہے۔ ان میں اشیاء کو چھونے ٹٹولنے اور ان میں اُتر کر شخصیت کے محسوساتی عمل میں شامل کرنے کا رُجحان کم نظر آتا ہے۔

سردار جعفری اپنی شاعری میں اکیلے بہت کم نظر آتے ہیں۔ ہر جگہ وہ کسی نے کسی سے بات کرتے ہوئے دِکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ پوری بھیڑ کی بھیڑ سے خطاب کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اس خطاب میں مقرر اور سامعین کا فاصلہ کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہو پاتا۔ خطابیہ وضاحت اور تفصیلی پھیلاؤ اس صورت میں ضرورت بھی ہے اور عیب بھی۔

ہم آج یلغار کر رہے ہیں۔
ذلیل جنگوں کے مورچوں پر حیات کا وار کر رہے ہیں۔

اُن کی آواز کے سُر بھی اسی لحاظ سے پُرشور اور اُکھرے ہوتے ہیں۔ ان میں لہجے کی تہہ داریاں

اور الفاظ کی راز داریاں تو نہیں ہیں مگر ایک خاص قسم کی توانا مردیت ضرور ہے' جو الفاظ کی سیدھی اور کھڑی اصوات میں جھلکیاں ماتی ہے۔ اس پر اقبال اور جوش کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ شاید وقت نے سردار کو خود سے ملنے جلنے کی فرصت کم ہی دی ہے۔ لیکن ''پرواز'' (پہلے مجموعۂ کلام) تک' بھیڑ کے ہنگاموں سے بچ کر وہ جب جب اپنے پاس بیٹھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ایسے مواقع کم ہی آئے ہیں' اُن کا لب ولہجہ نہ صرف اُن کی اپنی دیگر نظموں میں نمایاں نظر آتا ہے بلکہ پورے ترقی پسند عہد میں دُور سے پہچانا جاتا ہے۔ خصوصاً پتھر کی دیوار اور بعد کچھ نظموں کا لہجہ۔ ترقی پسند شاعروں مس سے صرف فیضؔ اور سردار کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے۔

''جعفری صاحب! شاعری میں لب ولہجہ کی اہمیت.....؟''

''لب ولہجہ کی اہمیت بہت ہے' مگر یہ سوال آپ پوچھ رہے ہیں' تعجب ہے۔''

''جعفری صاحب! اِس سوال کے پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں مواد کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور ہیئت پرستی پر کڑی تنقید بھی کی ہے اور مواد کی بھی آپ کے یہاں ایک بندھی ٹکی تعریف ہے۔ اگر کسی موضوع میں مخصوص نظریہ کا عکس نہیں ملتا تو آپ سرے سے اُسے موِوع ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اور کیونکہ آپ کے سامنے ہر وقت عوام کی لفظی رہنمائی کا مقصد رہتا ہے' اِس لئے نصیحتوں میں استعمال ہونے والی وَضاحتی زبان شعری ضرورت بن جاتی ہے۔''

''میں مواد کو ہیئت سے الگ نہیں سمجھتا' ہر خیال اپنا لباس ساتھ لے کر آتا ہے۔''

''دُرست ہے' مگر اِس کی پہچان کیسے ہو کہ خیال اپنے فطری لباس میں ظاہر ہوا ہے یا اُس کے بدن کو جھوٹی پوشاک سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ ہیئت کے نت نئے تجربے، موضوع کو اس کی گہرائیوں تک چھونے کی کوشش ہوتے ہیں۔ لب ولہجہ کی لغوی قطعیت موضوع کی رَوایتی سطح تک ہی شاعر کا ساتھ دے سکتی ہے۔ ''پتھر کی دیوار'' کی بیشتر نظموں میں خود آپ نے جو تجرباتی اُسلوب اختیار کیا ہے' اُس میں الفاظ کا صنعتی مزاج اور تصویروں کے نئے آکار موضوعات کو نئی سطحوں پر پھیلا دیتے ہیں۔

میں لکھ رہا ہوں
تمہاری آنکھیں سفید کاغذ پہ اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں
سفید آٹا، سیاہ چکّی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
گائے کے تھن سے نکلتی ہے چمکتی چاندی

چاولوں کی صورت پر مُفلسی برستی ہے
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
تیرے ماتھے کو پیار کرتی ہیں، ترچھی پرچھائیاں جہازوں کی

''لیکن آپ کی بعد کی بیشتر نظموں میں یہ اِردگرد کے ماحول کی مانوس فضا اور زمینی سجاؤ کے بجائے ''تشنگیِ آبلہ پا''، ''تابشِ رنگِ شفق''، ''کفِ پائے نگاراں''، ''آتشِ رُوئے خورشید''، ''سیارگانِ فلک''، ''چراغِ لالہ وگل''، ''شکستِ دار ورسَن''، ''لذتِ ذوقِ طلب'' ایسے کہر آلود آکاش اور دُھندلے مناظر کی تبدیلی کیوں؟ یہ کتابی زبان، شاعر اور زندگی کی درمیانی دُوری کی غماز بھی ہوتی ہے۔''

''لب ولہجہ عہد بہ عہد بھی بدلتا ہے اور موضوع سے بھی اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ''پتھر کی دیوار'' میں میرے جیل کے زمانے کی نظمیں ہیں، نئے مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں، کچھ پیچیدگیاں بھی اور بڑھی ہیں۔ ''پتھر کی دیوار'' اور دُوسری کتابوں میں جو وقت اور موضوع کا فرق ہے، وہی ان کے اُسلوب میں بھی نمایاں ہے۔ مثلاً نظم ''نیند کی ملائمیت'' جنسی موضوع کی نظم ہے، جنگ پر کہی ہوئی نظموں میں نہیں ملے گی۔ الفاظ اور شاعر کا سماجی رشتہ سماجی اور اقتصادی دونوں طرح کا ہوتا ہے۔''

''شاید نجی زندگی میں شاعر اور سماج کے رِشتے کی جو نوعیت ہوتی ہے، وہ بھی اس کے زبان و بیان پر اثر انداز ہوتی ہو۔ ''لوگوں کا خیال ہے'' اور ''ایک خواب اور'' میں کہیں کہیں فیضؔ کے نغماتی آہنگ سے آپ متاثر ہیں۔ اس میں وہ عام بول چال کی زبان جو آپ کے مزاج سے زیادہ قریب ہے، نظر نہیں آتی۔''

''یہ آپ کا خیال ہے۔ ویسے ہم عصر شعراء ایک دُوسرے سے متاثر ہوتے بھی ہیں اور متاثر کرتے بھی ہیں۔ جب ہم سب ایک ساتھ بیٹھتے ہیں، ایک دُوسرے کو بار بار سنتے ہیں، ہم میں سے سب کو ایک دُوسرے کا کلام آدھے سے زیادہ یاد ہے۔ جذبی، مجاز اور فیضؔ اِن سب کے ہاں ایک دُوسرے کے اثرات تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سب کا اپنا انداز ہے اور وہ پہچان لیا جاتا ہے۔ میرے ہاں کلاسیکی اور نئی امیجری (Imagery) شروع سے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے۔ ''ذوقِ طلب'' کے دو شعروں میں دو طرح کی آوازیں ہیں۔''

برنگِ بُوئے گُل ' پیراہن و کاکُل سے اُڑ آئے
شبستانوں کے عاشق جب شبستانوں سے گذرے ہیں

پپیہے بولتے ہیں ' کوکتی ہیں کوئلیں جن میں
ہمارے سر پہ ان گاتے ہوئے باغوں کے سائے ہیں

سردار جعفری بناٗر کے بولتے رہتے ہیں۔ وہ گفتگو کے دوران ہی کچھ لفظوں کو روک لیتے ہیں۔ کہیں جسے کم، زیادہ کر دیتے ہیں، کبھی آواز کی ہلکی سی تبدیلی سے معنی میں خاطر خواہ تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں ۔مگر یہ عمل دَر پردہ اُن کے ذہن میں ہی چلتا رہتا ہے۔ سننے والے کو نہ باتوں کا بہاؤ ٹوٹتا نظر آتا ہے اور نہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بولتے وقت 'اُتر، دکھن، پُورب، پچھم چاروں دِشاؤں کو ٹول رہے ہیں۔ ''ترقی پسند ادب'' کے دیباچے میں سردار جعفری نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ''ہم عصر ادیبوں پر تنقید کرنے سے زیادہ مشکل کوئی دُوسرا کام نہیں ہے۔ اور اگر مصنف خود بھی ادیب ہے تو مشکلات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔''

''جعفری صاحب! ترقی پسند شاعری میں امیج کا استعمال عام طور سے تزئینی یا Static ہوتا ہے۔ اس میں ذہن کی مختلف سمتوں کو بہ یک وقت الفاظ میں سمیٹنے کے ابعاد کم نظر آتے ہیں۔ امیج شعور کی سطح پر لاشعور کی پیچیدگیوں کا اظہار کرتی ہے، جس میں انجانے ہی شخصیت کے سارے رنگ گھل مل جاتے ہیں۔''

''دُرست ہے' مگر اس میں شعری رویّہ کا بھی فرق ہے۔ آج کل شاعری خارج سے باطن کی طرف مڑ رہی ہے۔ میں ادب کو خارجی مسائل سے الگ کر کے نہیں دیکھتا۔''

''جعفری صاحب! آپ نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں اصغر، یگانہ، فانی کے مقابلے میں جگر کی شاعری سے زیادہ بحث کی ہے۔ جگر ان تینوں میں کمزور شاعر بھی ہیں اور پھر جن شعروں میں آپ نے سماجی شعور کو تلاش کیا ہے وہ بھی جگر کی شاعری میں کچھ زیادہ اہم نہیں۔''

''یہ صحیح ہے۔ حسرت، یگانہ اور اصغر کا ذِکر بھی وضاحت سے ہونا چاہیئے تھا۔ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اِس کا خیال رکھوں گا۔ جگر کی شاعری کے بارے میں میری رائے بہت صاف ہے۔ میں نے لکھا بھی ہے۔ حسرت کے مقابلے میں جگر کی شاعری زیادہ سطحی ہے۔ ''ترقی پسند ادب'' سے اب تک میری سوچ کی بُنیادی سطح تو وہی ہے' ہاں! اس کے اطلاق میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ کچھ شاعروں اور ادیبوں میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ میراجی کے بارے میں میری جو رائے پہلے تھی' وہی اب بھی ہے۔ منٹو

نے کچھ بڑی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ جیسے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''کھول دو'' وغیرہ۔ یہاں وہ اپنے کرافٹ میں دُوسروں کو اپنے قریب تک نہیں پھٹکنے دیتا۔ یہ عالمی معیار کی کہانیاں ہیں۔ مگر ''سرکنڈوں کے پیچھے'' اور ''بُو'' گھٹیا کہانیاں ہیں۔ مجھے آج بھی یہ کہانیاں بُری لگتی ہیں۔''

''جعفری صاحب! عورت کے پیشاب سے لذّت لینے والے میرا جی اور ''بُو'' لکھنے والے منٹو ہمارے سماجی اور تہذیبی کھوکھلے پن کی علامتیں بھی تو ہیں۔ مجھے تو میرا جی کی اس کج رَوی میں برسوں بوڑھا سماج اپنی تمام بدہیئتی کے ساتھ کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں، ہم آئینے میں اپنے چہرے دیکھتے ہوئے گھبراتے ہوں؟''

''لیکن اس میں صرف سماج ہی نہیں، فرد بھی قصوروار ہے۔ سماج کے آگے ہتھیار ڈال دینا اور اس کے خلاف لڑنا، دونوں میں بہت فرق ہے۔ بغاوت کے بھی مثبت اور منفی دو پہلو ہوتے ہیں۔ میرا جی کے ہاں منفی رُجحان کارفرما ہے، اُن میں لڑنے کا ولولہ نہیں ہے، شکست خوردگی نمایاں ہے جو نئی نئی ذہنی بیماریوں میں ظاہر ہوتی ہے۔''

''اچھا، ندا صاحب! میں تو کھانے کے بعد تھوڑا سونے کا عادی ہوں۔ آپ جب تک پڑھیئے۔ ''سیپ'' میں اُمِ عمارہ کی کہانی پڑھ کے اپنی رائے دیجئے۔ اِس بار تو سچّی کہانیوں کا ٹوٹا ہے۔''

کہانیوں کا ٹوٹا ہے۔ چاروں طرف کہانیاں ہی کہانیاں تو بکھری ہوئی ہیں۔ سامنے پڑی ہوئی لکڑی کی کُرسی، پیڑ کی ہری ہری ڈالیں، ساون کے جھولے، گیت ملنے کے، بچھڑنے کے ... ننھی ننھی چڑیوں کے گھونسلے .... انڈے، بچے، بدلتے موسم ...خریدے ہوئے ہاتھ ... چلتا ہوا آرا...لکڑیوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے ... کیلیں ...لوہے کی اندھیری کانیں ... پیٹ کے بل رینگتے ہوئے مزدور ... چھوٹی چھوٹی کھولیاں، رِشتے، نفرتیں، محبتیں ... سرحدیں، جنگیں، فسادات، صرف ایک کُرسی میں کتنی ساری کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔ ایک کُرسی کو لکھنے میں کئی نسلیں گذر جائیں .... معمولی سے معمولی چیز میں بھی کتنے گہرے گہرے غار چھپے ہوتے ہیں۔ شاید ہمارے ادیب آج کل دوڑتے زیادہ ہیں، کسی چیز پر رُک کر نظر نہیں ڈالتے۔

''کہیئے، آپ نے کہانی پڑھ لی، کیسی ہے؟''

''جی ہاں، مگر مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آئی ....!''

''جعفری صاحب! آپ نے نئی شاعری پر کبھی تفصیل سے کچھ نہیں لکھا۔''

''نئی شاعری پر لکھنے کا حق نئے نقادوں کا ہے ہمارے ساتھ ہمارے نقاد بھی پیدا ہوئے تھے۔ ہر عہد کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ میں نئی شاعری کا مخالف بالکل نہیں ہوں' مجھے بھی دُوسروں کی طرح کچھ نئے شاعر پسند ہیں، کچھ اچھے نہیں لگتے۔ میں جدید اُردو ادب کا انتخاب بارہ جلدوں میں شائع کر رہا ہوں' اس میں ایک جلد نئی شاعری کا انتخاب ہوگی۔ نئی شاعری' شاعری سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ پچھلی شاعری کی توسیع Extention ہے۔''

''جعفری صاحب! گاڑی میں تو بہت بھیڑ ہے۔''

''دیکھئے کوشش کرتے ہیں''...اور دیکھتے ہی دیکھتے چرچ گیٹ کی لوکل کے ڈبے کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے جعفری صاحب مجھ سے پہلے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگئے۔ چاروں طرف بھیڑ ہی بھیڑ۔ بجھی ہوئی آنکھوں کی بھیڑ، تھکے ہوئے جسموں کی بھیڑ، اُترے ہوئے چہروں کی بھیڑ...اور بیچ میں لوہے کی سلاخ پکڑے ہوئے سردار جعفری...چُپ، خاموش... مجھے لگتا ہے' سردار جعفری ابھی کئی سال اور نظمیں کہتے رہیں گے...وہ آدمی جو خود کو اور خود کے ساتھ اِردگرد کے ماحول کو برہنہ کرنے کی جراُت رکھتا ہے۔ اس کی تخلیقی عمر کافی طویل ہوتی ہے۔

خشکیٔ لب ہے نہ اب دیدۂ تر باقی ہے
جانے کیا ہوگئے وہ عہدِ گذشتہ کے رفیق
وقت نے چھین لیا بھوک کا، فاقوں کا غرور

●●

اختر الایمان

اسٹیل کی قینچی، موم کی گڑیا، جامع مسجد کا مینار، بیل گاڑی کے پہیے، لمبی لمبی پدراہیں، سوکھی ہوئی ببول، گہرے غار، نرم مٹی، سفید اُون کے لچھے، چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دیر دیر تک رُکتی پسنجر ٹرین...
میرا جی چاہتا ہے کہ ان تمام مختلف چیزوں کو ایک گول گھیرے میں بند کر کے اس کے اوپر ایک نام لکھ دوں
....اختر الایمان۔

یہ چاہنا بھی خوب ہے۔ کوئی سلسلہ نہ تعلق' بھلا اختر الایمان اور ان مختلف اشیاء کے ذخیرے میں کیا سمبندھ! مگر تین ساڑھے تین گھنٹے بعد اختر صاحب کے فلیٹ سے نیچے اُترتے وقت میرے ذہن میں کچھ اسی قسم کی تصویریں اُبھر کر گڈمڈ ہو گئیں تھیں۔ میں سوچتا ہوں شاید اس ردِ عمل میں وقت کا بھی ہاتھ رہا ہو۔ ممکن ہے یہ وقت اگر تین ساڑھے تین گھنٹے سے کچھ کم ہو کر آدھ گھنٹہ یا پندرہ منٹ ہوتا تو.....اوّل تو یہ تصویریں اتنی مختلف نہیں ہوتیں اور پھر یہ سلسلہ بھی شاید اسٹیل کی قینچی سے شروع ہونے کے بجائے' فلمی ڈائیلاگ، اوارڈ کی مورتی سے شروع ہوتا اور آخر میں جگہ جگہ دیر دیر تک رُکنے والی پسنجر ٹرین کی جگہ کوئی انگریز نسل کا بھورے بالوں والا کتا ہوتا' جو قیمتی سامان سے آراستہ فلیٹ کی سج دھج سے اُوب کر کبھی دائیں کھڑکی سے جھانک کر گندی سڑک کو گھورتا اور کبھی بائیں کھڑکی کا پردہ سرکا کر بے وجہ بھونکتا۔

میں چاہتا ہوں ان اُلٹی سیدھی تصویروں کا تجزیہ کر کے دیکھوں' شاید کوئی سرا ہاتھ لگ جائے۔
ہم کسی دُوسرے کے بارے میں سوچتے وقت اپنی شخصیت کا کتنا حصّہ دُوسرے میں شامل کر دیتے ہیں۔ ہر آدمی اپنے طور پر ہی دُوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اِس 'طور' کے ساتھ ہی وہ حدود شروع ہوتی ہیں' جن سے باہر نکلنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

''معاف کیجیے اختر صاحب! مجھے کافی دیر ہوگئی۔'' اختر الایمان کھانے کی میز سے سنے ہوئے ہاتھ لئے بیسن کی طرف آ رہے تھے۔ کاڑھے کا کُرتا اور لنگی... اختر الایمان سے جب بھی ملنا ہو تو پہلے اُن کی تصویر دیکھ لینا بہت ضروری ہے۔ نہیں تو.... پہلی بار جب میں اُن سے ملا تھا تو کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ تعارف ہونے تک مجھے کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ گھر کا کوئی بچہ اِدھر سے گذرتے ہوئے صوفہ پر پھیلے ہوئے

اِن لنگی کُرتا پہنے ہوئے صاحب کوٹوک کر مہمانوں کے لئے چائے پانی لانے کو ضرور کہے گا۔

اختر الایمان کی غیر موجودگی میں اختر الایمان کا کمرہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ہر چیز دُوکان کے شو کیس میں رکھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کُرسی کے ہتھے پر بھی ہاتھ رکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے' کہیں یہ بول نہ دے۔'' ہٹاؤ ہاتھ' یہ بھی کوئی وقت ہے مجھے چھونے کا۔'' کھڑکیاں' کھڑکیوں پر پردے، فرش پر قالین، میزیں' میزوں پر فلمی اوارڈ کی مورتیاں، دیواریں' دیواروں پر گلدستے، پنڈت نہرو کے ساتھ اختر الایمان کی تصویر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کمرے میں نہیں ہیں بلکہ پورا کمرہ آپ کے اوپر رکھا ہوا ہے۔

'' کہیئے آپ کیسے ہیں؟'' اختر صاحب نے سامنے بیٹھتے ہوئے ایک رسمی سا جملہ میری طرف پھینک دیا۔ عموماً ہم ایسے ہی پھینکے ہوئے جملوں سے ہی کسی شخص کے اخلاق و کردار پر فیصلہ صادر کرتے ہیں ۔ نہ جانے مجھے کیوں ایسے جملوں کا جواب دینے میں گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔ ایسے جملوں کا جواب بھی رسمی اور برسوں کا رَٹا رَٹایا ہوتا ہے۔'' کیسے ہیں؟'' پوچھنے والے کے ذہن میں اِن الفاظوں کا کوئی مفہوم ہوتا ہے اور نہ ہی اِس کے جواب میں'' اچھا ہوں۔'' کہنے والا سوچ بچار سے کام لیتا ہے۔ اگر اتفاق سے کبھی کوئی ایسے سوالوں کے متوقع جوابات سے مختلف جملے تراشنے کی کوشش کرتا بھی ہے تو سننے والے ان کو سنجیدگی سے سننے کے بجائے اکثر ہنس کے ٹال دیتے ہیں ۔ سچے دُکھ کا اِظہار لطیفہ بن کر کئی دِن تک محفلوں میں گھومتا پھرتا ہے۔

آدمی اوپری بناؤ، سجاؤ کے ڈھیر میں نہ جانے کس کونے میں اندر کنڈلی مارے بیٹھا ہوتا ہے۔ جتنا اوپر کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے' اتنا ہی یہ بے چارہ سکڑ سکڑ کر دیکھتا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے' شخصیت کے نہاں خانے کی دبی گھٹی فضا میں یہ ایک نئی قسم کی بیماری کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ نیندوں کی بیماری ایک مہینے کی طویل نیند، برسوں گہری نیند اور پھر نیند ہی نیند... کُرتا، پائجامہ چلتا ہے، آنکھیں گھومتی ہیں، ہونٹ پھیلتے اور سکڑتے ہیں، ٹانگیں دوڑتی ہیں، سگریٹ سُلگتی ہے اور آدمی دبے گھٹے تاریک ماحول میں کسی کونے کھدرے میں بے جان سا گہری نیند میں سویا پڑا ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں ہر شخص کے دو نام ہونے چاہئیں' ایک نام کُرتا، پائجامہ یا پینٹ، بُش شرٹ کا اور دُوسرا اس بے چارے جنم قیدی کا۔ اختر الایمان کی شاعری اِن دو ناموں کے تضاد کا ڈرامہ ہے۔ یہی وہ نقطۂ امتیاز ہے جو اختر الایمان کی شاعری کو ترقی پسند اجتماعیت سے الگ کر کے میرا جی اور راشد کے انفرادی تجسس کی روایت سے قریب کرتی ہے۔ لیکن اختر الایمان کے یہاں شخصیت کے اِس تضاد کو نہایت میکانکی انداز میں برتا گیا ہے' جس

کی وجہ سے اُن کی بیشتر نظموں میں سپاٹ قسم کی منطقیت پیدا ہوگئی ہے۔ جوش کی اکثر نظمیں پہلے دو مصرعوں میں ختم ہوجاتی ہیں لیکن وہ اسے ربڑ کی طرح سے برابر نیچے کی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ اختر الایمان کی نظمیں اس کے برعکس نظم کے آخری دو مصرعوں میں چھپی ہوتی ہیں، جن کو وہ غزل کے قافیہ کی طرح پہلے سوچ لیتے ہیں اور جنہیں وہ برابر نیچے سے اوپر کی طرف کھینچتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے اختر الایمان کی نظموں کا اوپری ڈھانچہ (مختصر نظموں کے علاوہ) کھردرا، بلند آہنگ اور قطعیت لئے ہوئے ہوتا ہے۔ شخصیت کے اس تضاد یہ ڈرامہ کے داخلی کردار کو اختر الایمان نے ایک نظم میں ''ایک لڑکا'' کے نام سے پکارا ہے۔ جسے ''یادیں'' کے دیباچے میں اُنھوں نے ضمیر کی علامت کہا ہے۔ یہ لڑکا شروع سے اختر صاحب کے ساتھ رہا ہے اور یہی اُن کی شعری زندگی کی پہچان بھی ہے۔ لیکن ''یادیں'' تک آتے آتے جو ۱۹۵۷ء میں کہی ہوئی نظم ہے وہ اپنے مخصوص لہجے میں یوں اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔

اُس احمق کو آخر ہم نے اِسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہِ مفر کی اس آباد خرابے میں

اور کتاب کے آخری صفحے پر جہاں ۱۹۶۱ء درج ہے، کتبہ کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے، جس میں ایک طفلِ آرزو کا ماتم کیا گیا ہے۔

ہَے ہَے کوئی طِفلِ آرزو ہے
کمسن ہے، کلی ہے، نو دمیدہ

''اختر صاحب! یہ طفلِ آرزو کا ماتم جو اِس نظم میں کیا گیا ہے۔ یہ وہی لڑکا تو نہیں ہے جو رات کے ایک بجے نیند سے جھنجھوڑ کر آپ کا نام پوچھا کرتا تھا' وہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟''

''ایسا نہیں ہے۔ اگر میری نظموں میں اب وہ حُسن اور رَچاؤ آپ کو نظر نہیں آتا تو اِس سے یہ نتیجہ نکال لینا دُرست نہیں۔ وہ لڑکا آج بھی اسی طرح میرے ساتھ ہے۔ ہاں' یہ ضرور ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی لڑکے سے جوان اور جوان سے بُوڑھا ہوا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اس بدلے ہوئے رُوپ میں آپ اُسے نہ پہچان رہے ہوں۔''

''اختر صاحب! یہ بھی تو ہوسکتا ہے' وہ لڑکا جب آپ کی سماجی زندگی میں آڑے آیا ہو تو اُسے آپ نے احمق کہہ کر کہیں چھوڑ دیا ہو اور تنہائی میں خود کو فریب دینے کے لئے اپنی سہولت کے مطابق کوئی نئی مورت تراش کر اُسے ایک لڑکے کا نام دے دیا ہو۔ آپ کی اِدھر کی نظموں میں جو نثری لہجہ اور اکہری

آوازیں ہیں' اُن میں اور تو سب کچھ ملتا ہے' مگر وہ لڑکا دِکھائی نہیں دیتا جو تُند رو چشموں کے رَواں پانی سا گہرا، مضطرب اور چونچال تھا۔ فطرت..... جوانی اور بُڑھاپے کے مدارج سے نہیں گذرتی۔ اُس کا معصوم تقدس ہی اس کی خصوصیت ہے۔''

''یہ آپ کی رائے ہے۔ لیکن میں اپنے فن پر ہمیشہ بے تعلق Detached ہو کر سوچتا رہا ہوں۔ میں نے کبھی سماجی مصلحتوں سے اپنی شاعری کو ملوث نہیں ہونے دیا۔''

اختر الایمان کے چہرے کی مسکراہٹ بہت خطرناک ہوتی ہے۔ ایک ڈیڑھ سال کے بچے جیسی ملائم، نوجوان لڑکی جیسی سڈول، نرگس کے پھول جیسی نیند بھری۔ اگر آپ باتیں کرتے کرتے اتفاق سے اِدھر اُدھر دیکھ لیں تو اپنے دلائل چھوڑ کر اُنہیں کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔ اختر الایمان مسکراتے وقت کتنے اکیلے اکیلے نظر آتے ہیں..... مجھے اِس چیز سے وحشت ہوتی ہے جو میرے وجود پر چھانے کی کوشش کرتی ہے۔

اختر الایمان صاحب! آپ کی نظم ''سبزۂ بے گانہ'' میرے خیال میں' تمام رات یہ بے ربط باتیں کرتا ہے' پر ختم ہو جانی چاہیئے تھی۔ کیونکہ اِس کے بعد یہ نظم موضوع کے اعتبار سے آگے نہیں بڑھتی' صرف پہلے کہی ہوئی بات کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی اچھے تہہ دار شعر کی نثری تشریح کر دی گئی ہو۔ بعد میں مصرعے بھی، غرض کہ' نتیجہ یہ ہے' وغیرہ الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ اگر وہ نظم یہیں پر ختم ہو رہی ہوتی تو میں اُسے یہیں پر ختم کر دیتا' میں اِس معاملے میں بہت احتیاط برتتا ہوں۔ اکثر نظم کہہ کر مطمئن نہیں ہوتا تو دوبارہ اسی کو بحر بدل کر کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نظم کہنے کے بعد بھی اس پر برابر غور کرتا رہتا ہوں۔ 'عہدِ وفا' جس صورت میں اب ہے' اُسے میں نے نامکمل سمجھ کر ڈال دیا تھا۔ میرا جی اس زمانے میں میرے ساتھ رہتے تھے۔ اُنھیں وہ نظم مکمل نظر آئی، اُن کے اصرار پر میں نے دوبارہ پڑھی تو واقعی وہ نظم پوری ہو چکی تھی۔''

میرا جی..... چمکتے ہوئے دو لوہے کے گولے، گوشت کے گولوں سے لوہے کے گولوں تک کا طویل سفر۔ میرا جی نے یہ طویل سفر اپنے شریر کی ناؤ میں سوار ہو کر طے کیا تھا۔ کشتی بھلے ہی موجوں کی نذر ہو گئی ہو' لیکن دو گولے' آج بھی اُسی طرح اُچھل رہے ہیں۔ اپنے اندر کے لوہے کو باہر نکال لینا بھی کتنا کٹھن ہے۔ زندہ سانسیں، ننگی آتما.....

''اختر صاحب! ہمارے موجودہ معاشرے میں صحیح تنقیدی شعور کا اِمکان کہاں تک ہے۔

نظریاتی وابستگیاں، سماجی پیچیدگیاں، مفاد پرستیاں.... کیا یہ سب حالات ادب کی صحیح قدر و قیمت میں حائل نہیں ہوتے؟ ہمارے بیشتر ادیبوں کی مقبولیت میں ادبی صلاحیتوں سے زیادہ فلمی پبلسٹی اور سماجی نمائش کا ہاتھ ہے۔ کوئی جج رہ چکا ہے اِس لئے ادیب ہے۔ کسی کے پاس اِمپالا کار ہے اِس لئے بڑا شاعر ہے۔ کوئی ریڈیو اسٹیشن پر بڑے عہدے پر فائز ہے اِس لئے اونچا فنکار ہے.... ایسا کیوں؟''

''مصلحت زدہ رائے، مفاد پرستی اور ادب کا تجارتی ذوق بد قسمتی سے ہمارے معاشرے کی پہچان بن گیا ہے۔ میں یہاں کے آدمی کو مُیالا آدمی کہتا ہوں۔ اس کی خاصیت سُور کے مانند ہوتی ہے' جو اوپر کم دیکھتا ہے اور گردن جھکائے زمین کھودتا رہتا ہے۔ ہمارے یہاں ادب کو ثانوی درجہ حاصل ہے۔ روٹی کی حفاظت، مادّی آسائش، شخصی مفاد، دُوسروں کی خوشنودی' اِن سب کو اوّلیت دی جاتی ہے۔ صحیح تنقیدی شعور کے لئے جس ہموار فضا کی ضرورت ہے وہ ابھی نظر نہیں آتی۔ ہمارے ہاں ادیب کی موت عنفوان شباب میں ہو جاتی ہے' پھر ادیب نہیں ادیب کا بہروپ گھسٹتا رہتا ہے۔ میں نے پچھلے تیں پینتیس سال میں فن، اندازِ بیان اور مفہوم کے اعتبار سے وقیع شاعری کی ہے۔ اُردو شاعری میں اس وقت دو گروپ تھے۔ ایک میں فیضؔ، راشدؔ، میراجیؔ، اخترؔ الایمان۔ اور دُوسرے میں مجازؔ، جذبیؔ، جاں نثار اخترؔ اور مخدوم وغیرہ کا نام لیا جاتا تھا۔ لیکن لوگوں کی یادداشت بہت کچی ہوتی ہے۔ سستی پبلسٹی نے ان لوگوں کے نام اُجاگر کردئے جو سرے سے ادیب ہی نہیں ہیں۔ یہ اِس لئے ختم ہوئی کہ اس کے ساتھ اچھے ذہن نہیں تھے۔ اُس کی مثال ایسی کاپی ہے' جس کی کتابت تو ہوئی مگر پریس نہیں بھیجی گئی۔ ان لوگوں نے نیازؔ حیدر، حبیب تنویرؔ اور کیفیؔ تک کے نام لئے' مگر مجھے ہمیشہ نظر انداز کیا۔ اِس کی ایک وجہ میرے ساتھ میراجیؔ کا قیام بھی ہے۔ حالانکہ اُنھوں نے کبھی مجھ پر نہیں لکھا۔''

ایش ٹرے پر رکھی ہوئی سگریٹ بنا پئے آدھے سے زیادہ راکھ ہو چکی تھی' میں نے جلدی سے اُٹھا کر ایک ساتھ دو ایک کش لئے۔ کہیں ایسا نہ ہو پوری سگریٹ ہی اسی طرح سُلگ سُلگ کر راکھ میں تبدیل ہو جائے.... سگریٹ جب ہونٹوں پر نہیں ہوتی تو دُھواں زیادہ چھوڑتی ہے۔ اخترؔ الایمان شاید اپنی بات پوری نہیں کر پائے تھے۔ وہ لمحہ بھر خاموش ہوئے۔ شاید کچھ سوچ رہیں ہوں گے اور پھر بولنے لگے۔ اس ذراسی وقفے میں اُن کے ماتھے پر دو تین بار بَل بن بن کر ٹوٹے تھے۔

''بات یہ ہے ندؔا! لوگ اکیلے میں تعریفیں کرتے ہیں' لیکن لکھتے وقت مصلحت اندیشی نبھاتے ہیں۔ سردارؔ جعفری ہی کو لے لیجئے۔ اکیلے میں میری نظمیں سُن کر بہت تعریف کرتے ہیں، خوب سراہتے

ہیں، لیکن لکھتے وقت میرا نام دانستہ بھول جائیں گے۔ یہ اِس لئے کہ ایک بار جو وہ میرے بارے میں لکھ چکے ہیں، اُس کو رَد کرنے میں پس و پیش ہوتا ہے۔ یہاں تو ایسا ہی ہے۔ فراق نے اپنے آپ کو عظیم کہنا شروع کیا، عظیم ہو گئے۔ نئے نقادوں کو مصلحتوں سے اونچا ہونا چاہیئے۔ کچھ نقاد اُبھر رہے ہیں۔ نئے تنقید نگاروں میں مجھے محمود ایاز پسند ہیں، مگر وہ بہت کم لکھتے ہیں۔''

عمیق حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی، محمود ہاشمی، وحید اختر' کیوں نہیں....خیر.....پسند کا معاملہ ذاتی مفاد سے جڑا ہوا ہے۔

''اختر صاحب! آج کل آپ کا ایک جملہ ''نسل تو گھوڑوں اور خرگوشوں کی ہوتی ہے شاعروں کی نہیں۔'' بہت گشت کر رہا ہے۔ نئی نسل سے تو مراد نئے شاعروں کی اُس سوچ سے ہے جو انفرادی زاویوں کے اختلاف کے باوجود حقائق کے سائنسی وجدان کی ایک مشترک کوشش ہے۔ یہ تو بدلے ہوئے سماجی و تہذیبی حالات میں نئے شعری رویّہ کی تلاش ہے، جس میں موروثی روایات کی کورانہ قبولیت کی بجائے انفرادی تجسس و تجربہ کی روشنی میں فرد اور سماج کے بدلتے رشتوں میں نئی گرہیں لگائی ہوتی ہیں۔ تخریب و تعمیر کا یہ مسلسل عمل ہی انسانی آگہی کی سزا بھی ہے اور وَردان بھی۔ نئے شاعر فرد کو اجتماعی مشین کا پرزہ نہیں سمجھتے۔ وہ اسے جیتا جاگتا اور آزاد ذہن مانتے ہیں۔ نئی نسل کی اصطلاح آزادی کے بعد اسی ذہن کی پہچان کے لئے استعمال کی جاتی ہے، جو صرف اُردو میں ہی نہیں، ہندوستان کی دُوسری صوبائی زبانوں میں بھی رائج ہے۔''

''ٹھیک ہے، اس کے مفہوم پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے تو ''سوغات'' میں اس کے لغوی معنی سے بحث کی تھی۔ نسل کا اطلاق اس صورت میں چوہوں، خرگوشوں اور گھوڑوں پر ہوتا ہے۔ ادیبوں کو ایک نسل نہیں کہہ سکتے۔ ادیب فرد ہیں۔ ہر فرد اپنے اندر ایک کائنات ہوتا ہے، نئے ادیب، نئے ذہن، نئے لکھنے والے، ان کے وجود سے میں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ زندگی آگے بڑھتی ہے، پھیلتی ہے، سوچ کے زاویئے، اندازِ بیان، اِظہار کے سانچے ورثے میں ملنے والے عطیات نہیں ہیں۔ ہر عہد کے مطابق اپنی ذات کے سفر کی نوعیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ نئے لکھنے والے اس اعتبار سے پچھلے عہد سے بہتر ہیں۔ ان کا Expression زندہ اور Potent ہے۔ مگر میں یہ ضرور محسوس کر رہا ہوں کہ یہ کہنا تو ضرور کچھ چاہتے ہیں مگر ابھی تک اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ایک چھٹپٹاہٹ سی، ایک اُلجھاؤ سا محسوس ہوتا ہے۔''

''اختر صاحب! ایک زمانے میں خود آپ کی نظموں کو لوگ اُلجھا ہوا اور ابہام زدہ کہتے تھے، سردار جعفری تو فیض میں بھی ابہامی رجعت پسندی کے درشن کرتے تھے۔ آپ نے ''یادیں'' کے دیباچے میں پڑھنے اور سننے کی شاعری کے فرق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن آج آپ کی نظمیں کئی کئی معنوی سطحوں کے ساتھ صاف، سہج اور بنا اُلجھاؤ کے نظر آتی ہے۔ کہیں نئے لکھنے والوں کے بدلے ہوئے لہجے، نئی فکریات اور اپنے عہد کی تلاش کے تجربوں کی وجہ سے تو اُلجھاؤ سا اور چھٹپٹاہٹ سی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ بھی ضروری نہیں' ایک عہد کا نیا ذہن، دُوسرے عہد کے نئے ذہن کو نیا سمجھے۔ ہر ترقی یافتہ زبان دس سال میں اپنا رنگ رُوپ بدل لیتی ہے۔ ایلیٹ اِس راز سے واقف تھا۔ اس نے نئے شاعروں کو اُلجھا ہوا کہنے کے بجائے خود اپنی ذہنی کنڈیشننگ کا اعتراف کیا تھا۔''

''نہیں! یہ صحیح ہے میری شاعری بدلی ہوئی تھی۔ عام شاعری کے اعتبار سے یہ غیر رسمی بھی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا' وہ میرے ذہن میں صاف تھا۔ میں Truthfulness in Poetry کا قائل ہوں۔ میں نے زندگی جی تو محسوس ہوا' یہ بہت بے رحم ہے' اس کا حُسن ہی اس کا کرب ہے۔ میں نے چاعری میں کسی قسم کی فراری نقاب نہیں پہنی۔ زندگی کا عرفان ہی زندگی کا امیہ بھی ہے اور زندگی کی تہذیب بھی۔''

''لیکن اختر صاحب! یوں بھی ہوتا ہے۔ آپ انفرادی ردِعمل کے طور پر' کچھ محسوس کر رہے ہیں پر اس' کچھ' کا احساس تو آپ کو ہے۔ لیکن وہ کیا ہے' اس کا کیا رُوپ ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً میں یہاں بیٹھا ہوں، سگریٹ سُلگ رہی ہے، چھت پر پنکھا گھوم رہا ہے، میرے سامنے دُنیا کا گلوب رکھا ہوا ہے، آپ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور ان سب میں گھرا ہوا میں' کچھ' محسوس کر رہا ہوں۔ خدا جانے کیا؟ مگر میں اس احساس کو جس نے میرے اندر ابھی جنم لیا ہے دُوسروں تک اسی صورت میں منتقل کر دینا چاہتا ہوں۔ ہر ادیب زبان کے وسیلے سے ہی اپنی تلاش کرتا ہے۔ لیکن زبان ہی جو متعین تصویروں کے البم سے مماثل ہے' نئے تجربہ کی بے چہرگی کو چہرہ عطا کرنے میں سب سے بڑی رُکاوٹ بھی ثابت ہوتی ہے۔ سیموئیل بیکٹ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میں اپنی مادری زبان میں اس لئے نہیں لکھتا کہ اس میں لسانی روایات کی وجہ سے نجی تجربوں کا انوکھا پن اور تازگی کا اظہار مشکل ہو جاتا ہے۔ ذہن جب بھی عام سطح سے اوپر اُبھرنے کی کوشش کرتا ہے' زبان کی مروجہ چکناہٹ اور سرلتا اس کا ساتھ چھوڑتی نظر آتی ہے۔ کتابی خیالوں کی بنی بنائی شکلیں ہوتی ہیں۔ لیکن انفرادی احساس نئی صورتیں مانگتا ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے، مگر یہ فوری ردِ عمل ہوا۔ اس کو ذہن میں چھوڑ دیجئے۔ یہ اپنے آپ ہی کچھ وقت میں اپنی صورت، اپنا رشتہ، اپنی سمت لے کر اُبھر آئے گا۔ کوئی خیال ذہن میں آتا ہے تو میں فوراً اس پر نظم نہیں لکھتا۔ وہ 'بات' میں بھول جاتا ہوں، مگر وہ کھوتی نہیں ہے۔ تحت الشعور اپنے کام میں مصروف رہتا ہے۔ ایک غیر شعوری تلاش برابر جاری رہتی ہے۔ ہر موضوع کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کے اظہار کا اپنا انداز، بحر اور لفظیات ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تکمیلی رُوپ کاغذ پر تب ہی اُبھرتا ہے جب موضوع پر پوری گرفت ہوگئی ہو۔''

خدا جانے کیا وقت ہوگیا؟ گھڑی میری کلائی میں بندھی ہے، لیکن میں دانستہ اسے نہیں دیکھتا۔ میں جب بھی گھڑی دیکھتا ہوں، مجھے اس کی دو ننھی سوئیوں کے سامنے اپنی بے مائیگی کا شدید احساس ہونے لگتا ہے۔ اس چھوٹی سی ڈبیہ میں وقت قید ہے اور وقت میں مَیں ..... آدم، حوّا، بدھ، سُقراط، آدرش، تہذیب، فلسفہ! انقلاب، سرحدیں، خون ..... مَیں، مَیں، مَیں ..... اور کاغذ پر ٹنکے ہوئے چھوٹے چھوٹے ہندسے اور ٹِک ٹِک کرتی دو سُوئیاں! آج کا آدمی کتنا چھوٹا ہے۔ مگر آج کا ہی کیوں.....؟

''اختر صاحب! آپ نے ایک بار سردار جعفری کے مکان میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔'' نئی شاعری میں جو آدمی اُبھرتا ہے وہ ٹوٹا ہوا، پلپلا اور لجلجا ہے۔ اِس کے برعکس ہمارے یہاں آدمی کا تصور توانا اور مضبوط ہے۔ توانا اور مضبوط آدمی کا تصور محض رُومانی ذہن کی اختراع ہے، جس کا زندگی کے حقائق سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ آدمی تو خود آپ کی شاعری میں بھی سالم نہیں ہے۔ ہاں 'ترقی پسند شاعری' کی بات اور ہے، جہاں آدرش کے جادُو سے آدمی کو ہرکیولس کے رُوپ میں پیش کیا جاتا ہے۔''

پہلی بات میں نے ضرور کہی ہوگی، لیکن دُوسری بات شاید میں نے نہیں کہی۔ آج کا آدمی واقعی ٹوٹا، پھوٹا، پلپلا اور لجلجا ہے۔ لیکن یہ آج کی سچائی بھی ہے۔ دراصل مادّی اسباب آدمی کا ذہن بناتے ہیں۔ کھلا ماحول، بڑے بڑے گھر، پھیلے ہوئے آنگن۔ اُسی اعتبار سے آدمی بھی کھلا ہوا ہوتا تھا۔ آج کے چھوٹے چھوٹے کابکوں میں آدمی بھی سکڑا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ آدمی واقعی ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ اس کے پاس کسی قدر کا سہارا بھی نہیں۔ ہر دَور کے ساتھ پچھلا دَور مر جاتا ہے۔ نئے لوگوں کا اپنا اظہار ہوتا ہے، اپنے مسائل ہوتے ہیں، جو میں نے کہا ہے وہ نئی نسل نہیں کہہ سکتی۔ فہم و ادراک بھی آگے بڑھا ہے۔ حقیقتوں کو بوجھنے کے انداز بھی نئی دریافت ہوئے ہیں۔ یہ لوگ صحیح معنی میں دیانت داری سے لکھ رہے ہیں۔ مگر میں اپنی بات پھر دُہراؤں گا۔ یہ خود اپنی تلاش کی منزل میں ہیں۔ ان میں انتشار ہے، جسے بکھراؤ نہیں کہا

جا سکتا۔ بلکہ یہ بھی ایماندارانہ تلاش کی چھٹپٹاہٹ ہی ہے۔ یہ دریافت کی منزل بہت کٹھن بھی ہے۔ اس سے کامیابی سے گذر جانا ہی بڑی بات ہے۔ نئے شاعروں میں باقر مہدی، قاضی سلیم، ندا فاضلی، محمد علوی، شہریار، عادل منصوری اور بہت سے ہوں گے۔ اپنے تئیں اس منزل کو سَر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے تو مجموعے بھی آ چکے ہیں۔ باقر مہدی کا ''کالے کاغذ کی نظمیں''، علوی کا ''خالی مکان''، ندا فاضلی کا ''لفظوں کا پل''، شہریار کا ''اسم اعظم'' وغیرہ۔

اختر الایمان نے اپنی ایک نظم میں نئے شاعروں کو موضوع بنایا ہے۔

سخنوروں پہ میں روؤں کہ جن کے سامنے وقت
تمام مسئلے بے جان ہیں سوا اس کے
جو چائے خانوں سے چھوٹیں تو بھوکی آنکھوں سے
زنانِ شہر کے پستان ناپیں یا اپنے
اکیلے بیٹھے ہوئے زیرِ ناف بال گنیں
ملائکہ مری آواز سُن رہے ہو تم .... ؟

●●

جاں نثار اختر

رتلام کے مشاعرے کے اسٹیج پر سمٹا سمٹایا ایک جسم، آنکھوں میں نیند، بالوں میں نیند، لباس میں نیند، آواز میں نیند، آپ ہی آپ زیرِ لب مسکرانا، پھر گردن جھکا کر کچھ سوچتے رہنا یا آنکھیں سکوڑ کر پلکیں جھپکاتے رہنا، سب سے الگ تھلگ خاموش، پڑھنے کھڑا ہوتو اتو آنکھیں بند کیے لگا تار پڑھے جارہا ہے۔ ہر لفظ کو ربر کی طرح دبا دبا کر اتنا کھینچ رہا ہے کہ ہر مصرع لمبائی میں دوگنا زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ میم، نون، دال اور لام کی آوازیں خاص طور سے پھرکی کی طرح گھوم رہی ہیں۔ دانتوں اور ہونٹوں کے بے شمار کچوکے کھائے ہوئے شعر کھلی ہوا میں آتے ہی ڈھیر ہوتے جارہے ہیں۔

شاید پندرہ سال پہلے جاں نثار اختر کو دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ اس کے بعد وہ بار بار نظر آتے رہے۔ کبھی کسی شہر کی سڑک کے فٹ پاتھ پر سر جھکائے گذرتے ہوئے، کبھی کسی ادبی نشست کے کسی کونے میں گم سم سگریٹ پھونکتے ہوئے کبھی کھلے گریبان میں ایک ہاتھ ڈالے اور دُوسرے ہاتھ سے چہرے پر آتے ہوئے بالوں کو سنبھالتے ہوئے' لیکن ہر جگہ وہی بے خبری، وہی کھویا پن۔ پہلی بار اُنھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اُنھیں کچی نیند سے جھنجھوڑ کر زبردستی محفل میں لاکر بٹھا دیا گیا ہو.... اور سر جھکائے وہ بھی سوچ رہے ہیں، زیرِ لب مسکرا بھی رہے ہیں، شعر بھی سنا رہے ہیں...... اور اِن تمام خارجی حرکات کے ساتھ اپنی نیند بھی برابر پوری کیے جارہے ہیں۔

سروینیٹر نے ایک جگہ کہا ہے۔

''...... خدا اس کی رُوح کو اپنی رحمتوں سے نوازے جس نے اس شعور بھری دُنیا میں نیند کو دریافت کیا۔ نیند انسانی دُکھوں کا کتنا آسان علاج ہے۔ بھوک میں خوراک، پیاس میں پانی، جاڑے میں آگ، جلتی دُھوپ میں ٹھنڈک۔ دُنیا کی وہ کون سی نعمت ہے جو اس طلسمی سکّے سے حاصل نہیں کی جاسکتی...''

جاں نثار اختر کی بے خبری کبھی کبھی لطیفہ کا رُوپ بھی لے لیتی ہے۔ ایک بار باندرہ سے ٹیکسی میں آٹھ دس روپے خرچ کر کے آئے' ہاتھ میں دو پوسٹ کارڈ تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اُس وقت آنے کا مقصد صرف اُن خطوط کو بھنڈی بازار سے پوسٹ کرنا تھا۔ باندرہ سے بھنڈی بازار تک کئی چھوٹے بڑے ڈاکخانے بھی ہیں مگر اس کی اطلاع مکتبہ جامعہ جیسے محض ادبی ادارہ کو کیسے مل گئی۔ اختر صاحب اپنی اس بے خبری پر خود شرمندہ ہونے کے بجائے اس مسئلہ پر دیر تک سوچتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد وقت پوچھ کر

گیارہ بجے رُخصت بھی ہو گئے۔ مکتبہ جامعہ دوپہر کو لنچ ٹائم کے لئے ڈیڑھ بجے بند ہوتا ہے۔ مکتبہ جامعہ کے منیجر صاحب ڈیڑھ بجے نیچے اُترے تو فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبے کے قریب اختر صاحب کو ہی کھڑے ہوئے دیکھا تو تعجب ہوا۔

''اختر صاحب! آپ ابھی تک یہاں!؟''

''ہاں بھئی، میں سوچ رہا ہوں کہ ٹریفک بند ہو تو سڑک پار کروں۔ ٹریفک بند ہونے میں نہیں آرہا۔''

کچھ لوگ اینٹ پتھر سے تحفظی سمجھوتہ کر لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ انہیں کھردری حقیقتوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے کو اپنا مقدر بنا لیتے ہیں۔ لیکن انسانی برادری میں ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے' جو باہری شور وغل سے بے تعلق ہو کر خود اپنے اندر ایک دُنیا تخلیق کر کے اُسی میں رہنے بسنے لگتا ہے' لیکن صوفیوں اور سنتوں کی آکار میں نراکار کے درشن والی منزل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ اپنے اپنے اعصابی نظام اور انفرادی ارادے کی نوعیتوں کا فرق ہے۔ زندگی بسر کرنے کے اپنے اپنے ڈھنگ، جاں نثار اختر بھی اپنی داخلی دُنیا کے باسی ہیں۔ اِس دُنیا کو اُنھوں نے بیتے ہوئے دِنوں کی ملاحت اور کھوئی ہوئی راتوں کی صباحت کی خوب صورت یادوں کے سہارے نئے سرے سے تعمیر کیا ہے۔

اِن یادوں میں Thoughts recolleted in tranquality والا انداز ہے اور نہ وہ تجزیاتی تیور ہیں' جن کی جھلک اختر الایمان کی کچھ نظموں میں ملتی ہے۔ جاں نثار اختر کی ''یادیں'' جذبات کی اوپری سطح کے رُومانی رنگوں سے رنگی ہوئی ہیں۔ یہاں بدلتے وقت کی نہیں، بلکہ تصور کی حکمرانی ہے۔ جب ذرا گردن جھکائی..... کوئی چیز دُور ہو کر کتنی خوب صورت ہو جاتی ہے۔ جاں نثار اختر اپنے ماضی سے جتنے دُور ہوتے جا رہے ہیں' وہ ذہنی طور پر اس سے اُتنے ہی قریب بھی ہو رہے ہیں۔ نئے نئے رنگوں اور روشنیوں کا اِس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اِس دُنیا کی ایک جھلک خود شاعر کے لفظوں میں دیکھیے۔

وہ خوش پوش زہرہ جبینوں کے بلّے
بنارس کی ساڑی کے زر تار پلّے

ورق دار پیڑوں سے اُبھرتے وہ کلّے
وہ چوڑی کے ٹکڑے، وہ چاندی کے چھلّے

جو ملتے تھے ہم کو بطورِ نشانی
بہت یاد آتی ہیں باتیں پرانی

جھلانا حسینوں کو باغوں میں جھولے
اُنھیں شوق کوئی بہانے سے چھولے

پھسلتے وہ شیشم کی پٹری پہ کولہے
ہوا میں وہ آنچل کے اُڑتے بگولے

بسنتی ، گلابی ، ہرے ، زعفرانی
بہت یاد آتی ہیں باتیں پرانی

کتنی چھوٹی سی پُرسکون دُنیا ہے یہ.... افسانوی پریوں کی بستی کی طرح معصوم، شوخ اور رنگین۔ نہ بھاگتے پہیوں کا شور، نہ چڑھتے سورج کی جھلس دینے والی دُھوپ۔ جاں نثار اختر کی شاعری اِسی دُنیا کی سیاحت کی دِل چسپ داستان ہے، جسے وہ بار بار نئے انداز سے دُہراتے رہتے ہیں۔ اِس داستان کے مرکزی کردار تو اپنی چال ڈھال کے اعتبار سے روایتی ہی ہیں۔ جن کا رُوپ جو فارسی سے ہوتا ہوا اُردو میں آیا ہے۔ عشق کے بھی وہی روایتی تیور جو اختر شیرانی اور جوش سے ہوتے ہوئے اُن تک پہنچے ہیں۔

قدموں میں ہے آج تختِ جمشید
ٹھوکر میں ہے آج تختِ طاؤس

اے دوست ترے بغیر کیا ہے
یہ نام و نمود و ننگ و ناموس

لیکن ماحول کی جزئیاتی عکاسی اور خوب صورت منظر نگاری نے اس میں ایک خاص قسم کا معصوم بھولپن اور رُومانی تحیر پیدا کر دیا ہے۔ یہ کیمرہ آرٹ اُردو مثنوی میں بہت پہلے سے رائج ہے۔ اردگرد کے ماحول کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ جاں نثار اختر نے محسوس کم کیا ہے اور دیکھا زیادہ ہے۔ اِن کے چیزوں کے دیکھنے کے ڈھنگ میں ایک نیا پن ہے، وہ بار بار کے دیکھے ہوئے مناظر کو جھاڑ پھونک کر کچھ اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ انہیں دیکھنے سے طبیعت اوبتی نہیں۔ جاں نثار اختر کی بیشتر اچھی نظموں میں لوک گیتوں کی سی شانت اور نرمل فضا ملتی ہے۔ کھلے ہوئے نیل

آکاش اور پھیلی ہوئی ہری ،بھری دھرتیوں کا رُوپ' یہ شاعری فرد اور زمین کی جذباتی قربت کی پیداوار ہے' لیکن عام طور سے جزئیات نگاری فہرست سازی معلوم ہوتی ہے۔ ہر تصویر اِکہری اِکہری ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی لفظ بھی اپنے متعین معنی سے ہٹ کر کسی دُوسری طرف ذہن کی رہنمائی نہیں کرتا۔ لیکن اختر کے بنے سنورے لہجہ کی زمینی غنائیت اپنے اندر بڑی مقناطیسیت چھپائے ہوئے ہے۔ ''گرلس کالج کی لاری'' سے '' آخری ملاقات'' تک جاں نثار اختر کی شاعری ایک ایسے البم سے مماثل ہے، جس میں نئے زاویوں سے اُتاری ہوئی اَن گنت خوب صورت تصویریں آج بھی اپنی زمینی حرارت کے ساتھ زندہ ہیں۔ یہ ساری تصویریں اُس تہذیب کی جھانکی پیش کرتی ہیں جو ہمارے لئے گذرے ہوئے دِنوں کی داستان بن کر رہ گئی۔

اِک ٹوٹی رسّی جھولے کی
اک چوٹ کسکتی کولہے کی

اِک کھوئی کڑی افسانوں کی
دو آنکھیں روشن دانوں کی

اِک سُرخ دُلائی گوٹ لگی
کیا جانے کب کی چوٹ لگی

کوئی اِک طرف کو سمٹتی ہوئی سی
کنارے کو ساری کے بٹتی ہوئی سی

یادِ ماضی میں یوں خیال ترا
ڈال دیتا ہے دِل میں اِک ہلچل

دوڑتے میں کسی حسینہ کے
جیسے آجائے پاؤں میں آنچل

''اختر صاحب! سامنے دیوار پر جو تصویر لٹکی ہے' اُس کے ہلکے ہلکے رنگ اِس وقت آنکھوں کو بڑے اچھے لگ رہے ہیں۔ چوڑیاں بھرے ہاتھوں میں گاگر لٹکائے ایک جوان لڑکی ، جھکے ہوئے خوبصورت کندھے، سڈول بازو اور سوچتی ہوئی آنکھیں .... لیکن اِس تصویر کی سماجی افادیت ....'' میرا جملہ

پورا ہونے سے پہلے ہی اختر صاحب مڑ کر تصویر کو دیکھنے لگے۔

"کون سی تصویر.....! ارے توبہ..... مجھے تو ابھی آپ ہی کے کہنے سے معلوم ہوا کہ یہاں کوئی تصویر بھی لٹکی ہے۔ خُدیجہ (جاں نثار اختر کی بیوی کا نام) کے بھائی کو تصویریں بنانے کا شوق ہے۔ شاید یہ بھی اُنھیں کی بنائی ہوئی ہے، اُنھوں نے ہی اِسے یہاں لٹکا دیا ہوگا۔"

"لیکن آپ تو آرٹ میں سماجی مقصدیت کے قائل ہیں..."

"یہ صحیح ہے۔ جو فن سماج کی بہبودی اور بھلائی میں معاوِن ثابت نہ ہو میں اُسے فن ماننے کو تیار نہیں۔"

"لیکن آپ کے فلیٹ کی دیوار پر لٹکی ہوئی یہ تصویر جسے آپ نے بھی آج پہلی بار دیکھا ہے' اِس سے سماج میں کون سی بھلائی ہو رہی ہے؟ گھر کی سجاوٹ ضرور ہو رہی ہے، دیوار بھری بھری لگ رہی ہے، دیکھنے والوں کو بھی اچھی لگتی ہے....."

"مگر ہر تصویر ایسی نہیں ہوتی۔ اِسی آرٹسٹ کی ایک اور تصویر ہے' جو مجھے بہت پسند ہے۔ اُس میں نہرو کے چہرے میں ہندوستان کے تمام مسائل کو رنگوں کے شیڈس سے اُبھارا گیا ہے۔ اُس میں ایک عجیب سا تاثر ہے۔"

لیکن ہندوستان کے تمام مسائل آج بھی وہی ہیں۔ بھوک، بے روزگاری اور سرمایہ داری کی لعنتیں دِن بدن پنپتی جا رہی ہیں۔ اِن لعنتوں سے لڑنا انسانی اور سماجی فرض ہے' لیکن اِس کے لئے فنونِ لطیفہ کی جگہ عملی تگ و دَو کے تیز دھار آلات کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں آرٹ اور ادب کے کسی بِل پر منطقی بحث کرنے اور اِسے پاس کرانے والا کارپوریٹر بہت سی نظموں اور تصویروں سے زیادہ سماج کا کام کرتا ہے۔ جنگِ آزادی میں غالب کی غزلوں سے لڑائی نہیں لڑی گئی۔ اِس کے لئے ظفر کو تلواروں کا سہارا لینا پڑا تھا۔"

"ادیب اور شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں۔ میں خود مزدُور جیسی نہیں گذار سکتا۔ اُن کے درمیان کام بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن میری ہمدردیاں فن میں شامل ہونی چاہئیں۔ اِس کے لئے سماجی شعور کی بیداری کی شرط ہے۔ میں نے خود کبھی مزدُوری نہیں کی۔ لیکن میں اپنے علم کے ذریعہ اُن کی اُلجھنوں سے واقفیت حاصل کر سکتا ہوں' اُلجھنوں کا حل سجھا سکتا ہوں۔ فن کا مقصد ضرور ہونا چاہیئے۔ بے مقصد ادب ذاتی ردِعمل، جنسی گھٹن اور لاشعوریت کے اندھیروں میں بھٹک جاتا ہے۔ فن کار کے لئے عصری شعور کی گرفت ضروری

ہے۔''

''لیکن اختر صاحب! عصری شعور سے آپ کی کیا مراد ہے؟ عصری شعور تو اشیاء کے خارجی اشکال کے پیچھے جو صورتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں' اُن کی پہچان سے پیدا ہوتا ہے۔ اس شعور تک پہنچنے کے لئے کسی عقیدہ کی رہنمائی نہیں' تجربہ کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ قول وفعل کا توازن بھی فن کی بُنیادی شرط ہے۔ ادیب اپنے آپ سے الگ ہو کر اچھے ادب کی تخلیق کر سکے۔ اِس میں مجھے شک ہے۔ الفاظ اور شاعر کا رِشتہ معمار اور اینٹوں، بڑھئی اور لکڑی کے رِشتے سے مختلف ہے۔ لغت کی منطقی گرفت الفاظ سے اُن کی آب وتاب چھین لیتی ہے۔ زندہ الفاظ شخصیت کے نہاں خانوں کے گواہ ہوتے ہیں اور شخصیت کے نہاں خانے شعور کی سرحد سے باہر کے مقامات ہیں۔''

''درست ہے' تخلیقی عمل میں فن کار اگر زیادہ منطق زدہ ہوتا ہے تو فن کمزور ہو جاتا ہے۔ لوک گیتوں کی تخلیق کسی ضابطے کے تحت نہیں ہوئی۔ لیکن ہر شاعر کا اپنا مخصوص مزاج بھی ہوتا ہے۔'' آخری ملاقات'' جسے میں اپنی بہترین نظموں میں شمار کرتا ہوں' ۱۰۵ رڈگری بخار میں کہی گئی ہے۔ میں بے ہوشی کے عالم میں شعر کہتا جارہا تھا۔ ہاں' یہ ضرور ہوا کہ بعد میں میں نے اُسے ایڈٹ کر کے ایک رُوپ دے دیا۔ فرد سماج میں رہتا ہے۔ وہ سماج سے متاثر بھی ہوتا ہے' اُس کی شخصیت میں یہ تاثر رَچ بس جاتا ہے۔ اپنی بیوی کے انتقال پر میں نے جو نظم'' خاکِ دِل'' کے عنوان سے کہی ہے۔ اس میں ایک جگہ غیر شعوری طور پر یہ مصرعے بھی آ گئے ہیں۔

آج سوتا ہی تجھے چھوڑ کے جانا ہوگا
ناز یہ بھی غمِ دوراں کا اُٹھانا ہوگا

میں خود بھی تھوڑا انقادر ہا ہوں' نو سال تک پڑھایا ہے۔ اِن مصرعوں میں سماجی شعور کی چھاپ ہے' لیکن اِس کے باوجود یہ تاثر سے عاری نہیں ہیں۔''

''لیکن مجھے تو یہ مصرعے غمِ دوراں اور غمِ جاناں والے ترقی پسند فارمولے کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ نظم کا کیونکہ آپ کے ایک المیہ سے تعلق ہے' اِس لئے آپ اِس میں تاثر محسوس کر رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اختر صاحب! آخر سماجی مقصدیت پر اِتنا زور دینے کی ضرورت کیوں، سماجی مقصد سے کیا مراد ہے؟ فرد سماج سے الگ کب ہے سماج تو آخری سانس تک فرد کے وجود میں سانس لیتا رہتا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود انسان اور مشین میں فرق ہے۔ اِس اتفاقات کی دُنیا میں شخصی مقدرات ہی

خارجی حقائق سے ہمارے رشتوں کی نوعیت متعین کرتے ہیں۔

ہمارے ردِ عمل کے زاویے بھی اسی لحاظ سے ایک دُوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک سے نتائج کی توقع صرف مشین ہی پوری کرسکتی ہے۔ ادب میں سماج کی تلاش شخصیت کی روشنی میں ہی ممکن ہوسکتی ہے۔ ترقی پسند تنقید اشیاء و واقعات کے خارجی ناموں پر زیادہ زور دیتی رہی ہے۔ وہ الفاظ کی لغوی سطح سے نتیجے اخذ کرتے تھے۔ اُن کے اِردگرد اور اُن کے اندر نہیں جھانکتے تھے۔ سماجی مقصد بھی اسی طرح کی ایک میکانکی اصطلاح ہے۔ آج کل نئی نظم کو جو مبہم اور بے مقصد کہہ کر نظر انداز کیا جارہا ہے' اُس کی بھی یہی وجہ ہے۔ ایک خاص قسم کے کتابی سماج کا تصور اور اِس کی پرکھ کا غیر ادبی طریقہ ہی اِس کی بُنیاد ہے۔ اِس لحاظ سے تو مجھے مجاؔز کے یہ مصرعے بھی نہایت اُلجھے ہوئے لگتے ہیں۔

اِیک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملاّ کا عمامہ ' جیسے بنیئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی ' جیسے بیوہ کا شباب

محل کی آڑ سے نکلتا ہوا آفتاب .... پیلا کیوں؟ اور پھر پیلے ماہتاب میں اور ملاّ کے عمامے اور بنیئے کی کتاب وغیرہ میں کیا مماثلت ....؟"

"کیوں مماثلت کیوں نہیں ہے؟ ملاّ کا عمامہ پیلے رنگ کا ہوتا ہے، بنیئے کی کتاب بھی زرد ہوتی ہے اور ...."

"تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ مجاؔز نے اک خاص رنگ کو بُنیاد بنا کر اِن بے ترتیب امیجز میں ربط پیدا کیا ہے۔ اِس سے تو معنی صاف نہیں ہوتے اور پھر اِس کے علاوہ ملاّ کا عمامہ زرد ہو یہ بھی ضروری نہیں، بنیئے کی کتاب کا رنگ تو ہر جگہ سُرخ ہوتا ہے اور بیوہ کا شباب تو بہت چڑھتا ہوا ہوتا ہے۔"

"جی نہیں، امیجری نظم میں اِس لئے استعمال کی جاتی ہے کہ وہ نظم کے تاثر کو بڑھائے، موضوع کو اور زیادہ پھیلا کر واضح کرے اور خوب صورت بنائے۔ مجاؔز کے یہ مصرعے نظم میں ابہام پیدا نہیں کرتے بلکہ نظم کے موضوع کو اور تاثراتی شدت عطا کررہے ہیں۔"

"لیکن اختر صاحب! امیجری فرد کے ذہنی بکھراؤ کی اشاراتی زبان ہوتی ہے' جہاں داخل اور خارج کی متضاد سمتیں ایک دُوسرے سے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ امیج کا چہرہ اوپر نہیں اس کے اندر ہوتا ہے۔ اس کی اوپری سطح تو محض ایک نقاب کا کام کرتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مجاؔز ان تین مصرعوں میں

ایک سچے آرٹسٹ کی طرح غیر شعوری طور پر خود کو برہنہ کیے ہوئے ہے۔ ان میں جسِ مجاز کی تصویر اُبھرتی ہے' یہ وہ نہیں ہے۔ جو محفل میں قہقہہ بن کر فیشنی رِجائیت کا ثبوت دیتا تھا۔ بلکہ یہ مجاز کا وہ رُوپ ہے' جو جنسی نا آسودگی، مذہبی اجارہ داری اور اقتصادی بدحالی کی تہہ در تہہ پیچیدگیوں کی وجہ سے مذاقِ طرب آگیں کا شکار بن چکا تھا۔ نظریاتی تنقید ادب کو شخصیت سے بے تعلق کر کے سمجھنا چاہتی ہے۔ اِس طرزِ عمل سے الفاظ کے لغوی معنی تو ہاتھ آجاتے ہیں' مگر ان کے اندر چھپے ہوئے زندہ ڈرامے، جو ان الفاظ کی زندگی کی ضمانت ہیں اُن تک رِسائی نہیں ہو پاتی۔ پچھلے تیس سال میں اُردو میں جو تنقیدی ادب سامنے آیا ہے' اِس سے آپ کہاں تک متفق ہیں؟''

''میں اُردو کے موجودہ تنقیدی سرمائے سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ ہمارے بیشتر اچھے تنقیدی مضامین اکیڈمک انداز میں بحث کرتے ہیں۔ وہی آزادی کی لڑائی، اقتصادی بدحالی، سماج کا طبقاتی نظام وغیرہ۔ نقادوں کو گنتی کے چند ناموں کی فہرست سے سروکار ہوتا ہے۔ اس کے آگے وہ بات نہیں کرتے۔ اُن کی رائے عام طور سے کلرڈ ہوتی ہے..... کلرڈ یعنی...... خیر اُردو کا کوئی مناسب لفظ نہیں مل رہا۔ آپ شاید جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ ادب کو بھی میکانکی پیمانوں سے جانچنا پرکھنا چاہتے ہیں۔ ہر آنکھ پر شیشہ چڑھا ہوتا ہے۔ یہ روِش تخلیق اور تخلیقی عمل سے ناواقفیت ظاہر کرتی ہے۔ شاعری میں لب و لہجہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اِس کی اپنی نفسیات ہے لیکن اِس طرف ہمارے نقادوں کا دھیان ہی نہیں جاتا۔''

''اختر صاحب! آپ کی شاعری کی کلاسیکی نغمگی، لہجے کا دھیمہ پن، جانا پہچانا ماحول، زمین اور فرد کی جذباتی قربت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو بڑے صنعتی شہروں میں جہاں زمینوں کو بھاگتے ہوئے پہیئے ناپتے ہیں، شاید ممکن نہیں۔ لب و لہجے کا سمبندھ زمین سے بھی گہرا ہوتا ہے۔ گیت زراعتی نظام کی دین ہیں۔ کھیتوں کی ہریالی اور پگڈنڈیوں کے موڑوں سے الگ رہ کر یہ زندہ نہیں رہ پاتا۔''

''یہ درست ہے' میں پچھلے سترہ سال سے بمبئی میں مقیم ہوں۔ لیکن آج بھی بمبئی اجنبی محسوس ہوتی ہے۔ باندرہ سے دادر تک چلے جایئے، ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا جو آپ کو جانتا ہو۔ اس کے برعکس گوالیار اور بھوپال اتنی مدت کے بعد بھی اب تک اپنے سے لگتے ہیں۔ جدھر بھی نکل جایئے، جانے پہچانے راستے اور مانوس چہرے نظر آتے ہیں۔ سماج میں ہمارے آپسی رشتے فن پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ چھوٹی بستیوں میں خلوص ہوتا ہے... وہ پختہ مکانوں میں نہیں۔ بڑے شہروں میں کہاں میسّر۔ وہ مروتیں، وہ شرافتیں، وہ تہذیب یہاں نہیں ملتی۔ اس زندگی کی بات ہی اور ہے۔ میں نے ۹ر سال پروفیسر

کی حیثیت سے گذارے ہیں۔نئی نسل سے ہر وقت ربط رہتا تھا۔ یہ ایک بڑی نعمت ہے۔ نئے لوگوں میں آپ بھی اپنے آپ کو نیا اور شگفتہ محسوس کرتے ہیں۔ میرے ذہن وفکر کی نرمیاں اِسی ماحول کی دین ہیں۔ میری شاعری میرے شخصی واردات کی ترجمان ہے۔ میں بُنیادی طور پر رُومانی شاعر ہوں۔ بمبئی میں میں نے دو ایک طویل سیاسی نظمیں کہی تھیں' لیکن میں نے محسوس کیا۔ اِس کی نظمیں مجھے مطمئن نہیں کرتیں۔ اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ خطابیہ انداز یا گرجدار لہجہ میرے یہاں نہیں ہے۔ میری شاعری میں تنوع ہے۔ میں نے خاص نیچرل نظمیں بھی کہی ہیں۔ کہیں صرف لفظوں میں مصوری کی ہے، کہیں موضوع کو نفسیاتی سطح پر چھوا ہے۔ میری شاعری میں سماجی شعور بھی ہے لیکن اِس پر رُومان کی پرچھائیں پڑتی نظر آتی ہے۔ میرے معاصرین میں مجازؔ، جذبیؔ اور فیضؔ کے یہاں بھی کلاسیکی رچاؤ ملتا ہے۔ شاعری کے لئے عصری شعور کی بہت سخت ضرورت ہے۔ جس کے بغیر فن نقالی بن جاتا ہے۔ بہزادؔ، ماہر القادریؔ وغیرہ بھی تو آج کے شاعر ہیں۔ لیکن کیا آپ انھیں اچھا شاعر کہیں گے...''

''اختر صاحب! آج کل آپ بہت کم کہہ رہے ہیں۔''

''ہاں' بہت کم کہہ رہا ہوں۔ فلمی مصروفیات فرصت دیں تو آدمی سوچے، غور کرے۔ فلم کے لئے گیت لکھنے پڑتے ہیں۔ وقت پر دینے ہوتے ہیں۔ کبھی گیت لکھنے میں کوئی اچھا خیال سوجھتا بھی ہے تو اُسے ٹالنا پڑتا ہے۔ چھوٹی نظمیں ہو جاتی ہیں۔ لیکن طویل نظموں کے لئے جو سکون اور فرصت درکار ہے' وہ اب کہاں۔''

●●

ناخدائے سخن.... نوح ناروی

''اعجازِ نوح'' نوح ناروی کا تیسرا دیوان ہے۔ اس میں اُن کی ایک تصویر ہے۔ وہ کامدانی کی شیروانی میں ملبوس، ہاتھ میں چھڑی لئے بیٹھے ہیں۔ اُن کے دائیں، بائیں دو نوجوان کھڑے ہیں۔ تصویر کے نیچے ایک شعر ہے۔

اے نوح! آس پاس مرے فرخ و سعید
دائیں طرف سہیل ہیں، بائیں طرف مجید

یہ فرخ و سعید اُن کے نواسے تھے، جو خود بھی شعر کہتے تھے۔ ان میں چھوٹے سہیل تو آخری عمر کے ہر مشاعرے میں اُن کے ساتھ ہوتے تھے۔ اعجازِ نوح سے پہلے نوح صاحب کے دو دیوان'' سفینۂ نوح'' اور طوفانِ نوح'' کے نام سے شائع ہو چکے تھے۔ ان میں ہر دیوان الف سے ےتک کی ردیفوں سے مکمل ہے۔ اور ضخامت کے لحاظ سے بھی سیکڑوں غزلوں پر مشتمل ہے۔

میں نے انھیں اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ اپنے گھر میں اُس وقت وہ بالکل ویسے ہی تھے جیسے اعجازِ نوح کی تصویر میں نظر آتے ہیں۔ میرے والد ذُعاذ بابُوی اُن کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں تھے۔ اور اُن کے بعد اُن کے سند یافتہ جانشین بھی تھے۔ اُن دنوں اُستادی، شاگردی محض ایک روایت ہی نہیں تھی۔ رشتے کی عقیدت بھی تھی۔ اپنے اُستاد کے ساتھ اُن کی عقیدت میرے بچپن کی ایک ایسی یاد ہے جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

میری والدہ نے میری بڑی بہن کے لئے اپنی بڑی بہن کے منجھلے بیٹے کا انتخاب کیا تھا۔ منگنی کی رسم کے لئے لڑکے کے ساتھ اُس کی ماں دہلی سے گوالیار آئی تھی۔ رسم کی ایک رات پہلے گفتگو کے دوران اُس لڑکے نے دہلی کے کسی مشاعرے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ نوح صاحب کو پسند نہیں کیا گیا۔ اور میں نے اور میرے ساتھیوں نے خوب ہُوٹ کیا۔ اپنے ہونے والے داماد کے منہ سے اپنے اُستاد کی شان میں اِس گستاخی پر اُس وقت تو وہ خاموش رہے لیکن دُوسرے دِن انھوں نے یہ کہہ کر منگنی توڑ دی کہ جو لڑکا میرے اُستاد کا احترام نہیں کر سکتا وہ میری بیٹی کے لئے کیسے موزوں ہو سکتا ہے۔ اُن کے اِس فیصلے کو نہ میری ماں کے آنسو بدل سکے نہ لڑکے کی لگاتار معافی نے تبدیل کیا۔ وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔ اور دو زندگیاں قریب آتے آتے مختلف سمتوں میں مڑ گئیں۔ نوح صاحب کو بھی اپنے اُستاد حضرتِ داغ سے بھی

ایسی ہی عقیدت تھی۔

داغؔ صاحب بھی جس کو شاگرد بناتے تھے' اُس سے پہلے اپنے اُستاد ذوقؔ اور ذوقؔ کے اُستاد شاہ نصیر کی فاتحہ دِلواتے تھے۔ اور اُسی کو اپنا معاوضہ ٹھہراتے تھے۔

نوحؔ صاحب داغؔ کے کلام کے حافظ تھے۔ اُنھیں گلزارِ داغؔ، آفتابِ داغؔ، فریادِ داغؔ، مہتابِ داغؔ اور یادگارِ داغؔ پورے کے پورے زبانی یاد تھے۔ داغؔ نے اُن کی یہ خصوصیت دیکھ کر کہا تھا۔ کہ کلامِ الٰہی کے حافظ تو بہت دیکھے تھے' آج کلامِ داغؔ کا حافظ بھی دیکھ لیا۔ نوحؔ صاحب کو کلامِ داغؔ کا علاوہ اور دُوسرے بہت سے اساتذہ کا کلام بھی از بر تھا۔ وہ شعر گوئی کے لئے اِسے ضروری سمجھتے تھے۔ بعد میں وہ خود بھی جسے شاگرد بناتے تھے' اُسے بھی کم از کم پانچ ہزار اشعار یاد کرنے کی مشقت کرواتے تھے۔ اُن کے اِس مشورے کی اہمیت اور منطق پہلے تو سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن بعد میں عمر کے ساتھ اِس کی افادیت کا اندازہ ہوا۔ اُستادوں کے وہ شعر جو زبان و بیان سے درست قافیہ ردیف سے چست ہوتے ہیں' جب دماغ کے کھلنے میں بس جاتے ہیں تو وہ نہ صرف شاعر کی شعری رہنمائی فرماتے ہیں بلکہ اُسے وہ آداب بھی سکھاتے ہیں جو ادب کی تفہیم کی ضروری شرطیں ہیں۔

نوحؔ صاحب کی ولادت نارا کے ایک جاگیردار مولوی عبدالمجید کے یہاں ۱۸ رستمبر ۱۸۸۹ء میں ہوئی۔ لیکن ابھی مشکل کے چار سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والد کی اچانک رحلت اور تین سوتیلی ماؤں کی مسلسل عداوت نے ریاست کو مصیبتوں کا گہوارہ بنا دیا۔ اِن مصیبتوں کو مسرتوں سے بدلنے میں کافی عرصہ بیت گیا۔ اِن کی تعلیم اِنہی اُلجھنوں کا شکار ہوئی۔ حالات جب ہموار ہوئے تو اُنھوں نے اپنی محنت اور مسلسل مطالعے سے اُس کی کمی کو پورا کیا اور اُردو، فارسی میں خاطر خواہ دسترس حاصل کی۔

نوحؔ ناروی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز نثر سے کیا تھا۔ شاعری کی ابتداء سے پہلے وہ دو ناول لکھ چکے تھے۔ ایک ''ثریا'' اور دُوسرا ''ہائے ستم'' ثریا تو چھپ گئی لیکن دُوسرے کی شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی اور اُسے خود ہی پھاڑ کر پھنک دیا۔ اِن دو ناولوں کے علاوہ ایک اور بے نام کتاب ہے جس میں متروک شدہ الفاظ کی طویل فہرست کے ساتھ عروض اور علمِ قوافی کے متعلق بحثیں شامل ہیں۔ یہ کتاب بھی اُن کی شعری مصروفیات کی وجہ سے تین سو صفحات تک نامکمل ہو کر رہ گئی اور شائع نہیں ہو سکی۔

نوحؔ صاحب پابندی سے ایک مقررہ وقت پر شعر کہنے کے عادی تھے۔ یہ وقت مغرب اور عشاء

کے درمیان کا ہوتا تھا۔ شعر کہتے وقت پلنگ یا کُرسی پر دراز ہوتے تھے اور حُقّے کی کشوں کے ساتھ شعر مکمل ہوتے رہتے تھے۔ کبھی کوئی خادم جو اِس کام کے لئے مخصوص تھا، وہ تحریر کرتا تھا اور کبھی وہ خود بار بار اُٹھ کر کاغذ پر اُتارتے رہتے تھے۔ وہ ایک ساتھ ایک ہی زمین میں مطلع اور مقطع کے ساتھ کم سے کم دو تین غزلیں کہتے تھے۔ داغؔ دہلوی کے شاگردوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ اِن میں اِقبالؔ اور سیمابؔ اکبر آبادی بھی تھے۔ جو داغؔ کے شاگرد ہوکر بھی اپنے انداز اور اُسلوب کے لحاظ سے مختلف تھے اور وہ بھی تھے جنھوں نے داغؔ کے رنگِ سخن میں اُستادی کے کمال دِکھائے تھے۔ داغؔ کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ اُس وقت اُن کے شاگردوں میں اُن کی جانشینی کے حق دار بہت سے تھے۔ اُن میں چند اہم نام۔ نارائن پرشاد ہرؔ، وحید الدین، بےخودؔ دہلوی، نسیمؔ بھرت پوری، آغا شاعرؔ، گوہرؔ رام پوری، حُبِ لعل رعدؔ، متینؔ مچھلی شہری، وفاؔ مارہروی، لبھو رام جوشؔ، فضلِ رب باغؔ تھے۔ یہ سب اُستاد شعراء اور کئی کئی مجموعوں کے خالق تھے لیکن سائلؔ دہلوی نے جانشینی کے اِس تاج کے لئے جس شاگردِ داغؔ کا انتخاب کے وہ نوحؔ ناروی تھے۔ سائلؔ نے اپنی تحریری سند میں لکھا تھا:

''میں بہ اعتبارِ صحیح پیروی، مذاقِ سخن، حضرتِ بُلبُلِ ہندوستان آپ کو جاں نشینِ داغؔ سمجھتے ہوئے مبارک باد دیتا ہوں۔''

نوحؔ ناروی اپنی مشاقی اور شعری سرمائے کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ زُود گو تھے۔ جہاں تک ''صحیح پیرویٔ مذاقِ سخن حضرت بُلبُلِ ہندوستان'' کا سوال ہے اِس کے بارے میں اِتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ نوحؔ داغؔ کی شاعری کے اُسی رنگ کے نمائندہ ہیں، جس کی طرف حالیؔ پانی پتی کے اعتراض پر داغؔ نے اِشارہ کیا تھا۔ داغ نے کہا تھا:

''میں نے اپنی شاعری کے ذریعہ صرف قلعۂ معلّیٰ کی زبان کا تحفظ کیا ہے۔ اسی کو اپنی منزل بنایا ہے۔'' لیکن داغؔ صرف زبان و بیان کا چٹخارا نہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ داغؔ کے کلام کا ڈھنگ کا انتخاب ہو سکا اور نہ اُن کی دیگر شعری خصوصیات اُجاگر ہو پائیں۔ نوحؔ نے اس بہت کچھ میں سے داغؔ کی زبان کی فصاحت اور سلاست کو اپنا شعری معیار بنایا اور اسی دائرے میں اُستادی کا کمال دِکھایا۔ داغؔ کی طرح زبان کو زندگی کا آئینہ نہیں بنایا۔ نوحؔ کی شاعری کا مجموعہ زبان کی صناعی ہے۔ محاوروں کی رعنائی ہے اور قافیہ ردیف کی چوکسائی ہے۔

وہ کہتے ہیں آؤ میری انجمن میں' مگر میں وہاں اب نہیں جانے والا
کہ اکثر بلایا ، بلا کر بٹھایا ، بٹھا کر اُٹھایا ، اُٹھا کر نکالا

گو ساتھ اُٹھا ، ساتھ چلا ، ساتھ پھرا میں
سائے کی طرح پھر بھی رہا اُن سے جدا میں

کبھی عشق میں انقلاب ایسا آئے ، محبت کبھی یہ تغیر دِکھائے
بدل جائے دِل اور دِل ہو بدل کر' ہمارا ، تمہارا ، تمہارا ، ہمارا

جو وہ غم نہ رہا تو دِل نہ رہا' جو وہ دِل نہ رہا تو وہ ہم نہ رہے
جو وہ ہم نہ رہے تو وہ تم نہ رہے' جو وہ تم نہ رہے تو مزہ نہ رہا

نوحؔ صاحب اپنے رنگِ سخن کے ہی اُستاد نہیں تھے' اُن کے پڑھنے کا انداز بھی اُستادانہ تھا۔ وہ بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ آواز زیادہ بھاری نہیں تھی۔ لیکن ہاتھوں کے اِشاروں ، آنکھوں کے گھماؤ کے ساتھ مصرعوں کو مناسب جگہوں پر ٹھہرا کر آگے بڑھاتے تھے۔ ردیف و قافیہ بولتے ہوئے ہوتے تھے۔ دُوسرا مصرع آدھا ہی پورا ہوتا تھا کہ سامعین باقی کا حصہ بے ساختہ بول پڑتے تھے اور داد کے شور میں نوحؔ صاحب بار بار گردن گھما گھما کر ہاتھ کو ماتھے سے لگاتے نظر آتے تھے۔ رواں دواں چست مصرعے ، کھنکتے ہوئے قافیے ، شگفتہ ردیفوں ، سہل ممتنع کا اعجاز اور اس پر شعر کو تصویر بنا دینے کا انداز ، دیکھتے دیکھتے مشاعرہ میں ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔ پہلے کے اُستاد صرف کلام کی ہی اصلاح نہیں کرتے تھے۔ شاگردوں کو شعر پڑھنے کے طور طریقے بھی سکھاتے تھے۔ داغؔ صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شعر اِس طرح سناتے تھے کہ شعر زبان سے نکلتے ہی سامعتوں پر نقش ہو جاتے تھے۔ نوحؔ کافی دِنوں حیدر آباد میں داغؔ کے مہمان رہے تھے۔ اُنھوں نے اُستاد کے کلام کو ہی اپنی شعری منزل نہیں بنایا تھا اُن کے تحت لفظ کے انداز کو بھی اپنایا تھا۔ نوحؔ صاحب اپنے انداز اور شعر کی ڈرامائی پیش کش کی وجہ سے مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔

نوحؔ نے داغؔ کی زبان کو زیادہ سلیس اور بول چال کے قریب کیا ہے۔ اُن کی شعری زبان سند کا درجہ رکھتی ہے۔ داغؔ نے اُن کی اِسی مہارت پر اُنھیں ناخدائے سخن کے لقب سے نوازا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں داغؔ نے نوحؔ کے بارے میں لکھا تھا:

'نوح کے کلام کی وقعت عین میرے کلام کی وقعت اور اُن کی عزت عین میری عزت ہے۔ اُنھوں نے ایسی ترقی کی کہ میرے کلام میں اپنا کلام ملا دیا۔ میرے شاگرد اِس بات کا لحاظ رکھیں اور وہ میرے احباب جو میرے کلام کو پسند فرماتے ہیں' اُن کے کلام کو بھی اُسی نگاہ سے دیکھیں۔''

نوح صاحب کی مشاقی کا یہ عالم تھا کہ وہ شعر بھی نثر کی طرح لکھتے تھے۔ایک بار ایک مشاعرہ میں کسی نے اپنی کاپی اُن کے سامنے کرتے ہوئے پتہ تحریر فرمانے کی درخواست کی تھی۔نوح صاحب نے قلم لے کر بنا سوچے ایڈریس کو شعر بنا دیا۔

جو آنا ہے اُن کو تو اے نوح آئیں' طرف ، راستہ ، فاصلہ کچھ نہ پوچھیں
چڑھیں ریل میں اور پہونچیں سراتھوں ، سراتھوں سے نو میل ڈھکن ہے نارا

قدرت نے پیدائش سے رئیس بنایا تھا۔آرام و آسائش کی زندگی کا اثر اُن کی شعر گوئی پر بھی نظر آتا ہے۔جیسا کہا گیا ہے وہ پابندی سے روزانہ شعر کہتے تھے۔شعر بہت تیز کہتے تھے،کبھی اتفاق سے کہیں اٹکتے تھے تو زیادہ اُلجھتے نہیں تھے۔ پہلے مصرع میں سے ہی دُوسرا مصرعہ آسانی سے نکال لیتے تھے اور شعر پورا کر دیتے تھے۔اُن کے اِس طرح کے کچھ شعر یوں ہیں۔

جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے
جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

فکر و تشویش غور عشق میں کیا
فکر تشویش غور کچھ بھی نہیں

جو کچھ بھی ملا ہے' وہ خدا ہی سے ملا ہے
جو کچھ بھی ملے گا وہ خدا ہی سے ملے گا

شروع سے ثقلِ سماعت کے شکار تھے۔ بڑھتی عمر میں اس مرض میں اور اضافہ ہوا۔اپنی کمزور سماعت کی وجہ سے اُنھیں دُوسروں کی سماعتوں پر بھی شک ہونے لگا تھا۔اِسی شک کی بناء پر اکثر شعروں میں وہ ہم معنی الفاظ اس طرح طرح کھپاتے تھے کہ سننے والا چاہے کہیں سے سنے' شعر کا مفہوم واضح ہو جاتا تھا۔اُن کے اِس قسم کے اشعار مشاعروں میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔

آپ بہکانے میں لوگوں کے نہ آیا کیجیے
جانچا ، پرکھا ، دیکھا ، بھالا ، سوچا ، سمجھا کیجیے

عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے
دیکھ ، سُن ، سوچ ، کہا مان ' بہت مشکل ہے

تیری تُند خوئی ، تیری کینہ جوئی ، تیری کج ادائی ، تیری بے وفائی
بلا ہے، ستم ہے، غضب ہے، قیامت ، دُہائی ، دُہائی ، دُہائی ، دُہائی

نوحؔ صاحب کی شعری خصوصیات میں اُن کے مقطع بھی بہت اہم ہیں۔ مومنؔ خاں کے بعد وہ اکیلے شاعر تھے جو اپنے تخلّص کی تلمیحی رعایت سے مقطعوں میں وہ نئے نئے معنی پیدا کرتے تھے۔ اُنھیں اپنی زبان دانی اور داغؔ دہلوی کی تقلید پر فخر تھا۔ ایک مقطع میں اُنھوں نے بڑی خوب صورتی سے اِس کا اِظہار بھی کیا تھا۔

اے نوحؔ! دَمِ طوفانِ سُخن ' جانچیں ، پرکھیں یارانِ سُخن
میں بھی ہوں مقلّد دِلّی کا ' میری بھی زبان ٹکسالی ہے

●●

خُمار بارہ بنکوی

مذاق مذاق میں اُس دِن خُمار صاحب کی شیروانی کے دو بٹن شہید ہو گئے تھے۔ اُس کا مجھے افسوس تھا۔

ہوا یوں' راجستھان کے خوب صورت شہر اُودے پور میں مشاعرہ تھا۔ کچھ شاعر آ چکے تھے کچھ آنے والے تھے۔ میں ہوٹل کے ایک کمرہ میں ہندی، اُردو کے مقامی ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے بات چیت میں مصروف تھا کہ اتنے میں ایک بلند قامت موٹا تازہ شخص پولس آفیسر کی وردی میں اندر داخل ہوا اور مجھ سے نہایت بے تکلفی سے تُو تکار کے لہجہ میں بات کرنے لگا۔

''کیوں بھئی' کیسا ہے تُو؟ اچھا ہُوا تُو آ گیا' لگتا ہے مجھے نہیں پہچان رہا بیٹا؟ اب غور سے دیکھ' میں تیرے والد کا دوست ہوں۔ میرا نام احمد جمال ہے۔ ڈپٹی پولس کمشنر احمد جمال۔ تیرا باپ مرا لنگوٹیا یار تھا۔ میں نے تجھے ننگا گھومتے دیکھا ہے۔ سمجھا! (قہقہہ)

احمد جمال کی تُو تکار کا انداز مجھے اچھا نہیں لگا' وہ بھی دُوسروں کے سامنے۔ والد کا حوالہ سُن کر میں خاموش تھا اور یوں بھی وہ اب اتنی دُور جا چکے تھے کہ اُن سے اب کچھ معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جس بچپن کا وہ ذِکر فرما رہے تھے وہ کسے یاد رہتا ہے؟ حالانکہ اس حوالے کے باوجود میں اُنھیں پہچان نہیں پا رہا تھا۔ میرے مدّاحوں کے سامنے اُن کے طرزِ تکلّم نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں اپنے غصے کو چھپانا بھی چاہتا تھا اور اُن پر اپنی اہمیت جتانا بھی چاہتا تھا۔ اچھا ہُوا وہ دو تین چار جملے بول کر چلے گئے۔ میں نے فراغت کی سانس لی لیکن وہ تھوڑی دیر بعد پھر ڈرائنگ رُوم میں نظر آ گئے اور پھر وہی بے تکلفی' اب تبے والی۔ میں نے اُسی دوران کھڑکی سے دیکھا خُمار صاحب کی ٹیکسی ہوٹل میں اندر آ رہی ہے۔ مجھے اچانک ایک چال سُوجھی' میں نے فوراً پلٹ کر جمال سے کہا'' جمال صاحب! اچھا ہُوا آپ آ گئے۔''

''کیوں کیا بات ہے' کیا چاہیے تجھے؟'' اُنھوں نے دریافت کیا۔

بھائی جان مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اِس وقت اسٹیشن پر خُمار صاحب کو آپ کی ضرورت ہے۔ ابھی فون آیا تھا وہ شراب کے نشے میں تھے اور ریلوے پولس نے اُنھیں لاک اَپ میں ڈال دیا ہے۔'' میں نے اُنھیں ٹالنے کے لئے یہ بہانہ تراشا تھا۔

''بدتمیز، گدھے، گنوار، جاہل کہیں کے۔ میں ابھی اُن کو چھڑا کر لاتا ہوں۔'' وہ اول فول بکتے

ہوئے اُلٹے پاؤں لوٹ گئے۔لیکن ابھی وہ مشکل سے زینہ کی ایک دو سیڑھیاں ہی اُتر پائے کہ اُسے میں اُنھیں خُمار صاحب نظر آ گئے۔اُنھیں دیکھتے ہی وہ گھبرائی ہوئی آواز میں اُن سے پوچھنے لگے۔

''کہیئے حضرت!پولس لاک اَپ میں کسی حرام زادے نے آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟'' جمال خُمار کو جانتے تھے'خُمار اُنھیں نہیں جانتے تھے۔خُمار نے اُنھیں اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔''کون سے لاک اَپ کی بات کرر ہے ہیں آپ؟ مجھے خُمار بارہ بنکوی کہتے ہیں۔میں مشاعرہ کے لئے حاضر ہُوا ہُوں۔''

''میں جانتا ہوں قبلہ!میں اُسی لاک اَپ کی بات کر رہا ہوں'جہاں کچھ دیر پہلے آپ کو بند کیا گیا تھا۔میں آپ کو ہی چھڑانے کے لئے جا رہا تھا۔اچھا ہُوا.......''

خُمار جمال کی بات سُن کر زمین پر صندوق رکھ کر کھڑے ہو گئے۔''......مجھے لگتا ہے آپ کو دماغ کے علاج کی ضرورت ہے۔''خُمار کے طنزیہ تخاطب نے جمال کو ناراض کر دیا اور وہ جھلا کر کہنے لگے۔''واہ صاحب واہ!شراب آپ پیئیں ،بہکیں آپ اور دماغ کا علاج میں کراؤں؟بزرگوار خیریت جانیے'آپ مہمان ہیں۔اگر کوئی اور اِس طرح کی بات کرتا تو ایسی مرمّت کرتا کہ ساری شاعری وائری بھول جاتا۔آپ کیسے شاعر ہیں'کس سے کیسی بات کرنی چاہیئے یہ بھی آپ کو نہیں معلوم؟میں یہاں ڈپٹی پولس کمشنر ہوں'سمجھے۔''اُنھوں نے آواز اُونچی کر کے اور آنکھیں نکال کر کہا۔

اب خُمار کے غصہ کی باری تھی۔اُنھوں نے اپنی مخصوص گالیوں کا اِسٹاک نکالا اور اُن پر برسانا شروع کر دیا۔''آپ مادر.... ہیں،حرام کے.... ہیں،بہن.... ہیں!''ڈپٹی کمشنر نے اب تک دُوسروں کو گالیاں دی تھیں۔گالیاں کھائی نہیں تھیں اور وہ بھی خالص بارہ بنکوی۔اُنھیں شاید یہ بھی علم نہیں تھا کہ خُمار غزل کے مزاج داں ہی نہیں تھے' گالیوں کے ملک کے حکمراں بھی تھے۔جنھوں نے خُمار کو مشاعروں کے اسٹیج پر دیکھا تھا' وہ جانتے تھے کہ وہ جس شاعر کے متوجہ کرنے پر اُسے واہ اور سُبحان اللہ سے نوازتے تھے اُس کا چہرہ پھرتے ہی اُس کی ماں بہن کا بکھان شروع کر دیتے تھے۔لیکن یہاں مشاعرہ کا اسٹیج نہیں تھا۔معاملہ آمنے سامنے کا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھا پائی شروع ہو گئی اور اِس غیر متوقع مُڈبھیڑ میں جمال کی مصنوعی بتیسی کے سامنے کے تین دانت کے ساتھ خُمار صاحب کی شیروانی کے دو بٹن بھی شہید ہو گئے تھے۔

اِس طریقہ سے احمد جمال کی تُو تکار تو مشاعرے کے اختتام تک ضرور خاموش رہی لیکن اِس میں خُمار کو جو پریشانی ہوئی اُس کے لئے میں شرمندہ تھا۔خُمار صاحب کو اصل واقعہ کا علم ہوا تو اُنھوں نے اپنے پان

سُپاری اور تمباکو کے بٹوے سے کچھ اور بڑی چھوٹی گالیاں نکال کر جمال کی غیر حاضری میں اُس کی نذر کردیں۔

خُمار کے ساتھ میں نے کئی مشاعروں میں شرکت کی تھی۔ ٹرین میں، بسوں میں ہوائی جہازوں میں اُن کے ساتھ سفر کیا تھا۔ وہ گھریلو قسم کے شریف انسان تھے۔ غزل کہنے اور سنانے کے علاوہ ادب سے اُنھیں کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اُن کی فرصتیں پہلے شراب اور بعد میں جب شراب ترک کردی تو رَمی کے پتّوں میں خرچ ہوتی تھیں۔

اُن کے مزاج کی تعمیر میں محرم کی مجلسوں کی برکتیں، مزاروں کی زیارتیں، قصباتی فضیلتیں، جگر مرادآبادی کی شفقتیں اور حُسن کی چاہتیں شامل تھیں۔ وہ شروع سے سلام و منقبت کے ماحول میں پلے بڑھے تھے۔ اِس تہذیب نے نہ صرف اُن کے مزاج کو شائستہ کیا تھا' اُن کے شعری لب ولہجہ کو بھی کلاسیکی وَقار دیا تھا۔ وہ شوخ، بے حجابی اور جذبہ واحساس کی بے نقابی جو مشاعروں میں رائج تھی خُمار کی غزلیں اُن سے دُور تھیں۔ اِس احتیاط و توازن میں غزل کا وہی فکری رویہ جھلکتا تھا جو اُن سے پہلے فراقؔ، حسرتؔ اور جگرؔ کے یہاں مہکتا تھا۔ خُمارؔ نے اپنی غزل کو فراقؔ کی گہری سنجیدگی کی جگہ جگرؔ و اصغرؔ کے مجاز و حقیقت کے تصوف آمیز امتزاج کے قریب کیا تھا۔

محمد حیدر خاں خُمارؔ لکھنؤ کے قریب بارہ بنکی میں ستمبر ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ اُردو، فارسی کی درسی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ پھر انگریزی اسکول میں داخل ہوئے۔ میٹرک کے بعد کالج بھی گئے۔ لیکن ابھی انٹر میں ہی تھے کہ ایک پردہ نشیں نے کہیں سے سامنے آکر اِس طرح نقاب اُٹھائی اور اِس ادا سے وہ بجلی لہرائی کہ آنکھوں کو کئی دِنوں کتاب نظر نہیں آئی۔ اُس رُومانی حادثہ نے زندگی کو کالج کی پڑھائی سے دُور کرکے آشنائی کے حوالے کردیا۔

خُمارؔ کی پہلی محبت بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں غزل میں محبوبہ کے بدلتے ہوئے کردار کی طرح درمیانی طبقہ کا ایک گھریلو وجود تھی۔ اُس کی ایک جھلک اُنھوں نے اپنے ایک قطعہ میں پیش کی ہے۔ یہ وہی محبوبہ تھی جو حسرتؔ کے یہاں کوٹھے پر ننگے پاؤں آتی تھی اور جگرؔ کے یہاں پردے کے پیچھے آنسو بہاتی تھی۔

لبوں پر تبسم، نگاہوں میں مستی
اداؤں کے جھرمٹ میں وہ آرہے ہیں

نظر لڑ گئی ہے جو میری نظر سے
پسینے ، پسینے ہُوئے جارہے ہیں

اُن کی اُس پہلی محبت کا انجام بھی وہی ہُوا جو عام طور سے ہوتا ہے۔ محبت میں جنون سے زیادہ اہمیت' ماں باپ کی نظروں میں اِقتصادی تحفظ کی ہوتی ہے۔ مجاز کے بارے میں عصمت چغتائی نے ایک بار لکھا تھا۔ ''علی گڑھ میں لڑکیاں مجاز کا نام تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی تھیں' یہ جاننے کے لئے کہ صبح مجاز کس کے نصیب کا ستارہ بنتے ہیں۔''

لیکن جب اُن کے لئے رشتہ کی تلاش شروع ہوئی تو کوئی پری چہرہ اُن کے فال میں نہیں نکل سکا۔ وجہ صاف تھی' شاعر کے پاس صرف شاعری تھی اور لڑکیوں کے والدین کو اُن کے مستقبل سے وابستگی تھی۔ خُمار نے بھی اپنی اِس رُومانی ناکامی کا مرثیہ اپنے ایک گیت نما نظم میں تحریر کیا تھا جو بعد میں تھوڑی بہت ردو بدل کے بعد فلمی نغمہ بنادیا گیا تھا۔ اُس نظم کا ایک بند یوں ہے۔

چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا
روتے دھوتے ہی کٹے گی ہمیں معلوم نہ تھا

موت بھی ہم پہ ہنسے گی ہمیں معلوم نہ تھا
زندگی روگ بنے گی ہمیں معلوم نہ تھا

لیکن یہ زندگی بھر کا روگ وقت کے ساتھ نئے سنجوگ میں ڈھل گیا اور وہ کئی بچوں کے باپ بن کر زندگی کی گاڑی میں بیل کی طرح جُت گئے.....اور بیتی ہوئی یادوں کو مشاعروں کی شاعری بناتے رہے اور گھر چلاتے رہے۔

کبھی شعر و نغمہ بن کے، کبھی آنسوؤں میں ڈھل کے
وہ ملے تو مجھ کو لیکن' ملے صورتیں بدل کے

جب کبھی مجھ کو غمِ دہر نے ناشاد کیا
اے غمِ دوست تجھے میں نے بہت یاد کیا

پھیلتی جاتی ہیں ہر سُو بھینی بھینی نکہتیں
وہ خراماں کیا ہُوئے گلشن خراماں ہوگیا

بھولے ہیں رفتہ رفتہ اُنھیں مدتوں میں ہم
قسطوں میں خودکشی کا مزہ ہم سے پوچھئے

عرب امی ریٹ میں دُبئی کے ہوٹل کا سابلانکا میں خُمار صاحب اور میں ایک ہی کمرہ میں تھے۔صبح کے گیارہ بجے ہوں گے کہ کمرہ کی گھنٹی بجی اور ایک معمر خاتون لگ بھگ خُمار صاحب کی عمر کا بڑا سا گلدستہ لیے اندر داخل ہُوئیں۔وہ خُمار صاحب سے ملنے آئی تھیں۔خُمار آنکھوں پر چشمہ رکھ کر اُنھیں ابھی پہچاننے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ وہ بڑی بی بول پڑیں۔میں جانتی تھی! آپ کو میں یاد نہیں آؤں گی' یاد دِلانا پڑے گا۔اور پھر وہ یاد دِلانے لگیں۔اچھا یہ بتایئے' جس قطعہ میں آخری مصرعہ ہے'' پسینے پسینے ہوئے جارہے ہیں'' وہ کس کے بارے میں تھا؟ اِتنا سُنتے ہی خُمار صاحب کھڑے ہوگئے اور حیرت سے اُنھیں دیکھنے لگے۔اور اُس کے بعد پچاس پچپن سال پہلے کا بارہ بنکی، وہاں کی گلیاں، اِمام باڑے کی مجلسیں، کالج کی تاک جھانک اور دُور دُور کی ملاقاتیں سب چند لمحوں میں کمرہ میں چاروں طرف بکھر گئیں۔خُمار کا شعر ہے۔

کہانی میرے ہی گذرے ہُوئے لمحاتِ رنگیں کی
مجھی کو اب حدیثِ دیگراں معلوم ہوتی ہے

وہ محترمہ اپنی نواسی کے ساتھ آئی تھیں۔خُمار کے لئے کئی تحائف کے ساتھ۔اُن کے جانے کے بعد خُمار صاحب آپ ہی آپ بول رہے تھے' بول کیا رہے تھے وقت کے جبر کو کوس رہے تھے۔

''لعنت ہے صاحب' پچاس سال سے جو یادیں عزیز تھیں وہ اِتنی ناچیز تھیں یہ آج معلوم ہوا۔''

پھر مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگے۔'' یہ وہی صاحبہ ہیں جو میرے پہلے مجموعہ'' حدیثِ دیگراں'' کے کئی شعروں میں اب تک پوشیدہ تھیں۔آج اچانک ظاہر ہُوئیں تو سارا رُومانس ختم ہوگیا۔وقت بھی زندگیوں کے ساتھ کیسے کیسے سلوک کرتا ہے۔''

یہ حقیقت ہے' اُردو شاعروں کی محبوبہ ہمیشہ سولہ سے پچّیس کی عمروں میں ہی گھومتی رہتی ہے' وہ کم سن ہوسکتی ہے، جوان ہوسکتی ہے لیکن پختہ عمر کی کبھی نہیں ہوتی۔جوش ملیح آبادی نے اپنی ایک نظم میں اِس غلطی کو سُدھارنے کی کوشش کی تھی۔جگر نے بھی اپنی ہی طلاق شدہ بیوی نسیم سے جب اصغر کی وَفات کے بعد دوبارہ شادی کی تھی تو ایک غزل میں مطلع کہا تھا۔

گدازِ عشق نہیں کم ، جو مَیں جواں نہ رہا
وہی ہے آگ مگر آگ میں دُھواں نہ رہا

خمارؔ کی حیات میں اُن کے تین شعری مجموعے شائع ہُوئے تھے۔ پہلا مجموعہ " حدیثِ دیگراں " تھا جو کُتب خانہ تاج ، بمبئی نے شائع کیا تھا۔ " رقصِ مَے " اور آخری مجموعہ " شبِ تاب " ساقی بک ڈپو ، حیدرآباد سے چھپا تھا۔ اِن مجموعوں میں شکیلؔ بدایونی کے برعکس فلمی گیتوں کی شمولیت سے گریز کیا گیا تھا۔ " شبِ تاب " میں غزلوں کے ساتھ ایک سیکشن نعتیں اور سلام کا بھی ہے۔ خمارؔ کی عقیدت کی شدّت نے کتاب کے اِس باب کو ادبی لحاظ سے زیادہ باوقعت اور پُر تاثیر بنایا ہے۔ اُنھوں نے سلام اور نعتیں مقابلتہً کم لکھی ہیں۔ لیکن اِن تخلیقات کو اُنھوں نے اپنی تہذیبی اِقدار کا ترجمان بنایا ہے اور الفاظ میں نیا جادُو جگایا ہے۔

میں نے جو چھیڑی نعتِ رسولؐ
چھاگئے بادل ، کھل گئے پھول

ہائے رے حُسنِ عِشقِ رسولؐ
شام کو تارا ، صبح کو پھول

سلام کے شعر ہیں۔

جب کبھی حق کی بات چلی
چھِڑ گیا ذِکر ابنِ علیؑ

یہ ہے نبیؐ کے گھر کا پتہ
موڑ ہیں بارہ ایک گلی

ہم بہک جانے پہ بھی بات ایک ہی کہنے لگے
یا محمدؐ کہتے کہتے یا علیؑ کہنے لگے

اِن نعتوں اور سلاموں میں اُن کی غزل سے زیادہ تازہ کاری اور لفظوں کے برتاؤ میں زیادہ فن کاری نظر آتی ہے۔ اِن میں وہی نرمیاں اور گرمیاں محسوس ہوتی ہیں جو تجمل آفندی سے منسوب ہیں۔ حیدرآباد میں تجمل آفندی کی طرح ایک زمانے میں خمارؔ صاحب بھی معظم جاہ کے دربار کی زینت تھے۔ خمارؔ

شاگرد تو اپنے چچا قرار بارہ بنکوی کے تھے۔ اُنھیں کے نام اُنھوں نے اپنی پہلی کتاب "حدیث دیگراں" کا انتساب بھی کیا تھا۔ لیکن مزاجاً وہ جگر کے حلقے کے شاعر تھے۔ جگر بھی اپنے دور میں جن مترنم شاعروں کو اپنے قریب رکھتے تھے اُن میں شکیل، شعری، راز اور مجروح کے ساتھ خُمار کا بھی نام تھا۔ خُمار اپنی شاعری میں ہی نہیں ترنم میں بھی جگر کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ مشاعرہ کے کامیاب شاعر تھے۔ اُنھوں نے جب سے شاعری شروع کی تھی تب سے انتقال تک وہ مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت اور اُس کی ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ مشاعروں کا اتنا لمبا سفر اُن کے کسی ہم عصر کو نصیب نہیں ہوا۔ مختلف علاقوں میں اُن کے جشن منائے گئے۔ جہاں اُردو والے تھے وہاں شعر خوانی کے لئے بلائے گئے۔ ہر جگہ تعریف و توصیف کے ہار پہنائے گئے۔ آخری دِنوں میں قریبی رِشتہ داروں کی مسلسل اموات سے ٹوٹ کر بھی وہ مشاعروں کے فعال کردار تھے۔ اُن کی بہت سی غزلوں کو ہندو پاک کے مشہور موسیقاروں نے گایا، اُن کے کئی فلمی گانوں نے اُن کے نام کو ملک کے کونے کونے تک پہنچایا۔ مشاعروں کے ناظموں نے اُنھیں شہنشاہِ غزل اور وقارِ غزل کے خطابات سے نوازا۔ اِکیاسی برس کے غم و خوشی کی حصہ داری پوری کر کے وہ ۱۹۹۸ء کے آخری مہینے میں بارہ بنکی کے ایک موروثی قبرستان میں اپنے شہر کی تہذیبی تاریخ کا نشان ہیں۔

صبر کرو کہ زندگی چند دِنوں کی بات ہے
معرکۂ غم و خوشی چند دِنوں کی بات ہے

●●

کرشن ادیب

کئی سال پہلے کی بات ہے لُدھیانہ میں مشاعرہ تھا۔ لُدھیانہ پنجاب میں تھا اور سارا پنجاب گولی، تلوار اور بموں کے دھماکوں سے پُرشور تھا۔ جگہ جگہ بندوق دھاری فوجی نظر آتے تھے۔ سارے علاقہ میں دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ عقل کہتی تھی نہیں جاؤ، پیٹ کہتا تھا ہو کر آؤ۔ پیٹ کی نصیحت پر عمل کیا' ہاتھ میں صندوق لیا اور چل دیا۔ جدید سائنس کہتی ہے' انسان کے دو دماغ ہوتے ہیں۔ ایک سر میں ہوتا ہے دُوسرا پیٹ میں۔ ہندوستان کی آبادی کا تین چوتھائی سے زیادہ حصہ پیٹ سے ہی سوچتا ہے۔ پیٹ ہی راستہ سجھاتا ہے، یہ ہی رِشتے بناتا اور مٹاتا ہے، یہ ہی اپنی نیند سُلاتا ہے اور اپنی جگار جگاتا ہے۔

لُدھیانہ ٹرین سورج طلوع ہونے سے دو گھنٹے پہلے پہنچ گئی تھی۔ علاقائی حالات کے تحت جو قانون بنایا گیا تھا اُس کے مطابق سارے مقامی اور بیرونی مسافروں کو اسٹیشن میں ہی روشنی ہونے تک ٹھہرنا تھا۔ دُوسرے مسافروں کی طرح میں بھی مسافر خانہ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سفر کی تھکن نے آنکھوں میں غنودگی بھر دی اور اِس تھوڑی جھپکی میں اخباروں کی خبریں' ہتھیار بند دہشت گرد بن کر نیند بھری آنکھوں میں گھوم رہی تھیں کہ اچانک ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ نیند ٹوٹی تو کچھ دیر کچھ نظر ہی نہیں آیا' بعد میں معلوم ہوا جسے میں نے بے ہوشی میں دھماکہ سمجھا تھا وہ ہوش میں! اکہرے بدن و چہرے میں دھنسی ہوئی آنکھیں، لمبے قد، گرم سوٹ اور ٹائی میں ملبوس ایک انسان تھا' لمبے قد اور ایرانی خد و خال کا تندرست نوجواں تھا۔ اُس کے ہاتھ کی اُانگلیاں میرے کاندھے پر تھیں اور وہ اجنبی ہوتے ہوئے شناسا کی طرح مسکرا رہا تھا۔ بھاری ٹھیٹ پنجابی لہجے میں اُس نے پوچھا۔

''تم ندؔا فاضلی ہو؟''

''جی ہاں!'' میں نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔ اُس چونکنے میں تھوڑا ڈر بھی تھا۔

اُس نے میرے منہ سے' جی ہاں' سنتے ہی اُسی آواز میں کہا۔ ''ندؔا فاضلی ہو تو یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ چلو میرے ساتھ۔ شکنتلا شری واستو (کنوینر مشاعرہ) سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم اِسی گاڑی سے آرہے ہو اور میں جانتا تھا قانون کے مطابق تمھیں صبح تک باہر نہیں جانے دیا جائے گا۔ میں' حضور تمھیں ہی لینے آیا ہوں۔'' اُس نے میری اٹیچی اُٹھالی اور میں خاموشی سے اُس کے پیچھے ہولیا۔ میں اُس کے نام سے واقف تھا' گیٹ پر ریلوے حکام نے باہر جانے سے روکا تو وہ ناراض لہجہ میں اُن سے کہنے لگا۔

''حضور! آپ کو شاید علم نہیں' یہ شہر ساحرؔ لدھیانوی کی نظمیں اور غزلیں سُن چکا ہے، شیو بٹالوی کے کلام کو سراہتا رہا ہے، یہاں سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر جالندھر ہے' وہ حفیظ جالندھری کے گیتوں سے لُطف اندوز ہو چکا ہے، امرتا پریتم اور راجیت کور کو چاہتا ہے۔ یہ علاقہ شاعری کا پرستار ہے' اچھے شاعروں سے اِسے پیار ہے۔ یہاں ندا فاضلی کو کوئی خطرہ نہیں' یہ میرے ساتھ جائیں گے اور میں بدنام شاعر ہوں اِس شہر کا' شاید آپ جانتے ہوں!''

اِس مختصر سی تقریر کے بعد گیٹ کے پہرے داروں نے ہمیں باہر جانے دیا۔ باہر نکلتے ہی اُس نے ٹیکسی لی اور کئی اندھیرے راستوں سے گذار کر مجھے صحیح سلامت ایک ہوٹل میں پہونچا دیا۔ ہوٹل کے کمرے میں روشنی میں مَیں نے اُسے دیکھا تو وہ کچھ گھبرایا، گھبرایا، بے چین سا نظر آرہا تھا۔ اُس اضطراب کو بہلانے کے لئے وہ بار بار سگریٹ سُلگا رہا تھا اور لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ جب گھبراہٹ زیادہ بڑھنے لگی تو وہ بیٹھے بیٹھے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

''یار تمہارے سورج کو نکلنے میں ابھی ایک گھنٹے کی دیر ہے اور میرا سورج کبھی کا طلوع ہو چکا ہے' اِس لئے اب میں چلتا ہوں' مجھے پچاس روپے دو شراب پینے کے لئے۔ مَیں پہلے خوش کو شراب پلاؤں گا پھر تھوڑا جسم کو سُلاؤں گا اُس کے بعد شام کو مشاعرے میں آؤں گا تمہارے شعر سنوں گا اور اپنے سناؤں گا۔ تمہاری گاڑی کے انتظار میں ساری شراب اُتر گئی۔

اُس کی بے تکلفی مجھے پسند آئی اور میں نے فوراً اُسے سو کا نوٹ دے دیا۔ وہ نوٹ لے کر تیز قدموں سے گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آ کر پچاس روپے لوٹا گیا۔

کرشن ادیب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اُس کے بعد لدھیانہ میں اور پنجاب کے دُوسرے علاقوں میں بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر بار شراب کی طلب اُسے میرے پاس لاتی تھی اور معاوضہ لے کر چلی جاتی تھی۔ اُس سے آخری ملاقات بھی لُدھیانہ میں ہی ہوئی تھی۔ وہ حسبِ دستور میرے وہاں پہونچتے ہی مجھ سے ملنے آ گیا تھا۔ لیکن اِس بار وہ پہلے جیسا نہیں تھا۔ گالوں میں گڑھے پڑ چکے تھے، آنکھوں پر چشمہ لگ چکا تھا، کمر جھک چکی تھی اور وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا لگ رہا تھا۔ میں نے اُس کے آتے ہی پہلے کی طرح پیسے نکال کر اُسے دینا چاہے' لیکن اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا'' میں نے شراب چھوڑ دی ہے۔ اب تمھیں اِس عنایت کی زحمت کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اُس کی بات سُن کر مذاقاً کہا۔

''یار کرشن! جب تمہارے جسم میں شراب کے بگاڑنے کو بہت کچھ تھا' پھیپھڑے تھے، کلیجہ تھا، دِل تھا، بدن پر گوشت تھا، آواز تھی اور بینائی بھی تھی' تب تو تم دِن رات پیتے رہے۔ اب تو اِن میں سے کچھ

بھی نہیں رہا۔ اب شراب تمہارا کیا بگاڑ لے گی جو اسے چھوڑ رہے ہو؟'' میرے مذاق پر اُس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ اُس قہقہہ میں ہنسی کم تھی آنسو زیادہ تھے۔ اُس کی ایک غزل کے شعر ہیں۔

سر پھری پاگل ہوا کا تیز جھونکا آئے گا
حسرتوں کے خشک پتوں کو اُڑا لے جائے گا

دُودھیا آکاش میں کس کو صدا دیتا ہے تُو
تیرے ماضی کا پرندہ اب نہ واپس آئے گا

خواہشوں کے جنگل میں لذتوں کے پیڑ ہیں
ان کے سائے میں جو آئے گا' بہت پچھتائے گا

ہندوستان کے پنجاب میں لبھو رام جوشؔ، لالہ امر چند قیسؔ، پورن سنگھ ہنرؔ اور میلا رام وفاؔ وغیرہ کے بعد جو شعراء کی نسل اُبھری تھی اُس میں نریش کمار شادؔ، پریم وار برٹنی اور کرشن ادیب زیادہ نمایاں تھے۔ اُن کا تعلق مشاعروں کے ساتھ رسائل اور کتابوں سے بھی تھا۔ شاعر تو اُن کے ساتھ اور بھی تھے۔ اُن میں کچھ تو اب بھی تخلیقی لحاظ سے سرگرم ہیں' جیسے پرتپال سنگھ بیتابؔ، پریم کمار نظرؔ، جگر جالندھری، آزادؔ گلاٹھی اور کرشن کمار طورؔ وغیرہ۔ مگر ان تینوں' نریش کمار شادؔ، پریم وار برٹنی اور کرشن ادیبؔ میں جو قدر مشترک تھی وہ اُن کا بوہیمین رویّہ تھا۔ نریش کمار شادؔ دہلی میں جمنا ندی میں نشے کی حالت میں اپنی پرچھائیں سے باتیں کرتے ہوئے جمنا کے حوالے ہو گئے، پریمؔ وار برٹنی مالیر کوٹلہ کی پرانی عمارتوں اور گلیوں نما بازاروں کو اپنی بلانوشی کا افسانہ سناتے ہوئے خود فسانہ بن گئے لیکن کرشن ادیبؔ اُن دونوں سے سخت جان تھے۔ وہ ۷۲ رسال تک مسلسل زندگی کو ڈھوتے رہے۔ ستر سال پورے ہونے پر وزیر آغا نے ''اوراق'' میں اُن کا ایک گوشہ بھی نکالا تھا۔ اُس میں اُن کی شاعری اور شخصیت پر بلراج کومل، حامدی کاشمیری، آزادؔ گلاٹھی اور وزیر آغا نے لکھا تھا۔ اُس گوشہ میں خود کرشن ادیبؔ نے بھی اپنا ایک مختصر سا سوانحی خاکہ تحریر کیا تھا۔ اپنے بارے میں اُن کی رائے یوں ہے۔

''ستر سالہ زندگی کا سفر ایک طویل داستان ہے۔ بچپن نامُرادانہ گذرا، جوانی شاعرانہ بیتی۔ اگرچہ والد اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے لیکن مجھے تعلیم سے دِلچسپی نہیں تھی۔ اِمتحانات کی رپورٹ آتی' جس میں لکھا ہوتا کہ سوائے اُردو کے تمام مضامین میں فیل ہے۔ گھر میں اِسٹالن کی شکل کے مونچھوں والے والد کی مار اور اسکول میں اساتذہ کی پھٹکار مجھے ہر وقت خوف زدہ رکھتی تھی۔''

وزیر آغا نے اِس کے بارے میں لکھا'' کرشن ادیبؔ تمام عمر اپنے اندر کے عفریت سے برسرِ پیکار رہا۔ زندگی کے آخری ایام میں جب بقول غالبؔ '' قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اُس کے اندر کا یہ قیدی مونچھوں پر تاؤ دیتا بدن کے حصار سے باہر نکل آیا ہے اور اپنی جارحیت کا کھلم کھلا مظاہرہ کرنے لگا ہے۔''

بلراج کومل نے اُسے مقابلتہً زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اُس کی بوہیمین زندگی کے ہر پہلو

سے واقف تھے۔ وہ کہتے ہیں۔

''کرشن ادیب کی شخصیت اُس نظم کی مانند ہے جس میں تفصیلات نہایت غلیظ ہوتی ہیں' لیکن نظم مجموعی طور پر خوب صورت ہوتی ہے' اُس کی تصویر اسی قسم کی ہے۔ کرشن ادیب آوارہ گرد ہے، بے کاری اُس کا مستقل پیشہ ہے، درجنوں لڑکیوں سے عشق کر چکا ہے۔ پہلے دُوسروں کے شعر سنایا کرتا تھا' اب بہت سالوں سے اپنے شعر سناتا ہے۔

کرشن ادیب کی شاعری کی ابتدا سن پچاس سے ہُوئی۔ اس شروعات کو اُس نے اپنے ایک خط میں ایک ایسے رُومانی حادثہ سے منسوب کیا ہے' جس سے ایک مخصوص دَور میں سب ہی گذرتے ہیں۔ لیکن کرشن ادیب کی آوارہ مزاجی نے اُسے کسی ایک رُومانی حادثہ تک محدود نہیں رکھا۔ وہ مسلسل ایسے حادثوں سے بار بار دوچار ہوتا رہا اور ہر حادثہ میں قسط وار خود کو کھوتا رہا۔ اُن رُومانی حادثوں کی فہرست کا آخری نام مونا تھا۔ مونا اُس کی زندگی میں اُس وقت آئی جب آدمی لمبے سفر کی تھکان کے بعد کسی سائے کی تلاش کرتا ہے۔ مسز ادیب نے کئی حادثوں سے ٹوٹے پھوٹے کرشن ادیب کو اپنی نرسنگ مہارت سے جوڑ جاڑ کے وقتی طور پر درست چُست تو کر دیا لیکن عمارت میں مرمّت دیر سے ہُوئی تھی' اُس میں بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اِس لئے جلد ہی کبھی پلستر جھڑنے لگا، کبھی دالان بگڑنے لگا اور پھر پوری چلتی بلڈنگ ایک دِن ہرہرا کر ڈھے گئی۔ کرشن ادیب کی ایک نظم کا آخری بند ہے۔

اگرچہ میں اُس امتیازِ بہار و خزاں سے بھی ماورا ہو چکا ہوں
مگر خود سے پوچھتا ہوں
کہ یہ کون ہے
جس کے پاؤں میں بُلبُل کے نغمے کی زنجیر سی ہے
جواب بھی کسی آنے والے حسیں موسمِ گُل کی رہ تک رہا ہے

کرشن ادیب کئی شعری مجموعوں کے شاعر تھے۔ پہلا شعری مجموعہ آج سے ۳۰ برس پہلے شائع ہُوا تھا' اُس کا نام ''آگ کی پرچھائیاں'' تھا۔ مکتبۂ دِین و ادب سے ایک اور مجموعہ ''پھول پتے اور خوشبو'' شائع ہُوا۔ دیوناگری میں بھی ایک کتاب ''شام کے بعد'' ہے۔ اِن شعری مجموعوں کے علاوہ اُنھوں نے نثر میں بھی ایک کتاب ''ساحر... یادوں کے آئینے میں'' لکھی۔ اُس کتاب میں کرشن ادیب نے لُدھیانہ میں ساحر سے اپنی قُربتوں کا ذکر دِلچسپ انداز میں کیا ہے۔ اُس میں ساحر اور اُمرتا پریتم کی دوستی کے ذِکر میں ''اُمرتا کے گھر

میں اُن سگریٹوں کے ٹکڑوں کے بھی کردار ہیں جو ساحؔر کے چلے جانے کے بعد اَمرتا کے ہونٹوں سے لگ جاتے تھے اور سُلگ سُلگ کر اُنھیں ساحؔر کے شعر سناتے تھے۔ اُن سگریٹ کے ٹکڑوں کے رُومانس کے بارے میں گوپال مِتّل نے اپنی کتاب ''لاہور کا جو ذِکر کیا'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

کرشن ادیبؔ اُن شاعروں میں تھے جو سیاست کی ملکی و لسانی تقسیم کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ وہ اُردو کے حوالے سے دونوں ملکوں کو غیر منقسم سمجھتے تھے۔ وہ بہ یک وقت دونوں ملکوں میں ایک ساتھ رہتے تھے۔ اُن کا جسم ہندوستان میں رہتا تھا لیکن دماغ فیضؔ، ابنِ اِنشاء اور قتیلؔ شِفائی کے پاکستان میں رہتا تھا۔ کرشنؔ کا کلام بھی ''افکار''، ''اوراق''، ''تخلیق'' اور ''سیپ'' جیسے پاکستانی رسائل میں زیادہ نظر آتا تھا۔ ملکی و لِسانی تقسیم کو نہ ماننے کی ضد نشے میں اکثر شدت اختیار کر لیتی تھی، جس کی وجہ سے کبھی کبھی مقامی سیاسی لوگوں سے ہاتھاپائی بھی ہو جاتی تھی۔ ایک بار امرت سر میں شراب کی محفل میں ناراض ہو کر وہ امرت سر کراس کر کے واگھ کی سرحد پر پہونچ گیا تھا۔ جب سرحد کے محافظوں نے اُسے روکنا چاہا تو وہ نشے میں چلّانے لگا۔

'' آپ بکواس کرتے ہیں، یہ تقسیم جھوٹی ہے۔ فیضؔ اور ساحؔر کی شاعری نہ تقسیم ہُوئی ہے نہ ہوگی۔ اے۔ حمیدؔ اور کرشن چندر کے ناولوں کو سیاست نہیں بانٹ سکتی ہے۔ بابا نانک اور بُلّے شاہ ہماری سانجھی وراثت ہیں۔ یہ بٹوارہ محض سیاست ہے جو قابلِ ملامت ہے۔''

کرشن ادیبؔ کی باتیں سرحد کے سپاہیوں کی سمجھ میں نہیں آئیں وہ اُسے پاگل سمجھ کر بند کرنا چاہتے تھے کہ اِتنے میں ایک اونگھتے ہُوئے سردار جاگ پڑے، اُن کی نظر کرشن ادیب پر پڑ گئی۔ وہ کرشن ادیبؔ کو اُس کے نام سے بھی جانتے تھے اور صورت سے بھی پہچانتے تھے۔ اُس نے اُٹھ کر نہ صرف کرشنؔ کو سپاہیوں سے چھڑایا بلکہ سرحد پار کے اپنے ہم رُتبہ کپتان کو بھی وائرلیس سے بتایا کہ ایک اُردو کا شاعر کرشن ادیب اِس وقت ہمارے پاس ہے۔ وہ میرے تمہارے دو ملکوں کے درمیان کسی سرحد کو نہیں مانتا۔ آپ کا کیا خیال ہے، اِسے آپ کی طرف آنے دیں؟ وہ احمد ندیم قاسمؔی اور حبیب جالبؔ سے ملنا چاہتا ہے۔'' سرحد پار کے کپتان نے بلند قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

'' بات تو آپ کا شاعر صحیح کہتا ہے سردار جی! لیکن ہر سچائی سیاست کے کام کی نہیں ہوتی۔ اُسے سردارؔ جعفری کا مصرعہ سنا کر واپس اُس کے گھر بھیج دیجئے۔ سچ بات آج کل نشہ میں ہی کی جاتی ہے۔''

میں اِس سرحد پر کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

کرشن ادیبؔ کی شاعری شخصی رُومان اور اجتماعی ہیجان سے عبارت ہے۔ وہ ساحؔر کی دوستی میں

ترقی پسند بن تو گیا تھا لیکن اپنے مزاج اور انداز سے وے قتیل، عدم، ندیم، فیض، اور ساحر کی رُومانی شاعری کی عاشقانہ شاخ پر ہی اپنا شعری آشیانہ تعمیر کرتا نظر آتا ہے۔ وہ ایک سیکولر مزاج کا غیر منقسم ہندوستان کا اُردو کا شاعر تھا۔

جب بھی آتی ہے تری یاد کبھی شام کے بعد
اور بڑھ جاتی ہے افسردہ دلی شام کے بعد

یوں تو ہر لمحہ تری یاد میں بوجھ گذرا
دِل کو محسوس ہوئی تیری کمی شام کے بعد

مئے گُل رنگ سے روشن کرو تاروں کے چراغ
ورنہ ڈس جائے گی یہ تیرہ شبی شام کے بعد

اُس کی شعری خدمات پر پنجاب سرکار نے اُسے ''شرومنی انعام'' سے نوازا تھا۔ اُس کی کئی غزلیں، کئی موسیقاروں کی آواز میں صدا بند ہوئی ہیں۔ جگجیت سنگھ کی آواز میں اُس کی ایک غزل ''شام کے بعد'' کافی مقبول بھی ہوئی۔

●●

عالمی شاعری

پرتگالی شاعر فرنانڈو پیسوا کی نظمیں

پرتگال کا نام عالمی ادب کے منظر نامہ میں اُس وقت اُجاگر ہُوا جب پرتگال کے ایک ادیب سراما کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ انعام مشتہر ہُوا تو پڑھنے لکھنے والے وہاں کے ادب سے تھوڑا بہت باخبر ہُوئے۔ اِس انعامی تشہیر سے پہلے لوگوں کے علم میں کوٹکسوٹ اور واسکوڈی گاما تھا یا ہندوستان کی ایک ریاست گوا میں بنے ہُوئے گرجا گھروں کا فنِ تعمیر تھا۔ ہماری معلومات میڈیا کی کتنی محتاج ہو چکی ہیں۔ ہماری لاعلمی اُس کا ثبوت ہے۔ اُسی لاعلمی کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے سلمان رشدی نے اٹھارہ دستوری زبانوں کے دیس بھارت کے مجموعی ادب کو صرف ایک نام سعادت حسن منٹو سے پہچاننے کی بھول کی تھی۔ اُنھیں نہ قرۃ العین حیدر نظر آئیں، نہ شیو شنکر پلّئی دِکھائی دیے، نہ میلا آنچل والے رینو! ترقی یافتہ ممالک کے میڈیا نے دُنیا کے بہت سے خطوں کی طرح پُرتگال کی ادبی تاریخ کو بھی سراما گو کے میڈیائی تعارف سے قبل ہماری نظروں سے اوجھل رکھا۔ اُسی گم شدہ تاریخ کا ایک اہم نام فرنانڈو پیسوا بھی ہے۔ مشہور ناقد اور مترجم رچرڈ زینتھ نے جب پیسوا کی نظموں کا ترجمہ انگریزی میں کتابی رُوپ میں شائع کیا تو اُس کی شاعری کے بارے میں یوں رائے دی گئیں۔

''پیسوا کی شاعری میں بیسویں صدی کی رُوح روشن ہے۔'' (بُک لسٹ)

''پیسوا کی تخیلی وفکری وسعت کا احاطہ ناممکن ہے۔'' (نیوز ڈے)

''پیسوا کی شاعری زندگی کی حرارتوں سے رُلکے اور رینڈ ویلس ٹام کی طرح تابناک ہے۔'' (نیویارک ٹائمس)

''پکاسو کی طرح پیسوا کا تخلیقی ذہن بھی مختلف اسالیب کا فن کار ہے۔ اُس کی شعری تخلیقات پُرتگالی ادب میں جدیدیت کا ابتدائی تعارف ہیں۔ ان کے ساتھ ہی پرتگال کی شعری تاریخ نئی سمتوں پر گامزن ہُوئی ہے۔'' (رچرڈ زینتھ)

فرنانڈو پیسوا کی ۱۳؍جون ۱۸۸۸ء میں لسبن میں پیدا ہُوا اور ۴۷؍سال کی عمر میں اپنے ہی ذہنی وشخصی انتشار کا شکار ہو کر ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گیا۔ اُس کی کم عمر رحلت کی وجہ شراب کی بلا نوشی بتائی جاتی ہے۔ پانچ سال کی عمر میں باپ سے محروم ہو گیا' ماں نے دُوسری شادی کر لی۔ پیسوا کی ابتدائی زندگی

جنوبی افریقہ میں ڈربن میں گذری جہاں اُس کے سوتیلے والد پُرتگال کے سفارت خانے میں کونسلر تھے۔ اپنے بچپن کے بارے میں اُس نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''میں اپنے بچپن کو آنسوؤں کی طرح یاد کرتا ہوں۔ان آنسوؤں کی موزونی ہی میری تحریر کی تعمیر میں شامل ہے۔''

پیسوا ایک سابقہ شاعر، ناقد، مترجم اور نثر نگار تھا' وہ کئی زبانوں کا ماہر تھا۔اپنی مادری زبان پُرتگیزی کے علاوہ اُس کے اِظہار کے ذرائع انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بھی رہی ہیں۔اُس کا تخلیقی ذہن بلا کا زرخیز تھا۔وہ بیک وقت کئی ناموں سے کئی اسالیب میں لکھتا تھا۔اُس کے تخلیق کردہ ان ہم زادوں میں ابرکو، ریکارڈ اور اِکومیروز زیادہ مشہور ہیں۔وہ ایسا کیوں کرتا تھا' اِس کے بارے میں محققین صرف اِتنا ہی کہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں یہ ایک قسم کا ادبی فیشن تھا۔اِس دلیل کی دفاع میں وہ کئی جانے پہچانے ادیبوں اور شاعروں کا نام لیتے ہیں۔جیسے 'ایزرا پاؤنڈ مابرلی' کے نام سے بھی لکھتا تھا' رِلکے نے'' مالٹے لارڈس'' سے یہی کام لیا، ڈیلری نے اپنے ہم زاد کو تیستے کا اِسم دیا تھا۔مگر پیسوا نے اِس کھیل کو جس طرح ایک منظم کاروبار کی مانند پھیلایا' اُس کی دُوسری مثال مشکل سے ہی ملے گی۔اُس کے یہ ہم زاد نہ صرف انداز اور کردار کے لحاظ سے ایک دُوسرے سے مختلف ہیں بلکہ اُن میں سے ہر ایک کی اپنی فکری اور اُسلوبی شناخت بھی نمایاں ہے۔فرنانڈو پیسوا نے اُن کو اپنی منقسم شخصیت کے متضاد رویّوں کا علامتی رُوپ دیا ہے۔زیلتھ نے اُس کے بارے میں صحیح لکھا ہے۔

''وہ کائنات میں ایک ایسے سُونے علاقے کی مانند ہے جہاں کئی راہیں ایک دُوسرے سے ملتی نظر آتی ہیں۔''

پیسوا نے اِس عمل کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

''شیکسپیئر نے ایک ہیملٹ تخلیق کیا تھا میں نے بہت سے ہیملٹ گڑھے ہیں' فرق صرف اِتنا ہے کہ میرے کردار کسی ڈرامے کا حصہ نہیں ہیں، اُن کا اسٹیج میری شخصیت ہے، اُن کی اداکاریاں میری فکری جہات ہیں۔''

پیسوا کی شعری ونثری تخلیقات ان تین ناموں کے علاوہ جن کا اوپر ذِکر کیا گیا ہے' ابھی تک کی تلاش کے مطابق ۷۲ دُوسرے ناموں سے بھی منسوب ہیں۔

پیسوا کی شاعری اُس کی متضاد شخصیت کا لاشخصی اِظہار ہے۔اُس کے کئی چہرے ہیں، کئی جہات و

ترجیمات ہیں۔ وہ کہیں فلسفی نظر آتا ہے کہیں صوفی کی طرح خدا کی ہم گیریت کو گاتا ہے، کہیں ناستک کی طرح عقیدوں سے انکار کرتا ہے کہیں فطرت میں وہ حیرت و استعجاب کو آشکار کرتا ہے۔ اُس کی شاعری زندگی کی غیر مشروط ترجمان ہے۔ اُس کا شعری دائرہ کئی موسموں کو اپنے حصار میں لئے ہُوئے ہے۔ اُس کی بے پناہ پیکر تراشی، استعارہ سازی اور بلند پردازی نے اُس کی شاعری کو ادبی دُنیا کا نگار خانہ بنا دیا ہے۔ پیسوا اپنے دور میں اپنےلیے اور بعد میں ناقدین کے لئے بیسویں صدی کی ادبی تہذیب کا ایک ایسا معمہ تھا اور ہے جو ابھی تک پورے طور پر حل ہونا باقی ہے۔

ایک
بے شمار زندگیوں کا مجموعہ
میری زندگی ہے!
پتہ نہیں جب میں سوچتا ہوں
تو کون مجھ میں سوچتا ہے
جب میں کچھ محسوس کرتا ہوں تو کون مجھ میں جھانکتا ہے
میں گویا ایک مقام ہوں
جہاں اشیاء خیالوں میں ڈھلتی ہیں
جہاں فکریں
نئے نئے رُوپ بدلتی ہیں
میرے اندر ایک نہیں
بہت سی رُوحیں ہیں
میرا تین ایک ہے
لیکن اُس کی کئی سمتیں ہیں
کئی تہیں ہیں
اُن مختلف رویوں کی بھیڑ میں
میں کہاں ہوں
لیکن میں جہاں ہوں

اپنے ہی ساتھ ہوں
اپنا قلم ہوں
اپنی بات ہوں

دو

ہیلو گلہ بان!
سڑک کے اُس طرف
جو ہوا بہتی ہے
وہ تم سے کیا کہتی ہے؟
وہ کہتی ہے
ہوا، ہوا ہوتی ہے
ہوا کا کام بہنا ہے
کل ہو یا آج ہو
اُسے تو ہمیشہ یوں ہی رہنا ہے
تم بتاؤ، تم سے یہ کیا کہتی ہے؟
مجھ سے تو یہ بہت باتیں کرتی ہے
گذرے جہانوں کی
پرانے زمانوں کی
جو کبھی نہیں تھیں
ان داستانوں کی
لگتا ہے تم نے ہوا کو کبھی نہیں سُنا!!
ہوا، ہوا ہوتی ہے
وہ جب بھی سرسراتی ہے
خود ہی بولتی ہے

خود ہی کو سناتی ہے
تم نے جو سنا ہے
وہ تمہارا خیال ہے
تمہارے اندر چھپے
جھوٹ کا کمال ہے

تین
قسمت کے لکھے کو اپناؤ
پودوں کو پانی پلاؤ
گلابوں کے ساتھ مسکراؤ
باقی سب کچھ مایا ہے
اَن دیکھے درختوں کی چھایا ہے
حقائق ہمارے خوابوں سے
بہتر یا کمتر ہوتے ہیں
صرف ہم ہی
اپنے برابر ہوتے ہیں
تنہائی کو بساؤ
ہر دُکھ کو اُس کی دین سمجھ کر
شکر بجالاؤ
زندگی کو فاصلے سے دیکھو
اُس کے قریب نہیں جاؤ
کیا ہے؟
کیوں ہے؟
ایسے سوالوں سے خود کو بچاؤ

اولمپس کو دِل میں چھپاؤ
اُسی کی طرح وقت بِتاؤ
دیوتا اِس لئے دیوتا ہوتے ہیں
کیونکہ وہ اپنے بارے میں کبھی سوچتے نہیں

چار
دیوتا خوش ہے
وہ درختوں کی جڑوں کی طرح
خاموش اور پُرسکون ہیں
تقدیر اُنہیں کہاں ستاتی ہے؟
اور جب کبھی ستاتی ہے
تو اِس کے بدلے میں
اُنھیں اَمر بناتی ہے
دیوتا کسی پرچھائیں سے ڈرتے ہیں
نہ خطروں سے گذرتے ہیں
کیونکہ وہ غیر موجود ہوتے ہیں
اور وجود کے بغیر
موجود ہوتے ہیں

پانچ
تمہارے ہونٹوں پر
انجانی سی یہ مسکراہٹ
تمہارے بالوں میں
نئے سورج کی یہ جگمگاہٹ

ایسا کیوں ہو

خوشی کے وقت

ہم خوشی سے بے خبر کیوں ہوتے ہیں؟

چھ

میں ہری گھاس پر لیٹا ہُوا

وہ سب کچھ بھولنا چاہتا ہوں

جو مجھے پڑھایا گیا تھا

میرے ذہن میں جو بسایا گیا تھا

وہ میرے شب و روز میں نہیں جگمگایا

جو مجھے دِکھایا گیا تھا

وہ مجھے کہاں نظر آیا

مجھے جو نقشہ تھمایا گیا تھا

ویسا میں نہیں بن پایا

لفظوں کی دُنیا

لفظوں تک محدود ہے

لیکن حقیقت!

جیسی پہلے تھی

ویسی اب بھی موجود ہے

سات

تمام محبت نامے

مضحکہ خیز ہوتے ہیں

وہ مضحکہ خیز نہیں ہوتے

تو محبت نامے کیوں ہوتے؟

اپنے زمانے میں

میں نے بھی محبت نامے لکھے تھے

اُسی طرح

بے معنی اور مضحکہ خیز

محبت ناموں میں

محبت ہوتی ہے

اس لئے وہ بھی مسخری سے بھرے ہوں گے

لیکن جنھوں نے کبھی محبت نامے نہیں لکھے

وہ بھی ضرور مسخرے ہوں گے

کاش! میں پھر سے

اُس ماضی میں لوٹ سکوں

جب میں محبت نامے لکھتا تھا

یہ جانے بغیر

کہ ایسی تحریریں مضحکہ خیز ہوتی ہیں

●●

دُوسری عالمی جنگ کے بعد پولش شاعری

بوگ ڈان چیکوسکی' پیدائش ۱۹۳۳ء پولش زبان کے اہم جدید شاعر ہیں۔ بچپن میں خاندان کے ساتھ جلاوطن ہُوئے، چند برس ایران اور کچھ عرصہ افریقہ میں پناہ گزینی کے عذاب جھیل کر لندن میں منتقل ہو گئے۔ بچپن سے جوانی تک وہیں پلے بڑھے اور وہیں لندن یونیورسٹی سے مغربی یورپی ادب میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ بوگ ڈان انگریزی اور اپنی موروثی زبان پولش پر یکساں عُبور رکھتے ہیں' لیکن شعری اِظہار کے لئے اُنھوں نے اپنے چھوڑے ہُوئے مُلکی کی زبان کا ہی انتخاب کیا۔ بوگ ڈان مزاجاً روایت شکن جدید شاعر ہیں۔ شعری زبان کی تراش خراش میں بھی اور موضوعات کے انتخاب میں بھی اپنے معاصر شاعروں کے برعکس بوگ ڈان کا شعری رویہ پولش کی ہم عصر شعری مزاج سے مختلف اور انگریزی ادب سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ میٹر اور قافیہ کا پابندیوں سے آزادی اس کی جدت پسندی کی خصوصیت ہے۔

میں جہاں پیدا ہُوا ہُوں
وہ میرا انتخاب نہیں ہے
میں گھاس میں کیوں نہیں پیدا ہُوا
جو ریگستان کے علاوہ
ہر جگہ نظر آتی ہے
میں ہَواؤں میں ہَوا بن کر بھی پیدا ہو سکتا تھا
مگر یہ نہیں ہُوا
بچپن سے ہی میں زنجیروں میں ہُوں
انہیں زنجیروں کے ساتھ
میں اپنی تقدیروں میں ہُوں
میں جہاں ہُوں
وہ میرا انتخاب نہیں
میں سمندر کی لہر کی صُورت میں بھی تو پیدا ہو سکتا تھا

تم مقناطیس کی طرح
مجھے جیسا چاہتے ہو گھماتے ہو
تمہارے بغیر میں بے حرکت ہُوں
شاید اِسی لئے
میں ان زنجیروں کو ڈھو رہا ہُوں
میں ایسا مجبور شیر ہُوں
جو صرف ایال کی بے معنی حرکتوں میں
اپنی خُفگی کو سمو رہا ہُوں
وہ پکارتے ہیں... آؤ!
اور میں چلا آتا ہُوں
وہ گھاس اور باڑہ دِکھا کے بلاتے ہیں
اور میں دڑبوں میں گھس جاتا ہُوں
میں شاعر ہوں
میں اپنے لفظوں کا اسیر ہُوں
میں ایک چلتی پھرتی زنجیر ہُوں
مجھے کو پیدا ہی ہونا تھا
تو گھاس میں گھاس بن کر کیوں نہیں پیدا ہُوا

ٹیڈیوز روزوکس

ٹیڈیوز وروکس (پیدائش ۱۹۲۱ء) کی شاعری دُوسری عالمی جنگ کی ہیبت ناکیوں کی دہشت ناک دستاویز ہے' جس کو شخصی مشاہدہ اور ذاتی شمولیت نے پُر تاثیر بنا ہے۔ روزوکس خود ملکی فوج کے گوریلا جماعت کا حصہ رہا ہے' اس کے پہلے مجموعۂ کلام کی نظمیں اس آگ، بارُود اور انسانی خون کی بے حُرمتی کی تصاویر کا البم ہے۔ اس کے خیال میں حقائق کی الم ناکیاں شعری شائستگی کی جگہ الفاظ کی دُرشتگی اور مرثیاتی نغمگی کا تقاضہ کرتی ہیں ۔ یہ ہی وجہ ہے اس کی بیشتر تخلیقات ، راست بیانیہ ہیں اور مستعمل آرائشی

ضروریات سے بڑی حد تک دُور ہیں۔ یہ نظمیں انسانی رُوح کی ایسی چیخ سے عبارت ہیں جو دَرد، دَرد مندی اور ناراضگی کے ملے جلے احساس کے غیر رَوایتی الفاظ میں گونجتی محسوس ہوتی ہے۔ ان میں وزن، قافیہ، علامت اور پیکر کے بجائے سیدھے لیکن تیکھے اور نوکیلے پیرایوں کو اپنایا گیا ہے۔ یہ نظمیں خود ترحمی سے شعوری گریز کے ساتھ شر کشانہ تیوروں کا دائرہ بناتی ہیں۔ روزوکس شاعر کے علاوہ نقاد اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ پولش زبان میں لایعنی تھیٹر کے بُنیاد گذاروں میں ان کا نام کافی اہم ہے۔

ماہر خانساماں

میں ایک ایسے
ماہر خانساماں سے واقف ہُوں
جس کا ہاتھ پہلے دہانے میں آتا تھا
پھر نرخرے کے راستے سے
سیدھا بھیڑ کے جسم میں اُتر جاتا تھا
اور وہاں سے پھر
اس کے دِل تک پہنچ کر
ایک ہی جھٹکے میں پھڑکتے ہُوئے دِل کو نکال لاتا تھا
جی ہاں!
وہ ایک تجربہ کار خانساماں تھا

نئی شاعری

وہ آیا
اور اُس نے سمجھایا
تم دُنیا کے خاتمہ کے ذمہ دار نہیں ہو
تم اس جرم کے بالکل قصوروار نہیں ہو
تم اپنے کاندھے کو اس بوجھ سے آزاد کردو
غیر ضروری فکروں میں وقت مت برباد کرو

تم چڑیوں اور بچوں کی طرح
ہنسو کھیلو
کیونکہ کھیلنا انسانی فطرت ہے
اور وہ کھیلنے لگے، یہ بھول کر
کہ نئی شاعری' ہوش مند سانسیں جینے سے عبارت ہے

الیکزینڈر واٹ

الیکزینڈر واٹ (پیدائش ۱۹۰۰ء) پولش زبان کا مقبول و ممتاز شاعر تھا۔ زبان و بیان کے نئے شعری تجربے اور آوارہ گردیوں کی وجہ سے اس کی تاریخی اہمیت ہے۔ ابتدا میں اس کی شاعری پر دادا ازم اور سریلزم کے اثرات نمایاں تھے۔ اس میں تجربہ پسندی کے ساتھ اس زمانہ کی پولش کی ادبی تحریک اور اس کے میٹر کے خلاف احتجاج کے رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن واٹ کی یہ انتہا پسندی زیادہ عرصہ تک اس کا ساتھ نہیں دے سکی۔ ایک طویل مدت تک خاموش رہنے کے بعد جب وہ پھر سے تخلیق و تنقیدی طور پر فعال ہُوئے تو اُن کا انداز بڑی حد تک متوازن تھا' اور وہ پھر سے قاری و تخلیق کی ہم رشتگی کے قائل نظر آتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں واٹ نازیوں سے فرار کے راستے میں رُوسیوں کی حراست میں آئے اور چھ سال قید و بند کے شکار رہے۔ پولینڈ میں واپسی پر بھی ان پر عذابوں کی یلغار جاری رہی۔ ان لگاتار پریشانیوں نے دس سال تک ان کے تخلیقی سوتوں کو خشک رکھا' پھر ۱۹۴۹ء میں اُن کی نئی نظموں کا انتخاب شائع ہُوا۔ اُن کا یہ مجموعہ چونکانے کی حد تک فریش اور خوب صورت تھا۔ اسے پولش کی شعری دُنیا میں ایک اہم واقعہ تصور کیا جاتا ہے۔ واٹ کی آخری دَور کی شاعری ان کی ابتدائی شاعری کی طرح صرف تجربہ برائے تجربہ نہیں ہے' اس میں فکری وسعت، جدید حسیت اور اعتدالی حرارت بھی ہے اور قارئین سے قربت کا احساس بھی ہے۔

ہم زاد

تم کبھی اکیلے نہیں ہوتے
کوئی نہ کوئی تمہارے ساتھ ہوتا ہے
تم کہیں بھی جاؤ

کوئی نہ کوئی تمہارے ہی ساتھ جاگتا سوتا ہے
وَفادار کتا بھی کبھی بے وَفا نظر آتا ہے
اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے
لیکن وہ کوئی نہ کوئی
ہمیشہ ساتھ نبھاتا ہے
سُرخ بالوں والی طوائف
جو ہوٹل کے دروازے سے لگی کھڑی ہے
اس کے ساتھ
ایک اور اس کے جیسی ہے
بوڑھا آدمی جو بلّی جیسا اُس کے پاس آیا ہے
اُس کے ساتھ بھی اُس کی چھڑی ہے
وہ دونوں گرم بستر پر مدہوش ہیں
اور اُن کے ہمزاد
بستر کے نیچے سر جھکائے خاموش ہیں

شیطان کبھی نہیں مرتا

تیز بہاؤ والے سمندر کے کنارے
ایک کاسۂ سر جگمگا رہا تھا
جو مسلسل اِلٰہ لا اِلٰہ کے الفاظ دوہرا رہا تھا
اس آواز میں
عجیب دَرد
اور التجا تھی
میں نے جہاز راں سے پوچھا
اب یہ دَرد کیسا

اب یہ خوف کس لئے
اب تو یہ ہر دَرد اور خوف سے آزاد ہے
موت کی پُرسکون وادی میں آباد ہے
اسی وقت ایک تیز لہر نے
اسے اُٹھایا اور پانی پر نچاتے ہُوئے
کنارے کے پتھر سے ٹکرا دیا
جہاز راں نے اُداس آواز میں جواباً کہا
''کچھ بھی آخری نہیں ہوتا
شیطان کبھی نہیں مرتا''

لیو پولڈ اسٹاف

لیو پولڈ اسٹاف (۱۸۷۸ء) کا نام 'ینگ پولینڈ' نامی ادبی تحریک سے منسلک ہے' جو پہلے عالمی جنگ سے پہلے وہاں فعال رہی ہے۔ اس تحریک نے ادب کو فطرت کی تصویر گری اور تصوف کی گرانباری سے نجات دِلا کر شاعری مسائلی عمل داری کو وسعت دی۔ اسٹاف متحرک ذہن کے انسان تھے۔ وہ وَقت کے ساتھ خود بدلتے ہی نہیں رہے ہر دَور کے نوجوانوں کے بدلتے اقدار کو بھی لبیک کہتے رہے۔ وہ ادب کے اس مستعمل رویّے کی ہمیشہ نفی کرتے رہے۔ جسے تنقیدی اصطلاح میں انفرادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں لفظ اور موضوع' ہر تخلیق کے ساتھ رنگ رُوپ بدلتے نظر آتے ہیں۔

اسٹاف شاعری کے علاوہ ادب کی مختلف اصناف سے بھی ہم رشتہ تھے۔ یوروپی فلسفہ کی کتابوں میں ایک سیریز اُن کے نام سے منسوب ہے۔ ان میں نیشتے، کرکے گارد اور کارڈینل نیوٹن پر اُن کی تصانیف کافی اہم سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے منظوم تراجم جو اُنھوں نے لاطینی، اطالوی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں سے پولش میں کئے ہیں۔ ان کی وجہ سے شعر فہمی اور شعری تخلیق کا نیا منظر نامہ ترتیب ہوتا ہے۔ عالمی ادب کی سُوجھ بُوجھ اور ادب کے وسیع دائرہ کی بنا پر وہ اپنے عہد کے مختلف ادوار میں کئی نسلوں کے آئیڈیل رہے تھے۔

تین چھوٹی بے نام بستیاں

اِتنی چھوٹی
کہ تینوں مل کر ایک بھی بن سکتی تھیں
نقشہ میں نہیں ہے ان کی کوئی پہچان
خاموش
اَمن پسند افراد کی یہ بستیاں
جنگ میں ہو چکی ہیں بے نشان
بے خبر، بے فکر دوستو!
تم ان بستیوں کا خیال کیوں نہیں کرتے
وہ ذہنی طور پر کتنے مفلس ہوتے ہیں
جو کبھی کوئی سوال نہیں کرتے

دُعا

اے خدا! تُو مجھے بھلے ہی بادل میں اُڑا
لیکن پانی کا قطرہ نہ بنا
کیونکہ میں واپس زمین پر جانا نہیں چاہتا

اے خدا تُو مجھے بھلے ہی شاخ پر پھول سا اُگا
لیکن شہد کی مکھی نہ بنا
کیونکہ میں مٹھاس میں اور زیادہ وقت بتانا نہیں چاہتا

اے خدا تُو مجھے بھلے ہی تالاب میں چھپا
لیکن مچھلی نہ بنا
کیونکہ میں اپنی نسوں میں سرد خون کا بوجھ اُٹھانا نہیں چاہتا

اے خدا تُو مجھے بھلے ہی جنگلی پھل ہونے کی سزا دے
لیکن اناج کے دانے نہ بنا
کیونکہ میں لال پروں والی چڑیوں کی چونچوں میں جانا نہیں چاہتا

اے خدا تُو مجھے بھلے ہی پتھر سا بنا
لیکن لندن کی شہر کی فُٹ پاتھ نہ بنا
کیونکہ میں بے جان دیواروں سے اور ٹکرانا نہیں چاہتا

اے خدا مجھے آگ کے شعلوں سے بچا
آسمان میں بادل بنا کے اُڑا......

کراچی کے ایک علاقہ ناظم آباد کے ایک بنگلے میں جمیل فاطمہ زندگی و موت کی کش مکش سے گذر رہی ہیں۔ وہ ندا کی بڑی بہن قمر طلعت سے خط لکھواتی ہیں' اُس کی آخری سطریں ہیں۔

''تین دِنوں سے ایک کوا میرے سرہانے بول بول کر کان کھا رہا تھا' مَیں اُس کے بولنے سے ہر دِن تمہارا انتظار کرتی رہی' لیکن تم نہیں آئے۔ لگتا ہے انسانوں کی طرح پرندوں پر بھی شہر کا رنگ چڑھنے لگا ہے' وہ بھی اب بلا جھجک جھوٹ بولنے لگے ہیں۔ گوالیار کے اپنے محلے کے کوے کتنے اچھے اور سچے ہوتے تھے' وہ جب بھی مُنڈیر پر آتے تھے' کوئی نہ کوئی سچی خوش خبری سُناتے تھے۔''

''کھارا سٹیشن کے قریب ایک چبوترا کوؤں کے لئے بنا ہے۔ وہاں ڈھلتی عمر کے کئی لوگ باری باری آتے ہیں اور مٹھیوں میں بھر بھر کر جوار باجرہ اُنھیں کھلاتے ہیں۔ ڈھیر سارے کوے ایک ساتھ آتے ہیں اور دانہ کھلانے والوں کو دُعائیں دے کر اُڑ جاتے ہیں''

●●

نئی نئی پوشاک بدل کر موسم آتے جاتے ہیں
پھول کہاں جاتے ہیں، جب بھی جاتے ہیں لوٹ آتے ہیں

نامے بنام ندا

شمس الرحمن فاروقی

۲۹ر جولائی ۱۹۸۸ء، پٹنہ

کچھ دن ہوئے تمہارا خط اور نظمیں ملی تھیں' بہت خوشی ہوئی ۔ جو نظمیں ترجمے کے لئے زیادہ مناسب معلوم ہوئیں اُن کا ترجمہ میری بیٹی نے کر دیا ہے ۔ میں نے بھی دیکھ کر اطمینان کر لیا ہے' اُمید ہے تم پسند کرو گے ۔ ترجمے اشاعت کے لئے بھجوادیئے ہیں ایک نقل تمہارے لئے مرسل ہے ۔ پرسوں تمہاری کتاب '' آنکھ اور خواب کے درمیان'' بھی ملی' بہت بہت شکریہ.........! '' مورناچ'' میرے پاس موجود ہے اُس کے لئے تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ۔ جمیلہ نے تمہاری نظمیں بہت پسند کیں سلام لکھوا رہی ہیں ۔ '' شب خون'' کے لئے تمہارے کلام کا انتظار رہے گا۔

☆☆

وارث علوی

۲۵ر ستمبر ۱۹۹۲ء، احمد آباد

تمہارا پیارا سا خط ملا ۔ میں تمہیں سوتا چھوڑ کر اس لئے چلا آیا کہ ایک خاص وقت کے بعد میرے جوڑوں میں درد شروع ہو جاتا ہے اور ائر کنڈیشن مجھے بالکل راس نہیں آتا ۔ شام کو پروگرام میں اس لئے نہیں آیا کہ ایسے پروگراموں میں مجھے بڑی بوریت آتی ہے ۔ بس یوں سمجھئے کہ اب درِ خورِ محفل نہیں رہا۔ ہاں اِس بات کا افسوس رہا کہ تمہیں گھر بلاتا، دعوت کرتا اور کچھ باتیں ہوتیں ۔

'' شاعر'' میں تمہاری خود نوشت کے بعض حصے اچھے لگے ۔ اب کتابی صورت میں آنے اور یکسوئی سے پڑھنے کے بعد ممکن ہے سبھی حصے اچھے لگیں ۔ تم اپنی کتاب کے لئے اِس حقیر فقیر کی رائے پسند آئے تو شامل کر سکتے ہو ۔ چونکہ میں تمہیں تمہاری شاعری، تمہاری نثر کو پسند کرتا ہوں اس لئے رائے دینے میں کوئی تکلف یا سرپرستی نہیں ہے ۔ ندا کی شاعری مجھے پسند ہے ۔ وہ ایک منفرد اسلوب کا شاعر ہے ۔ ندا کی نثر بھی مجھے پسند ہے ۔ ندا کی کتاب '' ملاقاتیں'' شگفتہ اور رواں نثر کی اچھی مثال پیش کرتی ہے ۔ اب اِس نثر کے سامنے '' دیواروں کے بیچ'' تک آپہنچے ہیں ۔ اِس سایوں کی خشک چھاؤں میں ندا کی بیتی زندگی کی یادوں کا ذکر دل کشا اور فرحت بخش ہے ۔

☆☆

ڈاکٹر کرامت علی کرامت

۲۸ر فروری ۱۹۹۳ء

'' دیواروں کے بیچ '' کا حسین تحفہ موصول ہوا۔ آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے سوانحی حالات قلم بند کیے ہیں۔ شاعری کی طرح آپ کی نثر میں بھی بڑی شگفتگی اور دل کشی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو انشائیہ کے انداز میں اس قسم کی نثر لکھ سکتے ہیں۔ یوں تو ہر سال اُردو میں متعدد کتابیں چھپتی رہتی ہیں' لیکن اس قسم کی کتاب بہت کم نظر سے گذرتی ہے۔ قرۃالعین حیدر نے'' کارِ جہاں دراز ہے'' میں ناول کی شکل میں اپنے سوانحی حالات قلم بند کیے تھے۔ انشاءاللہ میں اس کتاب پر'' نئی شناخت'' میں تبصرہ دوں گا۔ نئی شناخت کے لئے اپنی کوئی تازہ تخلیق مرحمت فرمایئے ممنون ہوں گا۔

☆☆

آصف فرخی

۲۴ر مئی ۱۹۹۳ء، گلشن آباد، کراچی

اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ جواب دیر سے لکھ رہا ہوں کہ میں تین ہفتے کے لئے میکسیکو گیا ہوا تھا۔ نیویارک میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ اس دوران ہندوستان میں کیا کچھ لکھا جارہا ہے اور قابل ذکر کتاب کون سی چھپی ہے۔ اُنھوں نے آپ کی کتاب'' دیواروں کے بیچ '' کا ذکر کیا اور اس قدر تعریف کی کہ میرے دل میں اس کے پڑھنے کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔ اِس سے پہلے '' شاعر'' میں اِس کی کئی قسطیں پڑھ چکا تھا۔ پھر یہ سوچا کہ ہندوستان کی کتاب کراچی میں تو مشکل سے ملے گی۔ آپ کو خط لکھ کر اس کی فرمائش کروں گا۔ خیال آیا کہ آپ کا پتہ تو پاس ہے نہیں'' شاعر'' ہی کے پتے پر لکھوں گا۔ یہ مصمم ارادہ کر کے واپس آیا۔ گھر آکر ڈاک دیکھی اور آپ کی کتاب نظر آئی تو نہ پوچھئے کس قدر خوشی ہوئی۔ اِس رات Jet lag کے مارے نیند نہ آئی۔ Jet lag کا ترجمہ داؤد رہبر صاحب نے (اُڑان خمیازہ) کر رکھا ہے۔ تو کتاب پڑھنا شروع کردی اور پھر تو یہ کافر منہ سے ایسی لگی ہے کہ چھٹتی نہیں۔ صاحب! کمال کی کتاب ہے۔ زندگی کے تجربے سے دھڑکتی اسلوب بیان کی تازہ کاری سے چمکتی ہوئی اندر تک اندھیرے، اُجالے سے بھری ہوئی یہ کتاب کیا ہے' سرشار کردینے والی ایک کیفیت ہے۔ غرض اس کو پڑھ کر بے حد لطف آیا۔ اتنی معرکتہ الآراء اور جرأت مندانہ کتاب لکھنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے اور مجھے اس

کتاب کی لذت انگیز مسرت میں شریک کرنے پر ہدیہ تشکر!

☆☆

وارث علوی

۲۸ر جولائی ۱۹۹۳ء، احمد آباد، گجرات

تمہاری کتاب '' دیواروں کے بیچ'' حال ہی میں شائع ہونے والی نثری کتابوں میں ایک امتیازی مقام کی مستحق ہے۔ اسے میں نے بہت دلچسپی اور یکسوئی سے پڑھا۔ احباب میں کتاب پر چھینا جھپٹی رہی اور کتاب بالآخر امریکہ محمد عمر میمن کے پاس چلی گئی کہ میری تعریف پڑھ کر وہ بھی اس کا منتظر تھا۔

'' دیواروں کے بیچ'' قیمتی مشاہدے کا خزینہ اور دل پذیر اسلوب کا بے مثال نمونہ ہے۔ ایک اچھے نثر نگار کی اتنی خوبیاں تمہاری ذات میں جمع ہو گئی ہیں کہ داد دیتے ہوئے قلم رُکتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نثر نگار شاعر سے قد آور نظر آنے لگے۔ تم اُن چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہو جن کی شاعری اور نثر دونوں دل کو رِجھا گئے ہیں۔ انسان اور زندگی کی طرف تمہارا گمبھیر، بجل، دانشمندانہ رویہ بہت اچھا لگا۔ تمہارے والد، والدہ، سلام مچھلی شہری کے خاکے غیر معمولی ہیں۔ اب ایسا موضوع تو تمہارے ہاتھ آنے سے رہا۔ لہٰذا میں چاہوں گا کہ اب تم شاعری پر لکھنا شروع کرو۔ میں تمہاری تنقیدی صلاحیت کا اُس وقت سے قائل ہوں جب کہ میں نے فیض پر تمہارا مضمون شخصیات نمبر (صابر دت) میں پڑھا تھا۔ اِدھر بشیر بدر پر بھی اچھی چلبلی چیز لکھی ہے۔ اُمید ہے تم بخیر و عافیت ہو گے۔

☆☆

بیدار بخت

۲۷ر مئی ۱۹۹۴ء، کینیڈا

خدا آپ کو خوش رکھے، ایک بار پھر آپ نے جی خوش کر دیا۔ ممبئی سے لوٹ کر دلی میں رات گئے ٹیلی ویژن پر ایک صاحب کے گانوں، غزلوں کا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ اُنھوں نے ایک فلم شروع کی ہے'' ماں''۔ شاعر کا نام انگریزی محاورے کے مطابق Small Print میں تھا' جس کا ہونا قانونی طور پر اہم ہوتا ہے۔ مگر عام طور پر پڑھا نہیں جاتا۔ اگلے روز بہت کم تلاش کے بعد گانوں کا وہ کیسیٹ مل گیا کینیڈا میں۔ گھر آ کر جب دسویں بار سنا تو اندازہ ہوا کہ پہلا ردِ عمل ٹھیک نہ تھا' نظم اچھی نہ تھی بہت اچھی تھی۔

بھائی تشبیہیں تو جوشؔ بھی لکھ لیتے تھے مگر اُن کی تشبیہیں پڑھ کر آدمی مرعوب ہو جاتا ہے کہ لکھنے

والا بڑا قابل ہے۔ آپ کی نظم نے تو ایک پیکر تراشا، ایسا لگا کہ یہ تو میرے دل میں تھا، یہ تصویر تو میں دیکھ چکا ہوں، نہ صرف دیکھ چکا ہوں بلکہ شکر گذار ہوں اس وسیلے کا جس نے یہ تصویر ایسی مصور کر دی کہ میں سب کچھ بھول کر اس میں ایسا کھو یا ہوں کہ نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ خیال بھی نہیں آیا کہ شاعر کو ایسی نادر تشبیہات پر داد دینی چاہیئے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اسے بیس بار سن چکا ہوں اور آپ کی نظم کے طفیل ان صاحب کی نیم ہنری کو بھی معاف کر چکا ہوں، جنھوں نے اسے گایا۔ دوستوں کو نہ صرف سنایا بلکہ اس کی کاپیاں بنا کر بھی دے چکا ہوں (یہاں آپ کے پبلشر کی درگذری بھی درکار ہے) گوپی چند نارنگ یہیں آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی میری رائے سے متفق ہیں اور شمس الرحمٰن فاروقی بھی جو آج کل امریکہ میں ہیں اور جن سے بات ہوتی رہتی ہے۔ لکھتے رہئے۔

☆☆

مشفق خواجہ

۲۹ر جون ۱۹۹۴ء، ناظم آباد، کراچی

آپ کی کتاب ''دیواروں کے بیچ'' جو آپ نے کئی ماہ پہلے بھیجی تھی، وہ اب کہیں دست بدست مجھ تک پہنچی ہے۔ جن کرم فرمانے یہ آپ بیتی عنایت کی ہے انھیں کسی اور نے دی تھی اور یہ صاحب جو تاخیر کا سبب ہیں تو کتاب اُن کے پاس کئی مہینے پڑی رہی اور وہ اسے اس کی منزل تک پہنچانا بھول گئے۔ اس تاخیر کی معذرت میں ہی کئے لیتا ہوں کہ اصل مجرموں کو اس کا احساس ہی نہیں کہ انھوں نے اس کتاب کو مجھ تک تاخیر سے پہنچا کر کتنے برے اخلاق کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

اس آپ بیتی کی کچھ قسطیں ماہنامہ ''شاعر'' میں پڑھیں تو اُسی وقت احساس ہو گیا تھا کہ یہ کچھ مختلف سی کتاب ہے اور اب مکمل کتاب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اُردو میں اچھی کتابوں کا لکھا جانا، ماضی ہی کی بات نہیں ہے، زمانۂ حال میں بھی ایسا ہونا ممکن ہے۔ دو باتوں نے اس کتاب کو ایک یادگار کتاب بنا دیا ہے۔ ایک بیان واقعہ ہے اور دوسری اسلوب بیان۔ آپ نے بڑی جرأت سے بعض ایسے ذاتی واقعات بھی لکھ دئے ہیں جو کوئی دوسرا لکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ سچ لکھنا بہت مشکل کام ہے اور جب سچ لکھا جاتا ہے تو یہ اپنی گواہی خود دیتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آپ کا سچ، سچ ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔

اسلوب بیان کے اعتبار سے، آپ نے آپ بیتی نہیں لکھی، ادب تخلیق کیا ہے۔ یہ اسلوب دوسروں سے مختلف بھی ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد بھی۔ آپ نے سیدھی سادی وقائع نگاری نہیں کی، ادبی سطح پر واقعہ کی بازیافت کا کام انجام دیا ہے۔ ایسے ہی کام ''کارنامہ'' کہلانے کے مستحق

ہوتے ہیں۔ میں آپ کے ذاتی حالات سے قطعاً ناواقف ہوں، اِس لئے مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے کون کون سے واقعہ کو بیان نہیں کیا۔ لیکن دورانِ مطالعہ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوا ہے کہ یہاں کچھ ''چھوڑ'' دیا گیا ہے۔ خصوصاً عشرت کے حوالے سے آپ نے جو کچھ لکھا ہے اُسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے کچھ درمیانی کڑیاں چھوڑ دی ہیں۔ اِس کے باوجود پڑھنے والے کو آپ سے نہیں عشرت ہی سے ہمدردی ہوتی ہے۔ یہ بھی آپ ہی کی کامیابی ہے۔ آپ سے بمبئی میں جو ملاقاتیں ہوئی تھیں، اُن کی یادیں ہنوز تازہ ہیں۔ خدا کرے سب خیریت سے ہوں۔

☆☆

ڈاکٹر محمد حسن

۲۳ دسمبر ۱۹۹۶ء، دہلی

آپ کا تازہ مجموعہ ''کھویا ہوا سا کچھ'' موصول ہوا۔ اس کو اشاعت پر بارر کھنے کا شکریہ۔ پس منظرات نے دامن کھینچ لیا۔ یہ اطمینان ہوا کہ اب آپ نے اپنا طرز پالیا ہے اور اسے حالات کے موافق اور اپنے مزاج کے موافق بنانے کا گُر بھی جان لیا ہے۔ البتہ تعجب اِس بات پر ہوا کہ آپ بھی اب نظموں کے دست کش ہو رہے ہیں اور آپ کو فکر کی رعنائی غزلوں میں اور تو اور دوہوں میں زیادہ اُبھر کر سامنے آرہی ہے۔ البتہ ان منظرات میں جو خاصے کی چیز نظر پڑی وہ اجودھیا والے حادثے پر آپ کا ''خود اعتمادانہ'' ردِ عمل ہے' جو ایک مٹی ہوئی بستی کی کہانی ہے۔ ''غلط نشانہ، جو ہوا سو ہوا'' والی غزل میں نمایاں ہے وہ خاصے کی چیز ہے اور اُردو شاعری کی معتبر آواز۔ مبارکباد قبول کیجئے کہ اس ردِ عمل کو اتنے دھیرج اور اتنے فن کارانہ تحمل سے بیان کر پار ہے ہیں۔ بہر حال آپ کا یہ مجموعہ آپ کے سبھی مجموعوں سے ایک قدم ضرور آگے ہے اور آج کل کی... شاعری میں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

''عصری ادب'' بند ہو گیا اور آپ کا گوشہ نکالنے کا ارمان بھی یونہی رہ گیا۔ نئی بات البتہ گفتنی رہ گئی کہ اپنی نظموں کی فکر کہ ذرا کشادگی اور وسعت دیجئے اور آپ کے ایک پُر اشتیاق پڑھنے والے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ نظموں کو ذرا اور وسعت دیجئے کہ اتنے اختصار سے جی نہیں بھرتا۔

☆☆

پروفیسر شکیل الرحمن

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۸ء، گڑگاؤں، ہریانہ

''کھویا ہوا سا کچھ'' اور ''لفظوں کا پل'' خوبصورت تحفے ہیں میرے لئے' شوق سے پڑھوں گا۔ یوں آپ کو پڑھتا رہتا ہوں، منفرد انداز ہے آپ کا، اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ آپ بات کہہ دیتے ہیں' زبان

سے بے اختیار نکلا ہے۔ !You said it غالباً آپ ہی نے کہا تھا نا؟

گھاس پر کھیلتا ہے ایک بچہ
پاس ماں بیٹھی مسکراتی ہے
مجھ کو حیرت ہے جانے کیوں دُنیا
کعبہ و سومناتھ جاتی ہے

اس طرح بات کہہ دینے کے انداز نے آپ کے کلام کو منفرد حیثیت دی ہے۔ یہ شاعری بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے جو شاعری سوچنے پر مجبور کرتے ہوئے جمالیاتی انبساط بخشے وہی اچھی شاعری ہوتی ہے۔ آپ کی شاعری یقیناً اچھی شاعری ہے۔

رابطہ رکھئے، دلی آیئے تو فون ضرور کیجئے۔ پچھلے برس آپ کی خودنوشت سوانح حیات ''دیواروں کے بیچ'' مل گئی تھی، جی خوش ہو گیا تھا اُسے پڑھ کر۔ آپ نے میری خودنوشت سوانح حیات ''آشرم'' نہیں پڑھی۔ اُسے پڑھتے تو یقیناً کچھ کہہ دیتے، ایک مختصر سی نظم ہو جاتی۔ خوش رہیئے، مسکراتے رہیئے' بابا سائیں سے ملنے کی ضرور کوشش کیجئے گا۔ بچوں نے میرا نام بابا سائیں رکھ دیا ہے' میں نے اس نام سے اُن کے لئے ۱۲ رکہانیاں لکھی تھیں۔ آس پڑوس کے بچے بھی مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔ اب دوست احباب بھی مجھے بابا سائیں کہتے ہیں (بابا سائیں، بابا سائیں) یہ نام مجھے بہت پسند آیا اس لئے کہ یہ نام بچوں نے دیا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ عبادت میں مصروف رہتا ہوں اور دُنیا بھر کے لوگوں کو دُعائیں دیتا رہتا ہوں۔ میرے مرجانے کے بعد میری قبر پر جو بھی اپنی آرزو لے کر آئے گا اُس کی آرزو پوری ہوگی۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ مزار کے پاس آ کر اُردو یا فارسی کا کوئی خوبصورت شعر سنائے۔ شعر سن کر بابا سائیں جھوم گیا یعنی اُس کی روح جھوم گئی تو سمجھ لیجئے آرزو پوری ہو گئی۔ اِس کے لئے ندا فاضلی صاحب آپ کو بہت سے اچھے اشعار کی تخلیق کرنی ہوگی۔ اُن لوگوں کے لئے جو بابا سائیں کے پاس آئیں گے۔ ظاہر ہے بابا سائیں میر و غالب کے اشعار نہیں سنیں گے اُنھیں تو وہ عمر بھر اوڑھنا بچھونا بنا چکے ہوں گے۔ اچھے اشعار سنیں گے تو ندا فاضلی اور ایسے دوسرے اچھے شعراء کے۔ آپ کا بابا سائیں!

☆☆

اقبال مجید

۲۶ رجنوری ۹۹ء، بھوپال

ابھی میں آپ کو مبارکباد دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اخباروں میں بشیر بدر کو پدم شری ملنے کی خبر

پڑھی۔ظاہر ہے کہ آپ کی شاعری اور بشیر بدر کی شاعری میں وہی فرق ہے جو اکادمی کے انعام اور اعلیٰ قومی اعزاز میں ہوسکتا ہے۔آپ کی شال کھدر کی ہوگی اور بشیر کی شال خالص کشمیری پشمینے کی' خیر اعزاز تو بہر حال اعزاز ہی ہے۔ ہمارا کام مبارکباد دینا ہے سو قبول فرمایئے۔

☆☆

مصطفی کریم

۷/اپریل ۲۰۰۱ء،اسکار برو،یو۔کے

آپ کی کتابیں ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر'' مجھے بہت پسند آئیں۔ان کا اسلوب،تہہ داریاں،رنگ برنگے کردار،ان کے انوکھے رُخ اور جگہ جگہ خوبصورت اور بامعنی اشعار۔اِن سب نے آپ کی تخلیق کو ادب کا گراں قدر سرمایہ بنادیا ہے۔افسوس ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے۔اِس ملک میں اُردو دُنیا چراغ سحری ہے اور پاکستان میں ادب پر داڑھی لگادی گئی ہے اور اِس کی آنکھ پر سبز چشمہ چڑھادیا گیا ہے اِس لئے ممکن ہے اِن کتابوں کو پاکستان میں وہ شہرت نہ ملی ہو جن کی یہ مستحق ہیں۔

یہ صرف میرا نہیں آپ کا بھی المیہ ہے۔کتابوں کے چند اشعار میں مجھے اپنی زندگی کی جھلکیاں نظر آئیں اور بھی چند باتیں مشترک ہیں۔میری والدہ بھی کراچی میں دفن ہیں،میں بھی اپنے نام کے ساتھ سیّد نہیں جوڑتا۔جہاں کہیں بھی آپ کی تخلیق نظر آتی ہے میں ضرور پڑھتا ہوں۔میں نقاد نہیں لیکن یہ لکھنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ آپ نے ترقی پسند ادب کا شاندار تسلسل برقرار رکھا ہے اور اپنی شاعری کو وہ تنوع دیا ہے جس سے بیشتر شاعری محروم رہی ہے۔ایک دو نکات لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

گوالیار میں تان سین دفن (غالباً) ہیں (دیواروں کے بیچ میں اِس کا ذکر نہیں ہے)۔اِسی لئے گوالیار میں بہت بڑا سنگیت سمّیلن ہوا کرتا تھا۔جہاں آپ نے رُومیلا تھاپر اور ہربنس سنگھ کا سیکولر تاریخ داں کی حیثیت سے ذکر کیا ہے وہاں آپ عرفان حبیب کا ذکر کرنا بھول گئے۔جہاں آپ کی دلچسپ محبتوں کا ذکر آیا ہے وہاں قاری کو آپ کی شادی میں بھی دلچسپی ہونے لگتی ہے۔کیا اِس کی نوبت نہیں آئی؟ پھر بھی آپ کا خانہ آباد رہا تو یہ اور بھی بڑا محرک ہوگا۔آپ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔اِس لئے بے تکلف القاب استعمال کیا ہے۔اُمید ہے آپ نے برا نہیں مانا ہوگا؟ خوش رہیئے۔کسی اُردو ادیب کا قلم کے سہارے وقار سے زندگی گذار دینا آسان نہیں ہے۔

☆☆

رشید حسن خاں

۱۱/جون ۲۰۰۱ء، شاہجہان پور، یوپی

کتاب کا تحفہ ملا۔ آپ نے یاد رکھا اور یاد کیا، اِس کے لئے ممنون ہوں اور شکر گذار بھی۔ لکھنے پڑھنے والوں کے لئے کتاب سب سے اچھا تحفہ ہے، خاص کر اُس صورت میں جب وہ دلچسپ بھی ہو۔

میں نے کتاب پوری کی پوری پڑھ لی۔ دلچسپی کا اندازہ اِس سے ہوا کہ جب تک کتاب ختم نہ ہوگئی کوئی اور کام یاد ہی نہیں آیا۔ خط میں اپنی رائے کیا لکھوں، جب وہاں آنا ہوگا (چند ماہ بعد) تب زبانی عرض کروں گا اور نسبتاً تفصیل کے ساتھ اور بعض جملوں کی خاص طور پر داد بھی دوں گا۔

ایک بار پھر شکریہ۔

☆☆

عذرا پروین لکھنؤ

آپ کو عید کی مبارکباد کے ساتھ ساتھ "کھویا ہوا سا کچھ" کے لئے بھی شکریہ، اِس کتاب کے کور پر خاص دھیان دینے کا شکریہ۔ اچھی غزلیں، نظمیں اکٹھی کرنے کا شکریہ۔ میرے خیال سے شکریوں کا اچھا خاصہ بنڈل ہوگیا ہے۔ ارے ہاں یہ فلیپ نگار بندہ کون ہے جس نے نام نہ دے کر ایک نئی اور اچھی پرمپرا قائم کی ہے۔ یہ کس منصور کے پردے میں ادب کا کون سا خدا بول رہا ہے اور بول رہا ہے تو چھپ چھپ کر کیوں بول رہا ہے؟ اِس سے ذرا میری طرف سے گا دیجئے۔

ذرا سامنے تو آؤ چھلیے
چھپ چھپ چھلنے میں کیا راز ہے؟

جب فلیپ نگاری اختیار کر ہی لی تو اب کیسا شرمانا؟ سچ بات تو یہ ہے کہ فلیپ نگاری اپنی کتاب پر آپ کو خود کرنی چاہیئے تھی اور وہ نظم جو میری نظم کے نام سے آپ نے تمہید میں درج کی ہے، وہی فلیپ کے کھاتے میں درج ہو جاتی تو کیا خوبصورت منظر ہوتا۔ خیر خوش رہیئے۔ کہ آپ نے میری ماں کو چمٹا، پھکنی بنا دیا، جس کی مار سے ہم بہت ڈرتے ہیں۔ مرغے کی آواز پہ کنڈی کی طرح کھلنا تو میرے لئے بہت ہی سبق آموز ہے۔ کیونکہ ہم تو مرغے کی آواز پر کنڈی کی طرح کھلنے والی اماں نہیں ہیں بلکہ اور بند ہو جانے والی اماں ہیں۔ اللہ میرے معصوم بچوں پر رحم کرے اور بچوں کی ماں پر بھی۔

آپ کی کتاب کا کور پہلے والی کتاب "دیواروں کے بیچ" سے بہت اچھا ہے۔ کیا کریں میری کمزوری ہے کہ ہم کور کے رنگوں میں جتنا گھل مل جاتے ہیں اسی طرح کتاب سے تعلق استوار ہو جاتے

ہیں۔حالانکہ بچپن میں پکاپکار ٹایا گیا تھا کہ۔Dont judge a book by its cover ہم کو آپ کی ایک غزل کا ایک ہی شعر بہت اچھا لگا۔

بانٹ کے اپنا چہرہ ، ماتھا ، آنکھیں' جانے کہاں گئیں
پھٹے پرانے اِک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

''دیکھا ہوا سا کچھ ہے تو سوچا ہوا سا کچھ'' اور'' کہیں چھت تھی ، درو دیوار تھے کہیں'' دونوں غزلیں اپنی نغمگی اور تاثیر کی وجہ سے حاصل مجموعہ غزلیں ہیں۔ نظمیں تقریباً سب ہی بے حد خوبصورت ہیں۔آج کل آپ کے شعر ایک جیسے بنتے جا رہے ہیں۔

کوئی ملا تو ہاتھ ملایا' کہیں گئے تو باتیں کیں
گھر سے باہر جب بھی نکلے' دن بھر بوجھ اُٹھایا ہے

یہ کس گھر کا ذکر آپ نے کیا ہے؟ یہ مالتی دیدی کی رہائش یعنی امرا پارٹمنٹ نامی گھر کی بات کی ہے یا اپنی ذات میں The other کی شمولیت کے جبر کا نوحہ ہے؟ بہر حال شعر اچھا ہے۔مبارکباد، خوش رہیے ،خوب لکھیے۔

☆☆